حدیثِ حرم

سمیع اللہ ملک

حدیثِ حرم

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي
بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَ هُدًى لِّلْعَالَمِينَ

بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو
انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکّہ
میں واقع ہے اس کو خیر وبرکت دی گئی تھی
اور تمام جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت
بنایا گیا تھا۔ (العمران:96)

انتساب

حرمین شریفین کے نام جہاں

سے امت کیلئے ہدایت و

رہنمائی کا آغاز ہوا

کچھ نہیں مانگتا شاہوں سے یہ شیدا تیرا
اس کی دولت ہے فقط نقشِ کفِ پا تیرا

تہ بہ تہ تیرگیاں ذہن پہ جب لوٹتی ہیں
نور ہو جاتا ہے کچھ اور ہویدا تیرا

کچھ نہیں سوجھتا جب پیاس کی شدت سے مجھے
چھلک اٹھتا ہے میری روح میں مینا تیرا

پورے قد سے میں کھڑا ہوں تو یہ ہے تیرا کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

دستگیری میری تنہائی کی تو نے ہی تو کی
میں تو مر جاتا اگر ساتھ نہ ہوتا تیرا

لوگ کہتے ہیں سایہ تیرے پیکر کا نہ تھا
میں تو کہتا ہوں جہاں بھر پہ ہے سایہ تیرا

تو بشر بھی ہے مگر فخرِ بشر بھی تو ہے
مجھ کو تو یاد ہے بس اتنا سراپا تیرا

میں تجھے عالمِ اشیاء میں بھی پا لیتا ہوں
لوگ کہتے ہیں کہ ہے عالمِ بالا تیرا

میری آنکھوں سے جو ڈھونڈیں تجھے ہر سو دیکھیں
صرف خلوت میں جو کرتے ہیں نظارا تیرا

وہ اندھیروں سے بھی درانہ گزر جاتے ہیں
جن کے ماتھے میں چمکتا ہے ستارا تیرا

ندیاں بن کے پہاڑوں میں تو سب گھومتے ہیں
ریگزاروں میں بھی بہتا رہا دریا تیرا

شرق اور غرب میں نکھرے ہوئے گلزاروں کو
نکہتیں بانٹتا ہے آج بھی صحرا تیرا

اب بھی ظلمات فروشوں کو گلہ ہے تجھ سے
رات باقی تھی کہ سورج نکل آیا تیرا

تجھ سے پہلے کا جو ماضی تھا ہزاروں کا سہی
اب جو تا حشر کا فردا ہے وہ تنہا تیرا

ایک بار اور بھی بطحا سے فلسطین میں آ
راستہ دیکھتی ہے مسجدِ اقصیٰ تیرا

-: پیش لفظ:-

اللہ اکبر.... وہ کون سا گھر ہے آپ کی نگاہیں جس کی دیواروں کی بلائیں لیکر پلٹی ہیں..... جہاں آپ کا جسم بھی طواف میں تھا اور آپ کا دل بھی..... دنیا کے بت کدوں میں کل بھی وہ پہلا گھر تھا خدا کا اور آج بھی۔ دو چار صدیوں کی بات نہیں بلکہ دنیا کا سب سے پہلا عبادت خانہ! بنی آدم میں کسی کے حافظے میں اس وقت کی یادیں بھی محفوظ ہیں.... اس طویل عرصے میں بے حساب مندر تعمیر ہوئے، لاتعداد گرجے آباد ہوئے، کیسے کیسے انقلابات سے یہ زمین آشنا ہوئی، کیسی کیسی بلندیاں پستیاں ہوئیں، کون کون سی تہذیبیں ابھریں اور مٹیں.. چاہے مصر و بابل ہوں یا روم و ایران لیکن عرب کے ریگستانوں میں چٹانوں اور پہاڑوں کے وسط میں سیاہ غلاف میں لپٹی یہ عمارت جس کو رب نے "اپنا گھر" کہا اس کو زمانے کا کوئی طوفان، کوئی انقلاب، کوئی زلزلہ اپنی جگہ سے نہ ہلا سکا.... جو ابرہہ اس کو مٹانے اٹھا وہ نہ صرف خود مٹ گیا بلکہ تا قیامت رسوائی و عبرت کا ایک استعارہ بن گیا۔

اللہ کا خاص کرم ہو ان نفوس پر جن کو رب العزت اپنے گھر کی زیارت کی توفیق مرحمت فرمائی۔ اس سفر حجاز میں بار بار عملی طوافِ شوق کی تکمیل کہاں ممکن ہے، آپ کی نظروں سے اس گھر کا طواف ابھی مکمل نہیں ہو پاتا کہ روح کی ضد کہ یہیں حیات تمام ہو جائے....! ہر تکلف و تصنع سے مبرا یہ سیاہ چوکور گھر.... نگاہ جب پڑتی ہے تو جم کر رہ جاتی ہے اور روح ایسی سرشار ہوتی ہے کہ عجز و انکساری سے سجدہ ریز ہو جاتی ہے!! اس موقع پر موسیٰ کلیم اللہ یاد آگئے جب اس کے گھر کی تجلی پر ہوش و حواس قائم رکھنا مشکل ہے تو اس گھر کے رب کی تجلی کیا کیا ہلچل بپا کرتی ہو گی! جب گھر کی برق پاشیوں کا یہ عالم ہے کہ جو دیکھتا ہے وہ کچھ اور دیکھنا بھول جاتا ہے اور ہمیشہ کیلئے یہی نظروں میں سما جاتا ہے تو گھر والے کے دیدار کی تاب انسانی بصارت بھلا کہاں لا سکتی ہے!

رب کعبہ کا یکتا گھر نظروں کے سامنے تجلیاں بکھیر رہا تھا جسے پہلی مرتبہ کسی انجینئر، کسی ماہر تعمیرات نے نہیں بنایا، نہ لاکھوں روپے کا سامانِ تعمیر اس پر لگا، نہ جدید مشینری استعمال ہوئی!!! اللہ کے گھر کا معمار.....؟؟ ہاں وہ معمار بھی لمحہ لمحہ ہمارے تصور میں آرہا ہے جو اپنے سر پر بھاری بھاری پتھر اٹھا کر لا رہا تھا، جس کے ہاتھ چونے، مٹی اور گارے سے بھرے ہوئے تھے۔ عرب کی چلچلاتی ہوئی دوپہروں میں ریگستان کی آگ برساتی دھوپ کی پروا کیے بغیر، روپے پیسے کی مزدوری سے بے نیاز وہ مزدور..... جو گویا اپنے پورے وجود کو اس گھر کی تعمیر میں لگا رہے تھے اور گھر کا مالک بڑے چاؤ سے بڑے پیار سے ذکر کرتا ہے ان "مزدوروں" کا جب ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے:

ہاں! اس گھر کی زیارت کرتے ہوئے جب چشم تصور میں نظریں اس پر ٹھہر جاتی ہیں تو لگتا ہے کہ جو ہاتھ اب تعمیر بیت اللہ میں مشغول ہیں، پتھر پر پتھر رکھ رہے ہیں، ہاتھوں میں چونا اور گارا ہے اور چشم اشکوں سے لبریز... کہ دل کا سوز و گداز زبان پر آجاتا ہے کہ..... رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ اے ہمارے رب ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے بے شک تو سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے (البقرہ:127) تو یہ ہے دوستوں کی شان..... عشق کی منزلوں سے آگے کی منزلیں..... فدائیت کی منزلیں..... کہ سب کچھ لگا کر بھی دھڑکا یہی لگا ہوا ہے کہ مٹنا قبول بھی ہو گا کہ نہیں.....؟؟؟

زائر الحرمین اگر اپنے دل و جاں اور روح کی طرف متوجہ ہوں تو اس سفر حجاز کا ایک پیام ضرور سنائی دیتا ہے وہ اک پیام جو مسجد حرام نے بھی رخصت ہوتے ہوئے دیا تھا اور مسجد نبوی سے بھی وہی صدا موصول ہو رہی ہے جو عرفات کے میدان میں بھی آرہی تھی اور منیٰ کی قربان گاہ میں بھی، جو زم زم کے قطروں نے بھی ہم سے سرگوشی میں کی ہے اور خاکِ حرم کے ذروں نے بھی آپ کے قدموں سے لپٹ کر کی ہے اور وہ صدا تھی، بس ایک صدا، کیسی صدا کہ "کونوا انصار اللہ" جب دنیا ظلم سے بھر گئی تو کیا تم اپنے حصے کا کام کرنے نہ اٹھو گے!

راستہ بھی موجود ہے اور اس کی دی ہوئی ٹانگیں بھی موجود ہیں اور اس راستے پر چلنے کا قرض بھی موجود ہے۔ مالک نے جو زمین حوالے کی، مزارع نے اس پر ہل نہ چلایا اور زمین زہر آلود جھاڑیوں اور کانٹوں سے بھر گئی۔ سفر حجاز نے یہی تو کہا ہے آپ سے کہ جیسے یہاں کے ہر چپے پر اللہ کی بڑائی اور اس کا ذکر ہے، اللہ کی ساری کائنات یونہی اس کی بڑائی چاہتی ہے۔ معرکہ بدر اور واقعہ کربلا آج بھی بپا ہے۔ ہم نے کبھی سوچا کہ مملکت خداداد پاکستان 27 رمضان کی مبارک ساعتوں میں کیوں معرضِ وجود میں لایا گیا، ایسی رات جو ہزار مہینوں سے بہتر اور افضل ہے؟ ہم نے اس کے حصول کیلئے بیش بہا جانوں کا نذرانہ پیش کیا، صدی کی سب سے بڑی انسانی ہجرت میں لاکھوں خاندان ایک دوسرے سے بچھڑ گئے اور اپنوں کے فراق میں قبروں کا رزق بن گئے۔ ہم نے اپنے رب سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم اس ارضِ وطن میں قرآن کی حاکمیت قائم کریں گے۔ آج تک ایفائے عہد کی تکمیل کرنے سے قاصر ہیں۔ حرمین کا اپنے ہر زائر سے یہ برملا سوال ہے کہ ہمارے اندر اس دین کے نفاذ کی سختیاں جھیلنے کا کتنا عزم ہے؟

سفر حجاز کی یادیں ہم سے سوال کرتی ہیں کہ آج ربّ کعبہ کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر خالقِ کائنات کی غلامی میں واپس لانے کیلئے اپنا کردار کب ادا کرو گے؟

فہرست حدیثِ حرم

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
1	گھر کا بھیدی	بروز سوموار 12 رجب المرجب 1445ھ 22 جنوری 2024ء	9
2	کیا قیامت آنے والی ہے؟	بروز جمعرات 15 رجب المرجب 1445ھ 25 جنوری 2024ء	14
3	خون کی ندیاں بہانے میں ہوئی صدیاں تمام	بروز ہفتہ 17 رجب المرجب 1445ھ 27 جنوری 2024ء	19
4	سفر حجاز کا مطالبہ	بروز بدھ 21 رجب المرجب 1445ھ 31 جنوری 2024ء	24
5	وہی اوّل وہی آخر	بروز ہفتہ 24 رجب المرجب 1445ھ 3 فروری 2024ء	31
6	آقا ﷺ کا آخری پیغام	بروز منگل 27 رجب المرجب 1445ھ 6 فروری 2024ء	38
7	اسلام یا مغربی جمہوریت	بروز جمعتہ المبارک 30 رجب المرجب 1445ھ 9 فروری 2024ء	43
8	مغرب اسلام سے خوفزدہ کیوں؟	بروز سوموار 3 شوال المعظم 1445ھ 12 فروری 2024ء	50
9	امریکی جنگی مافیا اور عالمی امن	بروز سوموار 6 شوال المعظم 1445ھ 15 فروری 2024ء	56
10	لبرل جمہوریت کا بحران	بروز سوموار 9 شوال المعظم 1445ھ 18 فروری 2024ء	62
11	آخر یہ ہوا کیا ہے؟	بروز جمعرات 13 شوال المعظم 1445ھ 22 فروری 2024ء	70
12	ہے جُرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات	بروز سوموار 17 شوال المعظم 1445ھ 26 فروری 2024ء	78
13	امریکا: استعماری قوت	بروز بدھ 19 شوال المعظم 1445ھ 28 فروری 2024ء	82
14	سوال یا زوال	بروز ہفتہ 22 شوال المعظم 1445ھ 2 مارچ 2024ء	87
15	حضور ﷺ کا روحانی فیض۔۔پاکستان	بروز سوموار 24 شوال المعظم 1445ھ 4 مارچ 2024ء	93
16	مودی کا مکروہ چہرہ	بروز بدھ 26 شوال المعظم 1445ھ 6 مارچ 2024ء	98
17	ہم پست کیوں ہو گئے؟	بروز جمعتہ المبارک 28 شوال المعظم 1445ھ 8 مارچ 2024ء	103
18	غلامی کا طوق	بروز اتوار 30 شوال المعظم 1445ھ 10 مارچ 2024ء	108
19	استقبالِ رمضان.....روزے کی حقیقی روح	بروز سوموار یکم رمضان الکریم 1445ھ 11 مارچ 2024ء	111
20	عقل کی عیاری..... عشق کی حیرانی	بروز بدھ 3 رمضان الکریم 1445ھ 13 مارچ 2024ء	114
21	ماہِ رمضان.....ماہ تربیت	بروز جمعرات 4 رمضان الکریم 1445ھ 14 مارچ 2024ء	117
22	دہشتگرد کون؟	بروز ہفتہ 6 رمضان الکریم 1445ھ 16 مارچ 2024ء	121
23	اعتماد و اعتبار	بروز بدھ 10 رمضان الکریم 1445ھ 20 مارچ 2024ء	128
24	وطن، کفن اور دفن	بروز جمعرات 11 رمضان الکریم 1445ھ 21 مارچ 2024ء	131
25	رب کا انعام.....پاکستان	بروز ہفتہ 13 رمضان الکریم 1445ھ 23 مارچ 2024ء	137
26	بد دیانت کامیاب	بروز سوموار 15 رمضان الکریم 1445ھ 25 مارچ 2024ء	141

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
27	پھر دیر کس بات کی؟	بروز منگل 16 رمضان الکریم 1445ھ 26 مارچ 2024ء	144
28	خوابوں کی تعبیر	بروز بدھ 17 رمضان الکریم 1445ھ 27 مارچ 2024ء	146
29	دھوکہ ہی دھوکہ	بروز جمعرات 18 رمضان الکریم 1445ھ 28 مارچ 2024ء	149
30	نئی ڈیل	بروز جمعتہ المبارک 19 رمضان الکریم 1445ھ 29 مارچ 2024ء	151
31	یومِ یتیم، یومِ والدین	بروز ہفتہ 20 رمضان الکریم 1445ھ 30 مارچ 2024ء	154
32	گستاخی کی سزا موت	بروز اتوار 21 رمضان الکریم 1445ھ 31 مارچ 2024ء	156
33	ہمارا اصل ریزرو بینک	بروز بدھ 24 رمضان الکریم 1445ھ 3/ اپریل 2024ء	161
34	خود احتسابی	بروز 2 جمعرات 25 رمضان الکریم 1445ھ 4/ اپریل 2024ء	164
35	جُرمِ عظیم	بروز جمعتہ المبارک 26 رمضان الکریم 1445ھ 5/ اپریل 2024ء	168
36	لیکن ایسا ہو گا نہیں!	بروز اتوار 28 رمضان الکریم 1445ھ 7/ اپریل 2024ء	173
37	زمینی خداؤں کے زر خرید غلام	بروز منگل 30 رمضان الکریم 1445ھ 9/ اپریل 2024ء	179
38	عیدِ محکوماں، ہجومِ مومنیں	بروز بدھ یکم شوال المکرم 1445ھ 10/ اپریل 2024ء	182
39	آبِ حیات کی تلاش	بروز اتوار 5 شوال المکرم 1445ھ 14/ اپریل 2024ء	187
40	دعائے آخرِ شب	بروز سوموار 6 شوال المکرم 1445ھ 15/ اپریل 2024ء	190
41	مسلمان کب بیدار ہوں گے؟	بروز بدھ 8 شوال المکرم 1445ھ 17/ اپریل 2024ء	194
42	آستین کے بُت	بروز جمعتہ المبارک 10 شوال المکرم 1445ھ 19/ اپریل 2024ء	200
43	وقت کا عبرت کدہ	بروز ہفتہ 11 شوال المکرم 1445ھ 20/ اپریل 2024ء	203
44	بھارت اور ایڈز	بروز منگل 14 شوال المکرم 1445ھ 23/ اپریل 2024ء	208
45	کڑے فیصلوں کا موسم	بروز بدھ 15 شوال المکرم 1445ھ 24/ اپریل 2024ء	211
46	مودی کا جنگی جنون اور تعصب	بروز جمعتہ المبارک 17 شوال المکرم 1445ھ 26/ اپریل 2024ء	216
47	امید ہی امنگ ہے	بروز سوموار 20 شوال المکرم 1445ھ 29/ اپریل 2024ء	221
48	مداوا ضروری ہے	بروز منگل 21 شوال المکرم 1445ھ 30/ اپریل 2024ء	224
49	میں ٹوٹتی سانسوں کی فصیلوں پر کھڑا ہوں	بروز ہفتہ 25 شوال المکرم 1445ھ 4 مئی 2024ء	229
50	امت مسلمہ اور عالمی بارودی سرنگیں	بروز منگل 28 شوال المکرم 1445ھ 7 مئی 2024ء	236
51	واحد سپر پاور کا گھمنڈ	بروز جمعتہ المبارک 2 ذوالقعد 1445ھ 10 مئی 2024ء	241
52	کتنا مشکل ہے جینا..... مدر ڈے	بروز سوموار 5 ذوالقعد 1445ھ 13 مئی 2024ء	248
53	فیصلہ کن گھڑی	بروز جمعرات 8 ذوالقعد 1445ھ 16 مئی 2024ء	253
54	لُکن میٹی، چھپن چھپائی	بروز ہفتہ 10 ذوالقعد 1445ھ 18 مئی 2024ء	258

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
55	عصرِ حاضر کا سب سے بڑا دہشتگرد	بروز اتوار 11 ذوالقعد 1445ھ 19 مئی 2024ء	261
56	انجام کا وقت بہت قریب ہے	بروز سوموار 12 ذوالقعد 1445ھ 20 مئی 2024ء	264
57	بھارتی انتخابات اور پاکستان	بروز منگل 13 ذوالقعد 1445ھ 21 مئی 2024ء	267
58	سیاسی مذاکرات کی اشد ضرورت	بروز بدھ 14 ذوالقعد 1445ھ 22 مئی 2024ء	269
59	اگلی سپر پاور کون؟	بروز جمعرات 15 ذوالقعد 1445ھ 23 مئی 2024ء	272
60	ایک ہی سکے کے دو رخ	بروز ہفتہ 17 ذوالقعد 1445ھ 25 مئی 2024ء	277

گھر کا بھیدی

جب سے متعصب مودی نے اقتدار سنبھالا ہے، بھارت میں آر ایس ایس اور بی جے پی کے غنڈوں نے تمام اقلیتوں کا جینا دوبھر اور قبرستان بنا کر رکھ دیا ہے اور بالخصوص مسلمانوں پر بہیمانہ ظلم و ستم کی انتہاء ہو گئی ہے۔ یہ متعصب غنڈے جب جی چاہے کسی مسلمان کو پکڑ کر کسی بھی جگہ لے جاتے ہیں، ایک غنڈہ موبائل پر فلم بناتا ہے، دوسرا مسلمان کو حکم دیتا ہے، جے شری کا کا نعرہ لگاؤ۔ حکم عدولی پر بے پناہ تشدد کیا جاتا ہے اور اگر مضروب مجبوری میں ان کے حکم کی تعمیل کرے تو اسے بار بار یہ نعرہ لگانے پر مجبور کیا جاتا ہے، اس پر جب دل نہیں بھرتا تو پاکستان اور اسلام کو غلیظ گالیاں دینے پر مجبور کیا جاتا ہے جس کے بعد سر عام ہاتھ میں پکڑے ہوئے گنڈاسے یا تلوار سے خوفناک وار کر کے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور مجبور و مقہور جان بخشی دوسرا غنڈہ اس کی لاش پر تیل چھڑک کر آگ لگا دیتا ہے اور پاکستان کو دھمکی دیتا ہے کہ کیلئے گڑگڑاتا ہوا شہید ہو جاتا ہے جس کے بعد آر ایس ایس کا بھارت کے خلاف جہاد بند کرو ورنہ یہاں مسلمانوں کا یہی حشر کریں گے۔ یہی سلسلہ مقبوضہ کشمیر میں قابض بھارتی فوج نے بھی شروع کر رکھا ہے۔ وہ پیٹ کے دوران انہیں بھی پاکستان اور اسلام کو گالیاں دینے پر مجبور کرتے ہیں اور ڈھٹائی کا یہ عالم کشمیری نوجوانوں کو پکڑ کر ان پر بہیمانہ ظلم و ستم اور مار ہے کہ بعد ازاں سوشل میڈیا پر یہ ویڈیو وائرل کی جاتی ہے تاکہ کشمیری مسلمانوں دلبرداشتہ ہو کر جدوجہد آزادی میں حصہ نہ لیں۔

مجھے ایک پاکستانی دانشور دوست نے بتایا: میں نے ایک ایسا ہی ویڈیو کلپ جو آر ایس ایس نے وائرل کیا تھا، اپنی فیس بک پر چند روز کیلئے لگایا تو میری فیس بک اور پیج دو دن کیلئے بند کر دیئے گئے۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ وہی ویڈیو کلپ جس بھارتی پیج سے میں نے لیا تھا، وہ کئی ماہ سے ایسے ویڈیو کلپ چلا رہا ہے اور اب بھی کئی ایسے خوفناک ویڈیو کلپ اس کی فیس بک پر چل رہے ہیں لیکن اس پر کوئی پابندی نہیں۔ میں نے تو یہ کلپ ان پاکستانیوں بقراطیوں کیلئے وائرل کیا تھا جو دن رات اس متعصب بھارت کی تعریف کرتے نہیں تھکتے اور انہیں اس وقت نیند نہیں آتی جب تک وہ کسی بھارتی فلم کو دیکھ نہ لیں اور بے شرمی کی حد تو یہ ہے کہ ایک ایسے ہی متعصب ہندو نے سوشل میڈیا پر شواہد کے ساتھ یہ پیغام نشر کیا کہ ہماری فلموں کے سب سے زیادہ شوقین پاکستانی ہیں جن کی بناء پر ہمارا یوٹیوب منافع میں چل رہا ہے اور یہ بھی شنید ہے کہ بعض پاکستانی سینماؤں میں ٹھاٹھ سے وہ فلمیں بھی بغیر کسی سنسر کے چل بھی رہی ہیں جس کو دوسرے مسلمان ممالک نے اپنے ہاں سینماؤں میں چلنے کی قطعاً اجازت نہیں دی۔ بے غیرتی کا یہ عالم ہے کہ ہمارے ہاں سنسر بورڈ کے سربراہ کی جب اس معاملے پر توجہ دلائی گئی تو انہوں نے انتہائی بے شرمی سے اسے اظہار آزادی پر قدغن قرار دیتے ہوئے سوال پوچھنے والے کو جھڑکنا شروع کر دیا۔

بھارتی دہشتگردی اور بھارتی دہشتگردوں کے کرتوت ہمارے اپنے مہربان ہی لوگوں کے سامنے نہیں لانے دیتے، یہی وجہ ہے کہ ہم آج پوری دنیا میں انتہائی نچلے درجے کو پہنچ چکے ہیں۔ جہاں تک بھارت کی دہشتگرد حکومت کا تعلق ہے تو اس نے وندے ماترم، سوریہ نمسکار اور یوگا کے نام پر مسلمانوں کے مذہبی استحصال کے ساتھ بی جے پی کے لیڈروں نے مسلمانوں کے خلاف ہرزہ سرائی کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا ہے حتیٰ کہ یہاں تک کہا گیا کہ جو سوریہ نمسکار نہیں کرتا اسے ہندوستان چھوڑ کر چلا جانا چاہئے۔ بعض فرقہ پرست لیڈروں کے مطابق یوگا کرنے سے اسلام منع نہیں کرتا کیونکہ یوگا تو ایک قسم کی ورزش ہے جو صحت کیلئے سودمند ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ کئی مسلمانوں ملکوں میں یوگا کیا جاتا ہے تو پھر بھارتی مسلمانوں کو یوگا پر کیوں اعتراض ہے لیکن یوگا کی حمائت میں بات کرنے والے فرقہ پسند مسلم دشمنوں کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ کچھ مسلمان ملکوں میں یوگا کیا جاتا ہے لیکن وہاں یوگا کے دوران

منتروں کا جاپ اور سوریہ نمسکار نہیں کیا جاتا مگر بھارت میں یوگا کے نام پر مسلمانوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ سوریہ نمسکار کریں، اوم کا جاپ کریں۔ اس مذموم پروگرام میں بلا تفریق سارے ہندوستانیوں بشمول مسلم اقلیت کی شرکت پر حکومتی اصرار غیر جمہوری، غیر اخلاقی اور اسلام مخالف طرزِ عمل ہے

ایک سال قبل سب وکاس کا نعرہ لگاتے ہوئے مودی حکومت نے مسندِ اقتدار پر تسلط جمایا مگر اس دورِ حکومت میں فرقہ پرستی انتہاء کو پہنچ چکی ہے جبکہ یوگا میں شامل سوریہ نمسکار اور اشلوکوں پر مبنی منتر پڑھنے کا عمل بھارتی سیکولر آئین کی روشنی میں ملنے والے بنیادی مذہبی حقوق کی خلاف ورزی کے مترادف ہے۔ مودی حکومت کے نمائندے غیر جمہوری بیانات دینے اور مسلمانوں کی مذہبی جذبات مجروح کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں اور گائے کا گوشت کھانے والوں کو پاکستان بھیجنے کی دھمکی دینا، گھر واپسی اور چار شادیوں کا تمسخر اڑانا ان کا معمول بن چکا ہے۔ یوگا اصل میں گیان اور دھیان کا ایک طریقہ ہے جس کا مقصد بھگوان کے آگے خود سپردگی ہے۔ سوریہ نمسکار یعنی سورج کی پوجا یوگا کا اہم عنصر ہے۔ یوگا بنیادی طور پر یوگ سے نکلا ایک لفظ ہے جس کے معنی جوڑ کے ہیں۔ یوگ کی تاریخ اور پس منظر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت ہندوؤں میں عبادت کا ایک طریقہ ہے۔ بنیادی طور پر ہندوازم کا بنیادی فلسفہ ہے جس میں آتما (روح) پرماتما (بھگوان) اور شریر (جسم) کو مراقبے کے ذریعے ایک ساتھ مربوط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یوگ کا پہلا طریقہ ہندوؤں کے مطابق ان کے بھگوان شنکر نے ایجاد کیا تھا اور دوسرا طریقہ پتانجلی نام کے یوگ گرو نے شروع کیا تھا۔ لوگ ہندوؤں کے علاوہ بدھ مت کے ماننے والوں میں بھی رائج ہے۔ یہ محض ایک ورزش نہیں کیونکہ اس کی ایک مذہبی حیثیت رہی ہے۔ یوگ کے دوران مذہبی اشلوک کی ادائیگی بھی اس کا حصہ ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہزاروں آشرم قائم ہیں اور حکومت کی طرف سے انہیں سرکاری امداد بھی دی جاتی ہے جبکہ مودی کی حکومت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرنے والے "بابا رام دیو" یوگا کے سب سے بڑے پیروکار ہیں اور انہی کی کوششوں سے اقوام متحدہ میں یوگا کا عالمی دن منانے کا اعلان کیا گیا تھا جس میں بھارتی فرقہ پرست وزیر اعظم اور آر ایس ایس کے پرچارک مودی نے اہم کردار ادا کیا۔ مودی حکومت بھارت کو ہندو راشٹر بنانے کے ایجنڈے پر عمل پیرا ہے اور یوگا کا عالمی دن منانے کے پیچھے بھی حکومت کا مقصد کارفرما ہے۔

مودی نے اپنے اقتدار کے پہلے سال میں 27 ستمبر 2014ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے 69ویں سیشن میں خطاب میں بین الاقوامی برادری سے یوگا کے انعقاد کی اپیل کی تھی۔ 11 دسمبر کو جنرل اسمبلی نے اس تجویز کو 21 جون کو عالمی یوگا ڈے منانے کی تجویز کو اتفاق رائے سے منظور کر لیا۔ بھارت کی موجودہ (مودی) سرکار چانکیہ کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ اس کی دو واضح پالیسیاں ہیں، اوّل ان تمام جھوٹے وعدوں کو بھارتی عوام کے دماغ سے صاف کر دیا جائے جو مودی نے الیکشن کے دوران کیے تھے تاکہ ہندوستانی عوام سمجھنے کے اہل ہی نہ رہیں کہ ان کے ساتھ کوئی دھوکہ یا ٹھگی ہوئی ہے اور ناراض ہونے کی بجائے مودی کی مالا جپتے رہیں۔ دوم، ہندو اکثریتی طبقے کے دماغوں میں ہندتوا کے مفروضے کا اس طرح پرچار کیا جائے کہ انہیں یوں

لگے کہ اب وہ ایک ہندو دیش کے شہری ہیں اور ہندو سنسکرتی دنیا میں سب سے اعلیٰ ہے اور ہندو عوام کو یہ فضیلت سنگھ پریوار اور مودی کے طفیل ہی مل سکی ہے۔ ان دونوں پالیسیوں کو ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں متواتر پختہ کیا جا رہا ہے۔ ویدک کال میں جنگی جہازوں کا استعمال اس قدیم دور میں جدید میڈیکل سائنس کی کرشماتی سرجری سے بھی زیادہ پیچیدہ آپریشن اور اب یوگا کی اچانک اس قدر تبلیغ الیکشن کے دوران مودی باقاعدہ اعلان کرتے تھے کہ انہیں خود بھگوان نے بھیجا ہے تاکہ اس دیش کا کلیان کر سکیں۔

آج سے 50 سال قبل امریکا اور یورپ سے سیاح کثیر تعداد میں بھارت آنا شروع ہوئے، اس زمانے میں ہندو

عوام سادھوؤں اور سنتوں کو کسی اور دنیا کی مخلوق سمجھتے تھے اوران کو سمجھنے کیلئے ان کے آشرموں میں قیام کرتے تھے۔ان سادھوؤں، سنتوں کی سیوا کرتے اور بدلے میں تین چیزیں (بھنگ، گانجااور یوگا) ساتھ لے جاتے۔ان سیاحوں کیلئے رشی کیش، ہری دوار کے آشرم ہی تھکانے والے تھے جہاں ہندو یوگی اور سادھو چلم کے کش کے ساتھ دیگر بیہودہ اعمال کی تعلیم دیتے تھے۔ان لوگوں نے امریکا اور یورپ میں بھی آشرم قائم کیے اور لوگوں کو یوگا کی تعلیم دینے لگے جس سے کروڑوں ڈالر کماتے۔ہندو دھرم میں تمام علوم کا سرچشمہ وید ہیں اور ویدوں کے عالم اور تخلیق کاروں نے یہ سسٹم ایجاد کیا، اس لئے مختلف آسنوں کے دوران مختلف دیوتاؤں سے شکتی اور صحت پر ارتھنا کی جاتی ہے، ان کی تعریف کی جاتی ہے۔سوریہ (سورج) آسن میں سورج کے سامنے ڈنڈوت کیا جاتا ہے۔منتر اور اشلوک پڑھ کر ان سے مدد کی درخواست کی جاتی ہے۔ظاہر ہے کہ مسلمان یوگا تو کرسکتے ہیں لیکن اشلوکوں کے ورد سمیت یہ تمام اعمال انجام نہیں دے سکتے جو غیر اللہ کی پرستش پر محمول ہیں مگر سب کے سب مسلمان ہر مذہبی رسم کی تہ تک پہنچنے کی حاجت محسوس نہیں کرتے اوران کی آزاد اور غیر جانبدار طبیعت بے حد مضر رساں بھی ثابت ہو رہی ہے، دوسری طرف مسلمانوں اور دیگر غیر ہندوؤں کو مرتد کرنے کی مہم سونے پر سہاگے کا کام دے رہی ہے۔

جس مذہب کی اساس گائے کی تقدیس ہے اور جو بے شمار اوہام اور لایعنی رسوم کا مجموعہ ہے، اسے کوئی غیر ہندو کس طرح قبول کرے۔یہ وہ لاینحل مسئلہ ہے جو آج کل مودی سرکار میں ہندوستان کے ان تمام باشندوں کیلئے سوہانِ روح بن گیا ہے جو ہندو دھرم پر ایمان نہیں رکھتے، اس صورتحال سے بھارت کے عیسائی، پارسی، بدھ مت کے ماننے والے، کیمونسٹ حتیٰ کہ دہریے بھی پریشان ہیں۔اس صورتحال کا محرک ہندوؤں کا روحانی گرو مدھویوسدا شیو گولوا کر ہے۔اس نے مودی سرکار کی شہ پاکر اپنا نعرہ ہندوراشٹر ابڑی تیزی سے بلند کیا ہے۔وہ ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کر رہا ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام غیر ہندو اپنی جان کی امان چاہتے ہیں تو ہندو دھرم اور ہندو بود و باش اختیار کرلیں بصورت دیگر ان کی زندگی ہلاکت کی زد میں رہے گی۔مدھو یوسراشیو مدت سے ہندو دھرم کا پرچار کر رہا ہے۔وہ تمام مسلمانوں، عیسائیوں، بدھوؤں، پارسیوں حتیٰ دہریوں کو بھی تاکید کر رہا ہے کہ ہندوراشٹر کا فلسفہ قبول کرلو کیونکہ ہندو فلسفہ قومیت کی بنیاد ہے۔

بھارت کے کیمونسٹ ہندوتراشٹرا کے فلسفے پر تعجب کا اظہار کر رہے ہیں۔وہ پوچھتے ہیں کہ اگر مذہب ہی قومیت کی بنیاد مان لیا جائے تو پھر بھارت اور نیپال دونوں ملک ایک ہی دھرم کو ماننے والے ہیں، یہ دونوں آپس میں ضم ہو کر ایک قوم کیوں نہیں بن جاتے۔برما اور سری لنکا یکساں نوعیت کا ایک ہی دستور اختیار کیوں نہیں کرتے؟ اکثر پڑھے لکھے تعصب سے ماوراء لوگ ہندو دھرم کے تضادات پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پروفیسر ڈی این جھا، پروفیسر آر ایس شرما، رومیلا تھاپر اور ڈی سی کوسمبی نے مستند تاریخی حوالوں سے لکھا ہے کہ ہندوستان کے قدیم برہمن گائے کا گوشت کھایا کرتے تھے جبکہ نیپال کے ہندو تو آج بھی ہر قسم کی خوشی کی تقاریب میں بیل کے گوشت کا پکوان پکاتے ہیں۔اس صورتحال میں گاؤکشی کے نام پر مسلمانوں کو کیوں قتل کر دیا جاتا ہے؟

ہندو دھرما کا ایک اہم اثاثہ وید ہیں لیکن اس کے متن میں یکسانیت نہیں ہے۔گاندھی اپنی روزانہ کی دعائیہ مجلس میں قرآن کریم، انجیل اور گیتا کے اسباق پڑھا کرتے تھے۔ہر چند ان کا یہ عمل مذہبی سے زیادہ سیاسی تھا کیونکہ وہ ہندوستان کے تمام مذاہب کے لوگوں کو ایک قوم بنانا چاہتے تھے۔جسٹس دیپک دوا اور مودی بھی گیتا پڑھتے ہیں۔احمد آباد کا شاعر احسان جعفری عالمگیر انسانیت پر یقین رکھتا تھا، جواہر لال نہرو کا پیروکار تھا۔اس نے زندگی بھر پیرا، گوتم بدھ اور گورونانک جیسے شخصیات کے محاسن پر نظمیں لکھیں لیکن گجرات میں مسلم کش فسادات کے ذمہ دار مودی کے چیلوں نے انہیں بھی نہیں

بخشا۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور اس کے گھر کے سارے اثاثہ کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ اسی طرح احمد آباد ہی کی ایک مغنیہ رسولاں بائی کا گھر بھی جلا دیا حالانکہ وہ ہر نغمے کی دھن سے پہلے رام اور کرشن کے نام کا پاٹھ پڑھا کرتی تھی۔

معروف بھارتی اخبار انڈین ایکسپریس میں "سوامی اکنی ویش" ایک مختصر آرٹیکل دہائی دیتا ہوا نظر آیا تو سوچا آج کے متعصب ہندوؤں کو ان ہی کے آئینے میں ان کا چہرہ دکھا دوں: "وہ لکھتے ہیں کہ جو چیز میرے لئے انتہائی تکلیف کا باعث ہے وہ اس کا فرقہ وارانہ ایجنڈا ہے جو نہائت غلط اور نقصان دہ ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ رام بھگوان تھے اور بھگوان "نرادھار" یعنی جس کی کوئی شکل وصورت نہیں ہوتی تو آخر جو "نرادھار" ہو تو اس کی جائے پیدائش یا جنم بھومی کی نشاندہی کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ انسانی عقل ودانش کی سراسر توہین ہے کہ خدا کی شکل وصورت کا کوئی اپنے انداز سے تعین کرے میرے لئے یہ انتہائی دکھ اور تکلیف کی بات ہے کہ کروڑوں مسلمانوں کا استحصال کیا جارہا ہے، نفرت اور فرقہ پرستی کا زہر گھولا جارہا ہے۔ رام کے نام پر یہ سراسر غلط کام کا پرچار ہو رہا ہے۔ گاندھی جی ایک راسخ العقیدہ ہندو تھے، جب وہ قتل کیے گئے تو ان کی زبان پر رام کا نام نہیں بلکہ جے رام تھا۔ ان کی عقیدت مندی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ انہوں نے کبھی رام مندر کا مسئلہ نہیں اٹھایا، وہ یہ بھی کہتے تھے کہ خدا صرف مندر میں نہیں، وہ ہر جگہ رہتا ہے۔ خدا کسی مسجد، مندر یا چرچ میں مقید نہیں ہوتا۔ گاندھی جی نے شائد ہی کسی مندر میں وقت گزارا ہو بلکہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ مندروں میں صفائی ستھرائی نہیں ہوتی

اسلام اور عیسائیت سے بالکل الگ ہندومت ایک خاندانی روحانیت پر مبنی ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ خدا پروتیوں اور پنڈتوں کا جانبدار نہیں ہوتا، اس لئے کہ ہمارا گھر بھی مندر ہے۔ یہ سب اس وقت ہوا جب بڑی ذات کے لوگوں نے دھرم کو اچک لیا اور اپنے مفاد کیلئے اس کا استعمال جائز کر لیا۔ اس وقت سے سنائن دھرم پنڈتوں اور پروتیوں کے قبضے میں ہو گیا، حقیقت خرافات میں کھو گئی اور توہم پرستی، استحصال، فریب اور دھوکہ دہی کا سلسلہ شروع ہو گیا ۔ آج ہماری یہی سب سے بڑی کمزوری ہے کہ ہم اس پر منہ نہیں کھولتے، بند رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سرحد پار کے لوگوں سے مغلوب ہوئے، مغل بادشاہوں اور انگریزوں نے ہمیں اپنے بس میں کر لیا۔ سنائن دھرم کے لوگ کبھی ترقی نہیں کر سکتے جب تک وہ توہم پرستی اور بے عقلی کے خول سے باہر نہ آئے۔ ہم جنم بھومی کے معاملے پر رجعت پسندی، بے عقلی اور فرقہ پرستی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ ایک جنگ ہے جو سستی شہرت اور اقتدار کی کرسی حاصل کرنے کیلئے کی جارہی ہے۔ وہ لوگ جو عقیدے ویدے سے واقف ہیں وہی اسے ہندومت کی ترقی کہہ سکتے ہیں اور اس کیلئے لڑائی لڑ سکتے ہیں۔ میں اس عقیدے کو بڑی اچھی طریقے سے جانتا ہوں، اس سے میری محبت ہے اور یہی وہ وجہ ہے کہ آج مودی ٹولے کی اس گمراہی اور ضلالت کو کسی طرح بھی قبول نہیں کیا جا سکتا"۔

سوامی کے اس جمون کو اگر یوگا سے جوڑا جائے تو یوگا کی آڑ میں مذہبی تعصب کے پرچار کی سازش بے نقاب ہوتی جارہی ہے۔ عین عام انتخابات کے قریب ملک بھر میں جس طرح تقاریب منعقد کی جارہی ہیں، جس بڑے پیمانے پر ان کو سرکاری سرپرستی فراہم کی جارہی ہے، وہ نہ صرف ملک کے سیکولر دستور کے خلاف ہے بلکہ منصفانہ انتخابات کی روح سے بھی متصادم ہے۔ ایودھیا میں رام مندر کے افتتاح کی تاریخ جیسے جیسے قریب آتی جارہی ہے بھارت میں مسلمانوں میں اضطراب بڑھتا جارہا ہے۔ رام مندر کے افتتاح کی تیاریاں زوروں پر ہیں۔ خود وزیر اعظم نریندر مودی اس میں ذاتی دلچسپی لے رہے ہیں۔ انہوں نے ہندوؤں سے 22 جنوری کو ملک بھر کے مندروں میں خصوصی پوجا اور دیگر تقاریب کا اہتمام کرنے کی اپیل کی ہے اور ہندوؤں سے اس دن اپنے اپنے گھروں پر بھی "بھگوان رام" کو یاد کرنے پر زور دیا ہے۔

رام مندر کی مجلس منتظمہ کے جنرل سکریٹری نے مندر کی افتتاحی تقریب کا موازنہ یوم آزادی سے کر دیا ہے، جو کہ غلط اور تکلیف دہ ہے اور یہ بیان ملک کو مذہبی بنیاد پر تقسیم کرنے والا ہے۔ بھارتی مسلمانوں کے رہنماؤں نے اس صورت حال پر فکر مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ "رام مندر سے متعلق مجوزہ تقاریب کو سیاسی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی کوششیں تشویش کا باعث ہیں۔ اسی لئے اہم مسلم مذہبی اور سماجی رہنماوں نے ایک مشترکہ بیان جاری کر کے مسلمانوں اور ملک کے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ امن و امان کی برقراری کی ہر ممکن کوشش کریں۔ انہوں نے مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے بھی صورت حال پر سخت نگاہ رکھنے کی اپیل کی ہے۔

بھارتی اخبار انڈین ایکسپریس میں "سوامی اکنی ویش" اپنے آرٹیکل کے آخر میں لکھتے ہیں کہ "یہ آج کے بھارت کی وہ سرگرمیاں ہیں جنہوں نے مسلمانوں سمیت تمام اقلیتوں کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ شدھی یعنی مسلمانوں کو ہندو بنانے، مسلمانوں کی بستیاں جلانے اور ان کا خون بہانے کی تحریک ہندوستان میں بہت پہلے سے موجود تھی لیکن اب مودی حکومت میں یہ تحریک ایک وبا اور بلائے بے اماں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ آج خود بھارت میں ہر صاحبِ ضمیر شخص یہ سوال کر رہا ہے کہ کیا اب بھارت کا سیکولر آئین اندھا اور انسانی حقوق کا کا عالمی منشور اپاہج ہو گیا ہے؟ کیا اب بھارت میں کسی مہذب انسان کو اپنے افکار کے مطابق زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں؟"

بروز سوموار 12 رجب المرجب 1445ھ 22 جنوری 2024ء

کیا قیامت آنے والی ہے؟

اگر آپ کو یاد ہو تو سابق امریکی صدر ٹرمپ کی طرف سے قبلہ اول کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کرنے کے دن ہی میں نے اپنے آرٹیکل میں لکھا تھا کہ اگلا قدم اب اسرائیل کو بالخصوص ہمسایہ عرب ریاستوں اور بالعموم مسلمان ملکوں سے تسلیم کروانے کی مہم شروع ہو گی جس کے بعد فلسطین کا مکمل طور پر اسرائیل میں ضم کر کے یہودی نژاد ہنری کیسنجر کے "ون ورلڈ آرڈر" کا مشرقِ وسطیٰ کا پہلا فیز مکمل ہو گا جس کیلئے ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ٹرمپ کے یہودی نژاد داماد جیرالڈ کشنز کی خدمات حاصل کی گئی جس نے "لارنس آف عریبیا" کے ادھورے پلاٹ کو مکمل کیا۔ عین پروگرام کے تحت ٹرمپ سے کام لیکر اسے فارغ کر دیا گیا۔

ٹرمپ کی طرف سے قبلہ اول کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کرنے کی غلطی کی طرف بعد میں آئیں گے، آیئے پہلے ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہیں:

دنیا کا یہ فیز چھ ہزار سال پر محیط ہے۔ یہودی سال ستمبر میں شروع ہوتا ہے۔ 21 ستمبر 2023ء کو یہودیوں کے کیلنڈر کے مطابق (کتاب ہدایات) یہودیوں کی مقدس کتاب تلمود نے 5784 سال پورے کر لئے ہیں۔ یہودی عقیدے کے مطابق دنیا کے خاتمے میں اب صرف 216 سال باقی ہیں۔ یہ دنیا 216 سال بعد مکمل طور پر فنا ہو جائے گی۔ یہودیوں نے قیامت سے قبل دو اہم کام کرنے ہیں، تابوت سکینہ کی تلاش اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر۔ یہ کہانی حضرت ابراہیم سے شروع ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم چالیس سال حضرت اسماعیل کے پاس مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر رہے۔ آپ نے خانہ کعبہ تعمیر کیا اور آپ واپس فلسطین تشریف لے گئے، آپ نے وہاں اللہ تعالیٰ کا دوسرا گھر بیت المقدس تعمیر فرمایا۔ خانہ کعبہ اور بیت المقدس کی تعمیر کے درمیان چالیس سال کا فرق تھا۔ حضرت ابراہیم نے فلسطین میں انتقال فرمایا۔ آپ کا روضہ مبارک یروشلم کے مضافات میں ہے۔ یہ علاقہ حضرت ابرہیم کی مناسبت سے ہیبرون یا الخلیل کہلاتا ہے۔ حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کے مزارات بھی حضرت ابراہیم کے ساتھ موجود ہیں۔ بنی اسرائیل حضرت یعقوب کی اولاد ہیں۔ یہ لوگ قحط کا شکار ہوئے، مصر کی طرف نقل مکانی کی، فرعون کی غلامی میں گئے۔ سینکڑوں سال ذلت برداشت کی اور 33 سو سال پہلے حضرت موسیٰ کی معیت میں فلسطین واپس آئے۔ حضرت داؤد نے ہزار سال قبل مسیح میں یروشلم فتح کیا اور اسے اپنی سلطنت "کنگڈم آف ڈیوڈ" کا دارالحکومت بنایا۔

حضرت داؤد نے بیت المقدس کی بنیادوں پر یہودیوں کا عظیم معبد تعمیر کرانا شروع کیا، آپ کے بعد حضرت سلیمان نے یہ تعمیر جاری رکھی، حضرت سلیمان کے پاس حضرت موسیٰ کا ایک تابوت تھا۔ اس تابوت میں پتھر کی وہ دو تختیاں بھی تھیں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ پر کوہ طور پر اتاری تھیں۔ ان تختیوں پر اللہ کے دس احکامات درج تھے۔ تابوت میں حضرت ہارون کا عصا اور وہ برتن بھی تھا جس سے من وسلویٰ نکلتا تھا۔ حضرت سلیمان نے یہ تابوت اس معبد کی بنیادوں میں چھپا دیا۔ آپ کے دور میں بڑے بڑے جادوگر بھی تھے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر ان تمام جادوگروں کو قتل کر دیا اور ان کے جادو کے نسخوں کو بھی صندوقوں میں بند کر کے معبد کے نیچے غاروں میں چھپا دیا۔

یہودی حضرت سلیمان کے معبد کو ہیکل سلیمانی کہتے ہیں۔ یہ ہیکل 586 قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے تباہ کر دیا تھا تاہم اس نے ہیکل سلیمانی کی بیرونی دیوار چھوڑ دی۔ یہودی اس دیوار کو "کوتل" جبکہ مسلمان دیوار گریہ کہتے ہیں۔ یہودیوں کا خیال ہے حضرت سلیمان نے تابوت سکینہ اور جادو

کے نسخے بیت المقدس کے نیچے غاروں میں چھپائے تھے چنانچہ یہ لوگ تین ہزار سال سے بیت المقدس کے نیچے غار کھود رہے ہیں۔ یہ بیت المقدس کو گرا کر مستقبل میں ہیکل سلیمانی کو یہاں تک پھیلانا بھی چاہتے ہیں، کیوں؟ ہم اس کی طرف بھی بعد میں آئیں گے، ہم پہلے بیت المقدس میں مسلمانوں کی دلچسپی کا ذکر کریں گے۔

بیت المقدس 11 فروری 624 تک مسلمانوں کا قبلہ اوّل تھا۔ نبوت کے دسویں سال رجب کی ستائیسویں شب کو معراج کا واقعہ پیش آیا، اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ کو مکہ مکرمہ سے یروشلم لے کر آیا، آپ ﷺ نے قبلہ اوّل میں انبیا کرام کی امامت فرمائی۔ آپ ﷺ براق پر آق پر تشریف فرما ہوئے اور براق آپ ﷺ کو اللہ تعالی کے حضور لے گیا۔ آپ ﷺ بیت المقدس کے صحن سے آسمان پر تشریف لے گئے تھے، آج بھی وہاں سات فٹ لمبی چالیس فٹ چوڑی اور چھ فٹ اونچی چٹان موجود ہے۔ یہ چٹان آپ ﷺ کے ساتھ اوپر اٹھ گئی تھی لیکن حضرت جبرائیل نے اس پر ہاتھ رکھ کر اسے دوبارہ زمین سے جوڑ دیا تھا۔ چٹان پر حضرت جبرائیل کے ہاتھ کا نشان آج تک موجود ہے۔ اموی خلیفہ عبد الملک نے 691 میں چٹان کے گرد سنہرے رنگ کی عمارت بنادی اور یہ عمارت عربی میں قبہ الصخرہ اور انگریزی میں "ڈوم آف دی راک" کہلاتی ہے۔ یہ مسلمانوں کے ہاتھوں عرب سے باہر پہلی عمارت تھی اور یہ عمارت آج پوری دنیا میں یروشلم کی پہچان ہے۔

یہ سنہری عمارت قبلہ اول نہیں، بیت المقدس سنہری عمارت سے ذرا سے فاصلے پر تہہ خانے میں ہے، آپ کو وہاں جانے کیلئے سیڑھیاں اترنا پڑتی ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے آج سے آٹھ سو سال قبل مسجد اقصی کی توسیع کی، یہ توسیع اقصٰی جدید کہلاتی ہے۔ یہودی اس سنہری عمارت اور اقصٰی جدید کو بھی گرانا چاہتے ہیں۔ یہودیوں کا خیال ہے کہ ہیکل سلیمانی بیت المقدس اور اقصی جدید تک وسیع ہو گا۔ یہودیت عیسائیت اور اسلامی عقائد کے مطابق قیامت سے قبل دجال کا ظہور ہو گا۔ یہودی دجال کو مسیحا کہتے ہیں جبکہ عیسائی اسے اینٹی کرائسٹ کا نام دیتے ہیں، یہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے بعد ظاہر ہو گا ۔ پوری دنیا کے یہودی اسرائیل میں جمع ہوں گے، دجال اسرائیل کو "کنگڈم آف ڈیوڈ" ڈکلیئر کرے گا اور دنیا کو فتح کرنا شروع کر دے گا۔ یہ پوری عیسائی اور مسلمان دنیا کو تباہ و برباد کر دے گا، یہ جنگ چالیس پچاس سال جاری رہے گی اور دنیا ملبے کا ڈھیر بن جائے گی یہاں تک کہ دنیا کے قدیم ترین شہر دمشق میں حضرت امام مہدی کا ظہور ہو گا۔ فجر کی نماز سے قبل حضرت عیسٰی جامعہ امیہ کے سفید مینار سے اتریں گے اور حضرت امام مہدی کے پیچھے نماز ادا کریں گے اور یہ دونوں دجال کے خلاف صف آرا ہو جائیں گے، بڑی جنگ ہو گی، یہودی اس جنگ کو "آرما گیڈن" کہتے ہیں۔ اسلامی عقائد کے مطابق مسلمان یہ جنگ جیت جائیں گے اور فتوحات کے بعد اسلامی ریاست بنے گی۔

حضرت عیسی 45 سال کی زندگی گزار کر انتقال فرمائیں گے۔ یہ نبی اکرم ﷺ کے پہلو میں دفن ہوں گے۔ ان کے بعد حضرت مقعد کی حکومت آئے گی، حضرت مقعد کے انتقال کے 30 سال بعد اچانک سینوں سے قرآن مجید اٹھالیا جائے گا، جس کے بعد قیامت کے آثار شروع ہو جائیں گے جبکہ یہودی عقائد کے مطابق یہ جنگ دجال جیت جائے گا جس کے بعد یروشلم کے مضافات میں "جبل الزیتون" پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی اور یہ قیامت کی پہلی نشانی ہو گی۔ جبل الزیتون (ماؤنٹ آف اولیوز) یروشلم کے مضافات میں ہے اور یہودی اس پہاڑی پر دفن ہونا اعزاز سمجھتے ہیں۔

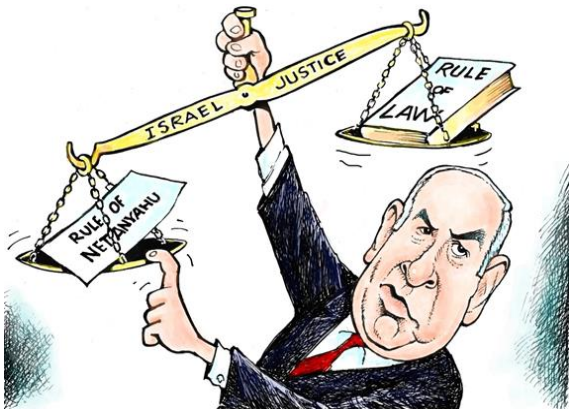

یہودی دن میں تین بار اپنے سینا گوگا میں دجال کی آمد کی دعا کرتے ہیں، یہ

دعا"شمونے عسرے" کہلاتی ہے۔ یروشلم یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں تینوں مذاہب کیلئے مقدس ترین شہر ہے کیونکہ یہ انبیا کرام کا شہر ہے۔ مسلمان 13 سال بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔ یہ شہر حضرت عمر فاروق کے دور میں فتح ہوا اور یہ سینکڑوں سال مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔ سنہری گنبد قبہ الصخرہ آج بھی مسلمانوں کی نشانی بن کر یہاں موجود ہے۔ یہ شہر قیامت کی اہم ترین نشانیوں میں بھی شامل ہے۔ وہ چٹان کہتے ہیں، یہودیوں جو معراج کے وقت براق کے ساتھ اوپر اٹھ گئی تھی، وہ مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کیلئے مقدس ہے۔ یہودی اسے "مانٹ ماریحا" کا خیال ہے یہ چٹان دنیا کا مقامِ آغاز تھا۔

حضرت ابراہیم نے قربانی کیلئے حضرت اسحاق (یہودی عقیدے کے مطابق حضرت ابراہیم نے حضرت اسحاق کو قربان کرنے کی کوشش کی تھی جبکہ ہم مسلمان حضرت اسماعیل کی قربانی پر ایمان رکھتے ہیں) کو بھی اسی چٹان پر لٹایا تھا۔ یہودی اگلے 24 برسوں میں بیت المقدس اقصی جدید اور سنہری عمارت یہ تینوں عمارتیں گرائیں گے، مسلمانوں کے ساتھ ان کا تصادم ہو گا، دجال کا ظہور ہو گا، عالمی جنگ شروع ہو گی۔ دجال احد کی پہاڑیوں تک پہنچ جائے گا، جبل الزیتون پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گی اور پھر قیامت آجائے گی۔ ہم مسلمان دجال تک یہودیوں سے متفق ہیں لیکن ہم آخر میں اسلام کے اور مسلمانوں کے غلبے پر ایمان رکھتے ہیں۔

ہم اب ڈونلڈ ٹرمپ کی حماقت کی طرف آتے ہیں:

دنیا اس وقت دو خوفناک خطرات کے درمیان سانس لے رہی ہے، دنیا میں تباہ کن ہتھیاروں کی انبار لگے ہیں۔ کرہ ارض کے چاروں کونوں میں شدت پسندوں کی حکومتیں ہیں، پیوٹن جیسا شدت پسند روس میں موجود ہے جو ہر حال میں امریکا اور یورپ سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کیلئے موقع کی تلاش میں ہے۔ شمالی کوریا میں کم جونگ جیسا پاگل برسر اقتدار ہے جس نے پہلی مرتبہ امریکا کو خوفزدہ کر کے اسے اس کی حیثیت یاد دلادی ہے، نریندر مودی جیسا شدت پسند بھارت کا وزیر اعظم ہے جو کہ دنیا کے امن کیلئے شدید خطرہ بنا ہوا ہے لیکن اپنی بزدلی کی بنا پر سازشوں میں مصروف ہے۔ امریکا میں ٹرمپ تو رخصت ہو چکا لیکن وہ ایک مرتبہ پھر دوبارہ آنے کیلئے بھرپور کوششیں کر رہا ہے جبکہ قصر سفید کے مکین تو تبدیل ہوتے رہتے ہیں لیکن یہاں پالیسی ساز اداروں پر صہیونیوں کا مکمل غلبہ ہے اس لئے یہاں کوئی بھی حکمران براجمان ہو، وہ صہیونیوں کی پالیسیوں سے روگردانی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ غزہ میں جاری جنگ کے شعلے اب ہمسایہ مملکتوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لینے کیلئے خطرناک حد تک بڑھ رہے ہیں جس کے جواب میں ایران بھی میدان میں بس اترا ہی چاہتا ہے کیونکہ یمن میں حوثیوں پر امریکا اور برطانیہ نے مل کر جو 60 مقامات پر حملے کئے ہیں، اس کے جواب میں حوثی کبھی بھی ایسا خطرناک قدم اٹھا سکتے ہیں جس کے بعد لبنان اور شام کے ساتھ مصر بھی لپیٹ میں آسکتا ہے۔ پہلا خطرہ یہ ہے کہ عراق اور شام میں بظاہر تو داعش چھپی بیٹھی ہے لیکن قرائن بتاتے ہیں کہ ان کیلئے یہ بہترین موقع ہو گا۔ اب افغانستان میں بھی باقاعدہ اس کی تشکیل ہو چکی ہے اور پاکستان اور افغانستان میں اب تک کئی خود کش حملوں کی ذمہ داری بھی قبول کر چکے ہیں۔

پاکستان کے حالات ہم سب کے سامنے ہیں، یہ پہلی نیوکلیر ریاست جو میزائل ٹیکنالوجی میں دنیا میں ممتاز حیثیت کا حامل ملک ہے۔ دوسرا خطرہ اسرائیل اور یہودی ہیں، یہ قیامت کی چاپ سن رہے ہیں۔ یہ روزدن میں تین مرتبہ "شمونے عسرے" کرتے ہیں، یہ اونچی آواز میں دجال کو آواز دے رہے ہیں چنانچہ بس یہ آواز سننے کی دیر ہے اور یہ دنیا چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس کر برابر ہو جائے گی۔

ڈونلڈ ٹرمپ نے 6 دسمبر 2017 کو اچانک اپنا سفارت خانہ تل ابیب سے یروشلم شفٹ کرنے کا اعلان کر کے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور جبکہ خود امریکا میں بیشتر صاحب الرائے افراد نے ٹرمپ کے اس عاجلانہ اور جاہلانہ پروانے میں دنیا کی تباہی صاف نظر آنے سے خبر دار بھی کیا تھا۔ ٹرمپ ان دنوں متعدد قانونی کیسز میں بھی پھنسے ہوئے ہیں۔ ان کے خلاف مختلف عدالتوں میں کئی فوجداری اور مجرمانہ مقدمات چل رہے ہیں۔ ناقدین جو مسلسل اس جاری صورت حال کی بناء پر ان کو اگلے انتخابات کیلئے نااہل قرار دینے کے دعوے کر رہے تھے، وہ ٹرمپ نے کے آئیوا کاکس میں واضح کامیابی حاصل کرنے اور اس بڑی تبدیلی پر حیران ہو رہے جس سے نومبر میں ہونے والے صدارتی انتخابات میں صدر جو بائیڈن کے خلاف ریپبلیکن امیدوار کے طور پر ان کی دعویداری مزید مستحکم ہو گئی ہے۔ اب یہ واضح ہے کہ نومبر 2024 میں ہونے والے صدارتی انتخابات میں ڈونلڈ ٹرمپ امریکی صدر جو بائیڈن کے خلاف ریپبلکن پارٹی کے ممکنہ حریف ہوں گے۔

لیکن دوسری طرف مختلف ریاستوں میں ٹرمپ کو نااہل کرنے کے مقدمات دائر ہیں جن میں یہ دلیل دی جا رہی ہے کہ ٹرمپ تین سال پہلے کیپیٹل ہل پر ہونے والے فساد اور بغاوت میں ملوث تھے۔ اس سے پہلے ٹرمپ کو امریکا کی دو ریاستوں کولوراڈو اور مینن میں بطور صدارتی امیدوار انتخابات میں لڑنے سے نااہل قرار دے دیا تھا۔ ریاست مینن کے الیکشن کے اعلیٰ عہدیدار نے فیصلہ کیا تھا کہ کیپیٹل ہل میں دنگے فساد کے واقعے میں ٹرمپ کے کردار کی وجہ سے وہ الیکشن میں حصہ نہیں لے سکتے۔ اس سے کچھ دن قبل ہی کولوراڈو کی سب سے بڑی عدالت نے بھی اس سے ملتا جلتا ہی فیصلہ دیا تھا۔ کولوراڈو کے برعکس جہاں یہ فیصلہ ریاست کی سپریم کورٹ نے کیا تھا کہ ریاست مینن میں یہ فیصلہ آئین میں موجود شق کی وجہ سے انتخابات کروانے والے ریاست کے سب سے اعلیٰ افسر نے کیا۔ اسی طرح ڈیموکریٹک پارٹی سے تعلق رکھنے والی مینن کی سیکرٹری آف سٹیٹ شینا بیلو نے 34 صفحات پر مشتمل فیصلہ دیا تھا جس میں انہوں نے کہا کہ ٹرمپ کا نام ریپبلکن پارٹی کے صدارتی امیدوار کے انتخابات سے 14 ترمیم کے سیکشن 3 کے مطابق ہٹنا چاہیے۔ یہ شق ایسے لوگوں کو وفاقی عہدوں سے نااہل کر دیتی ہے جنہوں نے "فساد یا بغاوت" میں حصہ لیا ہو۔

قانونی چیلنجز اس بات پر منحصر ہیں کہ آیا امریکا میں خانہ جنگی کے دور کی آئینی ترمیم ڈونلڈ ٹرمپ کو بطور امیدوار کھڑے ہونے کے لیے نااہل قرار دیتی ہے یا نہیں۔ ان کے فیصلے میں کہا گیا تھا کہ ٹرمپ کئی مہینوں سے اپنے حامیوں کو الیکشن فراڈ کے بیانیے سے بھڑکا رہے تھے اور اس کا اختتام 6 جنوری 2021 کو کیپیٹل ہل پر حملے پر ہوا۔ دونوں فیصلے اس وقت رکے ہوئے ہیں کیونکہ ان پر اپیلیں ہوئی ہوئی ہیں تو ابھی یہ بات واضح بھی نہیں ہے کہ جب ان دونوں ریاستوں میں عوام اپنے ریپبلکن امیدوار کا انتخاب کرنے کو نکلیں گی تو کیا اس وقت سابق صدر ٹرمپ کا نام بیلٹ پر ہو گا یا نہیں۔

اب اہم سوال یہ ہے کہ ٹرمپ پہلا امریکی صدر تھا جس نے اپنے دورِ اقتدار میں نہ صرف اسرائیل کی سب سے بڑی خواہش کو پایہ تکمیل پر پہنچانے میں تمام عالمی انصاف کے پیمانوں کو روند دیا بلکہ اسرائیل کی پوزیشن مضبوط اور خطے کا بدمعاش تھانیدار بنانے کیلئے باقاعدہ عرب ریاستوں سے اسے تسلیم کروا کے دوستی کے رشتے میں شیر و شکر کرنے کی تمام سہولتیں بھی مہیا کیں لیکن اس کے باوجود انتخابات میں بری طرح شکست کھانے کے بعد امریکی تاریخ میں پہلی مرتبہ انتخابات کے نتائج کو مسترد کرتے ہوئے دنگا فساد کے وہ مناظر دنیا کو دیکھنے کو ملے کہ دنیا حیران رہ گئی لیکن اب کیا وجہ ہے کہ ٹرمپ کو دوبارہ صدارتی میدان میں لانے کیلئے کئی اہم اور مضبوط ادارے اور تنظیمیں میدان عمل میں اتر آئی ہیں؟ کیا غزہ میں جاری شرمناک اور وحشیانہ مظالم کے باوجود حماس کے ہاتھوں بڑھتی ہوئی درگت نے صہیونی طاقتوں کو اپنے ایجنڈے کی تکمیل کیلئے ٹرمپ کی ضرورت دوبارہ آن پڑی ہے؟

اب اس خطے میں تیزی سے بڑھتے ہوئے جنگ کے شعلوں نے مغرب کو بھی فکر مند کر دیا ہے جبکہ اب تک ان کی مجرمانہ خاموشی اور درپردہ اسرائیل کی حمائت کے نقصانات سے بچنے کیلئے سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں کہ کیا واقعی اسرائیل کو مزید اس قدر چھٹی دی جائے کہ یہ اپنے مقاصد کی کامیابی کیلئے ان کے کندھوں پر آئندہ کی ایٹمی جنگ کا بوجھ ڈال دے؟ یاد رہے کہ اگر اسرائیل اپنے اس منصوبے کو پایہ تکمیل میں پہنچانے میں کامیاب ہو گیا تو اس دن دنیا کی تباہی کا عمل شروع ہو جائے گا اور ہم تیسری اور آخری عالمی جنگ کا رزق بن جائیں گے۔ چنانچہ میری آپ سے درخواست ہے آپ اللہ سے جتنی معافی مانگ سکتے ہیں آپ مانگ لیں، آپ سکھ کے جتنے سانس لے سکتے ہیں آپ لے لیں، اور آپ اللہ تعالی کا جتنا شکر ادا کر سکتے ہیں، آپ کر لیں کہ قیامت کا دن تو اٹل ہے کیونکہ خطرے کی گھنٹی بج چکی ہے، اب بس ایک دھماکے کی دیر ہے جس کے نتیجے میں عالمی جنگ کا طبل بجا ہی چاہتا ہے۔

يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ؕ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۙ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۙ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۙ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ، كَلَّا لَا وَزَرَ، اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمُسْتَقَرُّ، يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ، بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴿القیامہ:6-15﴾

پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہو گا، پس جب آنکھیں چندھیا جائیں گی، اور چاند بے نور ہو جائے گا، اور سورج اور چاند اکھٹے کیے جائیں گے، اس دن انسان کہے گا کہ بھاگنے کی جگہ کہاں ہے، ہرگز نہیں کہیں پناہ نہیں، اس دن آپ کے رب ہی کی طرف ٹھکانہ ہے، اس دن انسان کو بتادیا جائے گا کہ وہ کیا لایا اور کیا چھوڑ آیا، بلکہ انسان اپنے اوپر خود شاہد ہے، گو وہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔

بروز جمعرات 15 رجب المرجب 1445ھ 25 جنوری 2024ء

خون کی ندیاں بہانے میں ہوئیں صدیاں تمام

تاریخ کا اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ جو ثقافت یا تہذیب تمام معاملات پر چھائی ہوئی ہوتی ہے اس کے رجحانات بھی عالمی رجحانات بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس وقت مغرب ہر اعتبار سے دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ علمی، فنی، معاشی، مالیاتی اور عسکری برتری کے حامل مغرب کے اذہان پر جنگ چھائی ہوئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ دنیا بھر میں جنگ کا ماحول ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ سب جانتے ہیں کہ جنگ ایک ایسی جہنم ہے جس کے ہاتھوں سب کچھ ڈراموں، گیمز، کتابوں، گانوں میں ہر جگہ جنگ و جدل سے برباد ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود پھر بھی جنگ سے اس کا جی بھرتا ہے نہ پیٹ۔ فلموں، رغبت کا ماحول دکھائی دے رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جنگ مغرب کی ثقافت کا جزوِ لاینفک ہو کر رہ گئی ہے۔

جنگ کو پسند کرنے والی ذہنیت پیدا کرنے اور پروان چڑھانے پر بہت توجہ دی جارہی ہے۔ عنفوان شباب ہی سے جنگ کو پسند کرنے کا رجحان مغرب کے عام فرد کے ذہن میں جنم لے چکا ہوتا ہے۔ کھلونا بندوقیں، ماڈل ٹینک اور بورڈ گیمز جنگ کو ذہنی ساخت کا اندرونی یا کلیدی حصہ بنا کر اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا ہے کہ مغرب کے باسی زندگی بھر جنگ کو اپنے نظام اور زندگی دونوں کا لازمی حصہ تصور کریں۔

آج دنیا بھر میں جنگ و جدل سے بھرپور وڈیو گیمز بہت مقبول ہیں۔ مغربی معاشروں سے ہٹ کر بھی کروڑوں بچے یہ وڈیو گیم دیکھ دیکھ کر جنگ کو اپنے مزاج میں شامل کرتے جارہے ہیں۔ قتل و غارت دیکھ دیکھ کر ذہن کی کیا حالت ہو جایا کرتی ہے، اس کا اندازہ کچھ انہی کو ہو سکتا ہے، جن کی پوری زندگی جنگ و جدل میں گزری ہو۔ مغرب اپنی نئی نسل میں جنگ پسندی کو ایک رجحان کی حیثیت سے پروان چڑھا رہا ہے۔ نئی نسل قتل و غارت دیکھنے اور پھر سہنے کی عادی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ جنگ و جدل کے ماحول پر مبنی وڈیو گیم بچوں کے ذہن میں جنگ پسندی کے رجحان اور قتل و غارت سے رغبت کو کیل کی طرح ٹھونک دیتے ہیں۔

مغرب اور خاص طور پر امریکا کی ثقافت جنگ پسندی کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ ان کے ادراک اور فکر پر جنگ و جدل سے رغبت اس بری طرح سوار ہے کہ اب اس کے بغیر زندگی بسر کرنے کا تصور بھی محال ہے۔ جنگ و جدل سے رغبت نے ان کی اقدار کی ساخت میں بھی شدید منفی اثرات مرتب کر دیئے ہیں۔ امریکا کیلئے جنگ ایک ایسی حقیقت ہے جو کہیں اور واقع ہو رہی ہو، اگر امریکا کسی جنگ میں براہِ راست شریک ہو تب جنگ اس کی سرزمین سے بہت دور لڑی جارہی ہوتی ہے۔ امریکا کی بنیادی حکمت عملی یہ ہے کہ جنگ دوسروں کو لڑنی چاہیے اور اس جنگ کو جاری رکھنے میں مدد دینے کیلئے ہتھیار امریکی ہونی چاہئیں! امریکی سیاستدان اور ووٹر ہتھیاروں کے حوالے سے شدید ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں مگر ریاستی ڈھانچا اور پالیسی سازی کا عمل کچھ اس قسم کا ہے کہ بات بنتی نہیں، دال گلتی نہیں۔

امریکا جنگ کو ہوا دینے کا الزام ہمیشہ دوسروں پر عائد کرتا ہے لیکن حقیقت میں جنگ پسندی کی ذہنیت کو عام کرنے میں خود اسی نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ امریکا ہی نے اپنی پالیسیوں کی مدد سے دنیا بھر میں جنگ کو ہوا دی ہے۔ کئی خطوں کو جنگ و جدل کی دلدل میں امریکا ہی نے پھنسایا ہے اور یورپ نے اس معاملے میں اس کیلئے معاون کا کردار ادا کیا ہے۔ اس وقت دنیا بھر میں جو خانہ جنگیاں برپا ہیں ان کی غالب اکثریت کیلئے امریکی پالیسیاں اور اقدامات ذمہ دار ہیں۔ یورپ بھی بہت کچھ کرتا ہے اور مزید بہت کچھ کر سکتا ہے مگر مغرب کے بیشتر اقدامات امریکا کی مرضی سے طے پاتے ہیں۔ وہ صورتِ حال کا فائدہ بھی اٹھاتا ہے۔ جب ایسا ہے تو پھر کسی بھی بڑی خرابی کی ذمہ داری بھی امریکا ہی کو قبول کرنی چاہیے۔

جنگ کو ایک پسندیدہ عمل کی حیثیت سے قبول کرنے کیلئے ذہن تیار کرنے میں مغربی میڈیا نے خاصا نمایاں اور بھیانک کردار ادا کیا ہے۔ امریکا اور یورپ کے بیشتر میڈیا آؤٹ لیٹس جنگ کو ایک ایسی ناگزیر حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو قوم قبول کرلے۔ جنگ و جدل کی کوریج کچھ اس انداز سے کی جاتی ہے کہ لوگ قتل و غارت کے مناظر کو بھی بخوشی قبول اور ہضم کرلیں۔ جنگ کو ایک ناپسندیدہ اور تباہ کن حقیقت کی حیثیت سے پیش کرنے کی بجائے قابل قبول اور بہت حد تک کام کی چیز بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ مغربی میڈیا کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جنگ کی کوریج دیکھتے ہوئے لوگ بے مزا نہ ہوں۔

جو لوگ جنگ لڑتے ہیں اور اسے بھگتتے ہیں وہ زندگی بھر کیلئے ذہن اور جذبات کی سطح پر عدم توازن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جنگ کسی بھی معاشرے کو کس حد تک برباد کر دیتی ہے مگر ان کے پاس طاقت ہے نہ آواز۔ وہ اگر چاہیں بھی تو جنگ کے خلاف ذہن سازی نہیں کرسکتے۔ ایک بڑی مصیبت یہ بھی ہے کہ معاشرہ ان لوگوں سے کچھ سننے کیلئے تیار بھی نہیں جو جنگ کے تباہ کن نتائج اچھی طرح جانتے ہی نہیں بلکہ بھگت بھی چکے ہیں۔ عوام کسی بھی جنگ کو اسی طرح دیکھتے ہیں، جس طرح وہ انہیں دکھائی جاتی ہے۔ بن غازی (لیبیا) کے حوالے سے مائیکل بے نے "13 گھنٹے" اس طور پیش کی کہ دھماکے، جو کسی بھی جنگ میں سب سے خطرناک حقیقت ہوتے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے کول یعنی قابل قبول ہو جاتے ہیں۔

امریکی فوج اب بھی یہی چاہتی ہے کہ جنگ کو ایک بھرپور رجحان کی حیثیت حاصل رہے۔ اس مقصد کا حصول یقینی بنانے کیلئے اخبارات و جرائد اور ٹی وی چینلوں کے ساتھ ساتھ بالی وڈ کی فلموں سے بھی کام لیا جارہا ہے۔ نئے ہتھیاروں کی تیاری کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی جارہی ہے۔ بہت سی فلموں کے ذریعے نئے ہتھیاروں اور ان کی ٹیکنالوجی کا پرچار کیا جارہا ہے۔ مقصد باقی دنیا کو یہ باور کرانا ہے کہ اگر وہ آج کی دنیا میں جینا چاہتی ہے تو جدید ترین ہتھیار حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ جنگ پسندی کے رجحان کو پروان بھی چڑھانا ہوگا۔

امریکا اور یورپ نے اب تک دفاعی ٹیکنالوجی کے نام پر انتہائی خطرناک ہتھیار تیار کرنے پر غیر معمولی توجہ دی ہے اور پھر بہت سے خطرناک ہتھیار دنیا بھر میں فروخت بھی کئے ہیں۔ امریکی فوج تو اس جنون میں مبتلا رہی ہے کہ اس کے پاس انتہائی خطرناک ہتھیار ہوں اور اس معاملے میں کوئی بھی اس کے پاس سے ہو کر گزرنے کی پوزیشن میں نہ ہو۔ یہ سارا تماشا ووٹروں کے ادا کردہ ٹیکس کی مدد سے برپا کیا گیا ہے۔ تعلیم اور صحت کے اداروں کی ضرورت ہے مگر اس طرف متوجہ ہونے کی کسی کو توفیق نہیں۔ منتخب ایوانوں میں بھی یہ نکتہ کم لوگ اٹھاتے ہیں۔ سب کچھ قومی سلامتی کو بچانے کی چوکھٹ پر قربان کر دیا گیا ہے۔ قدم قدم پر سیکیورٹی رسک کا رونا رو کر شہریوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ان کے بنیادی مسائل کے حل کیے جانے سے کہیں اہم ملک کا برقرار رہنا ہے، ملک ہوگا تو ان کے مسائل بھی حل ہوں گے۔

ہتھیاروں کو اپ گریڈ کرنے اور نئے ہتھیاروں کی تیاری کے حوالے سے تحقیق و ترقی کی مد میں خطیر رقوم مختص کی جاتی ہیں۔ کوئی خطرہ سامنے ہو یا ابھر رہا ہو تو ٹھیک ورنہ نئے خطرات پیدا کرکے پروان چڑھانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا اور جیسے ہی کوئی بیرونی خطرہ ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے، نئے ہتھیاروں کی تیاری اور پہلے سے موجود ہتھیاروں کی اپ گریڈیشن کیلئے مختص کی جانے والی رقوم میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

ویسے تو خیر پورے یورپ کو امریکی نائن الیون کے بعد خاصے دشمن میسر آ گئے ہیں مگر امریکا اس معاملے میں خاص طور پر خود کفیل ہے اور ان میں سے بیشتر خود امریکی پالیسیوں کے پیدا کردہ ہے۔ اسلحہ ساز فیکٹریوں کو چلانے کیلئے ہر وقت کوئی بڑا دشمن یا مخالف میکانزم موجود رکھا جاتا ہے۔ امریکی سیاستدان دشمنوں کی تعداد میں اضافہ دکھانے کیلئے اگر کوئی بھرپور اور حقیقی دشمن نہ ہو تو فرضی دشمن کھڑا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں جس کیلئے دہشتگرد گروپوں کی درپردہ افزائش سے گریز نہیں کیا جاتا تاکہ امریکا کیلئے دنیا بھر میں کاروائیاں کرنے کا جواز باقی رہے۔ چند عشروں کے دوران امریکا نے کئی دہشتگرد گروپ کھڑے کیے ہیں اور ان سے بھرپور کام بھی لیا ہے۔ آپ نے بھی غور تو کیا ہو گا کہ انتخابی مہم کے دوران وہی امیدوار سب سے زیادہ مقبولیت اور پھر کامیابی بھی حاصل کرتا ہے جو ملک و قوم کے دفاع پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔ جو دفاع پر زیادہ زور دیتا ہے اسی کو محب وطن سمجھا جاتا ہے۔

امریکا اور یورپ میں ہتھیاروں کی صنعت کیلئے بہت سی مشکلات بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ کسی بھی حریف میں اتنی قوت نہیں کہ امریکا اور یورپ کی سرزمین پر حملہ کرے اور جنگ کو وہاں تک مرتکز رکھے۔ جب کسی حریف میں اتنا دم ہے ہی نہیں تو پھر ہتھیاروں کی صنعت چلتی رکھنے کا جواز کیا ہے؟ بس یہی وہ نکتہ ہے جس پر اہلِ مغرب غور کرنے اور اس حوالے سے عملی طور پر کچھ کرنے کیلئے تیار نہیں۔

امریکا چاہتا ہے کہ بعض شر پسند گروپ مستحکم رہیں اور میدان سے نہ بھاگیں، انہیں کسی نہ کسی طور زندہ اور توانا رکھنے پر خاطر خواہ توجہ دی جاتی ہے۔ ان گروپوں ہی کے دم سے امریکا کیلئے امکانات کی دنیا بھی اب تک جوان ہے۔ امریکا اور یورپ دونوں ہی نے دہشتگردی برپا کر کے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ امریکی پالیسیوں کی کوکھ سے خرابیوں نے جنم لیا ہے۔ ان خرابیوں کے رد عمل میں جو گروپ امریکا کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں ان کی درپردہ معاونت کر کے امریکا نے یہ تاثر دینے کی بھرپور کوشش کی ہے کہ اسے نادیدہ دشمن یعنی دہشتگردوں کا سامنا ہے۔ عرب ممالک کے سیال مادے سے اکٹھی کی گئی بے پناہ دولت جو امریکی بینکوں میں ہی محفوظ ہے، اس خطیر رقوم سے پہلے تو امریکی اسلحہ سازی کے کارخانوں نے امریکی معیشت کو سنبھال رکھا تھا جس کیلئے خود مشرقِ وسطیٰ میں پہلے اسرائیل کا خطرہ دکھا کر ان ممالک کو منہ مانگی قیمت پر اسلحہ خریدنے پر مجبور کیا گیا لیکن بعد ازاں خود انہی ممالک کے درمیان ایسی فساد کی آگ بھڑکا دی کہ اب ان کی اسلحہ سازی کی صنعت کا پہیہ دن رات تیزی سے چلنے لگا۔

عراق کو ایک سازش کے تحت پہلے ایران کے ساتھ آٹھ سال تک ایسی جنگ میں الجھا دیا گیا جس کی قیمت صرف ان دو ملکوں نے نہیں بلکہ تیل سے مالا مال دوسرے پڑوسی ممالک کو بھی اس جنگ کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ ابھی یہ عذاب ختم نہیں ہوا تھا کہ عراق کو ایک گھناؤنی چال میں پھنسا کر کویت پر حملہ کروا دیا اور پھر سعودی عرب اور کویت کی مدد کے بہانے "ورلڈ آرڈر" کا آغاز کرتے ہوئے خود باقاعدہ اس خطے میں اپنی پوری جنگی حکمت عملی کے تحت اپنی اور اتحادیوں کی افواج کے ساتھ عراق پر حملہ کر کے کویت کو واگزار کرایا گیا اور خود امریکی ریکارڈ کے مطابق امریکا نے جہاں کویت اور سعودی عرب سے اپنی خدمات کیلئے ان دونوں ممالک سے 178 / ارب ڈالر وصول کیے اور عراق پر مجوزہ پابندیاں لگا کر عراق سے بھی 120 / ارب ڈالر خراج وصول کیا وہاں خطے کی سب سے بہترین اور جنگی وسائل سے مالا مال عراقی فوج کو مکمل طور پر تباہ کر کے اپنے لے پالک اسرائیل کو عراق سے لاحق خطرات سے بھی محفوظ کر دیا جبکہ اسرائیل پہلے ہی عراقی ایٹمی پروگرام کو ایک ایسے فضائی حملے میں تباہ کر چکا تھا جس کیلئے اس نے باقاعدہ سعودی عرب اور کویت کی اجازت سے ان ملکوں کی فضاؤں کو استعمال کیا۔

اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ بعد ازاں ایک سازش کے تحت عراق پر خفیہ کیمیائی ہتھیاروں کی تیاری کا الزام لگا کر حملہ کر کے محض اس لئے تباہ برباد کر دیا کہ عراق نے امریکی جارحیت کے بعد اپنی فوج کو از سر نو منظم کرنے کیلئے روس اور چین سے عراقی تیل کے عوض کئی معاہدے کئے اور تمام ممالک سے عراقی پٹرول کی قیمت ڈالر کی بجائے یورو اور دیگر کرنسیوں کی شرط رکھ دی اور عراقی تیل کے تمام ذخائر کی بیش بہا دولت کا ٹھیکہ امریکی کمپنیوں بالخصوص امریکی نائب صدر ڈک چینی کے حوالے کر دیا گیا۔ صدیوں سے محفوظ عراقی تہذیب کے بڑی بے رحمی کے ساتھ پرخچے اڑا دیئے گئے اور آج تک عراق اس جنگ کے نقصانات سے باہر نہیں نکل سکا اور ماہرین معیشت کے مطابق اگلے پچاس سال تک عراق خسارہ کی معیشت سے باہر نکل نہ سکے گا۔

اُدھر امریکا، اور اس کے اتحادی اپنے لے پالک اسرائیل کے بارے میں صرف ہفتہ بھر میں حماس کے مکمل خاتمے اور غزہ کی مکمل فتح کے بارے میں جو توقعات لگائے بیٹھے تھے، 100 دن سے زائد گزرنے کے باوجود نہ صرف ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے بلکہ خطے میں جنگ کے شعلوں میں توسیع کے امکانات بہت بڑھ گئے ہیں۔ اتنے دن گزرنے کے بعد بھی اسرائیل غزہ میں کوئی خاص پیش رفت نہیں کر سکا ہے پھر امریکا بھی سمجھتا ہے کہ اس موقع پر حزب اللہ کے ساتھ براہ راست جنگ کا اعلان مزید تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ اس کے ساتھی مشرق وسطیٰ اور مغربی ایشیا میں تیزی سے جو کچھ کرنا چاہتے تھے، یہاں بھی کچھ خاص حاصل نہیں ہوا۔ یوکرین میں بھی امریکا اور اس کے اتحادیوں نے کچھ خاص حاصل نہیں کیا ہے جبکہ روس اور چین کی شدید خواہش ہے کہ اس خطے میں امریکا اس قدر الجھ جائے کہ یوکرین کا معاملہ بالآخر امریکا کی شکست کا باعث بن جائے۔

مشرق وسطیٰ میں مسلسل خطرہ ہے کہ جنگ کا دائرہ کسی بھی وقت بڑھ سکتا ہے۔ اس بات کو یقینی بنانے کیلئے کہ صورتحال قابو سے باہر نہ ہو جائے، اسرائیل حماس جنگ کے آغاز کے بعد سے امریکی وزیر خارجہ انٹونی بلنکن چار مرتبہ اسرائیل کا دورہ کر چکے ہیں۔ ایک طرف اسرائیل بین الاقوامی اپیلوں اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کو نظر انداز کرتے ہوئے غزہ پر مسلسل حملے کر رہا ہے تو دوسری جانب شمال میں لبنان کی سرحد پر حزب اللہ کے ساتھ اس کی جھڑپیں بھی جاری ہیں۔ امریکی اور برطانوی لڑاکا طیاروں نے یمن میں حوثی باغیوں کے 60 سے زائد ٹھکانوں کو نشانہ بنا کر بحیرہ احمر میں تجارتی بحری جہازوں کو مزید خطرات میں مبتلا کر دیا ہے جس کے جواب میں حوثی کمانڈر نے ان حملوں کو ہر صورت جواب دینے کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ اسی دوران یہ خبر بھی آئی کہ ایران نے خلیج عمان میں ایک امریکی آئل ٹینکر کو پکڑ لیا ہے۔ یہ تمام چیزیں ایران سے جڑی ہوئی ہیں کیونکہ اس پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ حماس، حزب اللہ اور حوثیوں کو نہ صرف مالی اور فوجی مدد فراہم کرتا ہے بلکہ درپردہ اسی کی ہدایات پر کاروائیاں ہو رہی ہیں۔

اس سب میں ایران کا کردار بہت اہم ہے۔ ایران کو نہ صرف روس اور چین کی حمایت حاصل ہے، بلکہ وہ خود بھی کافی طاقتور ہے۔ وہ عراق میں موجود ہے، شام میں بشارالاسد اس کا اتحادی ہے۔ لبنان میں حزب اللہ اور غزہ میں حماس جارحانہ موڈ میں ہیں اور ایران بھی ان حالات کا پورا فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑے گا لیکن اگر حالات مزید کشیدہ ہوتے ہیں تو یقیناً پاکستان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گا جس کا بروقت ادراک کرتے ہوئے پاکستانی نیوی نے ان کشیدہ حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے نہ صرف ہوم ورک مکمل کر لیا ہے بلکہ آرمی چیف کے امریکی دورے کے بعد مکمل خاموشی کے طوفان کی تہہ سے ابھرنے والے حالات کا بخوبی اندازہ بھی ہو رہا ہے۔ ماہرین کے مطابق مشرق وسطیٰ کی صورتحال اس سطح پر ہے جہاں کوئی بھی ملک نہیں چاہے گا کہ یہ مزید خراب ہو اور ہر کسی کے پاس اپنی اپنی وجوہات ہیں۔

یقیناً امریکا حوثی باغیوں کے ٹھکانوں پر حملہ کرنے کے باوجود یہاں بڑے پیمانے پر تنازع نہیں چاہتا کیونکہ 2016 میں بھی یمن میں اس کا تجربہ اتنا اچھا

نہیں رہا اور پھر امریکا رواں برس صدارتی انتخابات کی وجہ سے کسی تنازعے میں الجھنا نہیں چاہتا۔ یہی وجہ ہے کہ 11 جنوری کو انڈین وزیر خارجہ ایس جے شنکر جیسے مہرے کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا گیا اور شنید یہ ہے کہ وہ اچانک مجوزہ دورہ ایران میں ایرانی ہم منصب حسین امیر عبداللہیان سے ملاقات میں امریکی وزیر خارجہ انٹونی بلنکن کا ایک انتہائی اہم پیغام پہنچایا ہے۔ ان کا یہ دورہ ایک ایسے وقت میں ہوا ہے جب اسرائیل اور حماس کے درمیان جاری جنگ کے مشرق وسطیٰ میں پھیلنے کا خطرہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ انتہائی پیغام اسرائیل کو کس قدر قبول ہو گا یا پھر یہاں بھی دہری منافقت سے کام لیتے ہوئے خطے میں امریکی مفادات کی حفاظت کیلئے مزید کرائے کے سپاہی بن کر اپنی قیمت وصول کریں گے۔

تنازعات اور تشدد معاشروں کا حصہ ہے۔ بہت سی ثقافتوں میں جنگ و جدل سے رغبت ہر دور میں رہی ہے۔ آج بھی ایسی بہت سی جنگیں لڑی جا رہی ہیں جن کا امریکا اور مغرب سے کوئی تعلق نہیں مگر پھر بھی امریکا و مغرب کا ہاتھ نمایاں ہے۔ امریکی اور مغربی معاشرے اپنے ہتھیار فروخت کرنے کیلئے جنگ پسندی کو فروغ دے رہے ہیں۔ کئی خطوں کو سلامتی کے حوالے سے شدید اندرونی خطرات سے دوچار کر دیا گیا ہے۔ متعدد ممالک کو غیر ضروری طور پر جنگ میں الجھا دیا گیا ہے۔ افغانستان، عراق، شام، لیبیا اور یمن اس کی بہت واضح مثالیں ہیں۔ آج کے مغرب میں میڈیا، معیشت، سیاست، انٹرٹینمنٹ سبھی کچھ جنگ پسندی کے آغوش میں ہے، جب تک یہ رجحان ترک نہیں کیا جائے گا تب تک دنیا میں حقیقی امن کی راہ ہموار نہیں ہو سکتی۔

بروز ہفتہ 17 رجب المرجب 1445ھ 27 جنوری 2024ء

سفر حجاز کا مطالبہ

اللہ اکبر....وہ کون سا گھر ہے آپ کی نگاہیں جس کی دیواروں کی بلائیں لیکر پلٹی ہیں.....جہاں آپ کا جسم بھی طواف میں تھا اور آپ کا دل بھی..... دنیا کے بت کدوں میں کل بھی وہ پہلا گھر تھا خدا کا اور آج بھی۔ دو چار صدیوں کی بات نہیں بلکہ دنیا کا سب سے پہلا عبادت خانہ! بنی آدم میں کسی کے حافظے میں اس وقت کی یادیں بھی محفوظ ہیں.....! اس طویل عرصے میں بے حساب مندر تعمیر ہوئے، لاتعداد گرجے آباد ہوئے، کیسے کیسے انقلابات سے یہ زمین آشنا ہوئی، کیسی کیسی بلندیاں پستیاں ہوئیں، کون کون سی تہذیبیں ابھریں اور مٹیں.. چاہے مصر و بابل ہوں یا روم و ایران لیکن عرب کے ریگستانوں میں چٹانوں اور پہاڑوں کے وسط میں سیاہ غلاف میں لپٹی یہ عمارت جس کو رب نے "اپنا گھر" کہا اس کو زمانے کا کوئی طوفان، کوئی انقلاب، کوئی زلزلہ اپنی جگہ سے نہ ہلا سکا....جو ابرہہ اس کو مٹانے اٹھا وہ نہ صرف خود مٹ گیا بلکہ تا قیامت رسوائی و عبرت کا ایک استعارہ بن گیا۔

اللہ کا خاص کرم ہو ان نفوس پر جن کو رب العزت اپنے گھر کی زیارت کی توفیق مرحمت فرمائی۔ اس سفر حجاز میں بار بار عملی طوافِ شوق کی تکمیل کہاں ممکن ہے، آپ کی نظروں سے اس گھر کا طواف ابھی مکمل نہیں ہو پاتا کہ روح کی ضد کہ یہیں حیات تمام ہو جائے....! ہر تکلف و تصنع سے مبرا یہ سیاہ چو کور گھر.... نگاہ جب پڑتی ہے تو جم کر رہ جاتی ہے اور روح ایسی سرشار ہوتی ہے کہ عجز و انکساری سے سجدہ ریز ہو جاتی ہے!! اس موقع پر موسیٰ کلیم اللہ یاد آ گئے جب اس کے گھر کی تجلی پر ہوش و حواس قائم رکھنا مشکل ہے تو اس گھر کے رب کی تجلی کیا کیا ہلچل بپا کرتی ہو گی! جب گھر کی برق پاشیوں کا یہ عالم ہے کہ جو دیکھتا ہے وہ کچھ اور دیکھنا بھول جاتا ہے اور ہمیشہ کیلئے یہی نظروں میں سما جاتا ہے تو گھر والے کے دیدار کی تاب انسانی بصارت بھلا کہاں لا سکتی ہے!

در مصحف روئے او نظر کن
خسرو، غزل و کتاب تا کے

اس کے چہرے کی زیبائی کو دیکھو اے خسرو، شعر و کتاب میں کب تک مشغول رہو گے!

رب کعبہ کا یکتا گھر نظروں کے سامنے تجلیاں بکھیر رہا تھا جسے پہلی مرتبہ کسی انجینئر، کسی ماہر تعمیرات نے نہیں بنایا، نہ لاکھوں روپے کا سامانِ تعمیر اس پر لگا، نہ جدید مشینری استعمال ہوئی!!! اللہ کے گھر کا معمار.....؟؟ ہاں وہ معمار بھی لمحہ لمحہ ہمارے تصور میں آ رہا ہے جو اپنے سر پر بھاری بھاری پتھر اٹھا کر لا رہا تھا، جس کے ہاتھ چونے، مٹی اور گارے سے بھرے ہوئے تھے۔ عرب کی چلچلاتی ہوئی دوپہروں میں ریگستان کی آگ برساتی دھوپ کی پروا کیے بغیر، روپے پیسے کی مزدوری سے بے نیاز وہ مزدور.....جو گویا اپنے پورے وجود کو اس گھر کی تعمیر میں لگا رہے تھے اور گھر کا مالک بڑے چاؤ سے بڑے پیار سے ذکر کرتا ہے ان "مزدوروں" کا جب ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے:

ہاں! اس گھر کی زیارت کرتے ہوئے جب چشم تصور میں نظریں اس پر ٹھہر جاتی ہیں تو لگتا ہے کہ جو ہاتھ اب تعمیر بیت اللہ میں مشغول ہیں، پتھر پر پتھر رکھ رہے ہیں، ہاتھوں میں چونا اور گارا ہے اور چشم اشکوں سے لبریز.....کہ دل کا سوز و گداز زبان پر آ جاتا ہے کہ.....رَبَّنَاتَقَبَّلْ مِنَّاإِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ اے ہمارے رب ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے بے شک تو سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے (البقرہ:127) تو یہ ہے دوستوں کی شان.....عشق کی منزلوں سے آگے کی منزلیں.....فدائیت کی منزلیں.....کہ سب کچھ لگا کر بھی دھڑکا یہی لگا ہوا ہے کہ مٹنا قبول بھی ہو گا کہ

نہیں.....؟؟؟

اگر ایسا گھر نہیں دنیا میں تو اس گھر کے سے مزدور کب دیکھے ہیں دنیا نے! دنیا کے کسی مزدور نے وہ مزدوری مانگی جو بیت اللہ کے مزدوروں نے مانگی تھی اور مزدوری کی طلب تو دیکھئے، تنہا اپنی ذات کیلئے نہیں ہم بھی شریک تھے اس اجرت کی طلب میں کہ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَامَنَاسِكَنَاوَتُبْ عَلَيْنَاإِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ: اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد سے ایک امت اپنی فرمانبردار بنا اور ہمیں ہمارے حج کے اعمال بتا اور ہم پر رحمت سے توجہ فرما اور تو بے شک رحمت سے توجہ کرنے والا ہے (البقرہ:128) گھر بنانے والے کو جو مزدوری ملی وہ مزدور جانے یا مالک..... لیکن اس اجرت میں مجھے اور آپ کو جو حصہ ملا اور اس گھر کی زیارت کرنے والوں کو، طواف کرنے والوں کو، سفر کرنے والوں کو، اس گھر سے محبت کرنے والوں کو، اس کی تعظیم کرنے والوں کو..... کیا کچھ نہیں ملا، کیا کچھ نہیں مل جاتا، برکتوں اور عزتوں کے اس گھر سے۔ ہر ایک یہی خزانے لے کر پلٹتا ہے اور..... ساتھ آپ کا دل بھی تو انہی خزانوں سے مالا مال ہے۔ ایک شکر سپاس ہے آپ کے پاس بھی اس وقت کہ آپ کا نفس پاک ہو کر اپنی خودی (انا) کو مٹا کر اپنے رب کی معرفت کی منزلوں میں سرگرداں ہے۔ رب کا گھر ہے یہ!!! مقام تفریح تو نہیں؟ یہ آگرہ کے تاج محل یا فرانس کے ایفل ٹاور کا نظارہ تو نہیں تھا..... یہ گھروندے جو سیر تماشے اور دل کے بہلاوے کیلئے صدیوں سے موجود ہیں لیکن وہاں آنے والے لاکھوں لوگ نہ عقیدت مند ہوتے ہیں نہ انہیں چومتے ہیں نہ آنکھوں سے لگاتے ہیں نہ والہانہ طواف کرتے ہیں نہ سجدے کرتے ہیں نہ روتے اور گڑگڑاتے ہیں نہ جھکتے اور گرتے ہیں نہ عشق وفدائیت سے سرشار پکارتے رہتے ہیں کہ "لبیک اللھم لبیک، آگیا ہوں مولا، میں آگیا، میرے رب میں حاضر ہو گیا، تو نے بلایا تھا، میں کیوں نہ آتا؟ میں آگیا سب کچھ چھوڑ کر آگیا، درویشوں اور درماندہ فقیر کے روپ میں تیرے در پہ آیا ہوں، دنیا کی لذتوں کو ٹھوکر مار کر آیا ہوں۔ لاکھوں لوگ.... ایک ہی وقت میں ایک ہی لے ہے، ایک ہی دھن جس کا سودا سر میں سمایا ہے، دیوانہ وار طواف کرتے ہیں اور ہم بھی احرام کا یونیفارم پہنے اس سلطانِ عالم کی فوج کا حصہ تھے اور جب نمازوں کے اوقات میں بھی اور صبح کے تڑکے میں بھی جب ہر بلندی اور ہر پستی پر لبیک کی آوازیں گونجتی تھیں تو میں اور آپ بھی ایک نشے میں سرشار ہو جاتے ہیں، ایک کیفیت میں جذب ہو جاتے ہیں اور ایک مرتبہ پھر چشم تصور میں ہمیں اس خاک پر کبھی اس محبوب علیہ اسلام کے قدموں کے نشان نظر آتے ہوں گے جو کبھی آگ میں کود اتو کبھی عزیز از جان نور نظر کے حلقوم پر چھری پھیر دی کہ آسمانوں پر ملائکہ بھی ششدر رہ گئے اور یک زبان ہو کر پکار اٹھے کہ واقعی اس نے خلیل اللہ ہونے کا حق ادا کر دیا اور پسر، اطاعت کی معراج کو جا پہنچا اور..... اور..... یہ کیا کہ وقت ہمیں چودہ صدیاں پیچھے لے گیا، یکدم ہمارا شعور اسی خاک پر اس عظیم ہستی ﷺ پر قربان، اور یوں طواف کرتے کرتے ہماری وارفتگی میں یکبارگی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ یکایک یہ شعر حجاب بن کر نظروں کے سامنے آگیا کہ:

چو بطرف کعبہ رفتم بحرم اہم ندا اند
تو بر دن در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

جب میں کعبہ کے طواف کیلئے گیا تو مجھے حرم میں داخل نہ ہونے دیا گیا، کہا گیا کہ تو نے حرم سے باہر تو نافرمانی کی اب بیت اللہ کس منہ سے آیا ہے؟

تب ہماری سانسیں تھم تھم جاتی ہیں، گردشِ ایام کے جائزے پر اور توبتہ النصوح کا مفہوم آپ پر آشکار ہو جاتا ہے۔ دوران سعی آپ کو اس خاکِ پاک پر سیدہ ہاجرہ صدیقہ کے قدموں کے نشان بھی نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں جو نبی کی ماں اور نبی کی بیوی ہونے کے شرف سے مشرف تھیں اور برسہا برس سے قافلے اس عظیم خاتون کے قدموں کے نشانوں پر دوڑ رہے ہیں۔ کیسا شرف ایک عورت کو دیا ہے اس دین نے کہ رب ذوالجلال نے اپنے محبوب

ﷺ کو بھی بی بی ہاجرہ کی سنت کی پیروی کرنے کا حکم دیا، کیا منظر ہو گا جب رسول خدا بھی اس مخصوص مقامات پر اماّں ہاجرہ پر تفاخر کرتے ہوئے تیز تیز بھاگ رہے ہوں گے !یقیناً حضرت ام المومنین حضرت عائشہ بھی بی بی حاجرہ کی سنت کی ادائیگی کے مناظر اور عظیم عورت کے عظیم کردار پر اپنے رب سے مناجات میں رازونیاز کرتی ہوں گی، جگر گوشہ رسول ﷺ سیدہ فاطمہ بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ہاتھ تھامے رب کے حضور سر جھکائے اماں حاجرہ کے نقوشِ پائے کی نسبت پر تیز تیز چل رہی ہوں گی۔ یقیناً یہ سب کارہائے عظیم کتابوں میں ہم درجنوں مرتبہ اکثر پڑھتے ہیں لیکن آج اپنی چشم تر سے ان کا جی بھر کر نظارہ کرتے ہوئے اپنے مقدر پر رشک کرتے ہوئے صد ہزار مرتبہ جبیں اپنے خالق کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے۔

کعبہ سے غمِ جدائی کا عظیم بوجھ گریہ وزاری کر کے ہلکا کرنے کا وقت بڑا ہی مشکل اور آزمائش کا ہوتا ہے۔ طواف وداع کرتے ہوئے دل ملول و مغموم اور رنج و حزن میں غرق ہو جاتا ہے، کیوں نہ ہو اب کچھ ہی دیر میں کعبہ مشرفہ سے وداع جو لینا تھی۔ جوں جوں گھڑی کی سوئیاں آگے جا رہی ہوتی ہیں، مکہ کی روح پرور اور ایمان افروز تجلیات رودادِ ماضی بن جائیں گی اور دل ان اندیشوں اور وسوسوں سے لبریز ہو جاتا ہے کہ عمر بھر تمناؤں میں بسنے والے مرکز ہدایت اور قبلہ دل کی ساری دلنوازیاں، جلوتیں اور دلربائیاں اب صرف یادوں، خوابوں اور خیالوں کی جنت بننے والی ہیں۔ بہر کیف فرقتِ یار کے غم میں آنکھیں نم، جذبات متلاطم، روح الحاج وزاری میں رقصاں، لب آہ وفغان میں لرزاں دیکھ کر روح کو دلاسہ دیا، بے شک وداع کی یہ دل فگار گھڑیاں اللہ کے چہیتوں پر شاق گزرنی چاہیے، انہیں کوچہ جانان سے جدائی کا غم ماہی بے آب کی مانند تڑپانا چاہیے، ان کی ہچکیاں بندھنی چاہیے، انہیں سینہ کوبیاں کرنی چاہئے، کیا پتہ اب کبھی یہاں دوبارہ سربسجدہ ہونے کا شرف ملے گا، کیا معلوم اللہ اپنے گھر کا طواف کرنے کا کوئی نیا بلاوا بھیجے گا، کون سی ضمانت ہے کہ کعبتہ اللہ، حجر اسود، رکن یمانی، ملتزم، درِ کعبہ، مقامِ ابراہیم، زمزم، صفا و مروہ اور مقدساتِ مکہ کے دیدار کا قرعہ فال ہمارے نام دوبارہ نکلے گا بھی۔

یہ خیال آتے ہی یہاں پل پل غنیمت لگتا ہے، لمحے صدیوں میں بدل جاتے ہیں اور ایک مرتبہ پھر ربِّ کعبہ سے مانگنے، آہ وزاری کے ساتھ حاجت روائی، گناہوں سے بخشش اور عفو و درگزر والدین اور دوسرے مرحومین کیلئے گڑگڑا کر مغفرت کی دعائیں، اپنوں اور غیروں کی بھلائی کیلئے دعائے خیر، طبیبِ ازلی سے ہر مریض کیلئے اور ہر مرض سے شفایابی، قرضوں کی ادائیگی کیلئے غیبی مدد، بیروزگاری کی ذِلت سے نجات، عذابِ جہنم سے خلاصی، جنت کے انعامات و عطا، بیٹیوں کے موزوں بر، مناسب جوڑ طلب اور ان کے بہتر نصیب، فتنہ ہائے زمانہ میں ایمان و امان کی عافیت، مسجد اقصیٰ کی فریاد، غزہ اور مقبوضہ کشمیر کے شہداء کی مناجات اور آزادی، ملت کی آبرومندی کی بھیک، پوری انسانیت کی بھلائی، بار بار حرمین کی زیارت سے حصولِ فیوضات و برکات کی اشک بار دعاؤں کی درخواستیں اور التجائیں پیش کرتے ہوئے سارا جسم کپکپا رہا ہوتا ہے۔

دنیا و آخرت میں بہتر معاملے کیلئے اپنی تردامنی پر ندامت کے اشک بہا کر وحدہ ولاشریک سے سرگوشی کرنے کا وقت آن پہنچتا ہے: اے ربِ ارض و سماء! کعبہ مطہرہ تمہارا گھرانہ، تیرے خلیل کا نذرانہ، تیرے حبیب ﷺ کیلئے وجہ قرار، یہ تمہاری شانِ کریمی کہ تمام اہل ایمان بیت اللہ کے وارثین بنا دیئے ہیں، میں حقیر و ناکارہ، خطاونسیاں، گناہ و برائی کا مجموعہ لیکن ہوں تو تیرا ہی بندہ، میری توبہ قبول کر لے، اب سے میرے ایمان و کردار کو ایسا لعل و گوہر بنا دے کہ بیت اللہ کے ورثاء میں میرا بھی نام جڑ جائے، میں عمر بھر کعبے کی طرف رخ کر کے جیوں اور مروں۔ اے رحیم و رحمن اللہ! اپنے اس گھر کو میرے قلب و جگر کے نہاں خانے میں ایسے بسا دے کہ کبھی اس سے جدائی کا کھٹکا لگے نہ دوری مسافت کی دیوار حائل رہے، میرے اعمال سے ہمیشہ غلافِ کعبہ کی زینتیں اور ملتزم و سنگِ اسود کی عظمتیں جھلکیں۔ آمین یارب العالمین!

لگتا تھا کہ کعبہ شریف کے گرد جسم نہیں روح بھی چکر لگا رہی تھی، اللہ سے پیار اس قدر امڈ رہا تھا کہ ساحلوں اور کناروں کے بند ٹوٹ رہے تھے۔ طواف سے فارغ ہوئے تو ملتزم کے سامنے اللہ کے حضور دست بدعا ہو گیا، حجر اسود کو آنکھوں آنکھوں میں چوما، یاد آیا کہ رسولِ کائنات ﷺ نے جنت کے اس پتھر کو بوسہ دیتے ہوئے حضرت عمر سے فرمایا تھا کہ یہ جگہ آنسو بہانے کیلئے ہے۔ یہاں جو بھی اپنی نافرمانیوں اور روگردانیوں پہ بلک بلک کر روئے، اس کے گناہوں کے داغ دھبے یکسر دھل جائیں گے۔ حجر اسود سے گزر کر رکن یمانی کی زیارت سے حریم قلب آسودہ کیا، حطیم سے تھوڑا سا لپٹ گئے، میزابِ رحمت پر نظریں مرکوز کیں کہ رحمت کا ریلا ابھی شرابور کر دے گا، غلافِ کعبہ کی کشش و جاذبیت میں کھو گئے۔ دعا و مناجات سے فارغ ہوئے تو زمزم کے جامِ شریں سے روح کی پیاس بجھائی۔ یہ پانی اللہ کا عطیہ اور حضرت ذبیح اللہ کی ایڑیوں کا صدقہ ہے، اس کے گھونٹ گھونٹ میں پینے والے کیلئے علمِ نافع، رزقِ واسع اور شفائے امراض کی ضمانت پنہاں ہے۔

اذانِ عشاء ہوئی تو دل میں ہوک سی اٹھی کہ یہ کعبہ مشرفہ میں فی الوقت آخری نماز ہے، بس کچھ ہی پل بچے ہیں، کچھ گنی چنی سانسیں اس خلد بریں میں لینا باقی ہیں۔ بیت اللہ کا صحنِ مبارک جہاں سعید روح انسانوں کے اژدھام سے ہمہ وقت بھرا رہتا ہے، وہاں اللہ کے ستر ہزار فرشتوں کا ہمیشہ ہجوم اکٹھا ہوتا ہے۔ خود ہی سوچئے برکت و رحمت کے اس منبع و مرکز اور سرکار دو عالم ﷺ کے مولد و مسکن سے جب مفارقت کا لمحہ قریب آجائے تو دل کا کیا حال ہو گا۔ تاہم نماز سے فارغ ہوتے ہی طوافِ وداع کا فریضہ انجام دیا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ ساتوں اشواط میں تھوڑا ہی وقت صرف ہوا کیونکہ ہم نے کعبہ کے بالکل قریب ہی یہ سعادت پائی۔ خوش قسمتی سے سنتیں ادا کرنے کیلئے مقامِ ابراہیم سے بہت کم فاصلے پر مصلیٰ ملا، سنتیں ادا کیں، دعا کیلئے ہاتھ اٹھے ضرور مگر یکایک روح کی زبان گنگ ہو گئی کہ کعبے سے رخصتی پر افسردہ خاطر تھا، جگر نوحہ کناں تھا مگر مدینہ منورہ روانہ ہونے کی مسرت سے شادی مرگ ہونے کا اندیشہ بھی بڑھ رہا تھا ان کیفیات کی رو میں بہہ کر اللہ سے کس منہ سے کہتا کہ الٰہی! اِدھر کا قیام بڑھا دے یا جلد از جلد گنبدِ خضرا پہنچا دے۔

بے شک اللہ رحمن و رحیم کا ہم پر یہ خاص لطف و کرم تھا کہ اس ذاتِ اقدس ﷺ کے بقعہ نور، پناہ گاہِ مہاجرین اور شہر انصار کی خوشبوؤں سے مشامِ جان معطر و مسحور ہونے کا زریں موقع ہمیں نصیب ہوا۔ خیر کعبہ پر پہلی نظر پڑتے وقت اور پھر رخصت لینے کی گھڑی پر بصد جان و دل اللہ سے لبوں پر دعا مچلنے لگتی ہے: بارالہا! مجھے اور میرے اہل و عیال کو اپنے گھر اور اپنے محبوبِ کبریا ﷺ کے شہر شیریں میں بار بار و لگاتار بلانا۔ دعاؤں کو وردِ لب کرتے ہوئے اور نیک خواہشات اور تمناؤں کا نخلستان دل میں سجاتے ہوئے کعبہ شریف پر حسرت بھری نگاہیں مکرر، سہ کرر ڈالیں اور بوجھل قدموں سے مطاف چھوڑ دیا، کئی بار پلٹ کر دیکھا تو ایسے لگا جیسے کعبہ مہربان رخصت کرتے ہوئے کہہ رہا تھا: میری حیات بخش تجلیات و انوارات، ایمانِ قوی، اعمالِ صالح، خوفِ خدا، جو ابد ہی آخرت کی نہ ختم ہونے والی عظیم پونجی ہیں، جو بھی اس پونجی سے توحید و سنت کے بازار سے زندگی کا سودا سلف لائے، وہی لاریب زائر الحرمین کہلانے کے لائق ہے، دنیا کی بھلائی اور آخرت کے عز و شرف کا بھی وہی حق دار ہے۔

کتابِ ہستی کے سرورق پر جو نام احمد ﷺ رقم نہ ہوتا
تو نقشِ ہستی ابھر نہ سکتا، وجودِ لوح و قلم نہ ہوتا

اب دل وجاں اور روح تک ایک عجیب سی خوشی سے سرشار اور بے چین ہے کہ آنکھیں بند کر کے کھولوں تو سامنے گنبدِ خضرا ہو، جس کیلئے آقائے نامدار ﷺ کے شہر کی طرف رخصت سفر شروع کیا تو اچانک میرے آقا ﷺ کے فرامین یاد آگئے کہ آپ نے فرمایا: تم میں سے جس شخص کو مدینہ میں موت آسکتی ہو، اسے چاہیے کہ وہ یہ سعادت حاصل کرے، چونکہ یہاں مرنے والوں کی گواہی میں دوں گا۔ (سنن ابن ماجہ) بہشتِ مدینہ کی عظمت وسطوت ناپنے کا کوئی پیمانہ ہی نہیں مگر اس مقدس شہر کی برتری وبالادستی کا ایک اہم اشارہ یہ بھی ہے کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق دعا کیا کرتے: اے اللہ! مجھے اپنے راستے میں شہادت عطا کر اور اپنے رسول کے شہر میں موت عطا کر (صحیح بخاری)

اس پر شوق سفر کا پنچھی دل کی کتاب لئے بیٹھا یہ سوچنے لگا کہ یہ دعا مانگنے والی ہستی تاریخ اسلام کی ماتھے کا جھومر تھی، وہ جن کی آراء اور مشوروں کی بارگاہِ الٰہیہ میں اتنی پذیرائی ہوتی کہ وحی بن کر اللہ کے رسول پر نازل کی جاتی، وہ فاروق اعظم جس کی تعریفوں میں دوست تو دوست دشمن بھی رطب اللسان ہیں۔ یہ خاص دعا مانگ کر اس فنافی الرسول شخصیت نے ہمیں جینے میں ہی نہیں بلکہ مرنے میں بھی ہمسائیگی رسول اختیار کرنے کی آرزو سکھادی۔ آپ بالمعنی فرماتے ہیں اپنے نصیبے سے جو بہشت مدینہ میں داعی اجل کو لبیک کہے، سمجھو اس کا بیڑہ پار ہو گیا۔ امیر المومنین کی یہ دعا اللہ کی بارگاہ میں یک بار قبول ہو گئی۔

حبِ نبی ﷺ کے نادر نمونے ہمیں صحابہ کی پاک زندگیوں میں کہاں نہیں ملتے؟ ایک برگزیدہ صحابی حضرت ثوبان رضی اللہ تعالی عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ اکثر بیمار رہنے لگے، طبیعت کی ناسازی روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ صحابہ کبار بیمار پرسی کرتے تو یہ اپنے دل کا حال ان قدسی صفات پر بھی ظاہر نہ کرتے، شکریہ کر کے بات ٹال دیتے۔ آخر پیغمبر دوجہاں ﷺ نے پوچھا تو صاف صاف عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! ایک خیال دل میں آتے ہی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ سرور دوعالم ﷺ نے پوچھا: کیا خیال آتا ہے؟ عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! اب زندگی میں جب تک آپ ﷺ کا دیدار نہ ہو چین نہیں آتا۔ سوچتا ہوں مرنے کے بعد کیا ہو گا؟ اگر اللہ نے اپنے فضل عنایت سے مجھے جنت عطا بھی کی تب بھی معلوم نہیں آپ ﷺ کہاں ہوں گے اور میں آپ ﷺ کے روئے نازنین کی زیارت کئے بغیر جنت میں کیونکر تسکین وطمانیت پاؤں گا؟ معلوم ہی نہیں وہاں آپ ﷺ کے چہرہ انور کا دیدار کرنے کیلئے مجھے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ثوبان! تم جس سے محبت کرتے ہو اسی کے ساتھ رہو گے۔ پھر آپ ﷺ نے قرآن کریم کی وہ آیت تلاوت فرمائی جو اسی موقع پر عرشِ معلی سے نازل ہوئی: جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ ہی رہیں گے جنہیں اللہ تعالی نے نعمتوں سے نوازا ہو گا۔

یہ تو صحابہ کبار کے عشق رسول ﷺ کے احوال وکوائف تھے۔ اولیائے کاملین نے کامل اتباعِ سنت کر کے اپنے بیداد عشقِ رسول ﷺ کی لاج رکھی۔ حضرت بایزید بسطامی نے ایک مرتبہ بڑے اشتیاق سے خربوزہ منگوایا لیکن اس خیال سے کہ پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ آپ ﷺ خربوزہ کیسے تناول فرماتے تھے، پتہ چلا کہ رحمت عالم ﷺ نے کبھی خربوزہ تناول فرمایا ہی نہیں۔ بایزید بسطامی نے خربوزہ کھانے سے ہی انکار کر دیا۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

جونہی گنبدِ خضرا پر پہلی نظر پڑی تو یقیناً دل کو تھامنا بہت ہی مشکل ہو گیا کہ محسن انسانیت ﷺ کے در پر حاضری، اپنی قسمت پر رشک آنے لگا کہ ایسی عظیم الشان شخصیت جس پر خود اللہ اور اس کے ملائکہ کثرت سے درود پڑھتے ہیں اور اہل ایمان کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ بھی کثرت سے درود پڑھتے رہا

کریں۔ ایسی فخر کائنات ہستی جس کے بارے میں غیر مسلم بھی کچھ اس طرح رطب اللسان ہیں:

مغربی مصنف مائیکل ہارٹ نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب میں دنیا کے ان سو عظیم ترین آدمیوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے دنیا کی تشکیل میں بڑا کردار ادا کیا۔ اس نے حضور کو سب سے پہلے شمار پر رکھا ہے۔ مصنف ایک عیسائی ہو کر بھی اپنے دلائل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ پورے نسل انسانی میں سید البشر کہنے کے لائق ہیں۔

☆ تھامس کارلائیل نے 1840ء کے مشہور دروس میں کہا کہ میں محمد ﷺ سے محبت کرتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ ان کی طبیعت میں نام ونمود اور ریا کا شائبہ تک نہ تھا۔ ہم انہی صفات کے بدلے میں آپ کی خدمت میں ہدیہ اخلاص پیش کرتے ہیں۔

☆ فرانس کا شہنشاہ نپولین بوناپارٹ کہتا ہے محمد دراصل سرور اعظم تھے، 15 سال کے قلیل عرصے میں لوگوں کی کثیر تعداد نے جھوٹے دیوتاؤں کی پرستش سے توبہ کر ڈالی۔ مٹی کی بنی دیویاں مٹی میں ملا دی گئیں، یہ حیرت انگیز کارنامہ تھا آنحضرت کی تعلیم کا۔

☆ جارج برناڈ شا لکھتا ہے: موجودہ انسانی مصائب سے نجات ملنے کی واحد صورت یہی ہے کہ محمد ﷺ اس دنیا کے رہنما بنیں۔

☆ گاندھی لکھتا ہے کہ بانی اسلام نے اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی جس نے انسان کو سچائی کا راستہ دکھایا اور برابری کی تعلیم دی، میں اسلام کا جتنا مطالعہ کرتا ہوں اتنا مجھے یقین راسخ ہو جاتا ہے کہ یہ مذہب تلوار سے نہیں پھیلا۔

☆ جرمنی کا مشہور ادیب شاعر اور ڈرامہ نگار گوئٹے حضور ﷺ کا مداح اور عاشق تھا، اپنی تخلیق دیوانِ مغربی میں گوئٹے نے حضور اقدس کی بارگاہ میں جگہ جگہ عشق محمد ﷺ کا اظہار کیا ہے اور ان کے قدموں میں عقیدت کے پھول نچھاور کئے ہیں۔

☆ فرانس کے محقق ڈی لمرٹائن نے اپنی کتاب تاریخِ ترکی میں انسانی عظمت کیلئے جو معیار قائم کیا اس ضمن میں فاضل تاریخ دان لکھتا ہے: اگر انسانی عظمت کو ناپنے کیلئے تین شرائط اہم ہیں جن میں (1) مقصد کی بلندی، (2) وسائل کی کمی (3) حیرت انگیز نتائج، تو اس معیار پر جدید تاریخ کی کون سی شخصیت محمد ﷺ سے ہمسری کا دعویٰ کر سکتی ہے۔

☆ فرانسیسی مصنف دی لمرتین لکھتا ہے: فلسفی، مبلغ، پیغمبر، قانون ساز، سپہ سالار، ذہنوں کا فاتح، دانائی کے عقائد برپا کرنے والا، بت پرستی سے پاک معاشرہ تشکیل دینے والا، بیسیوں ریاستوں کو ایک روحانی سلطنت میں متحد کرنے والا.... وہ محمد ﷺ ہیں.... جہاں تک انسانی عظمت کے معیار کا تعلق ہے ہم پوچھ سکتے ہیں کہ ان معیاروں پر پورا اترنے والا محمد ﷺ سے بھی کوئی برتر ہو سکتا ہے؟

☆ ڈاکٹر شیلے پیغمبر آخر الزماں کی ابدیت اور لاثانیت کا اقرار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: محمد ﷺ گزشتہ اور موجودہ لوگوں میں سب سے اکمل اور افضل تھے اور آئندہ ان کی مثال پیدا ہونا محال اور قطعاً ناممکن ہے۔

مدینہ کے شمال میں واقع پہاڑ جبل احد کے پاس اس مقام پر حاضری دینے کی جب سعادت ملی تو سارا تاریخی جنگی منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا جہاں عاشقان رسول ﷺ اپنے آقا کے گرد گھیرا ڈالے پروانوں کی طرح آنے والے تیروں، بھالوں اور زہر آلود تلواروں کے وار اپنے سینوں پر روک رہے ہیں کہ میرے آقا ﷺ کے دندان مبارک اس قدر زخمی ہو گئے کہ منہ مبارک خون سے بھر گیا اور ایک روایت کے مطابق سیدنا جبریل علیہ السلام نے اس خونِ مبارک کو زمین پر گرنے سے پہلے اپنے پروں میں محفوظ کر لیا کہ اگر یہ خون زمین پر گر جاتا تو یہ زمین مارے ندامت کے بانجھ ہو جاتی۔ آج اسی میدان میں کے سامنے کھڑا ہوں جہاں نبی کریم ﷺ کے پیارے چچا حضرت حمزہ دفن ہیں۔ حضرت حمزہ جنگ احد میں 70 دیگر صحابہ کے ہمراہ شہید ہو

گئے تھے اور کفار نے ان کی لاش کی بے حرمتی کی تھی۔ رسول کریم ﷺ کو اپنے اس ہم عمر چچا سے بڑی محبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شہید لاشے کو دیکھ کر فرطِ غم سے آپ پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے اور جب تک اس دنیا میں قیام فرمایا آپ ﷺ ہر بدھ کو شہدائے احد کے مزار پر جا کر فاتحہ کہتے تھے۔

زائرِ الحرمین اگر اپنے دل و جاں اور روح کی طرف متوجہ ہوں تو اس سفر حجاز کا ایک پیام ضرور سنائی دیتا ہے وہ اک پیام جو مسجد جو مسجد حرام نے بھی رخصت ہوتے ہوئے دیا تھا اور مسجد نبوی سے بھی وہی صدا موصول ہو رہی ہے جو عرفات کے میدان میں بھی آ رہی تھی اور منیٰ کی قربان گاہ میں بھی، جو زم زم کے قطروں نے بھی ہم سے سرگوشی میں کی ہے اور خاکِ حرم کے ذروں نے بھی آپ کے قدموں سے لپٹ کر کی ہے اور وہ صدا تھی، بس ایک صدا، کیسی صدا کہ "کونوا انصار اللہ" جب دنیا ظلم سے بھر گئی تو کیا تم اپنے حصے کا کام کرنے نہ اٹھو گے!

راستہ بھی موجود ہے اور اس کی دی ہوئی ٹانگیں بھی موجود ہیں اور اس راستے پر چلنے کا قرض بھی موجود ہے۔ مالک نے جو زمین حوالے کی، مزارع نے اس پر ہل نہ چلایا اور زمین زہر آلود جھاڑیوں اور کانٹوں سے بھر گئی۔ سفر حجاز نے یہی تو کہا ہے آپ سے کہ جیسے یہاں کے ہر چپے پر اللہ کی بڑائی اور اس کا ذکر ہے، اللہ کی ساری کائنات یونہی اس کی بڑائی چاہتی ہے۔ معرکہ بدر اور واقعہ کربلا آج بھی بپا ہے۔ ہم نے کبھی سوچا کہ مملکت خداداد پاکستان 27 رمضان کی مبارک ساعتوں میں کیوں معرضِ وجود میں لایا گیا، ایسی رات جو ہزار مہینوں سے بہتر اور افضل ہے؟ ہم نے اس کے حصول کیلئے بیش بہا جانوں کا نذرانہ پیش کیا، صدی کی سب سے بڑی انسانی ہجرت میں لاکھوں خاندان ایک دوسرے سے بچھڑ گئے اور اپنوں کے فراق میں قبروں کا رزق بن گئے۔ ہم نے اپنے رب سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم اس ارضِ وطن میں قرآن کی حاکمیت قائم کریں گے۔ آج تک ایفائے عہد کی تکمیل کرنے سے قاصر ہیں۔ اب پاکستان میں دوبارہ سیاسی اکھاڑا سج گیا ہے لیکن کسی بھی سیاسی جماعت نے اپنے منشور میں نہ تو قرآن کی حاکمیت کے نفاذ کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی بدقسمتی سے مجبور مقہور کشمیر کا کہیں تذکرہ ہے۔ حرمین کا اپنے ہر زائر سے یہ برملا سوال ہے کہ ہمارے اندر اس دین کے نفاذ کی سختیاں جھیلنے کا کتنا عزم ہے؟

سفر حجاز کی یادیں ہم سے سوال کرتی ہیں کہ آج ربّ کعبہ کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر خالقِ کائنات کی غلامی میں واپس لانے کیلئے اپنا کردار کب ادا کرو گے؟

بروز بدھ 21 رجب المرجب 1445ھ 31 جنوری 2024ء

وہی اول، وہی آخر ﷺ

الصادق، المصدوق، احمد، ابوالقاسم، ابوالطیب، نبی التوبہ، نبی الرحمتہ، نبی المرحمتہ، نبی ال ملحمتہ، الرحمہ المہداۃ، حبیب الرحمن، المختار، المصطفیٰ، المجتبیٰ، الامین، صاحب مقام محمود، صاحب الوسیل والدرج الرفیع، صاحب التاج والمعراج، امام المتقین، سید المرسلین، النبی الامّی، رسول اللہ، خاتم النبیین، الرسول الاعظم، السراج المنیر، الرووٗف الرحیم، العروالوثقیٰ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! اپنی زبان کو کروڑوں مرتبہ مشک وکافور سے بھی دھو کر بیان کرنا چاہوں، روئے زمین میں پھیلے ہوئے جنگلات کے تمام اشجار کے قلم اور تمام ارض کائنات کے سمندروں کے پانی کو روشنائی میں بھی تبدیل کر کے آپ کے کسی ایک مناسک کی تعریف بھی تحریر کرنا ممکن نہیں لیکن اس ناچیز کی درخواست، میری یہ جسارت، میری یہ رسائی، میرے قلم کی یہ آہ نیم شبی ، میری آہ سحری کی یہ بازگشت دامن قرطاس پر بکھر کر سمٹ کر گریبان قرطاس کا قلاوہ بن کر اس بارگاہ بے کس پناہ میں حاضر ہونے کی اجازت چاہ رہی ہے اور یہ جسارت، یہ جرأت، یہ ہمت، یہ رسائی اور یہ اجازت آپ ہی کی مہربانی اور آپ ہی کے لطف کا صدقہ ہے۔

آپ کے سائل سینکڑوں ہوں تو بھی میں پہچانا جاؤں، ہزاروں ہوں تو شائد رسائی ہو، لاکھوں ہوں تو شائد شنوائی ہو، کروڑوں ہوں تو شائد کارواں عشق ومحبت میں ایک گوشہ مل جائے مگر اس آستاں کے سامنے بے حدوحساب، بے شمار وبے تعداد وبے کراں آپ کے در پر کھڑے سوالی ہیں ان میں ایک یہ غلام بھی ہے۔ میں اپنے بیان کی، اپنے اسلوب کی، اپنے انداز کی حیثیت کو بھی خوب جانتا ہوں لیکن پھر بھی سوت کے یہ چند قلمی تار آپ کے دربارِ عالیہ میں لیکر حاضر ہو رہا ہوں۔

اے رحمت العالمین! اتنے بڑے دربار کی روایات جہاں بوقتِ فجر سے مغرب تک 70 ہزار ملائکہ حاضر ہوتے ہوں اور مغرب سے لیکر فجر تک 70 ہزار ملائکہ کی دوسری جماعت حاضری کا شرف حاصل کرتی ہو اور پھر قیامت تک ان کی باری نہ آئے، یہ بے مایہ، بے بضاعت، آداب ومنقبت نگاری سے ناواقف، بھلا اتنے بڑے دربار سے کیسے آشنا ہو سکتا ہے۔ صرف اس لئے حاضر ہو رہا ہوں کہ شاہوں کے دربار میں بغیر نذرانے کے حاضر ہونا گستاخی سمجھی جاتی ہے لہٰذا یہ ناچیز اپنے دل کے ٹکڑوں کو عقیدت ومحبت کی کشتی میں درود شریف کا غازہ لگا کر آپ کے دربار میں درخواست پیش کرنے کی اجازت کا طلب گار ہے۔

اے پیغمبر مجتبیٰ! میں فقیر ہوں، مجھے مانگنا بھی نہیں آتا، صدا لگانے کے سلیقہ سے بھی ناواقف ہوں، میری صدا، میرے چند آنسو ہیں جو نیم شب بہہ کر آپ کی بارگاہ میں قبولیت کے منتظر ہیں اور آج پریشان الفاظ کی شکل میں قلم کی نوک پر آنے کیلئے مچل رہے ہیں۔ اگر ان آنسوؤں کے کچھ مطالب ہو سکتے ہیں تو انہیں قبول فرمائیں۔ ان آنسوؤں کے پردے میں جو سوز ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں، جو درد ہے آپ سے چھپا نہیں، جو گداز ہے وہ آپ سے پنہاں نہیں، ان سب کو الفاظ بنا کر آپ کی خدمت میں تحریر کرنا بھی چاہوں تو بھی ممکن نہیں، بس! یہ آپ کی محبت کے داغ ہیں جو کبھی مدہم بھی نہیں ہو سکتے، یہ آپ کی یادوں کے زخم ہیں جو بھر نہیں سکتے، یہ داغ، یہ زخم بھی آپ ہی کی نگاہِ کرم کا ایک عطیہ ہیں۔

اے طٰہٰ! بزرگوں سے سنا تھا، کتابوں میں پڑھا ہے کہ آپ کی بارگاہ میں قصیدہ خواں، مدحت سرا، آہ وفغاں کرنے والے ذکر اذکار کرنے والے آپ کے مناقب بیان کرنے والے اور لکھنے والے بلا روک ٹوک پہنچ جاتے ہیں۔ میں قصیدہ خواں بن نہیں سکا کہ خوش آواز نہیں ہوں، مقرر نہیں بن سکا کہ آپ کی مدح سرائی میں کوئی کمی نہ رہ جائے، مدحت سرا نہ ہو سکا کہ ذوقِ شاعری نہیں ہے، آہ وفغاں نہ کر سکا کہ سینہ بریاں نہ پایا ہے، فرہاد وفغاں لیکر نہ پہنچ سکا

کہ ذکر واذکار آپ کے شایانِ شان نہ کرپایا ہوں، ہاں اسی لئے میرے مہربان ورفقاء برملا الزام دینے سے گریز نہیں کرتے کہ محبت کا صحیح حق ادا کرنے کے سلیقے کا راستہ ڈھونڈنے میں پوری سعی استعمال نہیں کرپایا لیکن آپ کو تو معلوم ہے، آپ پر سب عیاں ہے کہ میں تو اپنا حالِ دل ماسوائے اپنے ربِّ کریم کے علاوہ کسی اور کے سامنے افشاء کرنے کو نہائت بے ادبی سمجھتا ہوں۔ اب آپ ہی ان قلوب کا رخ تبدیل کر دیں جن کو مجھ سے ایسی شکائت ہے اور مجھے بھی ایسی توفیق حاصل ہو جائے کہ میں آپ کے لائے ہوئے پیغام میں اس طرح ڈھل جاؤں کہ میرا سارا وجود عجز و انکساری کا ایسا غلام بن جائے کہ میرا ہر عمل آپ کی خوشنودی کا حامل بن جائے تا کہ روزِ محشر میری شناخت آپ کے غلاموں میں ہو۔ میرے تو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ مجھ گناہ گار کو ایسی حاضری کا موقع میسر ہو گا کہ جہاں سانس بھی اونچا لینا محال ہو!

اے یٰسیں! آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے احوال و فضائل، آپ ﷺ کی مبارک ہستی کا سراپا، قدوقامت اور مبارک شکل وصورت جس کے فیضانِ نظر سے تہذیب و تمدن سے ناآشنا خطہ ایک مختصر سے عرصے میں رشکِ ماہ وانجم بن گیا، آپ ﷺ کی تعلیمات اور سیرت و کردار کی روشنی نے جاہلیت اور توہم پرستی کے تمام تیرہ و تار پردے چاک کر دیئے اور آپ ﷺ کے حیات آفریں پیغام نے چہار دانگ عالم کی کایا پلٹ دی۔ حقیقت یہ ہے کہ ذاتِ خداوندی نے اس عبدِ کامل اور فخرِ نوعِ انسانی کی ذاتِ اقدس کو جملہ اوصافِ سیرت سے مالامال کر دینے سے پہلے آپ ﷺ کی شخصیت کو ظاہری حسن کا وہ لازوال جوہر عطا کر دیا تھا کہ آپ ﷺ کا حسنِ صورت بھی حسنِ سیرت ہی کا ایک باب بن گیا تھا۔ آپ ﷺ کے حسنِ سراپا کا ایک لفظی مرقع اصحاب کرام اور تابعینِ عظام کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کو وہ حسن و جمال عطا کیا تھا کہ جو شخص بھی آپ ﷺ کو پہلی مرتبہ دور سے دیکھتا تو مبہوت ہو جاتا اور قریب سے دیکھتا تو مسحور ہو جاتا۔ لاریب! آپ کو میرے رب نے ایسے سانچے میں ڈھالا کہ حسن بھی آپ پر نازاں تھا!

اے نبی مشہود! آپ ﷺ اللہ تعالی کے سب سے محبوب اور مقرب نبی ہیں، اِس لئے باری تعالی نے انبیائے سابقین کے جملہ شمائل و خصائص اور محامد و محاسن آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس میں اِس طرح جمع فرما دیئے کہ آپ ﷺ افضلیت و اکملیت کا معیارِ آخر قرار پائے۔ اِس لحاظ سے حسن و جمال کا معیارِ آخر بھی آپ ﷺ ہی کی ذات ہے۔ آپ ﷺ کی اِس شانِ جامعیت و کاملیت کے بارے میں اِرشادِ باری تعالی ہے: أُوْلَـٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ (یہی) وہ لوگ (پیغمبرانِ خدا) ہیں جنہیں اللہ تعالی نے ہدایت فرمائی ہے، پس (اے رسولِ آخر الزماں)! آپ ان کے (فضیلت والے سب) طریقوں (کو اپنی سیرت میں جمع کر کے ان) کی پیروی کریں (تا کہ آپ کی ذات میں ان تمام انبیاء و رسل کے فضائل و کمالات یکجا ہو جائیں) (الانعام: 6:90)

اے حریص علیکم! حضرت حسان بن ثابت جنہیں آپ ﷺ بڑی محبت کے ساتھ اشعار سنانے کا حکم دیتے تھے، وہ آپ ﷺ کے کمالِ حسن کو بڑے ہی دلپذیر انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

وَاَحْسَنَ مِنْکَ لَمْ تَرَقَط عَيْنِيْ وَاَجْمَلَ مِنْکَ لَمْ تلْدِ اَلْنِساءُ
خُلِقَتْ مُبَرّاًمِنْ کُلِّ عَيْبِ کَأَنَکَ قَدْ خَلِقْتَ کَمَاْ تَشَاءُ

آپ ﷺ سے حسین تر میری آنکھ نے کبھی دیکھا ہی نہیں اور نہ کبھی کسی ماں نے آپ ﷺ جیسے جمیل تر کو جنم ہی دیا ہے۔ آپ ﷺ کی تخلیق بے عیب (ہر نقص سے پاک) ہے، (یوں دِکھائی دیتا ہے) جیسے آپ ﷺ کے رب نے آپ کی خواہش کے مطابق آپ ﷺ کی صورت بنائی ہے)۔ حسان بن ثابت، دیوان: 21 ملا علی قاری ایک دوسرے مقام پر قصیدہ بردہ شریف کی شرح میں لکھتے ہیں: نہ ذاذکر علی میت حقیقی صار حیا

حاضرا،وذاذکر علی کافرو غافل جعل ممناوہول ذاکر الکن اللہ تعالی سترجمال ہذاالدر المکنون وکمال ہذا الجوہر المصون لحکم بالغ ونکت سابق ولعلہالیکون الایمان غیبیاو المورتکلیفیالالشہودعینیا والعیان بدیہیا ولئلایصیر مزلق لقدام العوام ومزل لتضر الجمال بمعرف الملک العلام۔۔۔

اگر خدائے رحیم وکریم حضور ﷺ کے اسمِ مبارک کی حقیقی برکات کو آج بھی ظاہر کر دے تو اس کی برکت سے مردہ زندہ ہو جائے، کافر کے کفر کی تاریکیاں دور ہو جائیں اور غافل دل ذکرِ الٰہی میں مصروف ہو جائے لیکن ربِ کائنات نے اپنی حکمتِ کاملہ سے حضور ﷺ کے اِس انمول جوہر کے جمال پر پردہ ڈال دیا ہے، شاید ربِ کائنات کی یہ حکمت ہے کہ معاملات کے برعکس اِیمان بالغیب پردہ کی صورت میں ہی ممکن ہے اور مشاہد حقیقت اس کے منافی ہے۔ حضور ﷺ کے حسن وجمال کو مکمل طور پر اِس لئے بھی ظاہر نہیں کیا گیا کہ کہیں ناسمجھ لوگ غلو کا شکار ہو کر معرفتِ اِلٰہی سے ہی غافل نہ ہو جائیں۔

اے خاتم النبیّن! میں نے بھی ایک بہانہ تلاش کیا ہے، ایک حیلہ ڈھونڈا ہے کہ آپ کی بارگاہِ اقدس میں آج قلمی حاضری ہو جائے۔ آپ میرے حالات سے واقف ہیں کہ آج آپ کے در پر حاضری کیلئے دن رات دعاؤں کا سہارا لیکر اپنی عاجزی اور بے بسی کا اس امید پر اظہار کر رہا ہوں کہ دلِ بے تاب سے نکلیں ہوئی فریادیں اب ایسے انقلاب کی اجازت کی طلب گار ہیں جہاں زندگی کے ہر شعبے میں آپ ﷺ کی سیرت مبارکہ کی جھلک نمایاں ہو۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ برہا کے یہ شب وروز کہیں جان ہی نہ نکال دیں، سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے اور دل کی دھڑکن بھی بے ترتیب ہو جاتی ہے۔ تحریری طور پر اپنی گزارشات آپ کی خدمت اقدس میں پیش کرنے کی جسارت کروں، یہ کب سوچا تھا؟ لیکن آپ ﷺ کی آل کی ایک بیٹی نے حکم دیا (جس نے میری زندگی کا رخ تبدیل کر دیا ہے) تو میں نے ڈرتے ہوئے اسے دربار میں حاضری سمجھتے ہوئے سر خم کر دیا۔

مجھے یہ بھی یقین ہے کہ نامکمل اور ٹوٹے پھوٹے ہوئے الفاظ میری دلی فریاد کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں لیکن آپ تو ایسے آقا ہیں کہ آپ کے دستِ مبارک میں پتھروں کو زباں مل جاتی ہے، چرند پرند، اشجار ہی نہیں بلکہ ارض وسما کی ساری مخلوق آپ کی نسبت پر صد افتخار کا دعویٰ کرتی ہے تو میرا قلم بھی آپ ﷺ کی صفات کے بحرِ قلزم سے ایک قطرے کی خیرات سے سیراب ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔ آپ ﷺ کو تو اللہ نے قاسم کی صفت سے متصوف فرمایا ہے اور میرے لئے تو یہی انعام میری زندگی کا سب سے بڑا حاصل ہے کہ ربِّ کریم نے مجھے آپ کا اُمّتی بنایا۔

اے مزمل! آپ کو خالق ارض وسمارب العلٰی نے رسولِ کائنات، فخر موجودات اور نسلِ انسانی کیلئے نمونہ کاملہ اور اسوہ حسنہ بنایا ہے اور آپ ﷺ کے طریقہ کو فطری طریقہ قرار دیا گیا ہے۔ آپ ﷺ کے معمولات زندگی ہی قیامت تک کیلئے شعار ومعیار مقرر کر دیئے گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی سیرت کا ہر گوشہ تابناک اور ہر پہلو روشن ہے۔ یومِ ولادت سے لے کر روزِ رحلت تک کے ہر ہر لمحہ کو باری تعالیٰ نے لوگوں سے محفوظ کرا دیا ہے، آپ ﷺ کی ہر ادا کو آپ ﷺ کے متوالوں نے محفوظ رکھا ہے اور سند کے ساتھ تحقیقی طور پر ہم تک پہنچایا ہے، لہٰذا آپ ﷺ کی سیرت انداز مبارکہ جامعیت واکملیت ہر قسم کے شک وشبہ سے محفوظ ہے۔ دنیائے انسانیت کسی بھی عظیم المرتب ہستی کے حالات زندگی، معمولات زندگی، واطوار، مزاج ورجحان، حرکات وسکنات، نشست وبرخاست اور عادات وخیالات اتنے کامل ومدلل طریقہ پر نہیں ہیں جس طرح کہ ایک ایک جزئیہ سیرت آپ ﷺ کا تحریری شکل میں دنیا کے سامنے ہے یہاں تک کہ آج بھی آپ ﷺ سے متعلق زندگی کے ہر لمحے سے متعلق اشیا کی تفاصیل بھی سند کے ساتھ سیرت وتاریخ میں ہر خاص وعام کو مل جاتی ہیں۔

اے متین ومصدّق!اس لیے کہ اس دنیائے فانی میں ایک پسندیدہ کامل زندگی گذارنے کیلئے اللہ رب العزت نے اسلام کو نظامِ حیات اور آپ ﷺ کو نمونہ حیات بنایا ہے وہی طریقہ اسلامی طریقہ ہو گا جو آپ ﷺ سے قولاً، فعلاً منقول ہے، آپ ﷺ کا طریقہ سنت کہلاتا ہے اور آپ ﷺ نے فرمایا ہے "من رغب عن سنتی فلیس منی "جس نے میرے طریقے سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں ہے۔

اے محسن انسانیت ﷺ!عبادات واطاعات سے متعلق آپ ﷺ کی سیرت طیبہ اور عادات شریفہ پر برابر لکھا اور بیان کیا جاتا رہتا ہے۔ دنیا میں ہر لمحہ ہر آن آپ ﷺ کا ذکرِ خیر کہیں نہ کہیں ضرور ہوتا رہتا ہے۔ آپ کی سیرت سنائی اور بتائی جاتی رہے گی پھر بھی آپ ﷺ کا عنوان پرانا نہیں ہو گا، یہی معجزہ ہے آپ ﷺ کی مبارک سیرت کا اور یہی تفسیر ہے ورفعنالک ذکرک کی۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی دنیاوآخرت میں کامیابی و سرفرازی کا عنوان اتباع سنت ہے، یہی اتباع ہر دور ہر زمانہ میں سربلندی اور خوش نصیبی کی کنجی ہے۔ اگر کسی کو عہدِ رسالت نہ مل سکا تو پھر ان کیلئے عہدِ صحابہ ہی معیارِ عمل ہے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی پاکیزہ جماعت آپ ﷺ ہی کی تربیت کا عملی پیکر ہے اسی لئے ہر طرح سے پرکھنے جانچنے کے بعد ان کو نسلِ انسانی کے ہر طبقہ کے واسطے ایمان و عمل کا معیار بنایا گیا ہے کیونکہ خود آپ ﷺ نے ان کی تربیت فرمائی ہے اور اللہ رب العالمین نے ان کے عمل و کردار، اخلاق واطوار، ایمان واسلام اور توحید وعقیدہ، صلاح وتقویٰ کو بار بار پرکھا پھر اپنی رضاوپسندیدگی سے ان کو سرفراز فرمایا، پھر کہیں فرمایا"اولئک الذین امتحن اللہ قلوبہم للتقوی" کہ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں کے تقوی کو اللہ نے جانچا ہے، کہیں فرمایا"آمنو اکماآمن الناس" کہ اے لوگو ایسے ایمان لاؤ جیسا کہ محمد ﷺ کے صحابہ ایمان لائے ہیں تو کہیں فرمایا" اولئک ہم الراشدون "یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔ یہ سب اس لیے کہ یہ سب آپ ﷺ کے تربیت یافتہ اور آپ ﷺ کی سیرت کا عکس جمیل تھے۔ ان کی عبادات میں ہی نہیں بلکہ چال ڈھال میں بھی آپ کی سیرت کا نور جھلکتا تھا، یہی سبب ہے کہ خود آپ ﷺ نے فرمایا "اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اہتدیتم(ترمذی)میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں جن سے بھی اقتدا ومحبت کا تعلق جمالوگے ہدایت پاجاؤ گے۔ چونکہ صحرا، جنگل میں سفر کرنے کیلئے سمت معلوم کرنے کیلئے ستاروں کی رہنمائی حاصل کی جاتی ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو ستاروں سے تشبیہ دی کہ وہ نفوس قدسیہ شرک وکفر کے صحرا میں مینارہ ایمان ہیں۔

چند مستند کتابوں میں آپ ﷺ کے چند خاص گوشوں کو موضوع بنایا گیا ہے جو آپ کے تربیت یافتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بیان کردہ ہیں مختصر طور پر ہر اس پہلو کو ذکر کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

بعض روایات کے مطابق 12 ربیع الاوّل عام الفیل کو آپ ﷺ نے شکمِ مادر سے تولد فرمایا۔ شمائلِ ترمذی حلیہ مبارکہ بیان کرنے کا سب سے مستند وجامع ذریعہ ہے جس کو امام ترمذی رحم اللہ علیہ نے ذکر فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کا میانہ قد، سرخی مائل، سفید گورا رنگ، سرِ اقدس پر سیاہ ہلکے گھنگھریالے ریشم کی طرح ملائم انتہائی خوبصورت بال جو کبھی شانہ مبارک تک دراز ہوتے تو کبھی گردن تک اور کبھی کانوں کی لو تک رہتے تھے۔ رخِ انور اتنا حسین کہ ماہِ کامل کے مانند چمکتا تھا، سینہ مبارک چوڑا، چکلا کشادہ، جسم اطہر نہ دبلا نہ موٹا، انتہائی سڈول چکنا

کہیں داغ دھبہ نہیں، دونوں شانوں کے بیچ پشت پر مہرِ نبوت کبوتر کے انڈے کے برابر سرخی مائل ابھری کہ دیکھنے میں بے حد بھلی لگتی تھی، پیشانی کشادہ بلند اور چمکدار، ابروئے مبارک کمان دار غیر پیوستہ، دہن شریف کشادہ، ہونٹ یاقوتی مسکراتے تو دندانِ مبارک موتی کے مانند چمکتے، دانتوں کے درمیان ہلکی ہلکی درازیں تھیں تکلم فرماتے تو پند و نصائح کے خزانے کو سمیٹنے میں دامن تنگ نظر آتا، سینہ پر بالوں کی ہلکی لکیر ناف تک تھی باقی پیکر بالوں سے پاک تھا صحابہ کا اتفاق ہے کہ آپ ﷺ جیسا خوبصورت نہیں دیکھا گیا۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالی کو تو آپ ﷺ ہی نے شاعرِ رسول ﷺ کا لقب عطا فرمایا ہے۔ وہ اپنے نعتیہ قصیدے میں نقشہ کھینچتے ہیں:

وحسن منک لم ترقط عینی وجمل منک لم تلدالنسا
خلقت مبرمن کل عیب کنک قدخلقت کماتشا

آپ ﷺ سے حسین مرد میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا اور آپ سے زیادہ خوبصورت مرد کسی عورت نے نہیں جنا، آپ ﷺ ہر قسم کے ظاہری و باطنی عیوب سے پاک پیدا ہوئے گویا آپ اپنی حسب مرضی پیدا ہوئے ہیں، نہ کبھی آپ چیخ کر بات کرتے تھے نہ قہقہہ لگاتے تھے، نہ شور کرتے تھے نہ چلا کر بولتے تھے، ہر لفظ واضح بولتے جب مجمع سے مخاطب ہوتے تو تین بار جملہ کو بالکل صاف صاف دہراتے تھے۔ اندازِ کلام باوقار، الفاظ میں حلاوت کہ بس سنتے رہنے کو دل مشتاق، لبوں پر ہمہ دم ہلکا سا تبسم جس سے لب مبارک اور رخِ انور کا حسن بڑھ جاتا تھا، راہ چلتے تو رفتار ایسی ہوتی تھی گویا کسی بلند جگہ سے اتر رہے ہوں، نہ دائیں بائیں مڑ مڑ کر دیکھتے تھے نہ گردن کو آسمان کی طرف اٹھا کر چلتے تھے، تواضع کی باوقار مردانہ خوددارانہ رفتار ہوتی، قدمِ مبارک کو پوری طرح رکھ کر چلتے تھے کہ نعلین شریفین کی آواز نہیں آتی تھی، ہاتھ اور قدم ریشم کی طرح ملائم گداز تھے، ذاتی معاملہ میں کبھی غصہ نہیں ہوتے تھے، اپنا کام خود کرنے میں تکلف نہ فرماتے تھے کہ کوئی مصافحہ کرتا تو اس کا ہاتھ نہیں چھوڑتے تھے جب تک وہ خود الگ نہ کر لے، آپ ﷺ جس سے گفتگو فرماتے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوتے، کوئی آپ ﷺ سے بات کرتا تو پوری توجہ سے سماعت فرماتے تھے، پھر بھی ایسا رعب تھا کہ صحابہ کو گفتگو کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ہر فرد یہی تصور کرتا تھا کہ مجھ کو ہی سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔

دعوت و تبلیغ کا آغاز: تاجِ رسالت اور خلعت نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد آپ ﷺ نے ایک ایسے سماج و معاشرہ کو ایمان و توحید کی دعوت دی جو گلے گلے تک شرک و کفر کی دلدل میں گرفتار تھا، ضلالت و جہالت کی شکار تھی انسانیت، شرافت مفقود تھی، درندگی اور حیوانیت کا راج تھا، ہر طاقتور فرعون بنا ہوا تھا۔ قتل و غارت گری کی وبا ہر سو عام تھی نہ عزت محفوظ، نہ عصمت محفوظ، نہ عورتوں کا کوئی مقام، نہ غریبوں کیلئے کوئی پناہ، شراب پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔ بے حیائی اپنے عروج پر تھی، روئے زمین پر وحدانیت حق کا کوئی تصور نہ تھا، خود غرضی، مطلب پرستی کا دور دورہ تھا، چوری، بدکاری اپنے عروج پر تھی اور ظلم و ستم ناانصافی اپنے شباب پر تھی، خدائے واحد کی پرستش کی جگہ معبودانِ باطل کے سامنے پیشانیاں جھکتی تھیں، نفرت و عداوت کی زہریلی فضا انسان کو انسان سے دور کر چکی تھی، انسانیت آخری سانس لے رہی تھی، معاشرہ سے شرک کا تعفن اٹھ رہا تھا۔ کفر کی نجاست سے قلوب بدبودار ہو چکے تھے۔ اس دور کا انسان قرآن کریم کے مطابق جہنم کے کنارے کھڑا تھا، ہلاکت سے دوچار ہونے کے قریب کہ رحمت حق کو رحم آیا اور کوہِ صفا سے صدیوں بعد انسانیت کی بقا کا اعلان ہوا کہ: یٓاایھاالناس قولو الاالہ الااللہ تفلحوا، اے لوگو! لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ایمان لاؤ، فلاح و صلاح سے ہمکنار ہو گے۔ یہ آواز نہیں تھی بلکہ ایوان باطل میں بجلی کا کڑکا تھا۔

وہ بجلی کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

آپ ﷺ کی یہی آوازِ حق ایک عظیم الشان انقلاب کی ابتدا تھی جس نے دنیائے انسانیت کی تاریخ بدل دی یہ اعلان توحید کی حیات نو کا پیغام تھا جس نے
آپ ﷺ کی یہی آوازِ حق ایک عظیم الشان انقلاب کی ابتدا تھی جس نے دنیائے انسانیت کی تاریخ بدل دی یہ اعلان توحید کی حیات نو کا پیغام تھا جس نے
مردہ دل عربوں میں زندگی کی نئی روح پھونک دی اور پھر دنیا نے وہ منظر دیکھا جس کا تصور بھی نہ تھا کہ قاتل عادل بن گئے، بت پرست بن شکن بن گئے ، ظلم وغضب کرنے والے حق پرست اور رحم دل بن گئے، سیکڑوں معبودانِ باطل کے سامنے جھکنے والی پیشانیاں خدائے واحد کے سامنے سرنگوں ہو گئیں ، عورتوں کو جانور سے بدتر جاننے والے قطع رحمی اور کمزوروں پر ستم ڈھانے والے عورتوں کے محافظ ،صلہ رحمی کے خوگر اور کمزوروں کا سہارا بن گئے، نفرت وعدوات کا آتش فشاں سرد ہو گیا، محبت واخوت کی فصلِ بہاراں آگئی، راہزن راہبر اور ظالم عدل وانصاف کے پیامبر بن گئے۔

جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

اے امر مصباح! پھر دنیا نے دیکھا کہ ایک امی لقب اعلی نسب رسول کے فداکاروں نے ایمان وتوحید کی تاریخ مرتب کر ڈالی، عدل وانصاف کے لازوال نقوش چھوڑے، وحدت مساوات کی لافانی داستان رقم کر دی، فتوحات کی انوکھی تاریخ لکھ دی، جہان بانی وحکمرانی کے مثالی اصول مرتب کیے، عفت و پاکدامنی کا ریکارڈ چھوڑ گئے، وفاداری، فداکاری کے انمٹ نقوش تحریر کر دیئے، عظمت ورفعت کے ان بلندیوں پر پہنچے جہاں سے اونچا مقام صرف انبیا ومرسلین کو نصیب ہو سکتا ہے، ایسا انقلاب دنیا نے کب دیکھا تھا اور کہاں سنا تھا۔

صبر واستقامت: آپ ﷺ نے دعوت حق اواعلانِ توحید کی راہ میں اپنے ہی لوگوں کے ایسے ایسے مصائب وآلام دیکھے کہ کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار جاتا مگر آپ ﷺ صبر واستقامت کے کوہِ گراں تھے، دشمنانِ اسلام نے قدم قدم پر آپ کو ستایا، جھٹلایا، بہتان لگایا، مجنون ودیوانہ کہا، ساحر وکاہن کا لقب دیا، راستوں میں کانٹے بچھائے، جسم اطہر پر غلاظت ڈالی، لالچ دیا، دھمکیاں دیں، اقتصادی ناکہ بندی اور سماجی مقاطعہ کیا، آپ کے شیدائیوں پر ظلم وستم اور جبر واستبداد کے پہاڑ توڑے، نئے نئے دنیا کے لرزہ خیز عذاب کا جہنم کھول دیا کہ کسی طرح حق کا قافلہ رک جائے، حق کی آواز دب جائے مگر دورِ انقلاب شروع ہو گیا تھا، توحید کا نعرہ بلند ہو چکا تھا، اس کو غالب آنا تھا۔

یریدون لیطفوا نور اللہ بافواہہم واللہ متم نورہ ولوکرہ الکافرون(القرآن) کفار چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور(ایمان واسلام) کو اپنی پھونکوں سے بجھادیں اور اللہ پورا کرنے والا ہے اپنے نور کو اگرچہ کفار اس کا ناپسند کریں۔ خود آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ابتلاء وآزمائش میں جتنا مجھ کو ڈالا گیا کسی اور کو نہیں ڈالا گیا۔ اسی طرح آپ کے صحابہ پر جتنے مظالم ڈھائے گئے کسی اور امت میں نہیں ڈھائے گئے۔

ہجرتِ مبارکہ: جب مکہ کی سرزمین آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام پر بالکل تنگ کر دی گئی تب بحکم الٰہی آپ ﷺ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور صحابہ کرام نے اللہ کیلئے اپنے گھر بار، آل واولاد، زمین وجائداد سب کو چھوڑ چھاڑ کر حبشہ ومدینہ کا رخ کیا۔ آپ ﷺ کے حکم پر پہلی ہجرت صحابہ کے ایک گروہ نے حبشہ کی طرف کی تھی، پھر جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لے گئے تو مدینہ اسلام کا مرکز بن گیا، ہجرت رسول کے بارے میں مفکر اسلام علی میاں ندوی کا یہ جامع اقتباس بہت ہی معنویت رکھتا ہے کہ ہجرت کس جذبہ کا نام ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کتنی زبردست قربانی دی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کی اس ہجرت سے سب سے پہلی بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ دعوت اور عقیدہ کی خاطر ہر عزیز اور ہر مانوس و مرغوب شئے اور ہر اس چیز کو جس سے محبت کرنے، جس کو ترجیح دینے اور جس سے بہر صورت وابستہ رہنے کا جذبہ انسان کی فطرت سلیم میں داخل ہے، بے دریغ قربان کیا جاسکتا ہے لیکن ان دونوں اوّل الذکر چیزوں (دعوت وعقیدہ) کو ان میں سے کسی چیز کیلئے ترک نہیں کیا جاسکتا (نبی رحمت) اور ہجرت رسول ﷺ کا یہی پیغام آج بھی مسلمانوں کے سامنے ہے کہ ایمان وعقیدہ اور دعوت و تبلیغ کسی بھی صورت میں ترک کرنا گوارہ نہ کریں یہی دونوں تمام دنیوی واخروی عزت وکامیابی کا سرچشمہ ہے"۔

بروز ہفتہ 24 رجب المرجب 1445ھ 3 فروری 2024ء

آقا ﷺ کا آخری پیغام

ہر عقل وشعور اور سمجھ بوجھ رکھنے والا یہ بات جانتا ہے کہ کسی بھی مکان یا جگہ کو فضیلت، مقام، مرتبہ اور عظمت وبلندی اس کے مکین کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے یہ مثال مشہور ہے کہ "شَرَفُ الْمَكَانِ بِالْمَكِيْنِ" یعنی مکان کی بزرگی اس میں رہنے والے کی وجہ سے ہوتی ہے، پھر جب قرآن نے مکین کی عظمت پر یہ مہر ثبت کر دی: وَمَآاَرْسَلْنَامِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّالِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُو اللهَ وَاسْتَغْفَرَلَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُ واللهَ تَوَّابًارَّحِيْمًا(النساء:64) اگر انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے تو تمہارے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے، اور رسول بھی ان کے لیے معافی کی درخواست کرتا، تو یقیناً اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔

میرے آقا ﷺ کو معراج سے پہلے تمام انبیاء کی امامت کا شرف بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ جس مکان کے مکین ہیں تو وہ مکان ان کے قدموں کی برکت پا کر یقیناً افضل واعلیٰ ہو گیا اور وہ مقام ہے ہمارے پیارے نبی ﷺ کا مبارک روضہ، کہ جس پر گنبدِ خضریٰ اپنی بہاریں لُٹا رہا ہے۔ یقیناً گنبدِ خضریٰ کے مکین ﷺ کے وجودِ مسعود نے اس مقام کو بھی افضل واعلیٰ بنا دیا، اسی لئے اس کی زیارت کرنا، وہاں جانا افضل عبادات میں سے ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے غلام حضرت نافع رحمۃُ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو 100 مرتبہ سے بھی زیادہ بار دیکھا کہ آپ روضۂ رسول پر سلام عرض کرنے کیلئے حاضری دیا کرتے۔ حضرت محمد بن مُنکدرؒ فرماتے ہیں: رَاَيْتُ جَابِرٍ اَوَ هُوَيَبْكِي عَنْدَقَبْرِرَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيه وسَلَّم یعنی ایک بار میں نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ رسولُ اللہ ﷺ کی قبرِ انور کے قریب روتے ہوئے عرض کر رہے تھے: هٰهُنَاتَسْكُبُ الْعَبَرَات ، یہی وہ مبارک جگہ ہے جہاں آنسو بہائے جاتے ہیں، میں نے رسولُ اللہ ﷺ سے سنا ہے: مَابَيْنَ قَبْرِي وَمِنْبَرِي رَوْضَةٌ مِّن رِيَاضِ الْجَنَّة یعنی میری **قبر اور میرے** منبر کے درمیان کا حصہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔

مؤذنِ رسول حضرت بلال رضی اللہ عنہ جن دنوں ملکِ شام میں رہا کرتے تھے، آپ کو ایک دن خواب میں رسولُ اللہ ﷺ کی زیارت ہوئی تو رسولُ اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَابٰذِهِ الْجَفْوَةُ يَابِلَال، اے بلال! یہ بے رُخی کیسی؟ تم ہم سے ملاقات کرنے نہیں آتے؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بیدار ہو گئے۔ آپ نے فوراً رختِ سفر باندھا اور اللہ پاک کے حبیب ﷺ کی بارگاہ میں حاضری کے لئے روانہ ہو گئے۔ وفاءُ الوفاء میں ہے: حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے مزارِ پُر انوار پر حاضر ہو کر رونا شروع کیا اور اپنا منہ آقا ﷺ کی قبر پر ملتے تھے۔

روضہ مبارکہ میں نبی کریم، حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر بن خطاب کی قبریں موجود ہیں۔ روضہ مبارکہ جسے حجرہ نبویہ شریفہ کہا جاتا ہے، اس میں نبی کریم ﷺ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ کے ہمراہ رہا کرتے تھے۔ اس کا دروازہ مسجد نبوی کے اس حصے کی طرف کھلا کرتا تھا جسے جنت کی کیاری ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ نبی کریم کا انتقال اسی حجرہ مبارکہ میں ہوا۔ صحابہ کرام رضون اللہ اجمعین نے مشورہ کیا کہ پیغمبر اسلام کو کہاں دفن کیا جائے، اس پر ابو بکر صدیق نے رسول اللہ کی ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ نبی کا مدفن وہی مقام ہوتا ہے جہاں اس کی روح قبض کی جاتی ہے۔ رسالت کی تعمیل میں رسول اللہ ﷺ کی تدفین اسی حجرہ مبارکہ میں ہوئی جہاں ان کی وفات ہوئی تھی۔ یہ حجرہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تھا۔

وہ حجرہ مبارکہ کے شمالی حصے میں قیام پذیر رہیں۔ پھر جب ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہوا تو عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اجازت سے ان کی تدفین بھی حجرہ مبارکہ میں رسول اللہ کے پہلو ہی میں کی گئی۔ رسول کی قبر اور ان کی رہائش کے درمیان کوئی دیوار یا رکاوٹ نہیں تھی۔ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ حجرہ مبارکہ میں ایک طرف تو ان کے شوہر اور دوسری جانب ان کے والد تھے لہٰذا حجاب کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی لیکن جب عمر فاروق کا انتقال ہوا اور انہیں حضرت ابو بکر صدیق کے پہلو میں دفنایا گیا تو انہوں نے اپنی رہائش والے حصے اور قبروں کے درمیان پردے کا انتظام کر لیا کیونکہ عمر فاروق محرم نہیں تھے۔

آج اللہ کی عطا کردہ توفیق سے ایک مجرم کی حیثیت سے اپنے آقا ﷺ کے حضور سلام کیلئے حاضری کا جب موقع ملا تو نجانے کیوں پسینہ سے شرابور گھبراہٹ اور خوف سے جہاں سارا جسم کانپ رہا تھا وہاں اپنے آقا ﷺ کے احسانات، رحمت العالمین کی اپنی امت سے محبت کے مناظر نے میرا احاطہ کیا ہوا تھا کہ اچانک مجھے اپنے آقا کی زندگی کے آخری لمحات یاد آ گئے کہ آپ ﷺ اس وقت بھی اپنی امت کی بخشش کیلئے اپنے رب سے مناجات فرما رہے تھے۔

وفات سے 3 روز قبل حضور اکرم ﷺ ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر تشریف فرما تھے، آپ ﷺ نے تمام ازواجِ مطہرات کو بلا کر دریافت فرمایا "کیا تم سب مجھے اجازت دیتی ہو کہ بیماری کے یہ ایام میں عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے ہاں گزار لوں؟" سب نے بیک زبان کہا "اے اللہ کے رسول آپ کو اجازت ہے"۔ پھر اٹھنا چاہا لیکن اٹھ نہ پائے تو حضرت علی اور حضرت فضل بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما آگے بڑھے اور نبی ﷺ کو سہارے سے اٹھا کر سیدہ میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرے سے سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرے کی طرف لے جانے لگے۔ اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور اکرم ﷺ کو اس (بیماری اور کمزوری کے) حال میں پہلی بار دیکھا تو گھبرا کر ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ رسول اللہ ﷺ کو کیا ہوا؟ صحابہ کرام کی کثیر تعداد فوری طور پر مسجد میں جمع ہو گئی۔ آقا ﷺ کا پسینہ شدت سے بہہ رہا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ "میں نے اپنی زندگی میں کسی کا اتنا پسینہ بہتے نہیں دیکھا۔ میں رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک کو پکڑتی اور اسی کو چہرہ اقدس پر پھیرتی کیونکہ نبی ﷺ کا ہاتھ میرے ہاتھ سے کہیں زیادہ محترم اور پاکیزہ تھا۔ حبیب خدا ﷺ سے بس یہی وردِ سنائی دے رہا تھا کہ "لا إله إلا الله، بیشک موت کی بھی اپنی سختیاں ہیں"۔

اسی اثناء میں مسجد کے اندر آنحضرت ﷺ کے بارے میں خوف کی وجہ سے لوگوں کا شور بڑھنے لگا۔ نبی ﷺ نے دریافت فرمایا "یہ کیسی آوازیں ہیں" عرض کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! تمام اصحابہ آپ کی حالت سے خوفزدہ ہیں۔ ارشاد فرمایا: مجھے ان کے پاس لے چلو۔ اٹھنے کا ارادہ فرمایا لیکن اٹھ نہ سکے تو آپ ﷺ پر 7 مشکیزے پانی کے بہائے گئے، تب کہیں جا کر کچھ افاقہ ہوا تو سہارے سے اٹھا کر ممبر پر لایا گیا۔ یہ میرے آقا ﷺ کا آخری خطبہ تھا اور آپ کے آخری کلمات تھے: اے لوگو! شائد تمہیں میری موت کا خوف ہے۔ سب نے سر جھکائے کہا کہ: جی ہاں، اے اللہ کے رسول ﷺ۔

ارشاد فرمایا: اے لوگو! تم سے میری ملاقات کی جگہ دنیا نہیں، تم سے میری ملاقات کی جگہ حوض (کوثر) ہے، اللہ کی قسم گویا کہ میں یہیں سے اسے (حوض کوثر کو) دیکھ رہا ہوں۔ اے لوگو! مجھے تم پر تنگدستی کا خوف نہیں بلکہ مجھے تم پر دنیا (کی فراوانی) کا خوف ہے، کہ تم اس (کے معاملے) میں ایک دوسرے سے مقابلے میں لگ جاؤ جیسا کہ تم سے پہلے (پچھلی امتوں) والے لگ گئے، اور یہ (دنیا) تمہیں بھی ہلاک کر دے جیسا کہ انہیں ہلاک کر دیا۔

اے لوگو: نماز کے معاملے میں اللہ سے ڈرواوراس کو تین مرتبہ دہرایا۔ پھر فرمایا: اے لوگو! عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو (یعنی عہد کرو کہ میں تمہیں عورتوں سے نیک سلوک کی وصیت کرتا ہوں۔ نماز کی پابندی کروگے، اور یہی بات بار بار دہراتے رہے۔

مزید فرمایا: اے لوگو۔۔۔! ایک بندے کو اللہ نے اختیار دیا کہ دنیا کو چن لے یا اسے چن لے جو اللہ کے پاس ہے، تو اس نے اسے پسند کیا جو اللہ کے پاس ہے۔ اس جملے سے حضور ﷺ کا مقصد کوئی نہ سمجھا حالانکہ ان کی اپنی ذات مراد تھی جبکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہ تنہا شخص تھے جو اس جملے کو سمجھے اور زار و قطار رونے لگے اور بلند آواز سے گریہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور نبی اکرم ﷺ کی بات قطع کر کے پکارنے لگے: ہمارے ماں باپ، دادا آپ پر قربان، ہمارے بچے آپ پر قربان، ہمارے مال و دولت آپ پر قربان، روتے ہوئے بار بار یہی دہراتے رہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (ناگواری سے) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھنے لگے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی بات کیسے قطع کر دی؟ اس پر نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا دفاع ان الفاظ میں فرمایا: اے لوگو! ابو بکر کو چھوڑ دو کہ تم میں سے ایسا کوئی نہیں کہ جس نے میرے ساتھ کوئی بھلائی کی ہو اور میں نے اس کا بدلہ نہ دے دیا ہو، سوائے ابو بکر کے کہ اس کا بدلہ میں نہیں دے سکا، اس کا بدلہ میں نے اللہ جل شانہ پر چھوڑ دیا۔ مسجد (نبوی) میں کھلنے والے تمام دروازے بند کر دیے جائیں، سوائے ابو بکر کے دروازے کے کہ جو کبھی بند نہ ہو گا۔ آخر میں اپنی وفات سے قبل مسلمانوں کیلئے آخری دعا کے طور پر ارشاد فرمایا: اللہ تمہیں ٹھکانہ دے، تمہاری حفاظت کرے، تمہاری مدد کرے، تمہاری تائید کرے۔ اور آخری بات جو منبر سے اترنے سے پہلے امت کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائی: اے لوگو! قیامت تک آنے والے میرے ہر ایک امتی کو میرا اسلام پہنچا دینا۔ پھر آنحضرت ﷺ کو دوبارہ سہارے سے اٹھا کر گھر لے جایا گیا۔

اسی اثناء میں حضرت عبد الرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور ان کے ہاتھ میں مسواک تھی، نبی اکرم ﷺ مسواک کو دیکھنے لگے لیکن شدت مرض کی وجہ سے طلب نہ کر پائے چنانچہ سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور اکرم ﷺ کے دیکھنے سے سمجھ گئیں اور انہوں نے حضرت عبد الرحمن رضی اللہ عنہ سے مسواک لے کر نبی کریم ﷺ کے دہن مبارک میں رکھ دی، لیکن حضور ﷺ اسے استعمال نہ کر پائے تو سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور اکرم ﷺ سے مسواک لے کر اپنے منہ سے نرم کی اور پھر حضور نبی کریم ﷺ کو لوٹا دی تاکہ دہن مبارک اس سے تر رہے۔ فرماتی ہیں: آخری چیز جو نبی اکرم ﷺ کے پیٹ میں گئی وہ میرا لعاب تھا، اور یہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا مجھ پر فضل ہی تھا کہ اس نے وصال سے قبل میرا اور نبی کریم علیہ السلام کا لعاب دہن یکجا کر دیا۔

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مزید ارشاد فرماتی ہیں: پھر ﷺ کی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تشریف لائیں اور آتے ہی

رو پڑیں کہ نبی کریم ﷺ اٹھ نہ سکے، کیونکہ نبی کریم ﷺ کا معمول تھا کہ جب بھی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تشریف لاتیں، حضور اکرم ﷺ ان کے ماتھے پر بوسہ دیتے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اے فاطمہ! قریب آجاؤ۔۔۔ پھر حضور ﷺ نے ان کے کان میں کوئی بات کہی تو حضرت فاطمہ اور زیادہ رونے لگیں، انہیں اس طرح روتا دیکھ کر حضور ﷺ نے پھر فرمایا: اے فاطمہ! قریب آؤ۔۔۔ دوبارہ ان کے کان میں کوئی بات ارشاد فرمائی تو وہ خوش ہو گئیں، حضور اکرم ﷺ کے وصال کے بعد میں نے سیدہ فاطمہ

رضی اللہ تعالی عنھا سے پوچھا کہ وہ کیابات تھی جس پر آپ روئیں اور پھر خوشی کا اظہار کیا تھا؟ سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالی عنھا کہنے لگیں کہ پہلی بار (جب میں قریب ہوئی) تو فرمایا: فاطمہ! میں آج رات (اس دنیا سے) کوچ کرنے والا ہوں جس پر میں رودی۔ جب انہوں نے مجھے بے تحاشا روتے دیکھا تو فرمانے لگے، فاطمہ! میرے اہل خانہ میں سب سے پہلے تم مجھے آملو گی، جس پر میں خوش ہو گئی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالی عنھما فرماتی ہیں پھر آنحضرت ﷺ نے سب کو گھر سے باہر جانے کا حکم دیکر مجھے فرمایا: عائشہ! میرے قریب آجاؤ۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی زوجۂ مطہرہ کے سینے پر ٹیک لگائی اور ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے فرمانے لگے: مجھے وہ اعلیٰ وعمدہ رفاقت پسند ہے۔ (میں اللہ کی، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی رفاقت کو اختیار کرتا ہوں) ۔ صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں "میں سمجھ گئی کہ انہوں نے آخرت کو چن لیا ہے"۔

جبرئیل علیہ السلام خدمت اقدس میں حاضر ہو کر گویا ہوئے: یارسول اللہ! ملَکُ الموت دروازے پر کھڑے شرف باریابی چاہتے ہیں۔ آپ سے پہلے انہوں نے کسی سے اجازت نہیں مانگی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جبریل! اسے آنے دو۔۔۔ ملَکُ الموت نبی کریم ﷺ کے گھر میں داخل ہوئے اور کہا: السلام علیک یارسول اللہ! مجھے اللہ نے آپ کی چاہت جاننے کیلئے بھیجا ہے کہ آپ دنیا میں ہی رہنا چاہتے ہیں یا اللہ سبحانہ وتعالی کے پاس جانا پسند کرتے ہیں؟ نبی اکرم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ مجھے اعلیٰ وعمدہ رفاقت پسند ہے اور دوبارہ اپنی اس خواہش کو دہرایا: ملَکُ الموت آنحضرت ﷺ کے سرہانے کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: اے پاکیزہ روح! اے محمد بن عبد اللہ۔۔۔ اللہ کی رضا وخوشنودی کی طرف روانہ ہو، راضی ہو جانے والے پروردگار کی طرف جو غضبناک نہیں!

سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں: پھر نبی کریم ﷺ کا ہاتھ نیچے آن رہا، اور سر مبارک میرے سینے پر بھاری ہونے لگا، میں سمجھ گئی کہ آنحضرت ﷺ کا وصال ہو گیا۔۔۔ مجھے اور تو کچھ سمجھ نہیں آیا، سو میں اپنے حجرے سے نکلی اور مسجد کی طرف کا دروازہ کھول کر اندر سے کہا: "رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا۔۔۔! رسول اللہ کا وصال ہو گیا"۔۔۔۔۔! مسجد آہوں اور نالوں سے گونجنے لگی۔ ادھر علی کرم اللہ وجہہ جہاں کھڑے تھے وہیں بیٹھ گئے پھر ہلنے کی طاقت تک نہ رہی۔ ادھر عثمان بن عفان رضی اللہ تعالی عنہ معصوم بچوں کی طرح ہاتھ ملنے لگے اور سیدنا عمر رضی اللہ تعالی عنہ تلوار بلند کر کے کہنے لگے: خبر دار! جو کسی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے ہیں، میں ایسے شخص کی گردن اڑا دوں گا، میرے آقا تو اللہ تعالی سے ملاقات کرنے گئے ہیں جیسے موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے ملاقات کو گئے تھے، وہ لوٹ آئیں گے، بہت جلد لوٹ آئیں گے! اب جو وفات کی خبر اڑائے گا، میں اسے قتل کر ڈالوں گا۔ اس موقع پر سب زیادہ ضبط، برداشت اور صبر کرنے والی شخصیت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ کی تھی۔۔۔ آپ حجرۂ نبوی میں داخل ہوئے رحمت دوعالَم ﷺ کے سینۂ مبارک پر سر رکھ کر رو دیئے اور ساتھ ہی کہہ رہے تھے:
وآآآخلیلاہ، وآآآصفیاہ، وآآآحبیباہ، وآآآنبیاہ۔۔۔ ہائے میرے پیارے دوست۔۔۔! ہائے میرے مخلص ساتھی۔۔۔! ہائے میرے محبوب۔۔۔! ہائے میرے نبی۔۔۔ پھر آنحضرت ﷺ کے ماتھے پر بوسہ دیا اور کہا: یارسول اللہ! آپ پاکیزہ جئے اور پاکیزہ ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ باہر آئے اور خطبہ دیا: جو شخص محمد ﷺ کی عبادت کرتا ہے سن رکھے کہ آنحضرت ﷺ کا وصال ہو گیا اور جو اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ جان لے کہ اللہ تعالی شانہ کی ذات ہمیشہ زندگی والی ہے جسے موت نہیں۔ یہ سنتے ہی سیدنا عمر رضی اللہ تعالی عنہ کے ہاتھ سے تلوار گر گئی۔۔ عمر رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں: پھر میں کوئی تنہائی کی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں اکیلا بیٹھ کر روؤں۔ آنحضرت ﷺ کی تدفین کر دی گئی۔

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: تم نے کیسے گوارا کر لیا کہ نبی اکرم ﷺ کے چہرہ انور پر مٹی ڈالو؟ پھر فرمانے لگیں: یاأبتاہ، أجاب ربا دعاہ، یا

أبتاه،جنۃالفردوس مأواہ،یا أبتاہ،الی جبریل ننعاہ:ہائے میرے پیارے باباجان!کہ اپنے رب کے بلاوے پر چل دیے،ہائے میرے پیارے باباجان، کہ جنت الفردوس میں اپنے ٹھکانے کو پہنچ گئے،ہائے میرے پیارے باباجان، کہ ہم جبریل کو ان کے آنے کی خبر دیتے،اللھم صل علی محمدکماتحب وترضا۔

امت کیلئے اصل اور بہترین پیغام تو یہ ہے کہ ہم اپنے آقا ﷺ کی زندگی،ان کی تعلیمات اور رحمتوں کو یاد کریں۔اس موقع پر ان کی سنتوں اور معاشرتی اقوال کو اپنی زندگیوں کا اوڑھنا بچھونا بنانے کا عہد کریں کہ ہم ان کے انعامات اور رہنما اصولوں کو اپنا کر اپنی باقی ماندہ زندگی گزاریں گے۔ہم سب اس دن کے حوالے سے یہ عزم کریں کہ ہم سیرت النبی کی روشنی سے اس دنیا کی ظلمتوں کو دور کریں گے۔آقا ﷺ سے محبت کا تقاضہ ہے کہ ہم دنیا بھر میں اپنے کردار سے امن،اخوت اور محبت کا استعارہ بن کر یہ پیغام دیں کہ ہمارے آقا ﷺ نے اپنے آخری سانسوں میں بھی دنیا کی فلاح،عورتوں کی بھلائی اور حفاظت کا حکم دیا ہے،ظلم وجبر کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار کا سبق دیا ہے تاکہ دنیا میں سب کو جینے کا حق مل سکے اور انسانیت بلا جبر وکراہ کے آشتی ومحبت کے ساتھ ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں۔

بطور امتی پیغامبر اسلام ﷺ کے احسانات کو یاد کرنے اور ان کی شان وشوکت کو یاد کرنے کا عظیم طریقہ تو یہ ہے کہ ہم ان کی عالمی اخلاقی اور انسانی حقوق کو اپنے زندگیوں میں منتقل کریں،ہم ان کے پیغام کو دنیا کے ہر کونے تک پہنچانے کا عملی ثبوت دیں تاکہ دنیا سیرت النبی کی روشنی اور رحمت کو چھو سکے۔ اس موقع پر ہمیں اپنی زندگیوں کو دوسروں کی مدد اور خدمت کیلئے وقف کرنے کا عزم کرنا چاہئے۔ہمیں اپنے گھروں،اجتماعات میں امن،اخوت اور محبت کو فروغ دینے کیلئے پہلے خود اپنی زندگی کو تبدیل کرنے کی محنت کرنی ہوگی تاکہ ہم اپنے آقا ﷺ کے پیغامات کو عملی شکل دے کر دوسروں کو بتا سکیں جو پیغامبر اسلام نے ہمیں دیے ہیں۔

ہمارے آقا ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ تو قرآن مجید ہے جس کے من وعن حفاظت کی ذمہ داری خود رب کریم نے روزِ قیامت تک کیلئے اپنے ذمے لے رکھی ہے، إِنَّانَحْنُ نَزَّلْنَاالذِّكْرَوَإِنَّالَهُ لَحَافِظُوْنَ"(الحجر:9) ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔یہ پہلی وہ آسمانی کتاب ہے،جس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے خود لیا،گویا اس کی حفاظت کے لیے یہ وعدہ الٰہی ہے اور قرآن کا اعلان ہے:"إِنّ اللَّهَ لَايُخْلِفُ الْمِيْعَادَ"(آل عمران:9) اللہ کبھی بھی وعدہ خلافی نہیں کرتے۔بس اللہ نے اپنا یہ وعدہ سچ کر دکھایا۔اور کتاب اللہ کی حفاظت کا حیرت انگیز انتظام کیا۔اس طور پر کہ اس کے الفاظ بھی محفوظ،اس کے معانی بھی محفوظ،اس کا رسم الخط بھی محفوظ،اس کی عملی صورت بھی محفوظ،اس کی زبان بھی محفوظ،اس کا ماحول بھی محفوظ،جس عظیم ہستی پر اس کا نزول ہوا اس کی سیرت بھی محفوظ،اور اس کے اولین مخاطبین کی سیَر بھی یعنی زندگیاں بھی محفوظ۔غرضیکہ اللہ رب العزت نے اس کی حفاظت کے لیے جتنے اسباب ووسائل اور طریقے ہوسکتے تھے،سب اختیار کئے،اور یوں یہ مقدس اور پاکیزہ کتاب ہر لحاظ اور ہر جانب سے مکمل محفوظ ہوگئی۔الحمدللہ آج 1459 / سال گذرنے کے بعد بھی اس میں رتی برابر بھی تغیر وتبدل نہ ہوسکا،لاکھ کوششیں کی گئیں،مگر کوئی ایک کوشش بھی کامیاب اور کارگر ثابت نہ ہوسکی،اور نہ قیامت تک ہوسکتی ہے۔

اس کے بعد ہمارے آقا کی زندگی کی سیرت کے تمام لمحات بھی ہمارے پاس محفوظ ہیں۔قرآن میں ہمیں آیت الکرسی جیسی عظیم آیت رب کریم کی طاقت اور کمال کی تعریف سے آشنا کرتی ہے اور ایک پیغام دیتی ہے کہ اللہ کی ذات میں کمال اور قدرت ہے جو کہ عالمی امن کی اہمیت کو بنیاد اور اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے اور اسی پیغام کو میرے آقا نے اپنے امتیوں کیلئے چھوڑا ہے۔ بروز منگل 27رجب المرجب 1445ھ 6فروری 2024ء

اسلام یا مغربی جمہوریت؟

آج کل نہ صرف ہماری نئی نسل اسلام سے عدم واقفیت کی بناء پر مغربی جمہوریت کے نعرے سے مرعوب ہو کر اپنے مسائل کا حل اس میں ڈھونڈ رہی ہے بلکہ ہمارے ملک کے کچھ دانشور قلمکار بھی اس کے پرچار میں مشغول ہیں۔ ضروری ہو گیا ہے کہ اس موضوع پر اپنی بساط کے مطابق کچھ تحریر کیا جائے تا کہ ہماری موجودہ نئی نسل مغرب کے پر فریب نعرے کی حقیقت اور اسلام کی حقانیت سے واقف ہو سکیں۔

اس وقت مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ صدیوں کی غلامی اور محکومی نے ان کی فکری صلاحیتوں کو سلب کر رکھا ہے۔ محکومی کی وجہ سے ہماری جان اور بدن بھی غیروں کے ہاں گروی ہیں۔ ہم اگر دیکھتے ہیں تو حاکم کی نظر سے، سنتے ہیں تو حاکم کے کانوں سے، سوچتے ہیں تو حاکم کے دماغ سے، یہاں تک کہ ہم قومِ غالب کے نظریہ مسلک یا نظام کو عرشِ معلیٰ سے نازل شدہ سمجھتے ہیں اور اس کی تقلید کو اپنے لئے ہزار فخر و مباہات سمجھتے ہیں۔ اقوام غالب اپنی چچوڑی ہوئی ہڈیاں جب ہماری طرف پھینکتی ہیں تو ہم ان کو لپک کر خوان یغما سمجھ کر اٹھا لیتے ہیں۔ تشکیل پاکستان کے بعد جب ہمیں ایک نظام کی ضرورت پڑی تو ہم نے فوراً مغرب کے جمہوری نظام کو صحیفہ آسمانی سمجھ کر تقدس کے ہاتھوں سے اٹھا کر عقیدت کی آنکھوں کے ساتھ بکمال فخر و مباہات اپنے ہاں نافذ کر لیا۔

شروع میں اس نظام کی حیثیت بالکل سیاسی تھی لیکن جب نام نہاد مذہبی پیشوائیت کے سینے میں مذہبی قیادت کے علاوہ سیاسی قیادت سنبھالنے کی کی آرزو نے انگڑائی لی تو انہوں نے سادہ لوح اور تقلید پرست عوام کو سہانے خواب دکھا کر میدان اپنے ہاتھ میں لینے کیلئے اپنی پوری توانائیاں حصولِ اقتدار کی بھٹی میں جھونک دیں، بجائے اس نظام کو مسترد کرنے کے اس مغربی جمہوریت کو اپنی منزل بنا کر مغربی اقوام کو بھی یہ تاثر دیا کہ گویا اسلام میں "نظام حکومت "کیلئے کوئی واضح ہدایات موجود نہیں۔ اس طرح انہوں نے اس نظام کو جو اقوامِ مغرب کے قریب مردہ پا چکا تھا عین اسلامی کہہ کر عوام کو اپنے پیچھے لگا لیا ۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی بیشتر تعداد اب مغربی جمہوریت کو عین اسلامی سمجھنے لگی ہے۔

مغربی جمہوریت کو سمجھنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ان حالات و کوائف کا جائزہ لیا جائے جس کے پیشِ نظر مغربی اقوام نے اس نظام کو وضع اور اختیار کیا تھا ۔جمہوریت سے پیشتر مغربی اقوام ظلم و استبداد کی چکی کے دو پاٹوں میں بری طرح پس رہی تھیں۔ ایک طرف ملوکیت کی قہرمانی اور دوسری طرف اربابِ کلیسا کی تھیوکریسی تھی۔ یعنی مذہبی پیشواؤں کی حکومت کا نظریہ جو سینٹ پال نے وضع کیا تھا جس میں تھیاکریسی نے حکومت کا حق خدا سے پادریوں کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ پادریوں کو خدا کا نمائندہ بنا کر ان کو بے پناہ اختیارات کا مالک بنا دیا۔ بعد ازاں رومن بادشاہوں سے گٹھ جوڑ کر کے حکومت کا اختیار بادشاہوں کو منتقل کر دیا لیکن حقیقتاً حکومت کا کنٹرول پادریوں نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ لوتھر نے عوام کو پادریوں کے فولادی اور ظالمانہ شکنجے سے رہائی دلانے کیلئے اپنی اصلاحی تحریک میں انجیل کو سمجھنے کا حق ہر فرد کیلئے مانگا لیکن اس نعرہ سے بھی مسئلہ حل نہ ہو سکا کیونکہ انجیل میں حکومت اور سیاست کے متعلق کوئی قانون موجود نہیں تھا۔

اس صورتحال سے تنگ آ کر فرانس میں ایک انقلاب برپا ہوا جس میں روسو کے نظریہ حکومت کو بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ روسو کے نظریۂ حکومت نے پادریوں اور بادشاہت سے نظامِ حکومت واپس لیکر عوام کو اقتدار کا سرچشمہ قرار دیا۔ اس طرح نظامِ جمہوریت کا ابتدائی تصور سامنے آ گیا۔ یہ وہی نظریہ تھا جس کا اساسی تصور یونان کے مفکرین اور دانشوروں نے بہت پہلے پیش کیا تھا۔ بہر حال ملوکیت اور پادریوں کے استبداد کی چکی میں پسنے والے عوام نے

اس نظریہ کو نجات دہندہ سمجھ کر اس کا نہائت گرمجوشی سے استقبال کیا اور اسے نوعِ انسانی کیلئے آیہ رحمت سمجھ کر اس کی تقلید شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ عوام کا جوش و خروش اور مسرت انبساط نظامِ جمہوریت کی کامیابی پر مثبت اظہارِ تشکر نہیں تھا بلکہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی قہرمانی سے حصولِ نجات پر ایک منصفانہ رد عمل تھا۔ یہ تھے وہ حالات جس کے پیشِ نظر جمہوریت نے جنم لیا۔

مغربی اقوام نے برسوں اس نظامِ حکومت کا مختلف طریقوں سے تجربہ کیا اور انجام کار ان اقوام کے مفکرین اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جس نظام کو انسانیت نے اپنے لئے آیۂ رحمت سمجھا تھا وہ نوع انسانی کیلئے کوئی ازلی وابدی قانون مبنی بر عدل مہیا نہیں کر سکا کیونکہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین میں ازلیت وابدیت نہیں ہو سکتی۔ اب یہ مفکرین ان عالمگیر قوانین، جن کا سرچشمہ انسانی فکر سے الگ اور سربلند وماوراہو، کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں اور ہم ہیں کہ ان کے مسترد شدہ نظام یا بامر مجبوری اپنائے ہوئے نظام میں اسلامی لاحقہ لگا کر اسے اپنے دکھوں اور مسائل کا مداوا سمجھ کر سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور اسلامی جمہوریت کے نام سے متعارف کروا کے اپنے ملکوں میں نافذ کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔

یہ اصطلاح دراصل ان لوگوں کی طرف سے متعارف ہوئی ہے جو اسلامی جمہوریت کا نعرہ لگا کر اسلام کے پردے میں درحقیقت اپنے جارحانہ مفادات کی حفاظت کا انتظام کرنا چاہتے ہیں۔ اس اصطلاح کا بے معنی پن اور استعمال کرنے والوں کی کم علمی یا عدم اخلاص تو خود اس اصطلاح کے اندر پوشیدہ ہے، چاہے اس پر کتنی ہی فلسفیانہ پالش کی جائے۔ اس اصطلاح کا تناقص ہر شخص کی سماعت پر فوراً عیاں ہو جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آخر وہ کون سا جذبہ ہے جس کے تحت،، اسلام اور جمہوریت،، کے دو متضاد خود کفیل اور جامع مفہوم رکھنے والے دو مختلف الفاظ کو باہم جوڑا جا رہا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ بات ممکن ہو سکتی ہے کہ ایسی متضاد اور متناقض اصطلاح استعمال کرنے والے شخص کا ذہن اسلام کے بارے میں مطمئن نہیں ہے۔ وہ اسے ناکافی، نامکمل، غیر جامع اور ناقص چیز سمجھتا ہے اور اس کے خیال میں جب تک اسلام میں مزید پیوند نہ لگائے جائیں، اس وقت تک وہ اپنا اصل فائدہ نہیں ظاہر کر سکتا۔ دوسری بات یہ ہو سکتی ہے کہ وہ شخص مغربی جمہوریت کے بارے میں مرعوبانہ ذہن رکھتا ہے۔ جو چیزیں وہ اسلام میں کم پاتا ہے، اس کے خیال میں ان چیزوں کی کمی جمہوریت ہی بدرجہ احسن پوری کر سکتی ہے۔ تیسری بات کہ ایسے شخص کا رجحان غالب مغربی جمہوریت کی طرف ہی ہے اور اسے صرف ذرا اسلامی بنا لینے کی ضرورت ہے۔ شائد یہ ضرورت اسے معاشی یا موجودہ حالات کے پیش نظر لاحق ہو۔ چوتھی بات جس کی طرف ذہن جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اس متناقض اصطلاح کو استعمال کرنے والے کو اس تناقض کا شعور ہی نہ ہو اور وہ پوری طرح اسلام سے واقف ہو اور نہ جمہوریت سے، بس زمانے کے چلتے ہوئے فیشن کے مطابق وہ بھی یہ اصطلاح اسی طرح لیکر چل پڑا ہو جس طرح فیشن بدلتے دیکھ کر لوگ بے سوچے سمجھے فیشن بدل لیا کرتے ہیں۔ ایسے نعرے لگانے والوں کے ہاں حقیقتاً ان ساری باتوں کا امکان موجود رہتا ہے۔

اگر ہم دیکھیں تو گزشتہ دو تین صدی تک مسلمان ممالک پر مغربی ممالک اپنی قہرمانی قوت اور شوخ وشنگ تہذیب کے ساتھ حکمران رہے ہیں جس کے بارے میں اقبال نے فرمایا ہے: "چہرہ روشن اندرون چنگیز سے تایک تر"
جب کوئی قوم کسی دوسری قوم پر تلوار کے زور پر فاتحانہ مسلط ہو جاتی ہے تو مفتوح اور مغلوب قوم کے افراد اس کی تلوار ہی سے مفتوح نہیں ہوتے بلکہ اس کے نظریات، اس کے علوم اور اس کے فلسفہ حیات تک سے مفتوح ہو جاتے ہیں اور کم ہی ایسے سخت جان ہوتے ہیں جو غالب قوم کے علوم وفنون اور تہذیب کی کٹھالی میں پگھلنے اور اس کا سانچہ اختیار کرنے سے بچ جاتے ہیں۔ جس طرح سیاسی برتری ختم ہونے کے بعد مدت تک یہ مغلوبانہ ومرعوبانہ تغیر و تبدل شروع ہو جاتا ہے اسی طرح سیاسی برتری ختم ہونے کے بعد مدت تک یہ مرعوبانہ اور مغلوبانہ طرزِ فکر اپنا کام کرتا رہتا ہے اور چونکہ فاتح قوم

کے راج دربار میں مغلوب و مفتوح قوم کے صرف وہی افراد باریاب ہوسکتے ہیں جو اس کے رنگ و بو کو اختیار کر کے اس کے سانچے میں ڈھل جائیں اور اپنی وفاداری اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیں، تب یہ بدیشی آقا اپنے اختیارات ایسے ہی لوگوں میں منتقل کر کے انہیں اپنا حقیقی جانشین بنا کر جاتے ہیں۔

تمام مسلمان ملکوں میں جہاں ایک مدت کے بعد مغربی قوموں کی واپسی کے سبب سیاسی آزادی درآمد ہوئی ہے وہاں فطری طور پر خود بخود ایسے لوگ برسر اقتدار آئے ہیں جو پہلے سے فرنگیت کے بہت قریب تھے اس لئے مشرقِ وسطیٰ سے لیکر مشرقِ بعید تک بیشتر مسلمان ممالک میں وہی لوگ مسلط ہیں جو مغربی تہذیب میں رنگے ہوئے اور اپنی زندگی کے شب و روز سے مغرب کے مقابلے میں اپنی مرعوبانہ طرزِ عمل اور طرزِ فکر کا پیہم انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ مشکل ہی سے یہ سوچ سکتے ہیں کہ یورپ سے آئی ہوئی کوئی چیز بھی ناقص ہو سکتی ہے چاہے وہ دین و ایمان کا تصور ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے لوگوں کی حیثیت مرغِ بادنما کی سی ہوتی ہے کہ جدھر کی ہوا چلی اسی طرف رخ موڑ لیا۔ اگر یورپین مسلط ہو جائیں تو سر سے پیر تک مغربی لباس میں نظر آئیں گے اور اگر حبشیوں کی حکومت قائم ہو جائے تو رنگ سیاہ ناک چپٹی اور بال گھونگھریالے کرنے کے طریقے استعمال کرنے لگیں گے اور اگر ہندوؤں کی برتری دکھائی دے تو سر سے پاؤں تک گاندھی بھگت نظر آئیں گے۔

ایسے لوگوں کے اپنے کوئی نظریات نہیں ہوتے صرف فاتح کے نظریہ حیات کا مشروب ان کے شیشۂ حیات میں رنگ بھرنے کیلئے کافی ہوتا ہے۔ انہیں اسلام پر اعتماد نہیں ہوتا کہ انہوں نے اس کا مطالعہ کر کے اس میں کچھ خامیاں، کمزوریاں اور نقائص پائے ہوتے ہیں بلکہ ملی کردار نہ ہونے کے سبب ایک مفتوح قوم کا دین سمجھتے ہوئے خود بخود ان کا نقطۂ نظر اس کے بارے میں حقارت آمیز نہیں تو معذرت آمیز ضرور ہو جاتا ہے۔ ان کیلئے ڈارون، آئن اسٹائن اور نیوٹن کی بات زیادہ سائنٹیفک اور وزنی ہوتی ہے اور حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کی بات بے وزن ہوتی ہے۔ انہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ دونوں گروہ دو مختلف علوم کے نمائندے ہیں، جن علوم پر موخر الذکر حضرات گہری نگاہ رکھتے ہیں ان کی ابتداء سے بھی اوّل الذکر لوگ نابلد ہیں لیکن ہر مسئلے پر سند ان کیلئے بہر حال اوّل الذکر حضرات ہی ہوتے ہیں۔ اسلام کے بارے میں ان کا تصور چند عبادات کے مجموعے سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا جو ان کی رائے میں ایک مصروف اور دنیادار آدمی کیلئے خارج از بحث اور از کار رفتہ معمولات ہیں۔

اسلام کی طرف سے اس بے اعتنائی اور محدود تصور کے بعد جمہوریت کے بارے بھی ان کا کوئی عملی تجرباتی اعتقاد نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی افادیت نے ان کو متاثر کیا ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کا نعرہ اپنے چاروں طرف لگتا ہوا سنتے ہیں، مغربی قوموں میں اس موضوع پر لٹریچر تیار ہوتا ہے اور وہاں کی سیاسی جماعتوں کو اس قسم کے نعرے لگاتے ہوئے دیکھتے ہیں اس لئے ترقی پسند کی علامت، جدیدیت کا تقاضہ اور عصری تقاضوں کا لازمی جواب سمجھ کر اسے فیشن کے طور پر اختیار کرتے ہیں اور اپنی سیاسی بولی میں بھی شامل کر لیتے ہیں۔ یہ ان کیلئے گویا کوئی عمرانی تصور نہیں ہوتا جو اپنے کچھ تقاضے رکھتا ہو بلکہ ایک پالیسی کا مسئلہ ہوتا ہے جو ہوا کا رخ دیکھ کر اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ پہلو ایک مرعوب ذہن اور ذہنی افلاس کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اب آپ خود ہی سوچیں کہ آخر اسلام اور جمہوریت میں کوئی قدر مشترک بھی ہے جس کی بناء پر ہم لوگ ان دو متضاد نظریات کا باہمی جوڑ لگانے اور دنیا بھر کے سامنے اپنی مزعومہ ترقی پسندی اور حقیقتاً اپنی کم علمی کا مظاہرہ کرتے ہیں؟ مغربی حکومتوں کا ماحصل یہ ہے کہ اس میں اقتدار کا سرچشمہ عوام

ہوتے ہیں اور وہ اپنے اقتدار کو اپنے نمائندگان کے ذریعے بروئے کار لاتے ہیں، ان نمائندگان کی اکثریت کے فیصلے یعنی وہ آئین یا قوانین ہیں جنہیں وہ خود وضع کریں اور وہ حرفِ آخر ہوتے ہیں ۔عوام کے یہ نمائندے مختلف پارٹیوں میں بٹ جاتے ہیں اور جو پارٹی اکثریت میں ہوتی ہے وہ سیاہ وسفید کے مالک بن جاتی ہے۔ بہر حال ایسی نظامِ حکومت یعنی مغربی جمہوریت میں حکومت یا اقتدار ہر صورت انسانوں کے ہاتھوں میں رہتا ہے اور انہیں دوسروں پر حکومت کرنے کیلئے ہوتا ہے اس کے برعکس اسلام یعنی قرآنی نظام میں حقِ حکومت کسی انسان اکثریت کی بناء پر ہر قسم کا قانون بنانے کا مکمل اختیار حاصل نہیں بلکہ (إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ) یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے (سورۃ یوسف۔40)۔

أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ ۗ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ: سن لو! یقیناً جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اللہ ہی کے لیے ہے اور جو لوگ اللہ کے سوا کسی کو پکارتے ہیں وہ کسی قسم کے شریکوں کی پیروی نہیں کر رہے۔ وہ گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کرتے اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اٹکل لگاتے ہیں۔ (یونس۔66)

حقِ حکومت کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مغربی جمہوریت یا آجکل کی اصطلاح میں "اسلامی جمہوریت" قرآنی نظام کی ضد ہے۔ مغربی جمہوریت میں پارٹی سازی کی اجازت ہے لیکن پارٹی سازی کا قرآن کریم کی رو سے کوئی جواز نہیں۔

خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ: اسی نے آسمانوں اور زمین کو مبنی بر حکمت پیدا کیا اور اسی نے تمہاری صورتیں بنائیں اور صورتیں بھی پاکیزہ بنائیں۔ اور اسی کی طرف (تمہیں) لوٹ کر جانا ہے (سورۃ تغابن۔3)۔

گویا قرآن کریم کے مطابق نوعِ انسانی صرف دو گروہوں میں تقسیم ہے جن میں ایک گروہ کفار کا اور دوسرا گروہ مومنین کا ہے۔
وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا: اور اسی طرح ہم نے تم کو امتِ معتدل بنایا ہے، تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر (آخر الزماں) تم پر گواہ بنیں (سورۃ البقرہ۔143)

یعنی یہ لوگ رسالتِ محمدیہ ﷺ پر ایمان لا کر حلقہ مومنین میں شامل ہوئے ہیں، انہیں اسلام نے ایک امت قرار دیا ہے۔
وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا: اور سب مل کر خدا کی (ہدایت کی رسی) کو مضبوط پکڑے رہنا اور متفرق نہ ہونا (العمران۔103)
یعنی انہیں آپس میں تفرقہ پیدا کرنے یعنی فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ جانے سے منع فرمادیا ہے۔

نیز مغربی جمہوریت میں عوام اقتدار اکثریتی پارٹی کے نمائندگان کو تفویض کرتے ہیں لیکن اسلام میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے اور وہ اپنا اقتدار کسی نمائندہ کو تفویض نہیں کرتا۔ چنانچہ اس حقیقت کی وضاحت کیلئے خود زبان نبوی سے کہلایا گیا کہ: قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ۔۔(یہ بھی) کہہ دو کہ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے (سورۃ انعام 15) یعنی "کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور حاکم کی طلب اور جستجو کروں حالانکہ اس نے اپنی کتاب نازل کر دی ہے"۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یَزۡعُمُوۡنَ اَنَّہُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ وَ قَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِہٖ ؕ وَ یُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّضِلَّہُمۡ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا: اے نبی! تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ

ہم ایمان لائے ہیں اُس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رُجوع کریں، حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔(النساء:60)

اس مقام پر واضح ہو جاتا ہے کہ خدا کی حکومت کے معنی اس کی کتاب کی حکومت ہے تو پھر خدا کی حکومت کیلئے انسانی نمائندگی یا خدائی اختیارات کی تفویض کا نظریہ خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔ مزید وضاحت کیلئے ان سادہ مثالوں پر آپ ذرا غور فرمائیں تو بات اور کھل کر سامنے آجائے گی کہ اسلام ایک خدا کی حاکمیت کا قائل ہے جب کہ جمہوریت کا بنیادی فلسفہ اکثریت کی جماعت کی حکمرانی ہے۔ اسلام رسالت کے ذریعے ہدائت الٰہی کا علمبردار ہے ،جمہوریت ہدائت الٰہی کے فلسفے کو سرے سے تسلیم نہیں کرتی بلکہ ہر قسم کی قانون سازی اور اس کے نفاذ کو اپنا حق سمجھتی ہے۔ اس کے نزدیک دعویٰ ،جوابِ دعویٰ کے ٹکراؤ سے جو نتیجہ درآمد ہوتا ہے بس وہی نسخۂ ہدائت ہے جو زمانے کے ساتھ پیہم بدلنے والی چیز ہے۔

اسلام آخرت میں خدا کے سامنے دنیا و اعمال کی جوابدہی پر اپنے سارے نظام فکر کی بنیاد رکھتا ہے، جمہوریت سرے سے آخرت، جزا و سزا، جنت و دوزخ کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ اسلام تمام انسانوں کو بنی آدم کی اولاد کی حیثیت سے مساوی اور بھائی بھائی قرار دیتا ہے جبکہ جمہوریت انسانیت کو کئی طبقوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کے خلاف لڑنے اور ختم کرنے پر ابھارتی ہے۔ انسان اخلاقی قدروں کو انسانی حسن کا لازمی جزو قرار دیتا ہے لیکن جمہوریت اخلاق کو اضافی اور قابل ترمیم و اضافی چیز سمجھتی ہے۔ اسلام معاشرے میں مرد و اور خاندان کو بنیادی اہمیت دیتا ہے، جمہوریت انہیں تحلیل کر کے ایک ریاستی معاشرے میں بالکل بکھیر دیتی ہے۔ الغرض یہ دو الگ الگ طرزِ حیات ہیں اور ان میں باہمی بنیادی طور پر کوئی بھی قدر مشترک نہیں کہ ان میں باہمی جوڑ لگایا جا سکے۔

اس کھلی ہوئی متناقض اصطلاح کو اختیار کرنے اور الحاد کے ساتھ ایمان کا جوڑ لگانے کی ایک مجبوری ان حضرات کیلئے کچھ مقامی حالات بھی ہوتے ہیں۔ جن قوموں میں انہیں اقتدار پر قبضہ کرنا ہوتا ہے ان کے عوام اپنے دین و مذہب سے جذباتی لگاؤ اور تعلق رکھتے ہیں۔ یہ وہی مجبوری ہے جو ایک مسلمان قومی لیڈر کو لاحق ہوئی تھی تو اس نے اپنی بے پردہ بیگم سے کہا تھا کہ ہمیں جس علاقے کا دورہ کرنا ہے وہاں تمہیں برقعہ اوڑھنا پڑے گا اور جب بیگم نے اپنی روایتی بے پردگی کے سبب یہ رجعت پسندی اختیار کرنے سے انکار کر دیا تو اس نے دباؤ ڈالتے ہوئے صاف کہہ دیا تھا کہ "یہ تمہیں بہر صورت کرنا پڑے گا کیونکہ وہاں کے لوگ بہت متشدد مذہبی ہیں،،۔ گویا خدا اور رسول کا حکم یا اسلامی شعار اس وقتی پردے کا باعث نہیں تھا بلکہ ایک سیاسی ضرورت تھی جو بر حال وقتی طور پر مقامی حالات کے مطابق پوری ہونی چاہئے تھی۔

ایسے لوگ نہ تو اسلام کا حقیقی علم رکھتے ہیں، نہ اسے ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے دیکھتے اور تسلیم کرتے ہیں اور نہ ان کے خیال میں اسلام دنیا کے مسائل کا کوئی حل پیش کرتا ہے، اس لئے زمانے کی چلتی ہوئی کسی بولی کا پیوند اسلام کے ساتھ لگا کر وہ اپنی قوم کو بھی خوش رکھنا چاہتے ہیں اور زمانے کی ہوا کے رخ پر بھی اڑنا چاہتے ہیں تا کہ کوئی انہیں قدامت پسند اور ،، جامد ملا،، خیال نہ کرے۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے اگر زمانے میں آمریت کا رواج ہو جائے تو اسلام کے اندر سے خدا اور رسول کی اطاعت کے ساتھ اولیاء الامر کی اطاعت کے وجوب کی دفعہ نکال کر سامنے رکھ دیتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے

ہیں کہ سارا اسلام آمریت ہے اور خلفاء راشدین بھی تمام آمر تھے اور اگر زمانے میں اشتراکیت کا غلبہ ہو جائے تو یہ بھی حضرت ابوذر غفاری کے تقویٰ و بے نفسی کی مثال سامنے لا کر مالی مساوات اور ،،ارض اللہ،، کا ٹکرا پیش کر کے قومی ملکیت کا تصور سامنے رکھ دیتے ہیں کہ دیکھو اسلام تو سراسر اشتراکیت ہی ہے اور اگر اشتراکیت میں تھوڑا سا خوفِ خدا شامل کر دیا جائے تو بالکل خالص اسلام بن جاتا ہے۔ اگر سوشلزم کی بات چل پڑے تو اسلام کی رفاہی عوامی خدمات کی کچھ مثالیں سامنے رکھ کر اسلام کو جدید سوشلزم کا قدیم ایڈیشن ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس پر بس ذرا سی نظر ثانی کی ضرورت ہے اور اگر جمہوریت کا چرچا ہو تو مساوات انسانی اور خلفاء پر تنقید کی مثالیں بتا کر اسے مغربی جمہوریت کا مکمل چربہ ثابت کر دیتے ہیں۔ یہ پوزیشن بالکل ویسی ہے جو سپٹنک کے فضائی خلا میں اڑنے پر ہندوستان کے برہمنوں نے کوئی وید دکھا کر اختیار کی تھی کہ وید میں سپٹنک کا ثبوت موجود ہے جہاں جنگ مہابھارت میں بھیم کے ہاتھ سے پھینکے ہوئے ہاتھی کا ذکر موجود ہے جو اتنی بلندی پر گیا کہ خلاء میں جا داخل ہوا اور اب تک خلاء میں پرواز کر رہا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ اسلام خود ایک مکمل نظام زندگی ہے اور بس اس کا آخری ایڈیشن لانے والے وہ آخری نبی ﷺ ہیں جو اسے تمام انسانی ضرورتوں کیلئے آخری نسخہ کیمیا اور نظامِ زندگی کے طور پر لائے ہیں۔ یہ نظام تمام عصری تقاضوں کو نہ صرف پورا کرنے والا بلکہ انسان کی تمام مشکلات اور الجھنوں کو رفع کرنے والا ہے۔ آج انسانیت کا سب سے بڑا مسئلہ قومی کشمکش اور بین الاقوامی جنگیں ہیں جو اسے تباہی کے کنارے کی طرف لیجا رہی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ناتمام اور ناقص نسخے بلکہ ٹوٹکے جو مغربی تہذیب زخم خوردہ انسانوں کیلئے تجویز کر رہی ہے ان میں ہر نسخہ پہلے سے بڑھ کر تباہی پھیلانے والا ثابت ہوا ہے۔ سرمایہ داری کا علاج بن کر اشتراکیت آئی لیکن وہ اس سے بڑھ کر انسانوں کو غارت کر کے اپنے ہی گھر کے دامن میں نیست و نابود ہو گئی۔

آج دنیا بھر میں انسان مغربی تہذیب اور اس کے عطائی نسخوں سے ہلاکت کے بستر پر پڑا ہوا ہے اور اس انتظار میں ہے کہ کب کوئی ہائیڈروجن بم یا ایٹم بم پھٹ کر انسانیت کو مکمل تباہی کے غار میں دھکیل دے گا۔ سوشلزم تو دنیا کے دو عظیم فتنوں میں سے ایک فتنہ ثابت ہو کر اپنے ہی خنجر سے خودکشی کر چکا۔ آج سے کچھ عرصہ قبل کوئی سوشلزم کی ایسی المناک موت کے بارے میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن پھر بھی اسلام کے علمبرداروں نے اس کی پیش گوئی کر دی تھی کہ "سوشلزم کو ماسکو میں اور سرمایہ دار جمہوریت کو لندن پیرس اور نیویارک میں پناہ نہیں ملے گی۔" دنیا نے دیکھ لیا کہ ایک فتنہ اپنے انجام کو پہنچ گیا اب جلد یا بدیر دوسرے فتنے کی باری ہے اور اس وقت تمام مصائب کے مداوا کیلئے اسلام ہی آخری پناہ گاہ ہو گا کیونکہ اسلام ہی اپنی ذات میں مکمل جامع خود کفیل اور ساری انسانی مشکلات کا واحد حل ہے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں، آزمودہ طرزِ حیات ہے جس نے اپنے اصولوں پر خالص معیاری انداز میں ایک طویل عرصے تک ایک خالص اسلامی ریاست چلا کر دکھائی جو دنیا کیلئے زمین پر خدا کی سب سے بڑی رحمت تھی اور پھر معمولی دستوری تغیر کے ساتھ مدت دراز تک ایسی حکومتیں چلائی ہیں جن میں افلاس کی کوتاہیوں کے باوجود جرم و افلاس، ظلم و زیادتی کی کم سے کم مثالیں ملتی ہیں اور ان کا مقابلہ آج کا مہذب اور ترقی یافتہ دور بھی بالکل نہیں کر سکتا۔ ان کی عدالتوں میں مقدمات کی بھرمار ایسی نہ تھی۔ مجرم خود اعتراف کرتے اور حکمران تک عدالت کے کٹہرے میں طلب کر لئے جاتے تھے۔ ان کے معاشرے میں بھوکے ننگے لوگوں کے لشکر چیونٹیوں کی طرح بازاروں میں چلتے اور ہر شخص سے چمٹے نظر نہ آتے تھے جیسے دور جدید کے تقاضوں نے پیدا کر دیئے ہیں۔ ان کے ہاں اشیاء صرف کی قیمتیں نہائت کم تھیں جب کہ اس ترقی یافتہ دور میں بنیادی ضروریات بھی وصال صنم کا درجہ اختیار کر گئیں ہیں۔

دراصل یہی وہ نظام زندگی ہے جس کا علمبردار بن کر مسلمان ملکوں کے سربراہوں کو اٹھنا چاہئے تھا۔ جس چیز کی دنیا کو تلاش اور طلب ہے وہ اسلام کے اندر مکمل طور پر موجود ہے اور شائد ہی کسی دور میں انسانیت اسلام کے اصولوں کیلئے اتنی پیاسی اور حاجت مند تھی جتنی آج ہے۔ ہمارا کام تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ مشرق و مغرب کی ساری مرعوبتیں چھوڑ کر اسلام کو ایک نظامِ حیات اور نظریہ زندگی لیکر اٹھتے، پہلے خود اس پر عمل کرتے اور پھر ساری دنیا کو اس کی دعوت دیتے کہ ہمارے سارے دکھوں کا علاج صرف اسلام میں ہے۔ ہمیں بین الاقوامی برادری کی اگر ضرورت ہے تو یہ بھی صرف اسلام عطا کر سکتا ہے اور اپنے دور عروج میں جب اس پر عمل کیا گیا تو مراکش سے لیکر چین تک اس کی عملاً تصویر دیکھنے کو ملی۔

ان جدید نظریات اور مغربی جمہوریت نے ہمیں رنگ و بو، نسل و قبیلہ کے چھوٹے چھوٹے متحارب گروہوں میں بانٹ دیا ہے۔ ہمیں اس وقت محبت و اخوت کی ضرورت ہے اور یہ صرف اسلام ہی ہے جو رنگ و نسل و قبیلہ کے امتیاز کو مٹا کر ہم کو بنی آدم کی حیثیت سے بھائی بھائی اور خدا کے مساوی بندے قرار دیتا ہے اور تمام علاقائی عصبیتوں سے نجات دلاتا ہے۔ آج ساری دنیا بد اخلاقی کے ریلے، فحاشی کے چکر، نئی نسلوں کی تباہی اور نئی نئی جنگوں کی یورش سے پریشان ہے۔ اسلام ہمیں اخلاق فاضلہ سکھاتا ہے، انساف و عدل کی تعلیم دیتا ہے، بین الاقوامی نظریاتی بیداری پیدا کر کے جنگوں کا سلسلہ ختم کر دیتا ہے۔

اب افسوس اس بات کا ہے کہ جاں بلب دنیا کا تریاق "اسلامی نظام" کی صورت میں ہمارے پاس ہے اور ہم اسے پس پشت ڈال کر دنیا سے زہریلے ٹوٹکے لیکر انہیں ان کے تریاق "مغربی جمہوریت" کے ساتھ ملا کر بڑے فخر کیساتھ سر اونچا کر کے کہتے ہیں کہ ہم بھی اسلامی جمہوریت کے قائل، ترقی پسند، جدید اور عصری تقاضوں کو سمجھنے والے لوگ ہیں۔ اس سے زیادہ کور بصری اور نظریاتی تہی دامنی اور کیا ہو سکتی ہے؟

اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں ایسے عطائی طبیبوں سے جلد نجات عطا فرمائے۔ آمین!

بروز جمعۃ المبارک 30 رجب المرجب 1445ھ 9 فروری 2024ء

مغرب اسلام سے خوفزدہ کیوں؟

ابھی 76 سال قبل جب پوری دنیا میں برطانوی شہنشاہیت کا ڈنکا بج رہا تھا، اس وقت برطانوی بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ ہماری حدود سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا (گو آج اس کا یہ حال ہے کہ وہاں کبھی کبھی سورج شرماتا ہوا دکھائی دیتا ہے)۔ اُس وقت ایک مسلمان یورپ و امریکا سے اس قدر خائف و مرعوب تھا کہ وہ سوچ تک نہیں سکتا تھا کہ وہ ان حکمراں اقوام کی سرزمین پر اپنی بستیاں بسائے گا اور ان کو اپنے مذہب کی طرف دعوت دے گا ۔ مسلمان ایک طرف ان کی سائنسی ترقی سے مرعوب تھے تو دوسری طرف ان کی سامراجیت سے دم بخود لیکن آخر کار برطانوی شہنشاہیت کا طلسم ٹوٹا اور سارے مسلم آبادی والے ممالک ایک ایک کر کے آزاد ہوتے گئے۔ دوسری عالم جنگ کے نتیجے میں ایشیا و افریقہ پر فرانس اور دیگر یورپی اقوام کی گرفت بھی ڈھیلی ہوئی اور سارے غلام ممالک آزادی کی نعمت سے ہمکنار ہوتے گئے۔

گو ایک طرف سوویت یونین کا عفریت وسط ایشیا پر اپنا آہنی پنجہ گاڑے رہا لیکن عالم اسلام کے اکثر حصوں میں ایک طویل نیند اور قیامت کی بے ہوشی کے بعد بیداری اور ترقی کی لہر پیدا ہو گئی تھی۔ مسلمان اعلیٰ عصری تعلیم کی طرف مائل ہونے لگے تھے اور استعماریت کی تخریب کاریوں کی تلافی میں سرگرم ہو رہے تھے۔ کچھ تو استعماریت کا شاخسانہ تھا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ سے لے کر مزدور مسلمان یورپ و امریکا کی طرف ہجرت کر رہے تھے اور کچھ تعلیم وغیرہ کیلئے نقل مکانی کر رہے تھے۔

یہ رجحان 20ویں صدی کے نصف اخیر میں کافی شدت اختیار کر گیا جس کی وجہ سے دیکھتے دیکھتے یورپ و امریکا میں مسلمانوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ نیز عالم اسلام میں پیدا ہونے والی بیداری کی وجہ سے مسلمانوں میں دینی دعوت کا مزاج اور علیحدہ شناخت کا تصور عام ہوتا گیا۔ اس سے بھی مسلمانوں کو یورپ امریکا کی سرزمین پر بہت سے ہمنوا ملتے گئے جن سے ان کی عددی طاقت میں اضافہ ہوتا گیا۔ آج صورت حال یہ ہے کہ امریکا میں اسی لاکھ، فرانس میں ساٹھ لاکھ، برطانیہ میں چوبیس لاکھ، اس کے علاوہ کینیڈا، جرمنی اور یورپ کے دیگر ملکوں میں مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں کے اندر ہی یورپ کے قلب میں البانیہ، بوسنیا ہرزیگووینا جیسی مسلم ریاستیں اور مقدونیہ و بلغاریہ جیسی کثیر مسلم آبادی والی ریاستیں وجود میں آچکی ہیں۔ چنانچہ یورپ و امریکا جہاں ہمیشہ سے عیسائی و یہودی کلچر موجود تھا اب وہاں اسلام ایسی صورت حال اختیار کر گیا ہے کہ اسے کسی بھی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

نائن الیون کو امریکا پر حملوں کا ایک مثبت پہلو یہ رہا کہ مسلمان ایک بار پھر موضوع بحث بن گئے۔ پینٹاگون اور ڈبلیو ٹی سی پر حملہ آوروں کا مذہب، تہذیب اور ان کی تعلیم پوری دنیا خصوصاً امریکا و یورپ کی عوام کی توجہ و دلچسپی کا محور بن گئی۔ تاریخ میں پہلی بار بھاری تعداد میں قرآن کریم کے نسخے امریکی و یورپی مارکٹوں میں کثرت سے بکے اور ختم ہو گئے۔ یونیورسٹیوں میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق پی ایچ ڈی کرنے والوں کا تانتا لگ گیا اور یورپ و امریکا کے سیکڑوں اداروں نے اسلامک اسٹڈیز کے شعبے قائم کیے۔ اسلام یورپ و امریکا میں پہلے ہی سے پنپ رہا تھا، ان حالات نے اسے کسی قدر مناسب آب و ہوا پہنچا دی کہ اس کے پھلنے پھولنے کے ذرائع خود پیدا ہو گئے۔ اس لیے آج یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مغرب میں اسلام سب سے زیادہ مقبول اور تیزی سے پھیلنے والا مذہب بن گیا ہے۔ گو مسلمانوں میں اکثر تعداد ان کی ہے جو آبائی طور پر مسلمان ہیں اور مستقل وہیں سکونت اختیار کر لی ہے لیکن ان میں امریکی و یورپی مسلمانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد شامل ہے۔

مشرق سے مغرب کے خوف کی تاریخ کافی پرانی اور عیسائیت واسلام کی چشمک کی جڑیں خاصی گہری ہیں۔ عہد فاروقی ہی میں مسلمانوں نے عیسائیت ویہودیت کے سب سے بڑے مرکز یروشلم وشام وغیرہ کو فتح کر لیا تھا۔ دوسری صدی ہجری میں مسلمان یورپ کے آخری مغربی سرے پر اندلس میں اسلامی حکومت کا علم لہرا چکے تھے جس میں آج کا پورا اسپین اور پرتگال وفرانس کا بڑا حصہ شامل تھا۔ وہ تو فرانس کے کچھ جیالوں نے مسلمان فوجوں کا راستہ روک دیا تھا ورنہ نجانے یہ طوفان کب کا پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہوتا۔ بعد میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کیا جو کہ روم کے بعد دنیا کا سب سے بڑا عیسائی مرکز تھا اور صلیبی جنگوں کا حال تو سب کو معلوم ہے جب اسلام وعیسائیت کی طویل ترین جنگ میں ایوبی حکمت وفراست نے عیسائیوں کو دھول چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ اسلام اور عیسائیت کے درمیان اس طویل کشمکش نے تاریخی حیثیت اختیار کر لی۔ صلیبی جنگوں کے گہرے زخم آج بھی اہل یورپ کے دل ودماغ میں اس قدر تازہ ہیں کہ عیسائی والدین، اساتذہ، میڈیا اور سیاست داں اسے اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے تئیں اپنے جذبات کو اپنی نئی نسل تک بحفاظت پہنچائیں۔

صلیبیوں نے گو فوجی ودفاعی میدان میں اپنی شکست تسلیم کر لی لیکن ثقافتی وتہذیبی جنگ انہوں نے جاری رکھی۔ عداوت ونفرت کی اس آگ کو نام نہاد محققین اور مستشرقین نے خوب ایندھن فراہم کیا اور مزعومہ تحقیق کے پس پردہ اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے اور مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اٹھارہویں صدی میں یورپ کے اندر برپا ہونے والے اقتصادی انقلاب نے انہیں مزید وسائل سے مالا مال کر دیا جس سے مغربی حکومتوں نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ ذرائع ابلاغ کی ترقی کے بعد اس مشن میں کافی تیزی آگئی۔ اسی دوران ایک اہم واقعہ یہ رونما ہوا کہ برطانیہ نے فلسطین میں جو کہ اس کی نو آبادیات تھا ایک ناجائز اسرائیلی ریاست قائم کر دی اور یہودیت وعیسائیت کی روایتی وتاریخی کشمکش کو مسلمانوں کی طرف پھیر دیا۔ یہودیوں کو، جنہیں تاریخ میں ہمیشہ مسلمانوں کے ہی دامن عافیت میں امن وسکون کی زندگی نصیب ہوئی، بڑے شدومد کے ساتھ یہ باور کرا دیا گیا کہ مسلمان ہی ان کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔

عالم عیسائیت اگرچہ فوجی محاذ پر اسلام کو نہ مٹا سکا لیکن اس کا اندازہ تھا کہ وہ اپنے جھوٹے پروپیگنڈوں، تہذیبی یلغار اور ثقافتی جنگ میں مسلمانوں پر ضرور غالب آئے گا۔ لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ اسلام ہر محاذ اور ہر میدان میں عیسائیت کے مدمقابل کھڑا ہوا ہے۔ سوویت یونین کے تار وپود بکھر جانے کے بعد اگر کوئی سیاسی، اقتصادی، سماجی اور اخلاقی نظام ہے جو عیسائیت اور مغربیت کو چیلنج کر سکے تو وہ صرف اور صرف اسلام ہے۔ آج اسلام، مسلمانوں خصوصا عربوں کے خلاف نفرت وعداوت کا جو بازار گرم ہے وہ اسی "اسلاموفوبیا" (اسلام سے خوف کی بیماری) کا ایک حصہ ہے۔ اگر آج مغربی دنیا اسلام سے خائف ہے تو اس کا یہ خوف بے بنیاد نہیں۔ اگر وہ طالبان کی کمزور حکومت سے خائف تھی تو محض اس لیے کہ وہ ایک مضبوط تر سیاسی نظام کے قائل تھے۔ اگر آج سوڈان پر پابندیاں عائد ہیں تو محض اس لیے کہ وہ ایک علیحدہ معاشی نظام کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ اگر آج عالم عرب، ایران، اور برصغیر ہند کی دینی تعلیم گاہیں اور ادارے مغربی ملکوں کو ایک آنکھ بھی نہیں بھاتے تو اس کے علاوہ اس کی اور کیا وجہ ہے کہ یہ ایک صالح اور تعمیری سماجی واخلاقی نظام کے نقیب ہیں۔

وہ دیکھ رہے ہیں کہ آج مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ارب ہے۔ روئے زمین کی مجموعی آبادی کا چوتھا حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ یہ دنیا کے ایک بڑے رقبے پر آباد ہیں۔ 54 ملین مربع میل کا ایک چوتھائی حصہ ان کے قبضے میں ہے اور روئے زمین کے سرسبز وشاداب خطے ان کی سکونت میں ہیں جنہیں تقریبا تمام قدیم تہذیبوں کا مرکز ومحور ہونے کا شرف حاصل ہے۔ عالم اسلام زمین کے ایک اہم اور وسیع رقبے پر مشتمل ہے۔ جنوبی خط استوا سے پھیلتے

ہوئے وسط ایشیا میں 55 خط عرض سے بھی زائد حصے اس کی قدرت و تصرف میں ہیں۔ مختلف آب وہوا کے تین منطقے مسلمانوں سے آباد ہیں۔ منطقہ حارہ کا منتشر حصہ، منطقہ صحراویہ اور منطقہ متوسطہ ان کی تگ و تاز اور بود و باش کا مرکز ہے۔ اسی لیے عالم اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس خطے میں متنوع نباتات پائی جاتی ہیں اور زراعتی پیداوار کی نوع بنوع اقسام یہاں موجود ہیں۔ فوجی میدان میں اسلحہ کی طاقت کے اعتبار سے عالم اسلام گو بہت پیچھے ہے لیکن افراد و وسائل کے لحاظ سے اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ فوجی وسائل میں پہلے نمبر پر پٹرول ہے جس کی پیداوار کا تناسب عالمی پیداوار کے مقابلہ میں 60٪ ہے اور زیر زمین ذخائر عالمی ذخائر کے مقابلے میں 80٪ سے بھی زیادہ ہیں۔

عالمی پیداوار کے مقابلہ میں عالم اسلام میں 5٪ لوہا، 25٪ تانبہ، 40٪ کروم کی معدنیات، 56٪ رانگا، 23٪ المونیم، 10٪ سیسہ، 5٪ فاسفیٹ اور دوسری بہت سی معدنیات پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اہم ترین آبی گذرگاہیں جو تجارت و دفاع وغیرہ میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہیں وہ سب عالم اسلام میں واقع ہیں۔ بحر ابیض متوسط تین براعظموں کے درمیان رابطہ کا ذریعہ ہے۔ جبل الطارق کا درہ بحر اٹلانٹک اور بحر متوسط کے درمیان واقع ہے۔ نہر سویز بحر احمر کو بحر متوسط سے ملاتی ہے۔ باب المندب کا درہ جو بحر احمر اور خلیج عدن کے درمیان وصل کا کام دیتا ہے۔ ملاکا کا درہ جو جزیرہ سوماترا کو جزیرہ نما ملایا سے الگ کرتا ہے۔ یہ سب تجارتی اور فوجی و حربی جگہیں ہیں جنہوں نے قدیم و جدید تاریخ کے ہر دور میں تجارتی راستوں اور فوجی حملوں کے نقطۂ نظر سے فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ عالم اسلام میں ترکی و الجزائر سے لے کر افغانستان اور وسط ایشیائی ممالک تک جنگجو طاقت آزما اور بہادر افراد کی کمی نہیں ہے۔ افغانستان جہاں تین سپر پاورز (برطانیہ، سوویت یونین اور امریکا سمیت اس کے 47/ اتحادیوں) کی افواج کے قبرستان اور ذلت آمیز شکست آج بھی تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔

اس وقت دنیا بھر میں سب سے زیادہ مصائب میں مبتلا امت مسلمہ ہے جس پر چاروں طرف سے ابتلا کی بارش کر دی گئی ہے لیکن ہمارے تمام دشمن نہ صرف اکٹھے مل کر مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کی عملی سازشوں میں شریک ہیں بلکہ ہمیں بھی ایک دوسرے کا دشمن بنانے میں انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ہم ایک دوسرے کا گلہ کاٹنے میں مصروف ہیں۔ یوں تو اس وقت امت مسلمہ کئی مسائل سے دوچار ہے لیکن کشمیر اور فلسطین دو ایسی بڑی مقتل گاہیں بن چکی ہیں جہاں پچھلی سات دہائیوں سے انسانیت مسلسل چیخ و پکار کر رہی ہے لیکن خود کو مہذب کہلانے والی قومیں نہ صرف بہرے اور گونگے شیطان کا کردار ادا کر رہی ہیں بلکہ اس ظلم و ستم میں برابر کے شریک ہیں۔ اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ وہ اس بات کو جان گئے ہیں کہ اسلام جس کے معنی ہی سلامتی کے ہیں اور اس کے پیغام نے نہ صرف عربوں کے درمیان صدیوں کی منافرت کو ختم کر دیا تھا بلکہ ان کو اخوت اور بھائی چارہ کے ایسے رشتے کی لڑی میں پرو دیا تھا کہ اس زمانے کی سپر پاورز "روم اور فارس" بھی ان پر حکومت کرنے سے عاجز تھے لیکن چند برسوں میں اسلام کی تربیت سے آدھی دنیا کی قیادت و سیادت ان کے قدموں میں آن گری تھی اور اس زمانے کی سپر پاورز کو بھی زیر نگین ہونا پڑا۔

یہی وجہ ہے کہ آج مغرب کی پوری کوشش ہے کہ ہر قیمت پر ان مسلمان ریاستوں کے درمیان خانہ جنگی کا ماحول پیدا کیا جائے، ایک دوسرے کے گلے کاٹنے سے ان کو فرصت نہ ملے اور اس جنگی اخراجات میں الجھ کر نہ صرف معاشی طور پر یہ کنگال ہو جائیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں مغرب اور امریکا کے اشارہ ابرو پر دم ہلاتے رہیں۔ اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ زیر زمین بے بہا قیمتی خزانوں کا مالک جن کو بنایا، انہوں نے اپنے رب کی طرف سے جاری

اسلامی نظام کو اپنانے کی بجائے اپنی بادشاہتوں کو دوام بخشنے کیلئے مغرب اور امریکا کی غلامی کر لی اور اپنا من تن دھن ان کے تصرف میں دے دیا۔ لیکن اچانک ایرانی انقلاب سے جب ان کو دھچکا پہنچا تو فوری طور پر عراق اور ایران کو ایک دوسرے کے مد مقابل ایک خونریز جنگ میں مبتلا کر کے نہ صرف معاشی طور پر اس خطے کے تمام اسلامی ممالک کے وسائل گ میں جھونک دیئے بلکہ اس بہتی گنگا میں اسلحے کی فروخت کے نام پر اربوں ڈالر کھرے کر لئے۔

جب ان ممالک کے درمیان جنگ ختم ہوئی تو پھر ایک اور افتاد میں مبتلا کر کے صدام کے ہاتھوں کویت پر حملے کی آڑ میں خود امریکا بہادر اپنے مغربی اتحادیوں سمیت حملہ آور ہو گیا۔ اس بہانے سے نہ صرف کویت اور سعودی عرب سے بھاری تاوان وصول کیا بلکہ خطے میں ایران کے مستقل خطرے کا ہوا کھڑا کر کے سیکورٹی کے نام پر اپنے مستقل اڈے بھی بنا لئے۔ اپنے عزائم کو مزید بڑھاتے ہوئے خلیجی ممالک میں دشمنی کا ایک اور بیج بو دیا اور قطر کے ساتھ بائیکاٹ کا مسئلہ کھڑا کر کے جہاں مسلم ممالک کے اتفاق کو برباد کیا وہاں دفاع کے نام پر ایک مرتبہ پھر اپنے اسلحہ ساز کارخانوں کو نیا خون مہیا کیا جبکہ اربوں ڈالر کی لاگت سے قطر کا بحری اڈہ پہلے ہی امریکا کے استعمال میں ہے اور آج بھی "بلیوں کا منصف بندر" کیے مصداق اپنا قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔

ہزاروں سال پرانی بابل و نینوا کی تاریخ کے حامل عراق کو تاراج کر کے تاتاریوں کے مظالم کو بھی شرمندہ کر دیا گیا۔ عرب ممالک میں بادشاہت کے نظام پر سب ہی معترض ہیں لیکن ان کے حکمرانوں کا استقبال "ریڈ کارپٹ" پر کرتے ہوئے جمہوریت گنگ ہو جاتی ہے۔ جمہوریت کے علمبردار مغرب میں شخصی آزادیاں ایک چیلنج بن چکی ہیں، یہاں کسی بھی خاتون کو برہنہ ہونے کا اختیار تو ہے لیکن اپنی مرضی سے اسکارف نہیں پہن سکتی۔ مذہب کی توہین کرتے ہوئے لمحہ بھر کیلئے شرم محسوس نہیں کرتے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ فرانس کے وزیر تعلیم نے تمام تعلیمی اداروں میں سکارف اور بازو کو مکمل چھپانے پر پابندی عائد کر دی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ معمر قذافی کو امریکا اور مغربی ممالک کے ساتھ اقتصادی روابط نہ رکھنے کی سزا دی گئی، بظاہر تو لیبیا پر یہ کہہ کر حملہ کیا گیا کہ وہاں کے عوام کو قذافی سے بچایا جا رہا ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ معمر قذافی نہ یورپی ممالک اور نہ امریکا کو اپنے اقتصادی معاملات میں مداخلت کی اجازت دیتے تھے بلکہ وہ عالمی منڈی میں تیل کے بدلے ڈالر کے مقابلے میں سونے کا سکہ چلانے کیلئے کوشاں تھے اور تمام تیل پیدا کرنے والے ممالک کو اس فارمولے پر قائل کرنے کی کوششوں میں کامیاب ہو رہے تھے۔ قذافی کی کوشش تھی کہ وہ چین، ترکی اور ایشیائی ممالک سمیت ان ممالک کے ساتھ اقتصادی تعلق رکھیں جو امریکا کے اثر سے پاک تھے۔ قذافی کے خلاف یہ بات اڑائی گئی کہ ان کی ایئر فورس بن غازی میں عوامی مظاہروں کے خلاف استعمال ہو رہی ہے، الجزیرہ ٹی وی پر یہ خبر بھی چلی کہ بن غازی میں بمباری کے نتیجے میں 50 ہزار لوگ مارے گئے، اگرچہ یہ خبر واپس لے لی گئی لیکن اس خبر کے نتیجے میں لیبیا کے اوپر نو فلائی زون قائم کر دیا گیا۔ بعد میں اسی نو فلائی زون کو توڑتے ہوئے بمباری شروع کر دی گئی اور قذافی کے گھر پر بمباری کر کے ان کے ایک بیٹے کو بچوں سمیت شہید کر دیا گیا۔ اس موقع پر پوری عرب اور اسلامی دنیا دیکھتی رہ گئی اور کچھ نہ کر سکی۔ یہ جہاں امریکا کی جانب سے لیبیا کے عوام کو بچانے کیلئے کھلی بدمعاشی اور جارحانہ مداخلت تھی وہاں تمام مسلمان ملکوں کے سربراہوں کو ان کی اوقات بتا دی گئی اور رہی مغرب کی خاموشی، آج ان کے ضمیروں پر بوجھ بن کر تازیانے برسا رہی ہے۔ اپنے اس جرم کا اعتراف خود مجھ سے مغرب کے کئی دانشوروں نے کیا ہے۔

مغرب اور امریکا کا مسلمان ممالک پر مکمل اجارہ داری کا خواب ابھی نامکمل ہی تھا کہ انہوں نے ساری دنیا پر قبضہ کرنے کیلئے "ون ورلڈ آرڈر" کا منصوبہ تیار کرتے ہوئے اپنے مدمقابل سپر پاور سوویت یونین سے گلو خلاصی کا پروگرام ترتیب دیتے ہوئے اسے افغانستان میں ایسا الجھایا کہ وہ برسوں کی کمائی کو چند سالوں میں اپنے بھرپور زخموں کی تاب نہ لاتا ہوا عبرتناک شکست سے چھ ٹکڑوں کی تقسیم کا داغ اپنے ماتھے پر سجا کر واپس بھاگ گیا لیکن یہاں قدرت کا تماشہ عجیب ہوا کہ دنیا میں مسلم ممالک ریاستوں میں چھ اور ریاستوں کا اضافہ ہو گیا جو پٹرول اور معدنیات کی دولت سے مالا مال ہیں۔ اب ان تمام معدنیات اور پٹرول سے استفادہ کرنے کیلئے یقیناً افغانستان اور پاکستان کی ضرورت تھی جس کیلئے درپردہ بہت کوششیں کی گئیں لیکن سوویت یونین کو افغانستان میں مسلمانوں ہی کی مدد سے پارہ پارہ کرنے کے بعد امریکا اور اس کے اتحادیوں نے اپنے سارے وعدے فراموش کرتے ہوئے جس طرح سارا ملبہ پاکستان پر ڈال کر عجلت میں بھاگ گیا تھا بلکہ پاکستان پر دباؤ بڑھانے کیلئے اس کے ازلی دشمن بھارت سے دوستی کی پینگیں بڑھانا شروع کر دی تھیں ،اس کے پیش نظر یہ دونوں ممالک امریکا اور مغرب پر اعتبار کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ جس کیلئے پاکستان میں کمزور جمہوریت کو بھی فارغ کرتے ہوئے اس کا تختہ الٹ کر نہ صرف فوجی ڈکٹیٹر مشرف کو سامنے لایا گیا بلکہ اس کے ناجائز عمل کو قانونی شکل دینے کیلئے پاکستانی عدلیہ کی طرف سے جائز سند دلوانے کیلئے اس فوجی آمر کو آئین میں تبدیلی کا حق بھی سونپ دیا گیا۔

دوسری طرف افغان طالبان کسی بھی طور پر غلامی کا یہ طوق قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ اس ناکامی کے بعد نائن الیون کا پروگرام ترتیب دیکر اس خطے پر قبضہ کرنے کا پلان تیار کر لیا گیا اور ثبوت کے طور پر اس پلان کے متعلق خود کئی امریکی دفاع اور تجزیہ نگاروں کی مفصل کتابیں اور ویڈیوز بھی موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ خود کو "جمہوریت کی ماں" کہنے والوں نے اپنے ہاتھوں پہلے الجزائر اور بعد ازاں مصر میں جمہور کا گلا گھونٹ کر انسانی حقوق کے علم برداروں کی وہ تذلیل کی کہ تاریخ میں ان کی آئندہ نسلیں بھی اس بدنما داغ کو دھونہ پائیں گی اور اب اس پر مستزاد یہ کہ برسوں خونخوار جنگ کی ہولناکیوں کے باوجود شرمناک اور عبرتناک رسوائی کے ساتھ افغانستان سے فرار ہونا پڑا۔

1948 میں اقوامِ متحدہ نے اس دن انسانی حقوق کے تحفظ اور آگاہی کیلئے 48 ممالک کی رضامندی سے 30 دفعات پر مشتمل عالمی منشور جاری کیا تھا- اس منشور کے تحفظ، بہتری اور عمل درآمد کو یقینی بنانے کیلئے ایک مستقل کمیشن برائے انسانی حقوق بھی قائم کیا گیا تھا- انسانی حقوق کے اس عالمی منشور میں بنیادی انسانی حقوق مثلاً انسانی آزادی، مساوی حیثیت، آزادانہ نقل و حرکت، آزادی اظہار، باوقار زندگی، سماجی تحفظ کا حق، مذہبی آزادی اور تشدد، ظلم و ستم، غیر انسانی اور توہین آمیز سلوک یا سزا کا نشانہ نہ بنائے جانے کو یقینی بنایا گیا ہے- گو کہ اِس دن دنیا بھر میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے خلاف آواز بلند کی گئی، لیکن کیا وجہ ہے کہ امریکا اور اس کے اتحادیوں نے کشمیر و فلسطین میں ہونے والی اندوہناک انسان دشمنی کو ہمیشہ کی طرح پسِ پشت ڈالے رکھا ہے۔ اس کی یقیناً ایک ہی وجہ ہے کہ امریکا سمیت مغرب اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ دیوالیہ کے کنارے پر پہنچا ہوا پاکستان ایک ایٹمی قوت کا ملک ہے اور تیزی کے ساتھ اپنے اپنی ڈوبتی معیشت کو سنبھالا دینے کیلئے خطے میں اپنی ترجیحات کی سمت کو تبدیل کرنے میں کوشاں ہے جہاں اس خطے میں امریکا اور مغرب کی منافقانہ پالیسیوں کیلئے مزید کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔ اب بھی وہ اسلام کی نشاط ثانیہ کے طلوع ہوتے ہوئے سورج کو مادی کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں غرق کرنے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ آج بھی ان کے تعلیمی اداروں میں یہ تحقیق جاری ہے کہ کس طرح وہ پاکستان کے ایک بہت بڑے اسلامی مفکر کے اسلامی سیاسی نظام کو ناکام بنایا جائے جو امریکا اور مغرب کے موجودہ سیاسی نظام کی موت بن سکتا ہے۔

مغربی دنیا اب تک مختلف ذرائع سے سیاسی، سماجی، فوجی اور اقتصادی سطح پر مسلمانوں پر حاوی رہی ہے لیکن ایک طرف مسلمانوں میں بیداری پیدا ہونے کے بعد انہیں یہ خوف لاحق ہو گیا ہے کہ اگر عالم اسلام کو کچھ لائق اور ژرف نگاہ قائد میسر آ گئے اور انہوں نے اپنی بکھری قوتوں کا استعمال کرنا سیکھ لیا تو وہ دن دور نہیں جب مغرب کی قیادت کا طلسم چکنا چور ہو کر بکھر جائے گا اور عالم اسلام قیادت و جہاں بانی کی نئی بلندیاں طے کرتا ہوا نظر آئے گا۔

دوسری طرف اہل مغرب کو خود اپنے ملکوں میں پیر تلے زمین کھسکتی نظر آ رہی ہے، مسلمان پورے اسلامی تشخص اور تہذیبی شناخت کے ساتھ ہر میدان میں پورے یورپ و امریکا میں اپنا وجود تسلیم کرا رہے ہیں۔ ان اسباب کے پیش نظر اگر یورپ میں "اسلام سے خوف" کی لہر دوڑ رہی ہے تو یہ بے بنیاد نہیں۔

بروز 3 سوموار شوال المعظم 1445ھ 12 فروری 2024ء

امریکی جنگی مافیا اور عالمی امن

امریکا کے صدر جمی کارٹر نے 1980 میں اسٹیٹ آف یونین خطاب کے دوران کہا تھا کہا تھا "اگر کسی بیرونی طاقت نے خلیج فارس کا کنٹرول سنبھالنے کیلئے کسی قسم کی مداخلت کی تو امریکا مشرق وسطی میں تیل کی آزادانہ نقل وحمل کی حفاظت کیلئے اس کے خلاف جوابی کاروائی کرے گا"۔ کارٹر اور ان کے جانشینوں نے اس وعدہ کو ہمیشہ نبھایا ہے۔ قصر سفید کا دعویٰ ہے کہ امریکا نے نہ صرف خطے میں موجود امریکی فوج کی صلاحیتوں میں اضافہ کیا بلکہ عراق کے صدام حسین کو تیل کی سپلائی لائن پر قبضے سے روکنے کا بہانہ بنا کر جنگ خلیج میں بھی حصہ لیتے ہوئے عراق کو تاراج بھی کر دیا۔ اگرچہ خلیج فارس میں امریکا کے دیگر بھی کئی مفادات تھے جن میں جوہری پھیلاؤ کی روک تھام، انسداد دہشتگردی اور جمہوریت کا فروغ شامل ہیں لیکن امریکا کا سب سے اہم مفاد تیل کی ترسیل کو بغیر رکاوٹ جاری رکھنا تھا جبکہ وقت نے امریکی بیانیے نے یہ ثابت کر دیا کہ اس خطے میں امریکا کی موجودگی اپنے مخصوص مفادات ورلڈ آرڈر کے تابع ہیں، باقی سب بہانے ہیں۔

خلیج فارس سے امریکا کی اس وابستگی پر اسے کبھی کسی بڑی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ حتی کہ وہ لوگ بھی جو امریکا کے یورپ اور ایشیا میں مختلف اتحادوں کے مخالف رہے ہیں اور ان اتحادوں کو ملکی معیشت پر بوجھ قرار دیتے رہے ہیں، انہوں نے بھی ہمیشہ اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ امریکا کو خلیج فارس کی حفاظت کا ذمہ اپنے سر رکھنا چاہیے کیونکہ دنیا کے ایک تہائی تیل کی پیداوار اس خطے سے ہوتی ہے۔ لیکن اب دنیا میں ڈرامائی تبدیلیاں رونما ہوئی سوویت یونین تیل کی ترسیل ہیں۔ سرد جنگ کے دوران خطے میں امریکی مفادات کیلئے سب سے بڑا خطرہ سوویت یونین تھا۔ امریکی پالیسی ساز پریشان تھے کہ اگر کو منقطع کرنے میں کامیاب ہو گیا، تو تیل و گیس پر انحصار کرنے والی امریکی فوج یورپ میں کوئی بڑی جنگ نہ جیت سکے گی۔ لیکن سوویت یونین کے خاتمے نے تیل کی سپلائی کے حوالے سے امریکی مفاد کی نوعیت کو تبدیل کر دیا۔ جہاں قومی سلامتی اور خوش حالی دونوں کا انحصار خلیج فارس کی حفاظت پر ہوا کرتا تھا، اب اس کا تعلق صرف خوشحالی سے رہ گیا جس نے امریکا کی پالیسی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

قومی سلامتی کے عنصر کی عدم موجودگی نے خلیج فارس میں فوج کی مداخلت بڑھادی، کیونکہ زیادہ تر امریکی معاشی مفادات کے دفاع کیلئے فوج کو مشکلات میں ڈالنے کو برا نہیں سمجھتے۔ تو یہاں سوال اٹھتا ہے کہ کیا خلیج فارس کا تیل اتنا قیمتی ہے کہ اس کا دفاع امریکی فوجی قوت کے ذریعے کیا جائے؟ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کیلئے مزید چار سوالوں کے جواب حاصل کرنے ہوں گے۔ اول یہ کہ اگر امریکا خلیج فارس سے اپنی وابستگی ختم کر دیتا ہے تو اس بات کا کتنا امکان ہے کہ خلیج فارس سے تیل کے بہاؤ میں کوئی بڑی رکاوٹ پیدا ہو گی؟ دوم، اس رکاوٹ کا امریکی معیشت پر کتنا اثر پڑے گا؟

سوم، امریکا خلیج فارس سے تیل کے بہاؤ کی حفاظت پر کتنے فوجی اخراجات اٹھاتا ہے؟ آخری یہ کہ خلیج فارس کی حفاظت کیلئے غیر فوجی متبادل ذرائع کیا ہو سکتے ہیں اور اس پر کتنے اخراجات ہوں گے؟ ان سوالات کے جوابات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ خلیج فارس میں تیل کی ترسیل کے نظام کی حفاظت پر آنے والی لاگت، اس سے حاصل ہونے والے فوائد کے برابر پہنچ گئی ہے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ لاگت اس پالیسی سے حاصل ہونے والے فوائد سے بھی بڑھ جائے گی۔ سو یہ وہ وقت ہے جب امریکا کو خلیج فارس سے فوجی وابستگی ختم کر کیا ایسے متبادل ذرائع میں سرمایہ کاری کرنی چاہیے جو تیل کی ترسیل میں رکاوٹ کی صورت میں امریکی معیشت کو سہارا دے سکیں۔ ایک دہائی یا اس سے کچھ زیادہ وقت میں جب یہ خطہ آج سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہو چکا ہو گا تو امریکا کو اس مقام پر ہونا چاہیے کہ وہ خلیج فارس سے فوجی وابستگی مکمل طور پر ختم کر دے۔

موجودہ پالیسی کا صحیح جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ ایک غلط فہمی دور کرلی جائے۔ سیاستدان اور تجزیہ نگار اکثر یہ بات کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ تیل کے ترسیلی نظام میں آنے والی کسی رکاوٹ کے خطرے سے بچنے کیلئے امریکا کو تیل کی پیداوار بڑھانی ہوگی تاکہ درآمدی تیل پر انحصار کم سے کم ہو یعنی توانائی کے شعبے میں خود مختار ہو۔ یہ دلیل بنیادی طور پر تیل کی عالمی منڈی کے نظام کی ناسمجھی کو ظاہر کرتی ہے کیونکہ قابل مبادلہ اجناس کی تجارت میں خود مختاری کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دراصل تیل کی خرید و فروخت عالمی منڈی میں ہوتی ہے، اس لیے امریکا میں اس کی قیمت دنیا بھر میں تیل کی قیمتوں سے جڑی ہوئی ہے۔ تیل کی عالمی منڈی کی مثال ایک پانی کے ٹب کی سی ہے، جس میں پانی ڈالنے کیلئے بہت سے نل لگے ہوئے ہیں اور اس کی نکاسی کیلئے بھی بہت سی نالیاں ہیں۔ اس لیے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں کہ کسی ایک نل سے کتنا پانی آتا ہے اور کسی خاص نالی سے کتنا پانی بہتا ہے۔ رسد اور طلب کی بنیاد پر انحصار کرنے والی تیل کی منڈی میں زیادہ اہمیت تیل کی رسد کی ہے کیونکہ اگر تیل کی رسد تیزی سے کم ہوتی ہے تو ٹب سے پانی حاصل کرنے والے تمام صارفین ہی متاثر ہوں گے۔ اس لیے اگر امریکا کی خلیج فارس سے تیل کی درآمد صفر بھی ہو جاتی ہے، تو بھی خلیج فارس سے نکلنے والے تیل کی سپلائی متاثر ہونے کی صورت میں تیل کی قیمتوں میں آنے والی تبدیلیوں سے امریکا بھی متاثر ہوئے بنا نہیں رہ پائے گا۔

یہ تو سوچا جاسکتا ہے کہ امریکا کے خطے سے نکل جانے کی صورت میں تیل کی سپلائی کس طرح متاثر ہو سکتی ہے لیکن ان سوچے جانے والے آپشنز میں سے قابل عمل کوئی بھی نہیں لگتا۔ ایک امکان جس پر غور کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی خلیجی ملک اپنے پڑوسی ممالک پر قبضہ کر کے خطے میں موجود تیل کے بیشتر ذخائر پر قبضہ کرلیتا ہے تو پھر تیل کی عالمی منڈی میں قیمتیں کنٹرول کرنے کی کوشش کر سکتا ہے اور ایسا کوئی بھی اقدام تیل کے بڑے صارفین جیسے برطانیہ اور امریکا کی طاقت کو چیلنج کرنے کے برابر ہوگا لیکن یہ آپشن کسی طور پر ممکنات میں سے نہیں، کیونکہ خطے میں اتنی طاقت رکھنے والا کوئی ملک نہیں ہے۔ عراق امریکی حملے کے بعد سے تباہ ہو چکا ہے اور ابھی بھی انارکی کی لپیٹ میں ہے۔ ایران کو مغربی پابندیوں نے کمزور کر کے رکھ دیا ہے اور اس کے رہنما اندرونی مسائل سے نمٹنے میں مصروف ہیں۔ سعودی عرب کو یمن میں جنگ میں پھانس کر اپنے مقاصد حاصل کرنے بعد کے نتائج سے فوائد سمیٹ لئے گئے ہیں اور بالآخر سعودیوں نے بھی اس کرب سے نجات حاصل کرنے کیلئے خاطر خواہ اقدامات اٹھالئے ہیں اور اب وہ بھی خطے کو فتح کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔

دوسری فرضی صورتحال جس پر غور کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ خطے پر کنٹرول حاصل کرنے کی بالواسطہ جنگ سے خلیجی ممالک افراتفری اور انارکی کی لپیٹ میں آسکتے ہیں اور بنیادی انفراسٹرکچر تباہ ہو سکتا ہے جس سے تیل کی سپلائی بذریعہ بحری جہاز متاثر ہو سکتی ہے۔ لیکن بہت سے عوامل ایسے ہیں جو اس فرضی صورتحال کو حقیقت کا روپ دینے میں رکاوٹ ہیں۔ خطے میں کوئی بھی ایسی ریاست نہیں ہے جو اپنی اجارہ داری قائم کرنے کیلئے اتنی بڑی جنگ کا خطرہ مول لے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ملک کسی دوسرے ملک پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے لیکن یہ بھی آسان کام نہیں۔ ایران اور سعودی عرب ایک دوسرے کو نشانہ بنا سکتے تھے لیکن ان دونوں کو خلیج فارس نے ایک دوسرے سے الگ رکھا ہوا ہے اور ویسے بھی چین ان دونوں کے درمیان مفاہمت کے پل کا کردار ادا کر رہا ہے۔

عراق اندرونی تقسیم اور ایران کے ساتھ سرحد لگنے کی وجہ سے نسبتاً زیادہ غیر محفوظ ہے، لیکن ایران کو خود بے شمار چیلنجوں کا سامنا ہے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ امریکا کے عراق پر حملے کی صورت میں پیش آنے والی مشکلات سے بہت کچھ سیکھ چکا ہے۔ اس کے علاوہ تیل کے ذخائر کا بنیادی

انفراسٹرکچر اس قابل ہے کہ شدید جنگ کے دوران بھی کام دیتا رہے، جس کی واضح مثال 1980 کی ایران، عراق جنگ ہے، جب شدید جنگ کے دوران بھی تیل کی سپلائی کم ضرور ہوئی لیکن جاری رہی اور جنگ بندی کے کچھ ہی عرصے میں تیل کی قیمتیں دوبارہ مستحکم ہو گئیں۔

تیسری ممکنہ صورتحال یہ ہو سکتی ہے کہ ایران امریکا اور اس کے اتحادیوں کو مشکلات میں ڈالنے کیلئے آبنائے ہرمز سے ہونے والی تیل کی سپلائی میں رکاوٹ پیدا کرے۔ آبنائے ہرمز کا 21 میل کا بہت ہی تنگ سا راستہ ہے جہاں سے روزانہ 20 ملین بیرل تیل گزرتا ہے جو کہ عالمی پیداوار کا تقریباً 20 فیصد بنتا ہے باوجود اس کے کہ ایرانی فوج اس راستے کو مکمل بند کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی لیکن ماہرین کا کہنا ہے کہ وہ بارودی سرنگیں بچھا کر اور میزائل بوٹ کی مدد سے سپلائی متاثر ضرور کر سکتی ہے لیکن اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آیا ایران آبنائے ہرمز کو بند کرنے کا ارادہ رکھتا بھی ہے یا نہیں بہرحال سپلائی لائن بند کرنے سے اس کی اپنی پیداوار اور آمدنی بھی متاثر ہو گی اور پڑوسی ممالک بھی اس پر سخت ردعمل کا اظہار کریں گے۔ درحقیقت ایران نے کبھی ایسا کرنے کی کوشش بھی نہیں کی، حتیٰ کہ عراق جنگ کے دوران بھی نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر امریکا خطے سے اپنی کمٹمنٹ ختم کر دیتا ہے تو شاید ایران کبھی اس آپشن پر بھی غور کرنا شروع کر دے بہرحال یہ بات قابل فہم لگتی ہے کہ امریکا کے خطے سے نکل جانے کے بعد ایران جب ایٹمی معاہدے کی خلاف ورزی کرے تو اس پر مغرب کی لگائی جانے والی پابندیوں کے ردعمل میں وہ آبنائے ہرمز کے راستے کو بند کرنے کی کوشش کرے۔ ایسا سب کچھ ہونا آسان تو نہیں ہو گا لیکن اگر امریکا خلیج فارس کی حفاظت کا بیڑا اٹھانے سے انکار کر دے گا تو اس صورتحال کے حقیقت کا روپ دھارنے کے امکان میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب سابقہ امریکی صدر ٹرمپ نے ایران کے ساتھ کئے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یکطرفہ علیحدگی اختیار کر کے ایران پر شکنجہ کسنے کیلئے مزید پابندیوں کا اعلان کر دیا جس کے جواب میں ایران کی جوہری توانائی کے ادارے کے سربراہ علی اکبر صالحی نے عالمی میڈیا کو آگاہ کیا کہ آیت اللہ خامنہ ای نے متعلقہ حکام کو افزودگی کیلئے اپنی تیاریوں کو مزید تیز کرنے کا حکم دیا ہے اور اقوام متحدہ کے جوہری ادارے آئی اے ای اے کو بھی مطلع کر دیا گیا کہ ایران افزودگی کا سب سے اہم جزیورینیم ہیگزافلورائڈ زیادہ بنائے گا۔ اگر معمول کے مطابق کام کرتے تو شاید چھ سے سات سال لگ جاتے لیکن اب یہ آئندہ ہفتوں یا مہینوں میں تیار ہو جائے گا اور اب یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ایران اپنے پروگرام کی تکمیل کر چکا ہے۔

امریکا کی بددیانتی کے بعد تیل کی سپلائی لائن میں رکاوٹ پیدا کرنے والا آخری ممکنہ خطرہ یہ ہو سکتا ہے کہ تیل پیدا کرنے والے کسی بڑے ملک کے اندرونی حالات اس حد تک خراب ہو جائیں کہ تیل کی پیداوار متاثر ہو۔ اس ممکنہ صورتحال کا نشانہ سعودی عرب بن سکتا ہے۔ سعودی عرب نہ صرف عالمی پیداوار کا 10 فیصد سے زیادہ تیل پیدا کرتا ہے، بلکہ اس کے پاس تیل کے اتنے بڑے ذخائر ہیں کہ وہ دنیا بھر میں تیل کی سپلائی لائن متاثر کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ فی الوقت تو اس کی برآمدات بظاہر محفوظ دکھائی دیتی ہیں۔ سعودی فوج تیل کے ذخائر کی حفاظت پر مامور ہے اور وہ اس کام کو بہتر طریقے سے سرانجام دے رہی ہے۔ اس لیے کسی قسم کی دہشتگردی کی کارروائی ممکنہ طور پر ناکام ہی ہو گی۔

سعودی شاہی خاندان کو عمومی طور پر بادشاہت کا حقدار سمجھا جاتا ہے۔ ملک کے بیشتر عوام تیل کی دولت سے فوائد حاصل کر رہے ہیں اور جنرل راحیل اور ان کے دیگر ساتھیوں کی انتھک محنت اور عسکری مہارت کی بنا پر ملک کی فوج بھی پہلے کی نسبت کہیں زیادہ اعلیٰ مہارت کی حامل بن چکی ہے۔ یہی وہ سب وجوہات ہیں جنہوں نے بروقت سعودی عرب کو عرب بہار کے اثرات سے بچائے رکھا ہے۔ مزید یہ کہ خانہ جنگی کی صورت میں اگر کوئی نئی طاقت اقتدار سنبھالتی ہے تو اسے بھی تیل کی پیداوار کو جاری رکھنا ہو گا کیونکہ ملک کی معیشت مکمل طور پر تیل کی پیداوار پر انحصار کرتی ہے۔ اگر امریکا خلیج سے

اپنی کمٹمنٹ ختم کرتا ہے تو بھی وہ سعودی عرب کی داخلی سلامتی کیلئے اس کی فوج کو تربیت دینے کا عمل جاری رکھ سکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ خفیہ معلومات کا تبادلہ اور ہتھیار کی فراہمی بھی جاری رکھی جاسکتی ہے۔ مختصر یہ کہ اگر امریکا خطے سے اپنی فوجی کمٹمنٹ ختم کرنے کا فیصلہ کرتا ہے، تو تیل کی سپلائی متاثر ہونے کے امکان میں اضافہ تو ہو گا، خاص طور پر آبنائے ہرمز سے، لیکن یہ اضافہ نہایت معمولی ہو گا لیکن سوال یہ ہے کہ تیل کی سپلائی میں ایسی کوئی رکاوٹ کتنی مہنگی پڑ سکتی ہے؟ اور یہ خطے میں کسی ممکنہ بڑی جنگ کا پیش خیمہ بھی بن سکتی ہے۔

تیل کی سپلائی میں کسی قسم کی رکاوٹ کے باعث ہونے والے نقصانات کے بارے میں ماہرین کی پیش گوئیاں کافی خطرناک ہیں۔ حالیہ اعداد و شمار کے مطابق تیل کی عالمی پیداوار میں ایک فیصد کمی سے تیل کی عالمی قیمتوں میں 8 فیصد تک اضافہ ہو گا۔ ان اعداد و شمار کو سامنے رکھا جائے تو ایک لاکھ بیرل یومیہ تیل اگر کسی رکاوٹ کی وجہ سے کم سپلائی ہوتا ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ سعودیہ کی برآمدات صفر ہو جاتی ہے یا آبنائے ہرمز سے تیل کی سپلائی 60 فیصد کم ہو جاتی ہے، تو تیل کی عالمی قیمتیں دگنی ہو جائیں گی۔ دنیا نے ابھی تک ایسی کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کیا، لیکن ایسا ہونے کی صورت میں نقصان کا اندازہ لگانا مشکل ہے اور قیمت میں اس بھی زیادہ اضافہ ممکن ہے۔ تیل کی قیمتوں کا امریکا کی معیشت پر بھی گہرا اثر پڑے گا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق تیل کی قیمت دگنی ہونے کی صورت میں امریکا کی مجموعی ملکی پیداوار میں 3 فیصد کمی آئے گی، جو کہ تقریباً 550 / ارب ڈالر بنتی ہے اور کسی بڑی رکاوٹ کی صورت میں جیسے کہ آبنائے ہرمز سے تیل کی سپلائی مکمل طور پر بند ہونا، تو اس کے نقصانات بھی اتنے ہی خطرناک ہوں گے۔

لیکن اس کے حقیقی اثرات امریکا پر نہایت کم ہوں گے۔ کیونکہ ایسی صورت میں امریکا اپنے پیٹرول کے ذخیرے کا استعمال کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ قیمتوں کو کنٹرول کرنے کیلئے زیر زمین ذخائر کا استعمال بھی کر سکتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 700 ملین بیرل تیل اسٹریٹجک پیٹرولیم ریزرو میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ چار ارب بیرل سے زائد تیل عالمی توانائی ایجنسی کے ارکان ممالک کے پاس بھی موجود ہوتا ہے۔ (یہ تنظیم 1974 میں قائم کی گئی، جس کا مقصد دنیا بھر میں تیل کے بحران کی صورت میں مل کر اس کا مقابلہ کرنا تھا)۔ آبنائے ہرمز سے اگر تیل کی سپلائی آٹھ ماہ کے طویل عرصے کیلئے بھی بند ہو جائے تو یہ چار ارب بیرل تیل آٹھ ماہ تک اس کمی کو پورا کر سکتا ہے۔ ایسے کسی بحران کی صورت میں پہلے ایک ماہ تو امریکا اپنے ہاں سے 4-4 ملین بیرل تیل یومیہ نکالے گا اور اسی طرح عالمی توانائی ایجنسی کے ارکان ممالک بھی 8-5 ملین بیرل یومیہ اضافی تیل اپنے ذخائر سے نکال سکتے ہیں۔ چین جو کہ عالمی توانائی ایجنسی کا رکن نہیں ہے، لیکن وہ بھی اپنے ذخائر کا استعمال کر سکتا ہے، چین اپنی درآمد کے حساب سے 90 دن کے ذخائر رکھتا ہے۔ یہ تمام اعداد و شمار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ خلیج فارس سے تیل کی سپلائی میں کسی بڑی رکاوٹ کی صورت میں دنیا اگر باہمی طور پر کوئی لائحہ عمل اپنائے تو وہ یومیہ ہونے والے نقصانات کا ازالہ کر سکتی ہے۔

امریکی فوج کی خلیج فارس میں موجودگی کے معاشی فوائد اور نقصانات کا جائزہ لینے کیلئے ضروری ہے کہ اس کے وہاں رہنے پر آنے والے اخراجات کا جائزہ بھی لیا جائے۔ وہاں بھاری اخراجات تو امریکی جنگی جہازوں کو فعال رکھنے پر آتے ہیں۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سے پینٹاگون نے ایک وقت میں دو دشمنوں سے مقابلے کی جو حکمت عملی بنا رکھی ہے اس میں سے ایک دشمن کو ہمیشہ خلیج فارس میں سمجھ کر منصوبہ بندی کی جاتی

ہے۔ دو محاذوں پر لڑنے کی حکمت عملی اس لیے اپنائی گئی کہ کبھی ایسا موقع نہ آئے کہ امریکا کسی ایک محاذ پر اتنا پھنس جائے کہ موقع پرست دوسرے حماذ سے حملہ کر کے فائدہ اٹھالیں۔ اگر امریکا خلیج فارس میں جنگ کی تیاری کی حکمت عملی کو ترک کرتا ہے تو اس کے پاس دو آپشن بچتے ہیں،، ایک یہ کہ وہ دو دشمنوں سے ایک وقت میں لڑنے والی حکمت عملی جاری رکھے لیکن وہ دوسرا دشمن کسی اور خطے میں ہو، دوسرا یہ کہ وہ ایک وقت میں ایک جنگ کی حکمت عملی اختیار کرلے لیکن اس حکمت عملی میں خلیج فارس سے زیادہ خطرناک کوئی خطہ نہیں جہاں اس حکمت عملی کے تحت موجودگی برقرار رکھی جا سکے۔

خلیج فارس میں امریکی فوج پر آنے والے اخراجات کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے، کیونکہ وہاں موجود فوج اور بھی کئی جگہوں پر استعمال ہو رہی ہوتی ہے۔ ماہرین کے مطابق اگر امریکا ایک جنگ کی حکمت عملی اپناتا ہے تو ایک اندازے کے مطابق سالانہ 75 ارب ڈالر کی بچت ہوگی جو کہ دفاعی بجٹ کا 15 فیصد بنتا ہے۔ فوجیوں کی تعداد میں کمی، جنگی جہازوں کی تعداد میں کمی اور اسلحہ کی مقدار میں کمی لا کر یہ رقم بچائی جاسکتی ہے لیکن امریکا کی خلیج سے وابستگی صرف فوجیوں کی تعداد میں کمی تک محدود نہیں۔ اس خطے میں امریکا تیل کے حوالے سے اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے بالواسطہ یا بلاواسطہ کئی جنگیں لڑ چکا ہے، جن کی بھاری قیمت چکائی ہے۔ امریکا نے خلیج کی جنگ میں حصہ لیا تو بنیادی مقصد تیل کی سپلائی جاری رکھنا تھا۔ اگرچہ امریکی بیانئے کے مطابق عراق جنگ تیل کیلئے نہیں لڑی گئی لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ صرف دنیا کو دھوکہ دینے کیلئے تھا اور پالیسی سازوں کے ہاں عراق میں استحکام اور جمہوریت کی جو تڑپ نظر آتی تھی اس کی بنیادی وجہ وہاں موجود تیل کے ذخائر ہی تھے۔ اس لیے اب خلیج سے وابستگی ختم کرنے کے نتیجے میں نہ صرف ڈالر بچیں گے بلکہ قیمتی جانوں کا ضیاع بھی رک جائے گا کیونکہ اب خطے کے ممالک امریکی دھوکے کو سمجھ چکے ہیں۔

اس ساری بحث کے اختتام پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ خلیج فارس سے نکلنے والے تیل کی حفاظت کیلئے فوج کے استعمال کا متبادل کیا ہو سکتا ہے؟ اگر تیل کی رسد میں آنے والی رکاوٹ سے نمٹنے کیلئے فوج کا استعمال ہی بہتر آپشن ہوتا تو آج اس پالیسی کا دفاع کرنے والے بہتر پوزیشن میں ہوتے۔ درحقیقت امریکا بہت سے غیر فوجی ذرائع استعمال کر کے اس سپلائی کی حفاظت کو یقینی بنا سکتا ہے۔ ایک طرف تو امریکا تیل کے اپنے تزویراتی ذخائر میں اضافہ کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر امریکا اپنے (سٹریٹجک پٹرولیم ریزرو) میں فیصد کا اضافہ کرتا ہے تو وہ تیل سپلائی میں آنے والے کسی بڑے تعطل کی صورت میں عالمی طلب کو مزید چند ماہ پورا کر سکتا ہے۔ اور اس کام کیلئے اسے دس سے چالیس ارب ڈالر خرچ کرنے پڑیں گے جو وہ متاثرہ ممالک سے وصول کر سکتا ہے۔

اگر ہم امریکی اور یورپی ممالک کی پٹرول کی طلب کی طرف دیکھیں تو ان میں بیشتر ممالک اس دن سے پٹرول کا نعم البدل ڈھونڈنے میں مصروف ہیں جب شاہ فیصل مرحوم نے امریکا اور اس کے اتحادیوں کیلئے پٹرول فروخت نہ کرنے کا اعلان کر دیا تھا جس کے بعد دنیا میں ایک بھونچال آگیا تھا۔ اس دن کے بعد ایک خاص حکمت عملی کے تحت امریکی معیشت میں تیل کا حصہ کم کرنے کے اقدامات شروع کر دیئے گئے لیکن ابھی تک مکمل طور پر پٹرول کا نعم البدل ڈھونڈ نہیں پائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ امریکا اور یورپ نے ایسے پالیسیوں کا اجرا ضرور کیا ہے کہ معیشت پر تیل کی تبدیل ہوتی قیمتوں کا اثر نہ پڑے۔ امریکا میں نقل و حمل کا شعبہ 70 فیصد تیل استعمال کرتا ہے، اس لیے اس شعبہ پر خصوصی توجہ دینے کے عمل کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ جارج بش سے لے کر اوباما تک تمام صدور نے اس معاملے پر خصوصی توجہ دی لیکن ٹرمپ کے اقدامات نے نہ صرف اس خطے کو بلکہ دنیا کو تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا۔ دفاعی اور معاشی ماہرین اب بھی ان خطرات سے بچنے کیلئے جارحانہ پالیسیوں سے گریز کا مشورہ دیتے ہوئے وائٹ ہاس کو متنبہ کیا کہ ممکنہ خطرات

سے بچنے کیلئے امریکا اور اس کے اتحادیوں کو ہنگامی بنیادوں پر تیل کی کھپت کو کم کرنے کے اقدامات پر ابھی سے اقدامات کرنا ہوں گے۔ اس کیلئے پٹرول پر ٹیکس کی شرح بڑھانی ہوگی تاکہ عوام متبادل ذرائع کا استعمال بڑھائیں۔

امریکی ماہرین کے مطابق کچھ ترقیاتی اخراجات ایسے ہوتے ہیں جو طویل عرصے بعد نتائج دیتے ہیں، جیسے کہ ریسرچ کا شعبہ، اگر حکومت ریسرچ کے شعبے کیلئے مختص رقم میں اضافہ کردے تو اس کے نتیجے کی صورت میں 2035 تک ملک میں تیل کی کھپت میں 50 فیصد تک کمی ممکن ہو سکے گی۔ اس لیے حکومت اگر آئندہ 15 سالوں میں 100 س200 ارب ڈالر ریسرچ جیسے شعبہ جات پر خرچ کرتی ہے جو کہ تقریباً دس ارب ڈالر سالانہ بنتے ہیں، تو خلیج فارس کے دفاع پر آنے والے 75 ارب ڈالر سالانہ اخراجات سے بچا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ امریکا تیل کی سپلائی میں کسی رکاوٹ کے معیشت پر اثرات کم کرنے کیلئے مختلف اقدامات کر سکتا ہے۔ وہ اپنے ذخائر میں خاطر خواہ اضافہ کرے۔ کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں کسی بحران کے موقع پر امریکا کو اکیلے بوجھ برداشت کرنا پڑے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ واشنگٹن خلیجی ممالک پر بھی دباؤ بڑھائے گا کہ وہ آبنائے ہرمز پر اپنا انحصار کم کریں اور تیل کی پائپ لائن، جو کہ آبنائے ہرمز سے گزرتی ہیں ان کی استعداد بڑھائیں اور یہ کام وہ آسانی سے کر بھی سکتے ہیں۔

امریکی فوج کی خلیج فارس میں موجودگی کے فوائد و نقصانات کا جائزہ لینے کے بعد ون ورلڈ آرڈر کو نافذ کرنے والوں کی خواہش ہے کہ حالیہ حکمت عملی کلی طور پر غلط نہیں ہے کیونکہ کم خطرات سے نمٹنے کیلئے بھاری اخراجات کرنے پڑتے ہیں۔ لیکن اب سیاسی، دفاعی اور معاشی تجزیہ یہ نگاروں کے مطابق اس وابستگی کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ قومی سلامتی کے تناظر میں دیکھا جائے تو اب خلیج فارس سے آنے والے تعطل پر کسی بڑے نقصان کا خدشہ نہیں ہے۔ معاشی طور پر بھی ملک اب تیل کی سپلائی میں آنے والی کسی بھی رکاوٹ کو برداشت کر سکتا ہے اور آئندہ اس تیل پر انحصار مزید کم ہی ہوگا۔ موجودہ حالات میں امریکا کو خلیج فارس میں اپنی موجودگی برقرار رکھنے کی بجائے بتدریج خود کو ایسی پوزیشن پر لانا ہوگا کہ کسی بھی وقت وہ اس وابستگی ختم کر سکے۔ آنے والے دو عشروں میں تیل کے حوالے سے خود انحصاری حاصل کرنے کیلئے مزید سرمایہ کاری کرنی ہوگی، جیسا کہ ملکی ذخائر میں اضافہ، توانائی کا بہتر استعمال اور آبنائے ہرمز سے گزرنے والی تیل کی پائپ لائنوں کی استعداد میں اضافہ، ان اقدامات سے ملک جلد خود انحصاری حاصل کرلے گا۔

ادھر پینٹاگون نے پہلی مرتبہ اعتراف کیا کہ انہوں نے ٹرمپ کو اس بات پر قائل کرلیا تھا کہ تیل کے معاملے میں خود انحصاری کے بعد امریکا کو خلیج میں اپنی وابستگی وہاں موجود خطرات کو سامنے رکھ کر برقرار رکھنی ہوگی۔ ان خطرات میں سب سے نمایاں ایران ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ایران پر ایٹمی معاہدے میں مزید سخت شرائط عائد کرنے کے بعد اس بات کا قوی امکان ہے کہ اس سے وابستہ خطرات بھی کم ہوتے چلے جائیں گے۔ تیل کی درآمد سے پابندی ہٹنے کے بعد ایران شاید ہی کبھی خلیج فارس میں کسی گڑبڑ کا سوچے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے اس کو بہت بڑی آمدنی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ اس طرح جب ایران سے خطرات بھی نہ ہونے کے برابر رہ جائیں گے اور امریکا تیل پر خود انحصاری حاصل کرلے گا تو اس کو تیل کی سپلائی لائن کی حفاظت کی ذمہ داری سے جان چھڑا لینی چاہیے۔ لیکن اگر ایران جارحیت پر اترتا ہے تو پھر امریکا کو مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

ان دنوں خود امریکی عوام کے اندر یہ احساس بڑھتا جارہا ہے امریکا کو خلیج سے اپنی فوجی وابستگی کا خاتمہ جلد از جلد کرنا چاہئے، جس سے اس کے اخراجات میں نمایاں کمی ہوگی اور ترجیحات بدل جائیں گی۔ دوسری طرف اگر امریکا اپنی فوجی وابستگی برقرار رکھتا ہے، تو اسے اپنے دفاعی بجٹ کا بڑا حصہ اس مد میں

خرچ کرنا پڑے گا۔ بہر حال یہ فیصلہ تو امریکا کی خلیج فارس میں فوجی ترجیحات کی بنیاد پر ہو گا، جن میں جوہری پھیلاؤ سب سے اہم ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ فیصلہ سازوں نے دہائیوں سے خلیج میں فوج کی موجودگی پر کبھی سوال ہی نہیں اٹھایا باوجود اس کے کہ خلیج میں فوج کی ضرورت پہلے جیسی نہیں رہی ۔اس معاملے پر نظر ثانی نہ کرنا اور اس کے متبادل پر سرمایہ کاری نہ کرنا ایک بہت بڑی غلطی ہے۔اس غلطی کے نتیجے میں جہاں امریکا کو اربوں ڈالر کا نقصان ہو رہا ہے وہیں اپنی فوج کو غیر ضروری جنگ میں بھی الجھایا ہوا ہے اگر اس سفید ہاتھی سے جلد جان نہ چھڑائی گئی تو یہ سفید ہاتھی خود امریکا کو اپنے قدموں تلے کچلنا شروع کر دے گا۔ان تمام حقائق کے بعد غزہ پر اسرائیل کی وحشیانہ بمباری اور وائٹ ہاس کی پشت پناہی پر جس طرح اقوام عالم اور خود امریکا میں عوامی احتجاج کی لہر نے سر اٹھایا ہے، یقیناً اس بات کی توقع کی جاسکتی ہے کہ امریکی جنگی مافیا کو نکیل ڈالنے کا وقت آن پہنچا ہے۔

بروز 6 سوموار شوال المعظم 1445ھ 15 فروری 2024ء

لبرل جمہوریت کا بحران

"جب مذہب ابدی حقائق کی ارفع اقلیم کو ترک کر دیتا ہے، اور نیچے اتر کے دنیاوی جھمیلوں میں دخل اندازی شروع کر دیتا ہے، تو وہ اپنی اور دنیا و مافیہا کی ہر شے کی ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے"۔ (عثمانی سیاستدان، مصطفی فاضل پاشا، 1867ء)

10 اپریل 2018ء کو قومی قانون ساز مجلس (پارلیمان) سے اپنے ہفتہ وار خطاب کے دوران ترکی کے طاقتور صدر طیب اردگان اور ان کے وزیر تعلیم عصمت یلماز کے مابین ایک مختصر گفتگو ہوئی، جس کے کچھ حصے غلطی سے ٹیلی ویژن پر نشر ہو گئے جبکہ مائیکروفون کو بند رکھنے کا اہتمام تھا۔ یہ ایک دلچسپ منظر تھا۔ اپنے خطاب کے درمیان میں، اردگان نے یلماز کو اسٹیج (پوڈیم) پر بلایا، اور "الحادی الٰہیات پر رپورٹ" کے بارے میں دریافت کیا، جس کا ذکر ان کے کلیدی سیاسی اتحادی "دولت باغچہ لی" نے کچھ گھنٹے قبل ہی اپنی ایک تقریر میں کیا تھا جب وزیر صاحب نے، بصد احترام، اپنے صدر کو اس رپورٹ کے نتائج کی بابت آگاہی دینے کی کوشش کی، تو اردگان کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا، "نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا"۔

مذکورہ رپورٹ کو چند ہفتے قبل ہی ترکی کی وزارتِ تعلیم کی ایک مقامی شاخ نے تیار کیا تھا، اور اس نے اردگان حکومت کو "نوجوان نسل کے درمیان تیزی سے پھیلتی ہوئی الحادی الٰہیات" کے حوالے سے متنبہ کیا تھا۔ سرکاری جائزہ (رپورٹ) کے مطابق حکومت کی زیرِ نگرانی چلنے والے مذہبی اسکولوں کے اندر بھی الحادی الٰہیات کا کھوج ملا، یہاں تک کہ (دینی تعلیم دینے والے) امام حطیب نامی مکاتیب کے اندر بھی، جہاں اردگان کے دورِ حکومت میں حکومتی ترغیبات اور سرکاری بھرتیوں کے طفیل داخلوں کی تعداد آسمان کو چھو چکی ہے، طلبہ کی ایک کثیر تعداد اسلام پر ایمان کھو رہی تھی۔ رپورٹ کے نتیجے کے مطابق "مکمل الحاد کو اختیار کرنے کی بجائے، (ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھنے والے) نوجوانوں کی کثیر تعداد الحادی الٰہیات کا انتخاب کر رہی ہے"۔ اس سے مراد ہے کہ ایک نئی "پاک باز / نیکوکار نسل" کی آبیاری کے واسطے ہونے والی اردگان حکومت کی جان توڑ کاوشوں کے باوجود، ترکی کے نوجوانوں کا ایک قابل ذکر حصہ اسلامی عقیدے سے دور ہٹتے ہوئے، ایک غیر معین و غیر واضح خدا پر یقین کرنے کا انتخاب کر رہا ہے۔

حالیہ برسوں کے اندر اس سماجی رجحان کا مشاہدہ بہت سے دوسرے ترکوں کو بھی ہوا ہے، اور اس وقت یہ معاملہ ترک قوم کے ہاں زبان زدِ عام بن چکا ہے۔ ہماری نوجوان نسل الحادی الٰہیات کی جانب کیوں کر مائل ہو رہی ہے؟" اس سوال کے حوالے سے (ترکی کے) پرنٹ میڈیا میں سیکڑوں مضامین لکھے جا چکے ہیں اور ٹی وی پر درجنوں مکالماتی نشستیں منعقد ہو چکی ہیں۔ اپریل 2018ء میں ڈائریکٹر مذہبی امور، علی ایرباش نے پہلے پہل تو الحادی الٰہیاتی عقیدے کے فروغ کی بابت منظرِ عام پر آنے والی رپورٹوں کی مکمل تردید کی نیز اس امکان کو یکسر جھٹلایا کہ "ہماری قوم کا کوئی فرد (الحادی الٰہیت) ایسے گمراہ کن تصور میں دلچسپی لے سکتا ہے"۔ تاہم پانچ ہی مہینوں کے بعد ایرباش کے محکمے نے الحادی الٰہیت کے خلاف "اعلانِ جنگ" کر دیا۔

سوال یہ ہے کہ ترک قوم میں الحادی الٰہیت کی وبا کیوں پھیل رہی ہے؟ اس "الحادی الٰہیت کی وبا" جیسا کہ ترکی کے قدامت پرست مذہبی حلقے اس کو منسوب کرتے ہیں، کے پسِ پردہ قوت کیا ہے؟ اردگان کے بعض حمایتی پنڈتوں نے اس سوال کا جواب اسی شے میں کھوجا ہے کہ مغربی سازش کے اندازِ جہاں بینی کی بنیاد پر یہ وبا پھیل رہی ہے۔ مثال کے طور پر دنیائے صحافت (میڈیا) کے معروف مسلمان مبلغ نہاد ہاتپ اوغلو کے نزدیک "مغربی سامراج" نے جلیل القدر ترک قوم کو الحادی الٰہیت کا ٹیکہ لگایا، بالخصوص ایسے وقت میں ترکی کو کمزور کرنے کے واسطے جب وہ آخر کار دوبارہ سے شاہراہِ عظمت پر گامزن ہے نیز اپنی اسلامی بنیادوں کی جانب پلٹ رہا ہے۔ اعلیٰ سطح کے سرکاری مذہبی رہنما علی ایرباش کے نزدیک، نوجوان ترک نسل کے

الحادی الٰہیت کی جانب مائل ہونے کے پیچھے حقیقی قوت، مغربی "مبلغین" ہیں، جو مفروضے کے طور پر اس جتن میں ہیں کہ نوجوانوں کو "اسلام سے دور کرنے کی غرض سے جانب متوجہ کیا جائے اور پھر بعد ازاں ان کو مسیحی بنالیا جائے۔

تاہم دوسرے ترکوں کے نزدیک الحادی الٰہیت سے متعلق تمام تر بحث ایک بہت بڑی سازش کی بجائے اعلیٰ درجے کی ستم ظریفی پر مبنی ہے: ترک قوم، جو اپنی 99 فیصد مسلم آبادی" پر اکثر و بیشتر فخر کا اظہار کرتی ہے، اس کے اندر ایک ایسے وقت میں اسلام سے بے نظیر دوری وقوع پذیر ہو رہی ہے جب اسلام کے علمبردار یعنی اسلامیت پسند بشمول صدر طیب اردگان اور برسر اقتدار جسٹس اور ڈویلپمنٹ پارٹی میں اردگان کے وفادار حضرات، ماضی کے مقابلے میں سیاسی اعتبار سے نسبتاً بہت زیادہ طاقتور ہیں۔ درحقیقت، کوئی اس طرح سے استدلال کر سکتا ہے کہ یہ ایک ستم ظریفی نہیں ہے بلکہ ایک قابل فہم سلسلہ علت و معلول ہے:

اسلامسٹوں (اسلامیت پسندوں) کے اقتدار میں ہونے کی بدولت ہی اسلام سے دوری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ چونکہ جسٹس اور ڈویلپمنٹ پارٹی کا اقتدار، یقینی طور پر استبدادی، بدعنوان اور ظالم ثابت ہو چکا ہے، چنانچہ بعض ایسے لوگ جو اس پارٹی کی طاقت اور ایجنڈے سے خار کھاتے ہیں، وہ اسلام سے بھی دوری اختیار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ترکی میں بہت سے لوگ یہی دلیل دے رہے ہیں۔ ایسے لوگوں میں سے ایک تمل قارا ملّا اوغلو ہیں، جو حزبِ سعادت کے رہنما ہیں۔ جسٹس اور ڈویلپمنٹ پارٹی کی مانند اس پارٹی کی جڑیں بھی اسلام ازم (اسلامیت) میں پیوست ہیں، تاہم اس نے اردگان حکومت کے خلاف مرکزی سیکولر حزب اختلاف کے ساتھ اتحاد قائم کر لیا ہے۔ قارا ملّا اوغلو نے جون 2019ء میں کہا تھا کہ "مذہب کی نمائندگی کے دعویداروں کی بدولت ترکی میں خوف و آمریت کا راج ہے، اور اسی وجہ سے لوگ اسلام سے دور بھاگ رہے ہیں"۔ قارا ملّا اوغلو کی چھوٹی سی پارٹی مذہبی قدامت پرستوں کی ایک ایسی اقلیت، جس کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، کی نمائندگی کرتی ہے جو اردگان حکومت سے تنگ ہے۔ ایسے ترک رائے دہندگان (ووٹرز) کے سامنے دو نئی سیاسی جماعتیں بھی موجود ہیں، جو "اے کی پی" کے مرکزی سابقہ اہم رہنما ہیں انہوں نے اپنی راہوں کو اردگان سے جدا کر لیا ہے: سابق وزیر اعظم احمد داؤد اوغلو کی رہنمائی میں "فیوچر پارٹی" اور سابقہ ماہر معاشیات علی باباجان کی زیرِ قیادت "تحریک نجات" میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔

امریکا میں رہائش پذیر ترک ماہر سماجیات مجاہد بیلیجی ایک دوسرے نقاد ہیں، جو ایک باعمل مسلمان ہیں اور الحادی الٰہیت کی جانب بڑھتے ہوئے رجحان کو "ترکی اسلام ازم (اسلامیت) میں مذہبیت کے بحران" کا ایک حصہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک، مصطفی کمال کے سیکولر نظام کو آخر کار شکست سے دوچار کرنے کے بعد "ترکی مذہبیت نے آزادی کے ساتھ سانس لینے کا آغاز کیا ہے"۔ تاہم، اس کے نتیجے میں "ترکی مذہبیت کو آزمائش کی ایک بھٹی سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ مذہبیت سیاسی اعتبار سے کامیابی سے ہمکنار ہونے کے باوجود روحانی اعتبار سے ناکام ٹھہری ہے۔ مزید یہ کہ الحادی الٰہیت کا ظہور اس ڈرامائی ناکامی کا ایک نتیجہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس بات پر زور دینا چاہیے کہ اس عمل کا تعلق کمالی سیکولر ازم یعنی جدید ترکی کے بانی سیاست دان مصطفی کمال کی ریاستی سیادت کے تحت کارفرما سیکولرائزیشن منصوبے کے ساتھ بہت ہی کم ہے۔ اس کے برخلاف، یہ ایک نامیاتی سیکولرائزیشن ہے جو کلیتاً پرامن ہے اور ریاستی خواہش کے مطابق نہیں بلکہ سرکاری پالیسیوں کے باوجود رونما ہو رہا ہے۔ یہ ایک مقامی اور ترک روشن خیالی کا نتیجہ ہے نیز مابعد اسلامسٹ (اسلامیت پسند) جذبے کا ثمر ہے۔ اپنے والدین کے مذہبی دعوؤں، جنہیں وہ ریاکارانہ یا منافقانہ سمجھتے ہیں، سے مایوس ہو کر نوجوان نسل انفرادی روحانیت اور روایت کے ایک خاموش انکار کا انتخاب کر رہی ہے"۔

یادرہے کہ پچھلی دہائی میں جو کچھ ترکی میں ہوا ہے، وہ اس سے بدرجہا کم ہے جو پچھلی چار دہائیوں میں اسلامی جمہوریہ ایران میں ہو چکا ہے۔ وہاں بھی معاشرے کے نسبتاً زیادہ بلند آہنگ اسلامی طبقے، جسے سیکولر حکومت کے تحت لگ بھگ ایک صدی تک دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا تھا، نے ایک انقلابی ولولے کے ساتھ دوبارہ سے اقتدار حاصل کر لیا۔ ایران میں 1979ء سے شروع ہونے والا اسلامی انقلاب زیادہ واضح اور خونی اوصاف سے متصف تھا۔ اس کے برعکس، ترکی میں جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی کی حکومت میں زور پکڑنے والا انقلاب نسبتاً ملائم، بتدریج، جمہوری اور قدرے پرامن تھا۔ تاہم اس کے باوجود دونوں ملکوں کے حوالے سے یہ کہنا بجا ہے کہ یہاں نافذ اسلام ایک انتقامی جذبے کے تحت سیاسی قوت کی صورت میں سامنے آیا، لیکن اس سے صرف غیر متوقع نتائج برآمد ہوئے۔

یہی وجہ ہے کہ 1979ء کے ایرانی انقلاب کو اپنے اصل مقصد یعنی ایرانی معاشرے کی دوبارہ سے اسلام کی جانب واپسی کی بجائے، کم از کم جزواً ہی سہی تاہم اس کے الٹ، یعنی ایران کی اسلام سے دوری، کے حوالے سے کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ تہران جانے والے غیر ملکی روزمرہ زندگی میں اکثر و بیشتر ان نتائج کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ نکولس پیلم ایسے ہی ایک سیاح ہیں جو "دی اکانومسٹ" اخبار کے مشرق وسطیٰ میں نمائندے کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ ان کو 2019ء کے موسم گرما میں ایرانی انٹیلی جنس نے ہفتوں تک حراست میں رکھا اور پھر رہائی کے بعد ہی وہ درج ذیل مشاہدات کو رپورٹ کرنے کے قابل ہوئے۔

"ایران کی مذہبی شہرت کے باوجود تہران شاید مشرق وسطیٰ کا وہ دارالحکومت ہے جو سب سے کم مذہبی ہے۔ اخبار مذہبی رہنماؤں کی خبروں سے بھرے ہوتے ہیں، جو قسط وار ڈراموں میں معاشرے کے بڑوں کا کردار ادا کرتے ہیں، لیکن میں نے ان کو اشتہاری بل بورڈوں کے علاوہ گلیوں محلوں میں کبھی نہیں دیکھا۔ بہت سے دوسرے مسلمان ملکوں کے برخلاف، تہران میں اذان کی صدا تقریباً سنائی ہی نہیں دیتی۔ نئی مساجد کی تعمیر کے واسطے ایک بھرپور مہم برپا ہے، تاہم جمعہ کے روز نماز جمعہ ادا کرنے کی بجائے لوگوں کی اکثریت آرٹ گیلریز کو جاتی ہے۔ شراب ممنوع ہے تاہم پیزا کے مقابلے میں گھر پر شراب زیادہ جلدی پہنچائی جاتی ہے"۔

اپنے گھروں کی محفوظ چاردیواری کے اندر خواتین اکثر و بیشتر اپنے سر کو ڈھکنے والے حجابات کو اتار دیتی ہیں، جب وہ انٹرنیٹ پر گفتگو (چیٹ) کرتی ہیں۔ تاریک سینما ہال، اخلاقی نظم وضبط کا نفاذ کرنے والی پولیس کی نگاہ سے بچنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ کیفے میں خواتین بے اطمینانی کے سبب اپنے اسکارف کھول دیتی ہیں۔ قدرے زیادہ شوخ و بے باک خواتین دس برس کی قید کا خطرہ مول لے کر گلیوں میں بے حجاب نکلتی ہیں۔ ایران خود کو ایک مُلّائی حکومت قرار دیتا ہے، اس کے باوجود مذہبیت کو تلاش کرنا پریشان کن حد تک مشکل معلوم ہوتا ہے نیز حقیقی مذہبی پیروکار کسی اقلیت کی مانند حاشیے تک محدود دکھائی دیتے ہیں"۔

عمل صالح سے ہمہ گیر دُوری، اسلام کی تشکیلِ نو کی بابت ایرانی انقلاب کے ولولے کی ناکامی کی صرف ایک جہت ہے۔ اسلام سے کھلم کھلا انحراف نسبتاً زیادہ سنگین جہت ہے یعنی ایک انتہائی ناگوار فعل جس سے روکنے کے واسطے اسلامی جمہوریہ ایران سزائے موت کے نفاذ کی خواہاں ہے۔ جیسا کہ میں نے کسی دوسری جگہ لکھا کہ ایران مسلم اکثریت کا حامل ملک ہے جو مرتدین کی تعداد کے اعتبار سے سرفہرست ہے۔ ان سابقہ مسلمانوں کی اکثریت مسیحیت

اختیار کرتی ہے جس کی بدولت ایرانی کلیسا، دنیا کا سب سے تیزی سے پھلنے پھولنے والا چرچ ہے۔ ایک مطالعے کے مطابق، 1960ء سے لیکر 2010ء تک کے درمیانی عرصے میں دائرہ اسلام سے نکل کر مسیحیت اختیار کرنے والوں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی جو اب ایک حالیہ مطالعے کے مطابق یہ تعداد ڈھائی سے لیکر پانچ لاکھ لوگوں کے لگ بھگ تک پہنچ چکی ہے۔ مذہب بدلنے والوں میں سے بعض خفیہ طریقے سے اپنے نئے عقیدے پر عمل کرتے ہیں اور بعض اپنی جانوں کو بچانے کے واسطے بیرون ملک فرار ہو جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں، کچھ ایرانی مرتدین مسیحیت اختیار نہیں کرتے بلکہ اس کی بجائے کھلم کھلا "ملحد" بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں سے ایک اعظم کمگویان نامی خاتون ہے جو تاثینی حوالے سے سرگرم ہے اور بمشکل ہی ایرانی انقلاب کے ہاتھوں سے محفوظ رہی، بیرون ملک منتقل ہو گئی اور کئی کتابیں بشمول "لادینیت، مذہب سے چھٹکارا اور انسانی مسرت" تحریر کیں۔ ایک دوسری کتاب میں، مذکورہ خاتون نے نہایت پُرجوش انداز میں اس بارے میں لکھا کہ 1979ء کے بعد ایران میں "اسلام نے تین متواتر نسلوں کی زندگیوں، خوابوں، امیدوں اور امنگوں کو کیسے تباہ کر ڈالا"۔ یقیناً ان تمام عوامل کے پس پردہ قوت، اسلام بذاتِ خود نہیں تھا بلکہ اسلامی جمہوریہ ایران تھا۔ بظاہر یوں دکھائی دیتا ہے کہ مابعد انقلاب کے ایران میں ان دونوں کو باہم گڈمڈ کر دینا آسان ہے۔

عرب دنیا سے متعلق بھی جان لیجیے یقیناً یہ ایک بڑا اور متنوع منظر نامہ ہے، جو مختلف سیاسی تواریخ اور نظاموں کے علاوہ جدا جدا فرقوں، نسلوں یا قبائل کے حامل 22 آزاد ممالک پر مشتمل ہے۔ تاہم، عرب دنیا میں لادینیت کی ایک نئی لہر کے آثار کا مشاہدہ ممکن ہے۔ پرنسٹن اور مشی گن کی دانش گاہوں میں واقع عرب بیرومیٹر نامی ایک تحقیقی نیٹ ورک نے حال ہی میں اس قسم کے چند آثار کو نشان زد کیا ہے۔ چھ عرب ممالک (الجیریا، مصر، تیونس، اردن، عراق اور لیبیا) میں ہونے والی رائے شماری میں اس تحقیقی نیٹ ورک کے محققین نے اس بات کو دریافت کیا کہ "عرب مذہبی جماعتوں اور رہنماؤں کے حوالے سے بدظن ہو رہے ہیں"۔ چنانچہ پانچ برس کے عرصہ میں اسلامی جماعتوں پر اعتبار نہ کرنے والے عراقیوں کی تعداد 51 سے بڑھ کر 78 فیصد تک پہنچ گئی تھی، متذکرہ بالا ممالک میں "اسلامی جماعتوں پر اعتبار" کا تناسب 2013ء میں 35 فیصد تھا، جو 2018ء میں گھٹ کر 20 فیصد رہ گیا۔ مسجد میں جانے والوں کی تعداد میں بھی اوسطاً دس فیصد سے زیادہ کمی ہوئی، نیز 2013ء میں اپنے آپ کو "غیر مذہبی" کہنے والے عربوں کی تعداد 8 فیصد تھی جو 2018ء میں 13 فیصد ہو گئی۔

ایسا کیوں کر ہو رہا ہے؟ ایک جواب یہ ہے کہ حال ہی میں عرب دنیا کے اندر اسلام کے نام پر بہت زیادہ خطرناک واقعات رونما ہوئے ہیں۔ ان واقعات میں شام، عراق اور یمن میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہونے والی خانہ جنگیاں شامل ہیں، جہاں متحارب گروہوں نے اکثر و بیشتر انتہائی ظالمانہ انداز میں خدا کے نام پر جنگ میں حصہ لیا ہے۔ ان جنگوں سے متاثر ہونے والے لاکھوں مقامی اور دور بیٹھ کر ان حالات کا مشاہدہ کرنے والے، دونوں ہی مذہبی سیاست کے ہاتھوں شدید صدمے اور مایوسی کے تجربے سے گزرے ہیں، نیز چند ایک نے عمیق سوالات کو اٹھانا شروع کر دیا۔

سخت سوالات پوچھنے اور ان کے نتیجے میں مذہب سے ہاتھ دھو بیٹھنے والوں میں سے ایک، بغداد کا رہائشی 52 برس کا عمر رسیدہ ابو سمیع نامی شخص ہے، جس نے ایک "ڈھکے چھپے عراقی ملحد" کی حیثیت سے اپریل 2019ء میں امریکا کے خبر رساں ادارے قومی "این بی سی" نشریاتی کمپنی سے بات چیت کی۔ رپورٹ کے مطابق، اس نے کہا کہ "ہم سنتے تھے کہ اسلام امن کا دین ہے، تاہم داعش نے عفریتوں اور وحشیوں، بلکہ ان سے بھی بدتر سلوک کیا"

اوراسی نکتے کے سہارے ابو سمیع نے ایک بڑا موقف اختیار کیا"کیا اسلام ایک امن پسند مذہب ہے؟ بالکل نہیں، اور میں ایسے مذہب کا حصہ بن کر نہیں رہنا چاہتا"۔

ایک دوسرا عراقی شہری، اسلامسٹ (اسلامیت پسند) دانشور اور محقق "غالب الشابندر بھی اس صورتحال کا جائزہ لے رہا ہے اور ایک مسلمان کی حیثیت سے اس بابت پریشانی کا شکار ہے۔ وہ تنبیہ کرتا ہے کہ اسلامی جماعتوں کی الٹی حرکتوں کی بدولت لادینیت کی ایک لہر عراق میں پھیل جائے گی۔ یہی وہ حرکتیں ہیں جس نے لوگوں کو اسلام و دیگر مذاہب کو ترک کرنے پر مجبور کر دیا ہے"۔

داعش اور اس کے ذیلی گروہوں کی بربریت کے علاوہ، بشارالاسد حکومت کے جبر کے نتیجے میں، کٹے پھٹے ہمسایہ ملک شام میں بھی ایسا ہی رجحان موجود ہے: "شامی نوجوانوں کے ہاں ارتداد میں اضافہ"۔ تشدد اور انتشار کی اس صورتحال کے بیچوں بیچ، مصری لکھاری شام العلی لکھتا ہے کہ مذہب اسلام پر ہونے والی تنقید پہلے سے زیادہ زور پکڑ چکی ہے، اور بہت سے شامی نوجوان بالخصوص یورپ کے باسی، اپنے قدیم مذہبی طرزِ حیات کو ترک کر رہے ہیں"۔ وہ مزید کہتا ہے کہ "اجتماعی سطح پر بھی عرب سوشل میڈیا مذہب مخالف نقادوں اور ان کے (مذہب دشمن) مواد سے لبالب ہے، جو اس بات کی پرجوش دعوت دیتا ہے کہ مذہبی اساطیر کی حیثیت کو از سرنو طے کیا جائے، یا پھر وہ مذہبیت کا خوب ٹھٹھا اڑاتا ہے"۔

سوڈان بھی اسلام ازم (اسلامیت) کے ایک ہولناک تجربے سے گزرا ہے۔ مسلم اکثریت کی حامل افریقی قوم نے 1989ء تا 2019ء کا عرصہ، فوجی صدر عمر البشیر کی آمرانہ حکومت کے تحت گزارا ہے۔ 2019ء کے اوائل میں ہونے والے عوامی احتجاجوں یا "سوڈانی انقلاب" کے نتیجے میں البشیر کا اقتدار ختم ہوا، اور اس کی حیران کن بدعنوانی بھی آشکار ہوئی: سیکورٹی فورسز نے 350 ملین ڈالر کی نقدی صرف اس کی رہائش گاہ سے برآمد کی۔ یہ ایک عوامی سبق تھا کہ "ایک شخص جس نے اپنے غربت زدہ ابتدائی حالات کا ذکر کرتے ہوئے ہمیشہ عوامی جذبات کو بھڑکایا تھا"، وہ صرف "عوام کی نسلوں کی تباہی کے واسطے اپنے لالچ اور ہوس" کو چھپا رہا تھا اور عوام نے واقعی یہ سبق سیکھ لیا۔ قطری نژاد ایک ممتاز مسلم عالم، عبدالوہاب الآفندی کے بقول، مابعد انقلاب دور کے سوڈان میں "اسلام ازم بدعنوانی، منافقت، ظلم اور بدعقیدگی کا نشان بن گیا۔ معروف معنوں میں سوڈان ہی وہ پہلا ملک ہے جو حقیقی معنوں میں (اسلامیت پسندوں کا) مخالف ہے"۔

اس موقع پر یہ نشاندہی کر دینا شاید کارآمد ثابت ہو کہ ہم یہاں دو باہم منسلک مگر امتیازی رجحانات کے متعلق بات کر رہے ہیں۔ ترکی، ایران، سوڈان اور کسی بھی دوسرے ملک میں اسلام ازم (اسلامیت) بیزاری، عین ممکن ہے کہ خود اسلام بیزاری کی جانب لے جائے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بیزاری، لادینیت یا الحادی الٰہیت یا پھر مسیحیت کی جانب لے چلے یا پھر ہو سکتا ہے کہ مذکورہ امر کے سبب انسان نسبتاً کم سیاسی عقیدے کی آرزو کرنے لگے۔ مؤخر الذکر سبب یقیناً تمام "مابعد اسلامسٹ" پس منظروں میں موجود ہے، اور ہو سکتا ہے کہ آخر میں مذکورہ رجحان (نسبتاً کم سیاسی عقیدے کی آرزو) مکمل ترکِ اسلام کے مقابلے میں زیادہ زور پکڑ لے۔

تاہم اسلام ازم کو سنی یا شیعہ اسلام کے مرکزی دھارے سے جدا کرنا سہل نہیں ہے۔ اسلامسٹ (اسلامیت پسند) جماعتیں مثلاً مصر میں اخوان المسلمون، شاید مذہب کو سیاست سے مزید آلودہ کر رہی ہوں نیز دہشتگرد گروہ اس آلودگی میں اندھا دھند تشدد جیسے گمراہ کن عنصر کا اضافہ کر رہے ہیں۔ تاہم یہ سبھی لوگ (اسلامیت پسند جماعتیں اور دہشتگرد گروہ) اسلام کی فقہی روایت یعنی نفاذِ شریعت کے علمبردار بن رہے ہیں۔ وہ شریعت جس کی مرکزی

تعبیرات ایسے احکامات پر مبنی ہیں جن کی قبولیت جدید زاویہ نگاہ کیلئے دشوار ہے مثلاً مرتدین اور توہین رسالت کے مجرموں کیلئے سزائے موت، زانی کیلئے سزائے رجم، چوروں کے ہاتھ کاٹنا، کئی گناہوں پر سرعام کوڑے مارنا، خواتین پر لباس کے ضابطوں کی پابندی، عورتوں پر مردوں کی حاکمیت، غیر مسلموں پر مسلمانوں کی برتری، اور مجموعی طور پر ایک ایسے تنگ نظر معاشرے کا کلی تصور جو نہ صرف مذہب پر استوار ہے بلکہ مذہب اس پہ نگہبان ہے۔

شامی نژاد عوامی دانشور محمد شاہرور (متوفی 2019ء) نے، جن کے اسلام سے متعلق اصلاح پسند تصورات کو عرب دنیا میں بڑے پیمانے پر موضوع بحث بنایا گیا ہے، اس نکتے پر زور دیا ہے کہ مسئلہ صرف اسلامسٹوں (اسلامیت پسندوں) کی جانب سے نہیں ہے جو شاید نفاذ شریعت کے واسطے مخصوص سیاسی لائحہ عمل کے حامل ہیں، بلکہ مرکزی دھارے کے ان روایتی اہل علم یعنی علما کی جانب سے بھی ہے جو شریعت کی قدیم تعبیرات کے علمبردار ہیں۔ اپنی ایک تحریر میں مسلمانوں کو "تنقیدی استدلال" کی دعوت دیتے ہوئے شاہرور نے لکھا:
ابتدا میں ہم سمجھے کہ اسلام ازم (اسلامیت) کو علما کے ہاں موجود ٹھوس علمی روایت سے انحراف کی حیثیت سے بیان کیا جائے گا، اور ہمیں علما سے توقع تھی کہ وہ اسلامسٹوں (اسلامیت پسندوں) نیز سیاسی اسلام اور ساری دنیا کو مسلمان کرنے سے متعلق ان کے جارحانہ جذبات کی تردید کریں گے۔ ہمیں اس وقت بہت حیرت ہوئی جب ہم نے ذی وقار علما کی جانب سے کسی قسم کے تردیدی بیان کی بجائے ایسی قانونی تشریحات سنیں جو بنیادی طور پر اسلامسٹوں (اسلامیت پسندوں) کے من گھڑت دعوؤں سے اغماض برتتی تھیں۔ ہم نے تب جانا کہ درحقیقت ارتداد، جہاد اور جنگ و جدل سے متعلق علما کی تعبیرات اسلامسٹوں کی آرا سے زیادہ مختلف نہ تھیں"۔

اس پس منظر میں، معاصر زمانے میں اسلام بیزاری صرف اسلامسٹوں (خواہ اخوان المسلمون جیسی سیاسی تحریکوں کی صورت میں متعین ہو، یا پھر انتہائی رخ پر دہشتگردوں کی صورت میں سامنے آئے) کی بدولت ہی نہیں ہے، بلکہ قدامت پسند سنی، سلفی، یا شیعہ علما کے کارن بھی ہے، جو حریت، مساوات اور انسانی حقوق جیسے جدید تصورات کے مخالف مذہبی نقطہ ہائے نظر کے حامی ہیں۔

مثال کے طور پر سعودی عرب کی مثال لے لیجیے، جس نے حال ہی میں اخوان المسلمون جیسے اسلامسٹوں کی غضب ناک طریقے سے مخالفت کی ہے، تاہم اپنے ہاں شریعت کی سخت ترین قسم کو نافذ بھی کر رکھا ہے۔ سعودی حکمران "لادینی افکار سے متعلق کسی بھی قسم کی تبلیغ، یا مذہب اسلام کے بنیادی ارکان پر سوال اٹھانے" کو دہشتگردی کے برابر جرم قرار دیتے ہیں۔ تاہم جیسا کہ حاکم خطیب جیسے صحافی کے مشاہدے میں آیا، "سعودی بادشاہت کے بہت سے شہری اسلام سے منہ موڑ رہے ہیں" اور ان میں سے بعض ویب گاہ پر اپنے خیالات وضاحت سے لکھ رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ ان پر نافذ کردہ اسلام کی سخت تعبیر کا جبر ہے اور دوسری وجہ اس امکان پر مبنی ہے کہ ایک متبادل دنیا کا ذائقہ چکھا جائے۔ بقول خطیب "دیگر اشیا کے علاوہ، غالباً جو شے سعودی باشندوں کو ان کے مذہب سے دور لے جا رہی ہے، وہ سعودی عرب میں نافذ کردہ سخت گیر اور غیر انسانی اسلامی قانون نیز معلومات اور بڑے پیمانے پر ترسیل معلومات تک آسان رسائی ہے"۔

عقیدے سے دوری کے اصل تناسب کا اندازہ لگانا دشوار ہے کیونکہ اس حوالے سے کوئی (باقاعدہ) سروے نہیں ہے نیز بیشتر لوگ اس موضوع پر بات کرنے میں محتاط ہیں۔ تاہم یہ معاملہ نہ صرف سعودی عرب میں بلکہ دیگر ہمسایہ بادشاہتوں میں بھی نہایت سنجیدہ مسئلے کی صورت اختیار کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے، جسے میڈیا بھی اٹھا رہا ہے کہ "ہمارے خلیج فارس کے معاشروں کی نوجوان نسل میں لادینیت کو قبول کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے"۔

(لادینی فکر کی ترویج میں) انٹرنیٹ اور بالخصوص سوشل میڈیا ایک کلیدی کردار ادا کرتا ہے جیسا کہ اکثر و بیشتر اس جانب اشارہ کیا جاتا ہے، تاہم محض ایک برآمد شدہ "ملحدانہ خیال" کے علمبردار کی حیثیت سے نہیں جیسا کہ قدامت پسندوں کا عمومی ایقان ہے، بلکہ ایک آزاد مقام کی حیثیت سے، جہاں لوگ (مذہب سے متعلق) اپنے داخلی اضطراب کو بیان کر سکتے ہیں اور ان میں ایک دوسرے کو شریک کر سکتے ہیں، جیسا کہ عبد اللہ حمید الدین نے 2019ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب "ٹویٹڈ ہیریسیز سعودی اسلام ان ٹرانسفرمیشن" میں اس بات میں اس بات کو اجاگر کیا۔ نوجوان نسل کے ہاں عقیدے سے محرومی میں اضافہ ہو رہا ہے، حمید الدین اپنے ذاتی تجربے کے ذریعے دکھاتے ہیں کہ ایسا صرف ان کے اٹھائے ہوئے سوالات کی بنا پر نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس کی ایک وجہ "روایتی مذہبی علما کی جانب سے دیے جانے والے گھڑے گھڑائے جوابات پر شک اور اضطراب" بھی ہے۔ ایسی ہی کہانیاں مراکش سے سننے کو ملتی ہیں جہاں سیاست اور قوانین قدرے نرم ہیں لیکن روایتی اسلام اور جدید اقدار کے مابین کشمکش ہنوز برقرار ہے۔ اس کشمکش کی بدولت ترکِ اسلام کرنے والوں میں سے ایک سابقہ مسلمان محمد نامی شخص ہے، جس نے ایک مغربی استاد کے ساتھ بات چیت کی۔ بظاہر یہ دکھائی دیتا ہے کہ اس کے مسلمان ساتھیوں کی خودراستی اس کے لادین ہونے کی وجہ بنی۔

اس کے ترکِ دین کا بنیادی محرک اہل اسلام کے ہاں اس حقیقت کا مشاہدہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو "ایک حتمی صداقت کے واحد مالک" سمجھتے ہیں۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ "صرف اور صرف مسلمان ہی جنت میں داخلے کے مستحق ہیں"۔ "تو باقی دنیا کا کیا بنے گا؟" محمد نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ نیز یہ بھی کہ "میرے ایک ہم جماعت کی ماں یہودی تھی۔ میں اس اچھی خاتون کے دوزخ میں جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا"۔

دیگر مراکشی ملحدین اپنے ترکِ اسلام کی بابت ایسی ہی ملتی جلتی وجوہات بیان کرتے ہیں۔ عبد اللہ نامی ایک سابقہ مسلمان کے نزدیک، اس کے ترکِ دین کی کلیدی وجہ اس کے رابطے میں آنے والے مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے ہاں ہم جنس پرستوں سے نفرت تھی۔ اس کا سوال تھا کہ "اگر خدا نے ہی ہم جنس پرستوں کو پیدا فرمایا ہے تو پھر وہ ان کے گناہوں کے سبب ان کو کیوں کر پھٹکار سکتا ہے؟"۔ ایک دوسرے سابقہ مسلمان کے نزدیک، "صنفی امتیاز جیسے اخلاقی مسائل کی بدولت جنم لینے والا تذبذب" ہی اس کے ترکِ دین کی حتمی وجہ ثابت ہوا۔

یہی وجوہات ہیں جن کی بنیاد پر شمالی افریقا سے لیکر جنوب مشرقی ایشیا تک اسلامسٹ (اسلامیت پسند) اور قدامت پسند علما مسلمانوں کو فرد اور رائے کی آزادی یا صنفی امتیاز جیسی جدید اقدار کے خلاف متنبہ کر رہے ہیں۔ ملائیشیا میں "لبرل ازم اور تکثیریت" کے خلاف مساجد میں خطبے دیے گئے، جبکہ اس کے سابق وزیر اعظم نے "انسانی حقوق پرستی" کی مذمت کی۔ سعودی عرب میں، وزارتِ تعلیم کے تحت سرکاری اسکولوں میں ایک پروگرام رواں دواں ہے، جو لبرل ازم، سیکولرازم اور "مغربیت" کے خلاف "مدافعت" پیدا کرتا ہے۔ اور ترکی میں اردگان کے حامی دانشور "لبرل جمہوریت بحران کا شکار ہے" کی دہائی دے رہے ہیں۔

بروز 9 سوموار شوال المعظم 1445ھ 18 فروری 2024ء

آخر یہ ہوا کیا ہے؟

امریکی سرزمین پر بسنے والوں نے 1776ء میں جب آزاد فضا میں سانس لینا شروع کیا تب اِس کے بانیان کی آنکھوں میں بہت سے خواب تھے۔ یہ خواب ہے۔ اِنسانی فطرت کے اِسی پہلو کو ذہن میں اُن کی اُمنگوں کے آئینہ دار تھے۔ زیادہ سے زیادہ طاقت اور خوشحالی کا حصول ہر دور کے انسان کی خواہش رہا رکھتے ہوئے امریکا کی جنگِ آزادی کے مرکزی کرداروں نے شبانہ روز محنت کے ذریعے آزادی کا ایسا فرمان جاری کیا، جس میں ریاست کے تمام مقاصد بھی سمائے ہوئے تھے اور زندگی کا معیار بلند کرنے کے مُحرّکات بھی کماحقہ بیان کر دیئے گئے تھے۔ فرمانِ آزادی کے اجراء کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ امریکا یا اُس سے باہر کسی کے ذہن میں نئے امریکا کے حوالے سے کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

امریکی فرمانِ آزادی کا مُسوّدہ صدر تھامس جیفرسن نے تیار کیا تھا۔ اُنہوں نے لکھا۔ ”تاریخ پر نظر دوڑائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی یہ لازم سا ہو جاتا ہے کہ معاشرے یا افراد ایک دوسرے سے تعلق ختم کریں اور زیادہ سے زیادہ طاقت کا حُصول یقینی بنانے کیلئے نئی اور بڑی اِکائی کھوجیں یا قائم کریں۔“ یعنی یہ لازم سا ہو گیا کہ امریکا نئے دوست تلاش کرے، نئے حلیفوں کے ساتھ مل کر آگے بڑھے۔ امریکا کے اوّلین قائدین نے دنیا بھر کے حالات کا جائزہ لے کر یہ طے کر دیا کہ اِس نئی آزاد ریاست کو قائدانہ کردار ادا کرنا ہے۔ اور اِس قائدانہ کردار کیلئے زبردست تیاری بھی کرنا تھی۔ امریکی فرمانِ آزادی کا بغور مطالعہ کیجیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی مرحلے ہی میں ملک کی نئی سمت کا جامعیت کے ساتھ تعیّن کر دیا گیا تھا۔ یہ سمت اپنی طاقت میں بے حساب اضافے کے ساتھ دوسروں اور بالخصوص کمزوروں کو زیادہ سے زیادہ کچلنے کے سِوا کچھ نہ تھی۔

برطانیہ سے آزادی حاصل کرنا امریکیوں کیلئے آسان نہ تھا۔ یہ مقصد بہت بڑے پیمانے پر قُربانیاں مانگتا تھا اور قُربانیاں دی بھی گئیں۔ امریکی انقلابی برطانوی شہنشاہ جارج کی فوجوں کے مقابل ڈٹ گئے۔ وہ اپنی دھرتی کو ہر قیمت پر آزاد کرانا چاہتے تھے۔ امریکی انقلابیوں نے قوم سے وعدہ کیا کہ وہ اُسے اپنے مستقبل کے تعیّن کا حق دلا کر ہی دم لیں گے اور اُنہوں نے واقعی ایسا کر دکھایا۔

امریکا کو غلامی کے شکنجے سے نکالنا ایک عظیم مقصد تھا، جس کیلئے غیر معمولی جذبے کے ساتھ برطانوی افواج کا سامنا کیا گیا۔ بڑے پیمانے پر قتل وغارت کا بازار گرم ہوا۔ امریکا میں بہت کچھ الٹ پلٹ گیا۔ بہت سی ہنستی گاتی بستیاں اُجڑ گئیں۔ معیشت غیر متوازن ہو گئی۔ معاشرہ شدید عدم استحکام سے دوچار ہوا۔ جب قتل وغارت اور عدم استحکام کی گرد بیٹھی تو امریکا آزاد ہو چکا تھا۔ امریکیوں نے برطانوی راج کا طوق اپنی گردن سے اُتار پھینکا اور ریاست ہائے متحدہ امریکا کی حیثیت سے دُنیا کے سامنے پیش ہو کر زندگی کا نیا سفر شروع کیا یا یُوں کہہ لیجیے کہ نئی زندگی کی ابتداء کی۔

معاشروں میں خواہ کتنا فرق ہو، وہ اِنسانوں ہی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ امریکی معاشرہ بھی اِنسانوں ہی پر مشتمل تھا۔ دوسرے معاشروں کے انسانوں کی طرح امریکی معاشرے میں بھی اچھے خصائل کے ساتھ ساتھ بُرے اوصاف بھی تھے مگر جب امریکیوں نے غلامی کا طوق اُتار پھینکنے کیلئے ہتھیار اُٹھائے اور برطانوی افواج کا ڈٹ کر سامنا کیا تو دُنیا نے اُنہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اُنہیں وہ احترام دیا جو آزادی کیلئے غیر معمولی قُربانیاں دینے والی کسی بھی قوم کے حصے میں آتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا امریکیوں نے آزادی کا حق ادا کیا۔ بہت غور کیجیے اور حقائق کا جائزہ لیجیے تو اِس سوال کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ

ہے کہ جو لوگ آزادی کے خواہش مند ہوتے ہیں وہ غلامی کا طوق گردن سے اُتار پھینکنے کے بعد دوسروں کی آزادی کا بھی احترام کرتے ہیں۔ طویل مدت تک دوسروں کے زیر دست رہنے سے اُنہیں اِتنا تو اندازہ ہو ہی چکا ہوتا ہے کہ زیر دست رہنا کیا ہوتا ہے اور غلامی کِس عذاب کا نام ہے۔ دنیا بھر میں جن اقوام نے بیرونی تسلّط سے چُھٹکارا پایا ہے اُنہوں نے بعد میں اپنی آزادی کی قدر کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی خود مختاری کی وقعت بھی محسوس کی ہے اور بہتر و مساوی تعلقات یقینی بنانے کیلئے کام کیا ہے۔

امریکا کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا یا شاید بہت کم ہوا۔ جو لوگ آزادی کی دولت پانے کیلئے بہت بے تاب تھے وہ اِس نعمت کو پانے کے بعد اپنے آپ سے اور اپنے رب سے کیے ہوئے تمام وعدے بُھول کر اُسی ڈگر پر چل دیے جس پر استعماری قوتیں گامزن رہی ہیں یعنی کمزوروں کا استحصال کرنے پر تُل گئے اور استحصال بھی ایسا کہ امریکا کو آزادی دلانے کی جدوجہد کے دوران ریاست کے جو مقاصد بیان کیے گئے تھے وہ سب کے سب محض ہدفِ استہزاء بن کر رہ گئے۔

امریکیوں نے اپنی گردنوں سے برطانوی غلامی کا طوق اُتار پھینکنے کے بعد غلامی کو جڑ سے ختم کرنے کی بھرپور کوشش کرنے کے بجائے اپنی بھرپور خوشحالی کیلئے غلامی ہی کو بہترین آپشن کی حیثیت سے اپنانے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اِس بات کو یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ جس لعنت سے چُھٹکارا پانے کیلئے عشروں تک جدوجہد کی گئی اور گردنیں کٹوائی گئیں اُسی لعنت کو امریکیوں نے دوسروں پر مُسلّط کرنے کا ذہن بنالیا! امریکی معاشرے میں غلامی کی لعنت موجود تھی۔ افریقا سے جن لوگوں کو غلاموں کی حیثیت سے خرید کر لایا گیا تھا، اُن کیلئے آزاد اور خوشحال زندگی کو ایک خواب ہی رہنے دیا گیا۔ افریقی نسل کے امریکیوں کو حیوانات کی سطح پر زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا رہا۔ جب اِس سے بھی تشفّی نہ ہوئی تو سفید فام امریکیوں نے غلامی کا دائرہ وسیع کرنے کی راہ پر گامزن ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ جو کچھ کرنا اور حاصل کرنا چاہتے تھے اُس کیلئے محض افریقی نسل کے غلام کافی نہ تھے۔ اب اُنہیں نئے غلام تلاش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اپنے مستقبل کا تعیّن کرنے کی طاقت اور اختیار حاصل کرنے کے بعد امریکی انقلابی سُکون سے نہیں بیٹھے بلکہ دوسری اقوام، معاشروں اور خطوں کا مستقبل مُتعیّن کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اُن پر یہ نشہ ایسا چڑھا کہ اب تک نہیں اُترا۔ آزادی کے بعد ابتدائی دور میں پیدا ہونے والی فِکری کجی نے بہت سے پڑوسیوں کا جینا حرام کیا۔ سب کو سیدھا کرنے کے جُنون کا آغاز اپنی ہی سرزمین سے ہوا۔ لاکھوں ریڈ انڈینز کو زندگی کے حق سے محروم کرنے کے ساتھ ساتھ افریقی نسل کے امریکیوں کو شدید جبر کے تحت غیر انسانی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا گیا۔

جس غلام معاشرے نے برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کی اُس نے اچانک یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ اِس دُنیا کے خالق نے اُسے پورے شمالی امریکا پر حکمرانی کے حق اور اختیار کے ساتھ آسمان سے اُتارا ہے! اِس معاملے میں امریکیوں کی سوچ ایسی راسخ ہوتی گئی کہ کچھ ہی مُدّت بعد اُن کے ذہنوں میں اِس حوالے سے کوئی اِشکال یا ابہام نہ رہا۔ یعنی اُنہیں "ازخود نوٹس" کے تحت یقین ہو گیا کہ حکم چلانا اُن کا پیدائشی استحقاق ہے اور اُن کے ہر حکم کی تعمیل کرنا دوسروں (غیر سفید فاموں) کا مقدور! اِسی کو اُنہوں نے اپنے لیے غیر ارضی یا فقید المثال مستقبل قرار دیا اور پھر اِس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کیلئے راہِ عمل پر چل پڑے۔

جو کچھ امریکا کے سفید فام اپنے لیے حاصل کرنا چاہتے تھے وہ بڑے پیمانے پر قتل و غارت اور خون خرابے کا طالب تھا۔ دوسروں سے کچھ چھیننے کی خواہش

ہو تو مزاحمت کیلئے بھی تیار رہنا چاہیے۔ امریکی سرزمین پر بھی یہی کچھ ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ سفید فام امریکیوں کے ذہنوں میں حکمرانی کا کیڑا پروان چڑھتا گیا اور دوسری طرف غیر سفید فام نسلوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا چلا گیا۔ امریکی پارلیمنٹ کے ایوانِ زیریں (ایوان نمائندگان) میں میری لینڈ سے منتخب ہونے والے نے امریکی انقلابیوں کو ایک الگ ہی راہ دکھائی۔ اُن کا کہنا تھا۔ ''ہمیں ایک بحر سے دوسرے بحر تک (یعنی پوری دنیا پر) مارچ کرنا چاہیے (یعنی حکم چلانا چاہیے) کہ گوروں کا یہی مقدور ہے، استحقاق ہے''۔ اِس ایک جُملے سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ جو ملک اِنسانیت کی اعلیٰ ترین اقدار کے تحفظ اور سیاست کے بہترین آئیڈیلز کو یقینی بنانے کے عزم کے ساتھ آزاد کرایا گیا تھا اُسی نے صریح نسل پرستی کی راہ پر گامزن ہونے کی ابتداء کی۔ امریکا نے جیسے ہی غلامی کی جادو نگری کو ختم کیا، قائدین نے یہ طے کر لیا کہ غلامی کے جادو ہی سے آگے بڑھنا ہے، ترقی کرنی ہے اور دنیا کو زیرِ نگیں رکھنا ہے۔

سفید فام امریکیوں کے ذہنوں میں یہ بات ٹھونس دی گئی کہ اُنہیں اِس دنیا میں صرف اِس لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ غیر سفید فام یعنی ''کلرڈ'' اقوام پر حکومت کریں، اُنہیں ہمیشہ اپنے زیرِ نگیں رکھیں، ضرورت پڑے تو اُن کے خلاف طاقت کا بے محابا استعمال کریں اور جہاں جہاں ناگزیر ہوں نسلی تطہیر سے بھی گریز نہ کریں۔ اگر گوروں کو یہ ثابت کرنا تھا کہ اُنہیں دُنیا بھر کی (ظاہر ہے غیر سفید فام) اقوام پر حکمرانی کیلئے نازل کیا گیا ہے تو پھر لازم تھا کہ بہت سوں کا راج ختم کر کے اُنہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا اور تاریخ شاہد ہے کہ ایسا ہی کیا گیا۔ ایسا کیے بغیر سفید فام نسل کی حکمرانی قائم ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ فقید المثال اور آسمانوں میں طے ہونے والا مستقبل حقیقی اور یقینی بنانے کیلئے حقیقت کی دنیا میں ابتداء امریکی سرزمین کے قدیم باشندوں یعنی ریڈ انڈینز سے کی گئی۔ امریکی فوج نے ریڈ انڈینز کی بڑی بڑی آبادیوں کو اُن کے گھروں اور علاقوں سے بے دخل کر کے اُن کی زمینوں پر قبضہ کیا اور تمام مکینوں کو مغرب کی طرف کوچ کرنے پر مجبور کیا۔ امریکا کے جن قدیم باشندوں نے اِس ظلم اور زیادتی کے خلاف ہتھیار اُٹھائے اُنہیں انتہائی سَفّاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ سفید فام امریکیوں کی نظر میں ہر اُس اِنسان کی کچھ بھی وقعت نہ تھی، جو اُن کے مقاصد کی راہ میں رُکاوٹ بنتا ہو یا بن سکتا ہو۔ جب اِنسانوں کا کوئی گروہ خود کو دوسروں سے برتر ثابت کرنے کیلئے تمام اُصولوں اور اقدار کو بالائے طاق رکھ دے تو صرف یہی ایک آپشن رہ جاتا ہے کہ طاقت زیادہ سے زیادہ استعمال کی جائے اور مخالفین کو جس قدر کچلا جاسکتا ہے، کچلا جائے۔

دنیا بھر میں ایسی اقوام کی کمی نہیں جو دوسری اقوام کو زیرِ نگیں کرتی ہیں، ریاستیں اور سلطنتیں قائم کرتی ہیں، اپنی طاقت اور لیاقت کا لوہا منواتی ہیں، دنیا سے بہت کچھ لیتی اور اُسے جواب میں بہت کچھ دیتی ہیں اور اِس پُورے عمل میں ایک طرف تو وہ بدنامی اور تذلیل سے دوچار ہوتی ہیں اور دوسری طرف اُن پر داد و تحسین کے ڈونگرے بھی برسائے جاتے ہیں۔ ہر دور کی بڑی طاقتوں نے دُنیا سے بہت کچھ چھینا اور اُسے بہت کچھ دیا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ظالم و جابر ریاستوں میں شدید اندرونی ردعمل کے مظہر کے روپ میں اصلاح پسند اُٹھے اور اُنہوں نے دنیا کو بہتر زندگی کے آداب سکھائے۔ دوسروں پر راج وہی قوم کر سکتی ہے جو خود کچھ ہو اور اپنی لیاقت کو طاقت میں تبدیل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہو مگر راج کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جسے زیرِ نگیں کیا جائے اُس کا وجود ہی مٹا دیا جائے یا ثقافتی و علمی شناخت ختم کر دی جائے۔ سفید فام امریکیوں نے ریڈ انڈینز کو کچلنے کے معاملے میں رحم اور کرم کے تصور کا ہر جُز اپنے ذہنوں سے کُھرچ کر پھینک دیا۔ انقلاب کے بعد کی پہلی صدی میں امریکا کے اصل باشندوں کو چُن چُن کر ختم کیا گیا۔ اُن کے علاقے چھین لیے گئے، زمینوں پر قبضہ جما لیا گیا جو تھوڑے بہت لوگ رہ گئے تھے اُنہیں ''ریزولیوشنز'' کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔ آج امریکی تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے بھی نہیں جانتے کہ کتنے ریڈ انڈینز کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ اِس حوالے سے دعوے تو بہت کیے جاتے ہیں مگر حقیقی

معنوں میں مُستند ریکارڈ کسی کے پاس نہیں۔ یہ ریکارڈ آئے بھی کہاں سے ؟جب ریڈ انڈینز کو تباہی سے دوچار کیا جارہا تھا تب اُن سے وابستہ ہر چیز، ہر تصور کو ختم کرنے پر خاطر خواہ توجہ دی گئی۔

ریڈ انڈینز پر ڈھائے جانے والے مظالم زیادہ بھیانک اِس اعتبار سے بھی تھے کہ اُن کے قتلِ عام پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اُن کی پوری ثقافتی شناخت ہی ختم کر دی گئی۔ انقلابی یعنی سفید فام امریکی طاقت اور برتری کے نشے میں ایسے چُور تھے کہ کمزور اور بُجھی ہوئی رنگت کا ہر اِنسان اُن کے نزدیک زندہ رہنے کا حقدار ہی نہ تھا۔ نسل پرستانہ تصور کے ساتھ یہ برتری کے جُنون کا انتہائی درجہ تھا۔ "اپنوں" سے فارغ ہونے کے بعد امریکی انقلابیوں نے اڑوس پڑوس پر نظریں جمانا شروع کیا۔ جو کچھ ریڈ انڈینز کے ساتھ کیا گیا تھا وہی کچھ میکسیکو کے باشندوں سے بھی روا رکھنے کی پالیسی اپنائی گئی۔ میکسیکو سے زیادہ سے زیادہ زمین ہتھیانے کا عمل شروع کیا گیا جو نصف صدی تک جاری رہا۔ امریکا 1848ء تک میکسیکو کی نصف سے زائد زمین ہتھیا چکا تھا۔ میکسیکو میں کئی نسلیں آباد تھیں۔ اِن تمام نسلوں سے امریکا نے کم و بیش وہی سُلوک کیا، جو ریڈ انڈینز کے مقدر میں لکھا تھا۔ کوئی بھی قوم یا نسلی گروہ اپنی زمین آسانی سے کہاں چھوڑتا ہے ؟ریڈ انڈینز کی طرح میکسیکو میں آباد نسلوں نے بھی امریکی طوفان کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی۔

امریکیوں کی طاقت زیادہ تھی، وہ زیادہ منظّم بھی تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُنہیں ہر قیمت پر اپنے ملک کی سرحدوں اور طاقت کو وسعت دینا تھی قیمت اُنہیں ادا کرنا تھی جنہیں امریکا کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا تھا۔

میکسیکو میں صدیوں سے آباد نسلوں کیلئے امریکی توسیع پسندی نے موت کے پیغام کا کردار ادا کیا۔ اِس توسیع پسندی کی بھینٹ چڑھنے والوں میں میکسیکو کے باشندے بھی نمایاں تھے۔ امریکی لکوٹا برادری کے مذہبی پیشوا اور جنوبی ڈکوٹا میں کے جان لیوا انتہا پسند تنظیم "وُنڈیڈنِی" حملے میں بچ جانے والے بلیک ایلک نے کہا تھا۔ "مجھے اب بھی عورتوں اور بچوں کی لاشوں اور باقیات کے ڈھیر یاد ہیں۔ میں نے یہ ڈھیر جوانی میں دیکھے تھے۔ خُوں رنگ مٹّی میں لاشوں کے ساتھ اور بھی بہت کچھ دفن ہو گیا۔ جن بے گناہوں کو سَفّاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے موت کے گھاٹ اُتارا گیا، اُن کے ساتھ اُن کے سپنے بھی ہمیشہ کیلئے مِٹّی میں مل گئے۔ دھاگا ٹوٹا تو مالا کے سارے موتی بکھر گئے"۔

امریکا کے انقلابیوں اور امریکا کی سرحدوں کو ہر حال میں وسعت دینے پر یقین رکھنے والوں نے جو کچھ میکسیکو میں کیا وہ ہر اُس اِنسان کو آزردہ کرنے کیلئے کافی تھا، جس کے سینے میں دھڑکنے کے ساتھ ساتھ تڑپنے والا دِل بھی ہو مگر امریکا میں کم ہی لوگوں کو یہ احساس ہوا کہ اُنہوں نے کسی سے کوئی بُرا سلوک روا رکھا ہے۔ میکسیکو کے باشندوں پر بھی زمین تنگ کر دی گئی، اُن کا جینا دُوبھر کر دیا گیا۔ کیا یہ سب کچھ درست یا جائز تھا؟ ظاہر ہے کہ میکسیکو کے باشندوں پر امریکی انقلابیوں اور آزادی پسندوں کے مظالم کو کسی بھی طور درست قرار نہیں دیا جاسکتا مگر حیرت اور شرم کی بات یہ ہوئی کہ امریکی کانگریس نے میکسیکو میں امریکی کارروائیوں کو بالکل درست، مناسب، حالات سے ہم آہنگ اور بروقت قرار دیا اور اِس سے بھی بڑھ کر شرم ناک بات یہ تھی کہ یہ سب کچھ جمہوریت کے نام پر کیا گیا! امریکی قائدین اور اہلِ دانش نے جمہوریت کے آئیڈیلز کو امریکی معاشرے کیلئے لازمے کی سی حیثیت دی تھی۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ امریکا حقیقی آزادی کا مفہوم ساری دُنیا کو سمجھائے گا۔ جمہوریت پسندی کا کلچر متعارف کرانے کا ڈھونگ رچایا گیا۔ دُنیا کو باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ امریکا ساری دنیا میں اصلاحات کا پرچم لہرا رہا ہے۔ امریکی اہلِ دانش نے اپنی تحریروں کے ذریعے مساوات، جمہوریت اور باہمی احترام

کا درس دیا مگر عملی سطح پر ایسا کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ عوام کی حکومت قائم کرنے کے نام پر جو کچھ بھی کیا گیا اُس کی پُشت پر زیادہ سے زیادہ زمین اور دولت حاصل کرنے کا مقصد تھا۔ بہت جلد یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ امریکا جمہوریت چاہتا ہے نہ حقوق کا احترام اور یہ کہ مساوات کے تصور کو عملی شکل دینا بھی اُس کی ترجیحات میں شامل نہیں۔ جو کچھ بھی کیا جارہا تھا اُس کی پُشت پر زیادہ سے زیادہ طاقت کے حُصول کی خواہش کار فرما تھی تاکہ کمزوروں کو دبوچ کر اُن کے وسائل پر قبضہ کیا جاسکے۔

کیا میکسیکو کے خلاف امریکی فوجی کاروائیوں کی راہ میں دیوار بننے والا کوئی نہ تھا؟ کیا تمام امریکیوں کا ضمیر سو گیا تھا؟ ایسا نہیں ہے، ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔ ہر معاشرے یا ملک میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو کسی بھی غیر اُصولی اور ظلم پر مبنی بات یا اقدام کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور حکومتی پالیسیوں کو یکسر مسترد کر دیتے ہیں۔ ایسے باضمیر لوگ امریکا میں بھی تھے۔ میکسیکو میں جب امریکی فوج نے کاروائیوں کا آغاز کیا تو اُسے اپنے ہی عوام کی طرف سے بھی مخالفت اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

امریکی فوج کے پاس آگے بڑھنے اور اپنے قائدین کے طے کردہ مقاصد کے حُصول کا صرف ایک راستہ تھا۔ یہ کہ نہتّے شہریوں کو موت کے گھاٹ اتارا جائے، اُن سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا جائے۔ امریکی فوج نے جب بے قصور اور نہتّے شہریوں کو قتل کرنا شروع کیا تو بہت سے باضمیر امریکی فوجیوں نے بھی اِس عمل کی مخالفت کی اور شہریوں کو قتل کرنے سے انکار کر دیا۔ جمہوریت کی سَربُلندی اور انسانیت کے اعلیٰ ترین اُصولوں کی پاسداری کے نام پر ہتھیار اُٹھانے والی فوج میں کوئی عام، نہتّے شہریوں پر ہتھیار اُٹھانے اور اُنہیں موت کے گھاٹ اتارنے میں کچھ باک محسوس کرے یہ بات جنرل جیکری ٹیلر سے برداشت نہ ہوئی۔ اُس نے زندگی جیسی نعمت پر نظم وضبط کو فوقیت دی۔ اُس کے نزدیک ہر حکم کی تعمیل کرنا ہی کسی فوجی کی زندگی کا واحد مقصد تھا ۔ حکم کی خلاف ورزی اُس سے بالکل برداشت نہ ہوئی۔ اُس نے میکسیکو کی سرزمین پر لڑنے سے انکار کرنے والے سیکڑوں امریکی فوجیوں کو سزائے موت دے دی۔

امریکیوں نے سب سے پہلے تو بحر اوقیانوس کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اپنی بھرپور طاقت کے مظاہرے کو دیگر تمام اُمور پر ترجیح دی۔ مقصود یہ تھا کہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ایک سپر پاور اُبھر رہی ہے، جو پوری دنیا پر اپنے اثرات قائم کرنے کی تیاری کر رہی ہے۔ جب اِس کنارے سے اُس کنارے تک اپنا راج قائم ہو چکا تب ''غیر ارضی مستقبل'' کا خواب دیکھنے والے سوداگروں نے اپنی آنکھوں میں ایک عظیم الشان سامراجی یا استعماری اقتصادی ریاست کے قیام کا خواب سمویا۔ گویا بِلّی تھیلے سے باہر آگئی۔ امریکا نے جمہوریت، مساوات، بنیادی حقوق اور انسان دوستی کی جتنی باتیں کی تھیں وہ دکھاوے کے سِوا کچھ نہ تھیں۔ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکی گئی تھی۔ مقصود صرف یہ تھا کہ دنیا دھوکا کھا جائے اور ہر بُرے عمل کو کسی نہ کسی اچھے کی بنیاد پر سمجھ کر اُسی طرح قبول کر لے جس طرح آنکھوں دیکھی مکّھی نگلی جاتی ہے۔ امریکا جو کچھ کر رہا تھا وہ واضح طور پر صرف اور صرف زیادہ سے زیادہ مالی منفعت یقینی بنانے کیلئے تھا۔ اقتصادی معاملات کو توسیع دینا مقصود تھا۔ اِس کیلئے طاقت کا استعمال ناگزیر تھا جو کیا گیا۔

اِس سوچ کے حامل لوگوں کا سربراہ (یعنی سرغنہ) کرنل چارلس ڈیبنی تھا جو ایک ریل کمپنی کا مالک بھی تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک ایسے امریکا کے خواب تھے جو دنیا بھر میں اپنی مرضی کی ہر چیز حاصل کر سکتا ہو، کوئی روکنے اور ٹوکنے والا نہ ہو۔ زیادہ سے زیادہ طاقت کا حصول یقینی بنانے اور دوسری قبور پر اپنا تاج محل تعمیر کرنے کیلئے ایسا ملک درکار تھا جو ہر قیمت پر آگے بڑھنے کا یقین رکھتا ہو۔ اس حوالے سے چارلس ڈیبنی کے ذہن میں کوئی ابہام نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ امریکا سُرعت سے اپنے مقاصد کے حصول کی کوشش کرے۔ اِس کیلئے عسکری مہم جوئی ناگزیر تھی۔ نوآبادیاتی طاقت بننے کی خواہش

کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر میدان میں آنے والے ملک کیلئے طاقت کا بے محابا استعمال ناگزیر ہوا کرتا ہے۔ کرنل چارلس ڈینبی کا کہنا تھا: ''ہمارا ملک جن حالات سے دوچار ہے وہ ہمیں بہتر کاروباری امکانات تلاش کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ ہمارے لیے لازم ہے کہ اب سرحدوں سے باہر جانے کا سوچیں اور ایک ایسا اقتصادی نظام تشکیل دیں، جس میں ہمارے ملک کیلئے بہت کچھ ہو۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ اشیا تیار کر رہے ہیں۔ اِس فاضل پیداوار کو بہتر انداز سے ٹھکانے لگانے کیلئے اب ہمارے لیے بیرونی منڈیاں تلاش کرنا ناگزیر ہو چلا ہے۔ ہمیں ایک ایسا بازار تلاش کرنا ہے جو سب سے بڑا ہو''۔

کرنل چارلس ڈینبی نے امریکی توسیع پسندوں کے عزائم پوری صراحت کے ساتھ بیان کر دیے۔ اُس نے بتا دیا کہ امریکا عسکری سطح پر جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ معاشی مفادات کو زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کرنے کی خاطر ہے۔ امریکی جنگِ آزادی کے دوران جن آئیڈیلز کی تشہیر کی گئی تھی اور لوگوں کو بہتر اور تابناک مستقبل کے خواب دکھا کر جس طور پُرجوش ہو کر میدان میں آنے کی تحریک دی گئی تھی وہ سب کچھ ایک طرف رہ گیا۔ مطمعِ نظر یہ ٹھہرا کہ اپنی طاقت میں غیر معمولی حد تک اضافہ کیا جائے اور نسبتاً کمزور اقوام کو زیرِ نگیں لانے کے معاملے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جائے۔

اپنے اسی فاشسٹ پالیسیوں کی بناء پر یہودی نژاد ہنری کسینجر نے پوری پلاننگ کے ساتھ ایک ورلڈ آرڈر ترتیب دیا۔ برسوں کی اس کی نوک پلک سنوارتا رہا۔ فری میسنز اور دیگر صہیونی طاقتوں نے اپنا پورا حصہ ڈالا اور بالآخر اس کو عملی شکل دینے کیلئے مشرقِ وسطیٰ کے میدان کو چنا گیا کیونکہ اس خطے میں امریکا کا مستقل تھانیدار شہنشاہ ایران نہ صرف اقتدار سے محروم کر دیا گیا بلکہ انقلاب ایران کی شکل میں خطے میں سب زیادہ مزاحمت اور ندامت اور امریکی غرور کو دیس نکالا مل گیا اور 40 سال حکمرانی کرنے والا شہنشاہ رضا شاہ پہلوی آسمان کی بلندیوں سے ایسا گرا کہ زمین اس پر تنگ ہو گئی۔ اپنی جان بچانے کیلئے نامعلوم وہ کس کس ملک میں پناہیں ڈھونڈتا رہا۔ کئی اسلامی ملک بدلے مگر ہر جگہ اسے اپنے لیے غیر محفوظ نظر آئی، امریکا کی بدقسمتی تھی کہ اس نے شاہ سے نمک حلالی نبھانے کی غلطی کر لی۔ امریکا کی یہ نمک حلالی امریکا کو بہت ہی مہنگی پڑی۔ ایرانی طلبا نے امریکی سفارت خانے کے سفارت کاروں کو یرغمال بنا لیا اور رضا شاہ پہلوی کو مانگ لیا۔

کہاں امریکا بہادر کہاں ایران؟ اور وہ بھی اس وقت کا ایران جب خمینی کے انقلاب کے بعد بہت بحرانی کیفیت کا شکار تھا؟ عراق بھی ایرانی سرحدوں پر ہر روز چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا اور شاہ کے وفادار بھی اس وقت کی حکومت سے برسرپیکار تھے۔ ایران کے اندرونی حالات بہت ہی ناگفتہ بہ تھے اور سرحدیں بہت ہی کشیدہ۔ تربیت یافتہ فوج بھی ابھی تشکیل نہیں دی گئی تھی، گویا سرحدوں پر بھی عوام ہی برسرپیکار تھے۔ طاقت کا غرور سر چڑھ کر بولتا ہے اور وہ اپنے سے ہر کمزور کو مچھر اور مکھی تک سمجھنے سے انکار کر دیتا ہے۔ جونہی ایرانی طلبہ نے ایران کے سفارت کاروں کو یرغمال بنایا اور اپنے شہنشاہ کی حوالگی کا مطالبہ کیا، ایران کا ایک طیارہ ہائی جیک کر لیا گیا جس میں مسافروں کی اکثریت کا تعلق ایران سے تھا۔ اغوا کاروں نے ایران پر زور ڈالا کہ وہ سفارتی اہلکاروں کو اغوا کاروں سے رہائی دلوائے ورنہ وہ مسافروں کو ایک ایک کر کے ہلاک کرتے رہیں گے۔ دنیا اس وقت دنگ رہ گئی جب مسافروں کی جانب سے انقلابیوں کو یہ پیغام دیا کہ اگر ہم سب کو ایک، ایک کر کے ہلاک بھی کر دیا جائے تو ایرانی حکومت امریکا کے آگے اپنا سر کبھی خم نہ کرے۔ کیا ایسے عزم و حوصلہ والوں کو شکست دی جا سکتی ہے؟ کیا دنیا ایسے مصمم ارادے والوں کو فراموش کر سکتی ہے؟ یہ بات یونہی جذباتی انداز میں نہیں کہی گئی۔ بزدل ہائی جیکرز نے ڈیڈ لائن کے بعد کئی افراد کو ایک ایک کر کے ہلاک بھی کیا لیکن جہاز کے مسافروں کا عزم و یقین متزلزل نہ ہوا اور دنیا بھر کے دباؤ کو امریکا برداشت نہ کر سکا اور جہاز میں سوار باقی سارے ایرانیوں کو رہائی دینی پڑی۔

طاقت کے اس گھمنڈ میں امریکا بہادر نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنے کمانڈوز اتار کر، بزور طاقت اغوا کرنے والوں کا نہ صرف صفایا کر کے ان کو اس گستاخی کا مزا چکھادیں بلکہ اپنے سفارتی عملے کو واگزار کرا کے ایک نہایت لاغر اور نحیف ملک میں اپنی چابک دستی کی دھاک بھی بٹھادیں۔ اس وقت خلیج فارس میں امریکا کے دو بحری بیڑے موجود تھے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ اس کے آٹھ ہیلی کاپٹر کمانڈوز کا پورا دستہ لے کر جائیں گے اور اغوا کرنے والوں کا قلع قمع کر کے اپنے سفارتی عملے کو اٹھائیں گے اور فتح و شادمانی کے شادیانے گاتے بجاتے لوٹ آئیں گے۔

تاریخ اس حیران کر دینے والے واقعے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی کہ ان کمانڈوز کے ساتھ کیا ہوا جو 8 ہیلی کاپٹروں پر سوار ہو کر اور یہ خیال کر کے آئے تھے کہ وہ ان کیڑے مکوڑوں پر آگ اور گولہ بارود کے شیلوں کا اسپرے کر کے ان کو فنا کی راہ دکھا کر اپنے ملک کے سفارت کاروں کو چھڑا کر شادیانے بجاتے ہوئے روانہ ہو جائیں گے ؟ زمین و آسمان اس بات کے گواہ ہیں کہ آٹھ میں سے فقط پانچ ہیلی کاپٹر تہران میں لینڈ کر سکے، تین آگ لگ کر راستے میں تباہ ہو گئے، پہنچنے والے پانچ بھی ریت کے طوفان میں پھنس کر اتنے بیکار ہو گئے کہ کارروائی کے قابل ہی نہیں رہ گئے، کمانڈر نے وہیں سے وائرلیس کے ذریعے صورت حال سے آگاہ کیا اور مدد طلب کی، ان کیلئے ایک ہوائی جہاز بھیجا گیا جس میں وہ اپنی جانیں بچا کر لے جانا چاہتے تھے لیکن دوران پرواز اس جہاز میں بھی آگ لگ گی اور وہ راستے میں تباہ ہو گیا۔ وہ قصر سفید کے فرعون کے اقتدار کا آخری دن تھا لیکن جمہوریت کے تمام دلدادہ ممالک امریکا کی مذمت کرنے کی بجائے اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے اور امریکا نے اپنی ذلت و رسوائی کا بدلہ لینے کیلئے اس خطے میں نئی سازشوں کا جال پھیلا دیا اور عراق اور ایران کے مابین ایک ایسی جنگ شروع کروادی جو کئی سال تک مسلمانوں کے مال و خون برباد کر کے اپنے انجام کو پہنچی۔

سعودی عرب اور کویت کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ کی برسوں کی پٹرول کی تمام آمدنی امریکی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی کا کام دے رہی ہے جس پر امریکا کی نظریں کافی عرصے سے للچا رہی تھیں۔ ایران عراق جنگ میں سعودی عرب اور کویت نے عراق کی جنگی بنیادوں پر اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے تھے لیکن ورلڈ آرڈر سازش کے تحت عراق اور کویت کے درمیان سرحدی علاقوں کا تنازعہ کھڑا کر کے پہلے ناچاقی میں اضافہ کیا گیا اور بعد ازاں عراق میں امریکی سفیر کی مبینہ سازشوں کی بناء پر صدام حسین کو کویت پر قبضہ کرنے پر اکسایا گیا اور جونہی عراقی فوج نے کویت پر قبضہ کیا تو دونوں میں امریکا بہادر نے اپنے درجن بھر اتحادیوں کے ساتھ عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اس کے بدلے میں سعودی عرب اور کویت سے جہاں ساٹھ ٹریلین ڈالرز اپنے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروالئے وہاں دونوں ممالک کی حفاظت کے نام پر مستقل طور پر فوجی اڈے بھی قائم کر لئے جو اب اس کی مستقل آمدنی کا ذریعہ بھی بن گئے ہیں۔

لیکن امریکا کی خون آشام سازشوں کا سلسلہ اس وقت اور دراز ہو گیا جب سوویت یونین نے افغانستان پر چڑھائی کر کے اپنی فوجیں داخل کر دیں۔ افغان قوم نے جس دلیری سے نہ صرف سوویت یونین کو شکستِ فاش دی بلکہ سوویت یونین کے بطن سے مزید چھ ریاستیں آزاد ہو گئیں اور سوویت یونین سکڑ کر روس رہ گیا۔ امریکا جس نے ان جری و دلیر قوم کی وساطت سے سوویت یونین کے دانت کھٹے کئے تھے، امریکا جنگ کی وجہ سے تباہ شدہ افغانستان کو چھوڑ کر واپس امریکا لوٹ گیا لیکن چند سالوں کے بعد نائن الیون کے بہانے اسی افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور امریکا کا خیال تھا کہ اس تباہ کن بمباری کے بعد افغان ہتھیار پھینک کر ان کے تابع ہو جائیں گے اور وہ بڑی آسانی کے ساتھ افغانستان کی پچاس ٹریلین کے معدنیات پر قبضہ کر لے گا لیکن طالبان کی شدید مزاحمت نے امریکا اور اس کے اتحادیوں کو ایسا سبق سکھایا کہ اس کے تمام اتحادیوں نے امریکا کی خواہش کے برعکس انخلاء میں عافیت سمجھی اور امریکا افغانستان میں اپنے شرمناک انجام بد کے ساتھ رخصت تو ہو گیا لیکن مکاریوں اور سازشوں میں ابھی تک مصروف ہے۔

امریکا آزاد تو ایک ایسے ملک کی حیثیت سے ہوا تھا جس میں جمہوری اقدار کے پنپنے کی بھرپور گنجائش موجود تھی مگر اِس حوالے سے کیے جانے والے تمام معصومانہ دعوے یا وعدے راتوں رات یُوں غائب ہو گئے کہ لوگ سوچتے ہی رہ گئے کہ آخر یہ ہوا کیا ہے۔

بروز جمعرات 13 شوال المعظم 1445ھ 22 فروری 2024ء

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

ایک زمانہ تھا جب پاکستان ٹیلی ویژن روزانہ بیروت بلفاسٹ اور ویتنام میں خانہ جنگی کی خبریں نشر کرتا تھا اور ہم سوچا کرتے تھے کہ ان ملکوں کا کیا حال ہو رہا ہو گا؟ وہاں معاشی سرگرمیاں کس طرح چل رہی ہوں گی۔ یہی حال فلسطین کا بھی نظر آتا تھا لیکن وہاں قبضہ کرنے والے انتہا پسند یہودیوں سے مقابلہ کی وجہ سے بات سمجھ میں آجاتی تھی بلکہ اب غزہ میں جاری ہونے والے ہولناک واقعات سے بھی آنکھیں چرائی جا رہی ہیں۔ 40 سال بعد افغانستان میں بھی امن کی ہواؤں نے بسیرا جما لیا ہے۔ ایک عرصہ گزر گیا، بیروت میں ملیشیاں کی لڑائی ختم ہو گئی ہے۔ بلفاسٹ میں امن ہو چکا ہے۔ ویتنام امن کے بعد نہ صرف اپنی معیشت سدھار چکا ہے بلکہ دنیا میں ویتنام کی مصنوعات پھیل رہی ہیں لیکن اب وہی خبریں پاکستان کے حوالے سے پاکستان اور عالمی میڈیا پر سنی جا رہی ہیں۔ ہر روز اس قسم کی خبریں سامنے آتی ہیں کہ بلوچستان میں اتنے دہشتگرد مارے گئے ہیں، قبائلی علاقوں کو خیبر پختونخواہ میں ضم کرنے کے باوجود سیکورٹی فورسز کے دہشتگردوں کے خلاف آپریشنز جاری ہیں۔ ہر روز محافظوں کے جنازے اس بات کے گواہ ہیں کہ دشمن طاقتیں اپنی سازشوں اور کاروائیوں میں بے مہار ہو چکی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ساری دنیا میں اب تک ہونے والی اس قسم کی کارروائیاں بیک وقت پاکستان میں شروع ہو گئی ہیں اور اب رہی سہی کسر انتخابات کے نتائج پر شکوک و شبہات نے نکال دی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ امریکا افغانستان سے رخصت ہو چکا لیکن ہمارے ہاں قبائلی علاقوں کے ساتھ ساتھ بلوچستان میں بارود کی آگ اب بھی ہمیں نگل رہی ہے بلکہ اس کے جواب میں اگر کوئی کاروائی ہوتی ہے تو پاکستانی حکومت اسے دہشتگردی بلکہ عالمی دہشتگردی قرار دیتی ہے۔ اس سارے عمل پر گزشتہ کئی برسوں کے دوران پاکستانی قوم کو متحد کرنے کی کوششوں کو سبوتاژ کیا گیا بلکہ اس سبوتاژ کی ذمہ داری بھی پاکستانی حکمرانوں اور حکومت کرنے والے اداروں پر عائد کی گئی چنانچہ پاکستانی حکومت اور ادارے ہر دوسرے تیسرے ہفتے ایک نیا شوشا چھوڑ دیتے ہیں تاکہ قوم کی توجہ اس جانب مبذول ہی نہ کرائی جا سکے۔ کبھی ججوں کا معاملہ تازہ کر دیا جاتا ہے کبھی آڈیو، ویڈیو کو میڈیا میں اچھالا جاتا ہے اور اپنے مخالفین کی کردار کشی کی تحریک شروع کر دی جاتی ہے۔ کبھی آٹا غائب کر کے لوگوں کو مسائل میں الجھا دیا جاتا ہے تو کبھی پٹرول اور ڈیزل کے نام پر ٹرانسپورٹ کرایوں میں اضافہ کر کے عوام کو مزید بوجھ تلے دبا دیا جاتا ہے۔ کبھی گیس کی عدم دستیابی سے عوام کو ایک نئے عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ انتشار کیلئے اس قسم کے شوشے چھوڑنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم ایک عجیب قسم کی بے یقینی میں سوشل میڈیا پر چلنے والے پروپیگنڈہ پر یقین کرتے ہوئے دشمن کی کامیاب پروپیگنڈے کا شکار ہو چکی ہے۔

بیروت بلفاسٹ سری لنکا یا ویتنام کی خبروں کو تو پاکستانی قوم ان ممالک کی خبریں سمجھتی تھی لیکن پاکستان میں ہونے والی یہ کاروائیاں کس ملک کی خبریں ہیں۔ اب ہر گزرتا لمحہ تشویش میں اضافہ کرتا جا رہا ہے۔ ساری قوم کو یہ دلاسہ دیا گیا کہ منصفانہ انتخابات کے بعد حق دار کو حکومت سونپ کر ملکی ترقی کا ایک نیا باب شروع کر دیا جائے گا لیکن یہاں تو معاملہ ایسا الجھتا جا رہا ہے کہ ڈور کا سرا ہاتھ میں آ ہی نہیں رہا۔ ہفتہ کی دوپہر کمشنر راولپنڈی لیاقت چٹھہ نے کرکٹ سٹیڈیم میں ہونے والی ایک عام سی پریس کانفرنس کے دوران یہ کہہ کر ملک بھر میں کھلبلی مچا دی کہ "میں نے راولپنڈی ڈویژن کے لوگوں کے ساتھ جو غلط کام کیا ہے، اس پر مجھے پنڈی کے کچہری چوک میں پھانسی کی سزا دینی چاہیے"۔

انتخابات کو گزرے ہفتہ عشرے سے زیادہ ہو گیا ہے لیکن ملک میں سیاسی بحران کا سورج ڈھلتا نظر نہیں آ رہا۔ ایک طرف سب ہی جماعتیں انتخابات میں مبینہ دھاندلی کے خلاف احتجاج کر رہی ہیں تو دوسری جانب کسی بھی سیاسی جماعت کو حکومت بنانے کیلئے سادہ اکثریت حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ الیکشن

کمیشن کی جانب سے جاری کیے گئے حتمی اور غیر سرکاری نتائج کے مطابق آزاد امیدوار 93 سیٹیں جیت کر سرفہرست ہیں، مسلم لیگ ن قومی اسمبلی کی 75 نشستوں پر جبکہ پاکستان پیپلز پارٹی کے 54، ایم کیو ایم پاکستان 17، جے یو آئی قومی اسمبلی میں مجموعی طور پر چار، بلوچستان اسمبلی میں 11 اور خیبر پختونخوا اسمبلی میں 7 نشستیں اور دیگر جماعتوں کے 25 امیدوار کامیاب ہوئے ہیں یعنی کسی کو بھی سادہ اکثریت حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ اس وقت تمام جماعتیں وفاق میں حکومت بنانے کیلئے سیاسی جوڑ توڑ کیلئے سرگرم تو ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ پہلی مرتبہ حکومت بنانے میں ہچکچاہٹ دیکھنے کو مل رہی ہے۔ مولانا فضل الرحمان نے اپنی جماعت کی مجلس عاملہ وصوبائی امراو نظما کے اجلاس کے بعد گذشتہ روز نہ صرف انتخابی نتائج کو مسترد کرتے ہوئے اپوزیشن بنچوں پر بیٹھنے کا اعلان کیا بلکہ پاکستان مسلم لیگ ن کو بھی اپوزیشن بینچز پر بیٹھنے کی دعوت دی ہے۔ مولانا فضل الرحمان نے 8 فروری 2024 کے انتخابی نتائج کو مجموعی طور پر مسترد کرتے ہوئے مؤقف اختیار کیا ہے کہ الیکشن کمیشن اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں یرغمال بن رہا ہے اور یہ کہ "جے یو آئی سمجھتی ہے کہ پارلیمنٹ اپنی اہمیت کھو بیٹھی ہے اور جمہوریت اپنا مقدمہ ہار رہی ہے۔ اگر اسٹیبلشمنٹ سمجھتی ہے کہ الیکشن صاف شفاف ہوئے ہیں تو پھر اس کا معنی ہے کہ فوج کا 9 مئی کا بیانیہ دفن ہو چکا اور عوام نے ان کے غداروں کو مینڈیٹ دیا ہے"۔ انہوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ اب لگتا ہے کہ فیصلے ایوان کی بجائے میدان میں ہوں گے تاہم مولانا فضل الرحمان نے واضح کیا کہ ان کے جیتنے والے اراکین قومی اسمبلی کے اجلاسوں میں شرکت کریں گے۔

یاد رہے کہ 8 روری کو نواز شریف نیخواہش ظاہر کی تھی کہ "جو بھی حکومت بنے سادہ اکثریت سے ہی بنے تو بہتر ہے" مگر ان کی "خواہش" پوری نہ ہو سکی اور انتخابات کے اگلے ہی روز پاکستان پیپلز پارٹی، جمعیت علمائے اسلام، ایم کیو ایم اور آزاد اراکین کو مخلوط حکومت بنانے کی دعوت دیکر اپنے اگلے عزائم کا اظہار کر دیا لیکن مولانا فضل الرحمان نے اپنے برسوں کے شدید ترین بیانئے کے بخئے ادھیڑتے ہوئے پی ٹی آئی کو گلے لگالیا ہے۔ اگرچہ صوبائی حکومتوں کی بات کی جائے تو مسلم لیگ ن پنجاب، پیپلز پارٹی سندھ اور پی ٹی آئی کے آزاد ارکان خیبر پختونخوا میں حکومت بنانے کیلئے پر عزم ہیں مگر مرکز میں حکومت سازی کے حوالے سے اب تک سیاسی پارٹیوں کے مابین پاور شئیرنگ فارمولہ طے نہیں ہو پایا ہے۔ الیکشن کے اگلے روز 9 فروری کو نواز شریف کی جانب سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ان کی جماعت وفاق میں حکومت بنانے کیلئے دیگر جماعتوں سے رابطے کرے گی، جبکہ 16 فروری کو چوہدری شجاعت حسین کی رہائش گاہ پر شہباز شریف اور آصف زرداری سمیت دیگر جماعتوں کی سربراہان کی موجودگی میں وفاق میں مل کر حکومت بنانے کا اعلان کیا گیا تھا جس پر بلاول نے کہا ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی قومی اسمبلی میں ن لیگ کے وزیرِ اعظم کے امیدوار کو ووٹ دے گی لیکن کابینہ کا حصہ نہیں بنے گی مگر صدارت کیلئے اپنے والد کو مضبوط امیدوار کے طور پر اعلان کر دیا ہے جبکہ جمعیت علمائے اسلام نے اس دعوت کو مسترد کرتے ہوئے اپوزیشن میں پی ٹی آئی کے ساتھ بیٹھنے کا فیصلہ کیا ہے۔

دوسری جانب پی ٹی آئی کی جانب سے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ وہ مرکز اور پنجاب میں حکومت بنالیں گے جس کیلئے پنجاب اور مرکز میں وزیرِ اعلی اور وزیرِ اعظم کے ناموں کیلئے بھی امیدوار نامزد کر دیے تھے مگر اب پی ٹی آئی کے رہنما بیرسٹر سیف نے قومی وطن پارٹی کے رہنماؤں سے ملاقات کے بعد وفاق اور پنجاب میں اپوزیشن میں بیٹھنے کے فیصلہ کا اعلان کر دیا ہے۔ اس تمام تر صورتحال میں سیاسی و صحافتی حلقوں میں ہونے والی چہ میگوئیوں سے یہ تاثر مل رہا ہے جیسے سیاسی جماعتیں مرکز میں حکومت بنانے سے گریزاں ہیں۔

ادھر دوسری طرف مسلم لیگ ن کے چند سینیئر اراکین اور سعد رفیق کی جانب کا یہ اہم بیان کہ "مسلم لیگ ن کو کانٹوں کا یہ تاج اپنے سر پر سجانے کا کوئی شوق نہیں، وفاقی حکومت کی تشکیل مسلم لیگ ن کی نہیں بلکہ پارلیمان میں موجود تمام جماعتوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ موجودہ قومی اسمبلی میں کسی

کو اکثریت حاصل نہیں ہے۔ پی ٹی آئی کے حمایت یافتہ آزاد اراکین پہل کریں، پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر مرکزی حکومت بنالیں، ہم مبارکباد پیش کریں گے"۔ اسی طرح ن لیگ کے ایک اور رہنما جاوید لطیف نے بھی یہ کہا ہے کہ "خدا کرے مسلم لیگ ن یہ فیصلہ کرلے کہ جس کو مرکز میں اکثریت دلائی گئی اسی جماعت کو حکومت بنانے کا موقع دیا جائے، اس سے ملک میں انتشار پیدا کرنے کی منصوبہ بندی ناکام ہو سکتی ہے"۔

تاہم ن لیگ کی ترجمان مریم اورنگزیب نے اس تاثر کی تردید کی ہے کہ ان کی جماعت وفاق میں حکومت بنانے سے گریزاں ہے۔ ہفتہ کو لاہور میں ایک پریس کانفرنس کے دوران ان کا کہنا تھا کہ "مسلم لیگ ن سیاسی جماعتوں اور اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر ایک مشاورتی عمل سے گزر رہی ہے جس کیلئے اسلام آباد میں اسحاق ڈار کی رہائش گاہ پر دونوں جماعتوں کی کمیٹیوں کے درمیان ملاقاتیں جاری ہیں۔ ہر اجلاس کے بعد ایک اعلامیہ جاری ہوتا ہے اور اس اعلامیے کے علاوہ جتنی بھی خبریں ٹی وی سکرین پر چل رہی ہیں وہ ان کی مکمل طور پر تردید کرتی ہیں"۔

اس میں دورائے نہیں کہ یہاں انتخابات میں اسٹیبلشمنٹ کی مداخلت تو رہتی ہے مگر بظاہر اس دفعہ سب تدبیریں الٹی ہو گئی ہیں۔ ان کے مطابق اس سارے کھیل میں جے یو آئی اور جماعت اسلامی کو زیادہ نقصان پہنچا اور اس وجہ سے غصہ بھی زیادہ ہے لیکن یہ دونوں جماعتیں پرانی سیاسی جماعتیں بھی ہیں اس لئے وہ غیر سیاسی رویہ اختیار نہیں کریں گی۔ جنوبی ایشا میں مذہبی جماعتوں کا کردار ہمیشہ سے ہی زیر بحث رہتا ہے اور خاص طور پر ہمارے خطے میں اس بحث کے بعد عمومی تاثر ان کی ناکامی کی وجہ ہمارے اداروں پر مغربی ممالک کا وہ دباؤ ہے جو کسی بھی صورت میں ان کو اقتدار میں دیکھنا نہیں چاہتے۔ ان کے مطابق ان گروہوں میں ابھی بھی جمہوریت کو کفر، ووٹ ڈالنے کو گناہ اور بین الاقوامی معاہدات تک کو دھوکہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "ان میں کچھ شدت پسند اور کچھ غیر شدت پسند گروہ بھی موجود ہیں، جو خلافت وغیرہ کی بات کرتے ہیں"۔

ان کے مطابق ان جماعتوں سے کئی گروپ اور رہنما علیحدہ ہوئے، جو اس پارلیمانی نظام سے متفق نہیں بلکہ داعش اور تحریک طالبان طرز کے گروہوں کا لٹریچر ابھی بھی جمہوریت کے خلاف تحریروں پر مبنی ان میں انتہائی مقبول ہے۔ مزید برآں افغانستان میں طالبان حکومت آنے کے بعد جے یو آئی کی صفوں میں بھی بے چینی پائی جاتی ہے کہ ہم تبدیلی پارلیمانی نظام کے ذریعے نہیں لاسکتے اور اب وقت آگیا ہے کہ پارلیمانی نظام کو چھوڑ کر جدوجہد کرنی چاہیے۔ وہ تنظیمیں جو پارلیمانی نظام کا حصہ نہیں، انہوں نے ان انتخابات کے بعد اس نظام پر یقین رکھنے والوں کا بہت مذاق اڑایا ہے لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ جن افراد نے جماعت اسلامی یا جے یو آئی سے علیحدہ ہو کر مسلح جدوجہد کی، وہ بھی اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔

اس تمام صورت حال کو سمجھنے کیلئے موجود منظر نامے اور سیاسی جماعتوں کی ہچکچاہٹ کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ آخر اقتدار کے بھوکے کھلاڑی آج سامنے پڑے ہوئے راتب سے کیوں گریزاں ہیں ؟ دراصل تمام سیاسی جماعتوں کو اس بات کا علم ہے کہ موجودہ معاشی و سیاسی صورتحال میں وفاقی حکومت میں آکر مشکل فیصلے کرنے پڑیں گے اور کوئی اس کا بوجھ اکیلے اٹھانے کو تیار نہیں ہے۔ ملک کی موجودہ سیاسی و معاشی صورتحال میں یہ بات تمام جماعتوں پر واضح ہے کہ وفاقی حکومت میں آکر سخت اور مشکل فیصلے کرنا ہوں گے جن میں آئی ایم ایف سے معاہدے کی تکمیل کیلئے پٹرول، گیس،

بجلی کی قیمتیں، اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ تعلقات اور خارجہ تعلقات جیسے معاملات شامل ہیں۔ اس بھاری پتھر کو اٹھانے سے گریزاں سیاسی جماعتیں مسلم لیگ ن اور پیپلز پارٹی انتخابات میں اپنی شکست کی ان وجوہات سے واقف ہیں کہ ان کی شکست میں ان کی حکومتی کارکردگی کا بھی بڑا عمل دخل ہے۔

تاہم اب بھی یہ امکان ہے کہ بالآخر مرکز میں حکومتی ڈھول مسلم لیگ ن کے گلے میں ہی ڈالا جائے گا مگر اس کی خواہش ہے کہ دیگر تمام جماعتوں کو بھی حصہ بقدر جثہ ضرور دیا جائے کیونکہ انہیں پہلے ہی پی ڈی ایم اتحاد میں حکومت کرنے کا خمیازہ بھگتنا پڑا ہے۔ دوسری طرف تمام سیاسی جماعتیں صوبوں میں اس لیے حکومت بنانا چاہتی ہیں کیوں کہ صوبوں میں وسائل اور پیسے زیادہ ہیں۔ صوبائی وزرا اعلیٰ، وزیر اعظم سے زیادہ با اختیار اور طاقتور ہیں۔ زیادہ تر ترقیاتی منصوبے اور فنڈز صوبوں کے پاس ہیں جیسا کہ رواں برس این ایف سی کے تحت پنجاب کو تقریباً 11 سو ارب ملیں گے۔

سیاسی جماعتوں کو اپنے اندر اتنی صلاحتیں پیدا کرنی چاہئیں کہ وہ وفاق میں حکومت کر سکیں۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ نواز شریف آج تو سب کو حکومت میں شامل کرنے کیلئے کہہ رہے ہیں لیکن ۹ فروری کی تقریر میں انہیں پی ٹی آئی کو وفاق میں ساتھ حکومت بنانے کی دعوت دینی چاہیے تھی، وہ سنیئر سیاستدان ہیں انہیں آگے بڑھ کر لیڈ کرنا اور ملک کو مشکل حالات سے نکالنا چاہیے لیکن اس وقت معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آرہا ہے اور سب سیاسی جماعتیں فی الحال وفاق میں حکومت بنانے سے گریزاں ہیں۔ یقیناً کچھ وجوہات اور عوامل تو بہت واضح ہیں جن میں مہنگائی، خراب معاشی صورتحال، آئی ایم ایف سے معاہدہ، بجلی، گیس و پٹرول کی قیمتیں وغیرہ شامل ہیں۔ یہ صورتحال ملک کے پارلیمانی نظام اور جمہوریت کیلئے سود مند نہیں ہے۔ اسی لئے مسلم لیگ ن ہو یا پیپلز پارٹی یا پی ٹی آئی کے حمایت یافتہ آزاد اراکین، سب ہی وفاق میں آکر سخت فیصلوں کی ذمہ داری لینے سے گریزاں ہیں۔ تو اس کمزور پارلیمانی نظام میں حکومت سازی کا معاملہ کتنی طوالت اختیار کرے گا؟ کسی نئے بحران کی نشاندہی کر رہا ہے۔ نگراں حکومت کے وزیر اطلاعات نے ایک نئی آئینی تھیوری کا حوالہ دیکر موجودہ اقتدار کی طوالت کا اشارہ دے دیا ہے گویا اس جاری بحران سے نکلنے کیلئے ایک نئے بحران کا سامنا کرنا ہو گا۔

اس کا فوری حل تو یہ ہے کہ حکومت سازی کے عمل سے پہلے تمام سیاسی جماعتوں کو قومی معاملات پر اکٹھا ہونا ہو گا، معاشی معاملات سے متعلق ایک قومی اتفاق رائے کرنا ہو گا، کسی معاہدے پر پہنچنا ہو گا جس کے تحت معاشی فیصلوں کی ذمہ داری سب پر عائد ہو گی۔ جس قسم کی خرابیوں کا بیج ڈال دیا گیا ہے اب اس کی اصلاح ایک دو دن کا کام نہیں، نقصان پورا کرنے میں برسوں لگیں گے۔ مشرف دور کے بعد بھی پاکستان کو ایسی صورتحال کا سامنا تھا مگر اس وقت معاشی بحران اتنا سنگین نہیں تھا۔ جو جماعتیں اس عمل میں شامل نہیں ہوتیں ان کو تمام مسائل کا ذمہ دار قرار دیا جائے کیونکہ اگر ان معاملات پر بات نہیں ہوتی تو پہلے سے ہی کمزور پارلیمانی نظام میں اس حکومت کا وجود بننے سے پہلے ہی خطرے میں ہو گا۔ بابا اقبال یاد آگئے:

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتوی ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

بروز سوموار 137 شوال المعظم 1445ھ 26 فروری 2024ء

امریکا: استعماری قوت

اب معاملہ چند افراد یا کسی گروہ تک محدود نہیں رہا تھا۔ جمہوریت کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کے وعدے کے ساتھ قائم کیے جانے والے ملک کو استعماری اور نو آبادیاتی قوت میں تبدیل کرنے کا سوچا جارہا تھا۔ ملک کو حقیقی استعماری قوت میں تبدیل کرنے کی باتیں اب واشنگٹن کے ایوانوں میں بھی گونجنے لگیں۔ پھر یہ ہوا کہ پوری کی پوری قومی سیاست اِسی ایک مقصد کے گرد گھومنے لگی۔ یہ گویا اِس امر کی طرف واضح اشارہ تھا کہ امریکا جس مقصد کے تحت معرضِ وجود میں لایا گیا ہے اُسے بُھلا کر اب اُسی راہ پر گامزن ہونا ہے جس کی منزل انتہائی طاقتور حکمرانی ہے۔

1894ء میں ریاست کنیکٹیکٹ سے تعلق رکھنے والے سینیٹر اورویل پلیٹ نے کہا "میں اِس بات پر پوری طرح یقین رکھتا ہوں کہ ہمیں جب بھی اپنی سلامتی یا کاروباری معاملات کی توسیع کیلئے ملک سے باہر زمین کی ضرورت پڑے تو بلا تاخیر اور ضرورت کے مطابق زمین پر قبضہ کر لینا چاہیے"۔
اورویل پلیٹ نے جو کچھ کہا وہ محض اُس کی ذاتی رائے یا خواہش کا عکّاس نہ تھا۔ امریکا میں ایک ایسا گروپ پروان چڑھ چکا تھا جو انتہائی طاقتور اور ریاستی قوت میں ناقابلِ یقین حد تک اضافہ کرکے آس پاس کی ریاستوں کو ہڑپ کرنے کے ساتھ ساتھ دور اُفتادہ ممالک کے خلاف بھی جنگ چھیڑنے کی خواہش رکھتا تھا۔

امریکا کے قائدین نے جو کچھ سوچ رکھا تھا اُسے ٹھوس حقیقت کی حیثیت سے سامنے لانے کیلئے بہت بڑے پیمانے پر ایسے اقدامات بھی درکار تھے جن میں کہیں کوئی بڑی خامی یا جھول نہ ہو۔ امریکا کو حقیقی استعماری قوت بنانے کیلئے لازم تھا کہ اُس کی بحری قوت غیر معمولی ہو اور اپنے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کیلئے دنیا بھر میں کہیں بھی تیزی سے کاروائی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ یہ کام کسی ایسے انسان کی نگرانی اور قیادت ہی میں ممکن بنایا جاسکتا تھا جس میں غیر معمولی جوش اور بھرپور جذبہ ہو۔ امریکی بحریہ کو عالمی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی ذمہ داری تھیوڈور روزویلٹ کو سونپی گئی اور اُنہوں نے اس ذمہ داری سے بطریقِ احسن عہدہ برآ ہونے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔

تھیوڈور روزویلٹ نے 1897ء میں کہا تھا۔ "میں کسی بھی ملک سے اور کسی بھی سطح پر جنگ کا خیر مقدم کروں گا۔ میں پورے اعتماد اور احساسِ ذمہ داری سے یہ بات کہتا ہوں کہ اِس ملک کو جنگ کی ضرورت ہے"۔ تھیوڈور روزویلٹ نے جو کچھ کہا وہ محض اُن کا ذاتی بیان نہ تھا بلکہ بہت حد تک ریاستی پالیسی کا آئینہ دار تھا۔ روزویلٹ کوئی عام آدمی نہ تھا کہ کوئی بات کہتا اور توجہ نہ دی جاتی۔ اُسے اندازہ تھا کہ جنگ کو پسند کرنے کی ذہنیت سے متعلق بیان دے کر اُس نے کس کی ترجمانی کی ہے۔ وہ اُسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو امریکا کو کسی بھی قیمت پر اور کسی بھی حالت میں دُنیا کے طاقتور ترین ملک کے روپ میں دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ جو لوگ امریکا کو دنیا پر حکمرانی کے قابل ریاست بنانے کی راہ پر گامزن ہوئے تھے اُنہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ طاقت کے حُصول کا راستہ دوسروں کی طاقت میں کمی کی طرف جاتا ہے۔ کوئی طاقتور اُسی وقت ہوتا ہے جب کوئی اور کمزور ہوتا ہے۔

ہر دور میں چند ممالک نے منظّم ہو کر اپنی طاقت میں اضافہ اُسی وقت ممکن بنایا ہے، جب بہت سے دوسرے ممالک کو شدید کمزوری سے دوچار کیا گیا اور معاملہ دوسروں کو کمزور کرنے تک محدود نہیں۔ اپنے آپ کو طاقتور رکھنے کیلئے دوسروں کا مستقل کمزور رکھنا بھی ناگزیر ہے۔ جب کسی ریاست کو زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنا ہو تو اُس کی پالیسیوں میں بھی یہ مقصد واضح طور پر در آتا ہے۔ امریکا نے ہر دور میں اپنی طاقت بڑھانے کو ترجیح اور ایسا کرنے پر توجہ

دی ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ بر آمد ہوا ہے کہ خارجہ اُمور اور دفاع سے متعلق اُس کی تمام پالیسیاں کہیں نہ کہیں عسکری مہم جُوئی جاری رکھنے کو بنیادی مقصد قرار دینے پر مبنی رہی ہیں۔

جو لوگ امریکا کو استعماری قوت میں تبدیل کرنا چاہتے تھے اُن کیلئے ناگزیر ہو گیا تھا کہ اپنے عزائم کو مکمل عملی شکل دینے کیلئے ایسی باتیں کُھل کر کریں جن سے لوگوں کا ذہن جنگِ آزادی کے دوران سامنے والے آئیڈیلز سے ہٹ جائے۔ یہ کوئی ایسا کام نہ تھا کہ ایک آدھ کوشش سے یا راتوں رات ہو جاتا۔ لوگوں کے ذہنوں کو مُسخّر کرنا اور اُن کی سوچ میں اپنی مرضی کے مطابق تبدیلی لانا محنت طلب کام تھا۔ امریکی قائدین نے اہلِ وطن کے ذہن تبدیل کرنے کیلئے بھی جامع اور بے داغ قسم کی منصوبہ بندی کی۔ آزادی سے وابستہ تمام تصورات یا آئیڈیلز کو رفتہ رفتہ ذہنوں سے دیس نکالا دیا گیا اور ایک ایسے امریکا کا خواب آنکھوں میں سجایا گیا جو دُنیا کو بہت کچھ دینا چاہتا تھا "تہذیب" سکھانا چاہتا تھا اور جس کی مساعی کے بغیر یہ دُنیا رہنے کے قابل نہیں ہو سکتی تھی!

جنگ کو ناگزیر قرار دینے پر اِس قدر زور دیا جانے لگا کہ ایک عام امریکی بھی یہی سوچنے لگا کہ اقوامِ عالم میں اپنی دھاک بٹھانے اور کچھ کر دکھانے کیلئے عالمی سیاست و اقتصادیات کو اپنی مرضی اور ضرورت کے سانچے میں ڈھالنا ناگزیر ہے اور یہ کہ ایسا کرنے کیلئے جنگ کی راہ سے ہو کر گزرے بغیر چارہ نہیں۔ روزویلٹ کو دوسری اقوام پر جنگ مُسلّط کرنے کے معاملے میں زیادہ انتظار کی زحمت بھی نہیں اُٹھانا پڑی۔ جس زمانے میں امریکی قائدین نے استعماری قوت بننے کے بارے میں اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا تب برطانیہ، فرانس، پرتگال اور اسپین کا شمار بڑی نو آبادیاتی قوتوں میں ہوتا تھا۔ اِن یورپی ممالک نے ایشیا، افریقا اور جنوبی امریکا میں بہت کچھ اپنی مُٹّھی میں کر رکھا تھا۔ امریکا چاہتا تھا کہ چند ایک ممالک اُس کی مُٹّھی میں بھی آ جائیں۔ ظاہر ہے ایسا آسان تو نہ تھا کہ محض سوچنے سے ہو جاتا۔ امریکا کو استعماری سُپر پاور میں تبدیل کرنے کا خواب دیکھنے والوں کو بھی اندازہ تھا کہ کسی بھی خطے میں عسکری مہم جوئی کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ نو آبادیاتی قوت بننے کا عمل لوہے کے چنے چبانے جیسا تھا۔ لازم تھا کہ ہر معاملے کے تمام پہلوؤں کا عمیق جائزہ لے کر جامع حکمتِ عملی اپنائی جائے تاکہ ناکامی کے امکان کو زیادہ سے زیادہ کم کیا جا سکے۔

پہلے مرحلے میں امریکیوں نے ایسے خطوں کی طرف دیکھنا شروع کیا جہاں کمزوریاں تھیں۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں یورپی نو آبادیاتی قوتیں زیادہ مستحکم اور بہتر حالت میں نہ تھیں۔ اسپین کیلئے اپنی قوت برقرار رکھنا انتہائی دُشوار ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اندرونی کمزوریوں کے باعث بیرونی سطح پر بھی اپنی کمزوریوں کو دُنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایسے میں امریکیوں نے ہسپانوی نو آبادیات پر نظریں جمانا شروع کر دیا۔ جن ہسپانوی نو آبادیات پر امریکی قائدین کی رال ٹپکی اُن میں کیوبا اور فلپائن سب سے نمایاں تھے۔ یُوں امریکی قائدین نے اپنے ملک کو استعماری قوت میں تبدیل کرنے کے پہلے مرحلے میں اسپین کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اسپین میں باغی فوجیں الگ ریاست قائم کرنے کیلئے لڑ رہی تھیں۔ یہ تو امریکا کیلئے "اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں" جیسا معاملہ تھا۔ امریکی قائدین نے صورت حال کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہسپانوی باغیوں کا دامن تھام لیا۔ اسپین کے باغی امریکا کیلئے بہترین حلیف ثابت ہوئے۔ جب امریکا نے ہسپانوی باغیوں کو گلے لگایا تو ہسپانوی حکومت اور فوج

کمزور ہوتی چلی گئی۔ اسپین کی نو آبادیات میں بھی آزادی کی لہر اُٹھی۔ اندرونی شکست وریخت اور کمزور سیاست ومعیشت کا نتیجہ یہ بر آمد ہوا کہ اسپین تیزی سے جنگ ہار گیا۔ اِس پر دنیا کو کم ہی حیرت ہوئی۔

اسپین کو ہرانے کے بعد امریکا کو اپنے عزائم بے نقاب کرنے میں کچھ بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ امریکی قیادت نے اعلان کیا کہ فتح حاصل کرنے کے بعد اب امریکی فوجی فلپائن سے آسانی سے نہیں ہٹیں گے۔ یہ اِس بات کا اعلان بھی تھا کہ امریکا نے استعماری قوت بننے کا صرف ارادہ نہیں کر لیا بلکہ اُس پر عمل کرنے کی لگن اور بھرپور سکت بھی رکھتا ہے۔ فلپائن کو زیرِ نگیں کرنے کے بعد انڈیانا سے تعلق رکھنے والے سینیٹر البرٹ بیورج نے کہا۔ ”اب فلپائن ہمیشہ کیلئے ہمارا رہے گا۔ اور فلپائن سے ذرا سا آگے چین کا بہت بڑا بازار ہے۔ ہم بحرِ اوقیانوس کے کنارے رہتے ہیں مگر اب بحرِ الکاہل ہی ہمارا بحر ہے۔ جو طاقت بحرِ الکاہل پر راج کرے گی پوری دنیا پر اُس کا غلبہ قائم ہو گا۔ اب بحرِ الکاہل پر اقتدار کی لگام ہمیشہ امریکا کے ہاتھ میں رہے گی“۔

البرٹ بیورج نے جو کہا اُس میں نیا کچھ بھی نہیں تھا۔ دنیا کو اندازہ تو ہو ہی چکا تھا کہ اب امریکا عسکری مہم جوئی کے ذریعے زیادہ سے زیادہ ممالک کو اپنے دائرۂ اثر میں لینے کی تیاری کر رہا ہے۔ تمام کمزور ممالک کو انتہائی بُرے حالات کا سامنا کرنے کیلئے تیار رہنا تھا۔ یُوں بھی یہ اُن کیلئے بالکل نئی صورت حال نہ تھی۔ وہ استعماری قوتوں کو بھگتتے آئے تھے۔ فرق صرف اِتنا تھا کہ اب کے استعماری قوت کا تعلق یورپ سے نہیں تھا۔ نو آبادیاتی نظام کے احیاء کی باتیں کی جانے لگیں۔ واشنگٹن چونکہ دارالحکومت تھا اِس لیے وہاں بھی اِن باتوں کا پھیلنا غیر فطری اور حیرت انگیز نہ تھا۔ نو آبادیاتی نظام کا جواز پیش کرنے کیلئے نسل پرستی اور دیگر علّتوں پر مشتمل نظریات پیش کیے جانے لگے اور اِن نظریات کو واشنگٹن میں کُھلے دِل سے باہیں پسار کر قبول کیا جانے لگا۔ سفید فام امریکیوں کی ذہن سازی کی جارہی تھی۔ اُنہیں ایک ایسے دور کیلئے تیار کیا جارہا تھا کہ جس میں امریکا کو طاقت کے فقید المثال استعمال کے ذریعے بہت کچھ الٹنا اور پلٹنا تھا۔ اِس معاملے میں نسل پرستی کو ذہن سازی کے حوالے سے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ سفید فام امریکیوں کے ذہنوں میں یہ بات پوری شِدّت سے ٹھونس دی گئی کہ حکمرانی صرف اُن کا حق ہے اور ہر معاملے میں قائدانہ کردار قُدرت نے صرف اُن کے مقدر میں لکھ دیا ہے۔

انڈیانا کے سینیٹر البرٹ بیورج نے کہا۔ ”ہم جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں اُسے دنیا پر راج کرنا ہے۔ ہمیں یہ مشن خدا نے سونپا ہے اور ہماری نسل اِس مشن کو کبھی نہیں بھولے گی۔ اِس دنیا پر کسی کو تو، بلا شرکتِ غیرے، حکمرانی کرنا تھی اِس لیے خدا نے ہمیں منتخب کیا ہے۔ خدا ہی نے ہم میں پوری دنیا پر حکمرانی کرنے کی صلاحیت پیدا کی ہے اور ہمیں دنیا کے ہر خطے پر راج کرنے کا ہُنر سکھایا ہے۔ اب ہم وحشی، غیر مہذّب لوگوں پر قابو پانے کی صلاحیت اور سکت بھی رکھتے ہیں“۔

البرٹ بیورج کے الفاظ میں وہی دعویٰ ہے جو یہودی آج تک کرتے آئے ہیں یعنی یہ کہ وہ خدا کے پسندیدہ ترین بندے ہیں اور اُنہیں اِس دارِ فانی پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔ البرٹ بیورج نے سفید نسل کے بارے میں یُوں رائے دی ہے جیسے وہ حرفِ آخر ہو۔ سفید فام نسل کو باقی دنیا سے بہتر اور افضل قرار دینے کی سوچ ہی نے امریکا کے ہاتھوں اِس قدر بگاڑ کی راہ ہموار کی ہے۔ امریکی قائدین نے جب آزادی کے بعد ذرا حواس بحال کیے تو سفید فام امریکیوں کو یقین دلانا شروع کیا کہ اب اُنہیں صرف امریکا نہیں بلکہ پوری دُنیا پر راج کرنا ہے۔ سفید فام امریکیوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ وہ دوسری تمام نسلوں اور اقوام سے واضح طور پر بہتر اور مہذّب ہیں۔ یعنی یہ کہ اُنہیں باقی دنیا کو سکھانا ہے کہ بہتر زندگی کس طور بسر کی جاسکتی ہے اور کی جانی چاہیے۔

البرٹ بیورج نے سفید فام امریکیوں کو برتر نسل ہونے کا یقین دلانے کیلئے خدا کا حوالہ دینا بھی ناگزیر جانا تاکہ سفید فام امریکیوں کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ یہودی نہیں بلکہ وہ خدا کے پسندیدہ اور منتخب بندے ہیں۔ آخر میں البرٹ بیورج نے صرف سفید فام امریکیوں کو مہذّب اور باقی سب کو وحشی اور غیر مہذّب قرار دے کر گویا قلم توڑ کر رکھ دیا ہے! اِن الفاظ سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ امریکی قائدین بیشتر اور بالخصوص سفید فام امریکیوں کے ذہنوں میں کیا ٹھونسنا چاہتے تھے اور یہ کہ ایسا کرنے کا کیا نتیجہ بر آمد ہوا۔ ذہنوں میں کجی پیدا کرنے ہی کا یہ نتیجہ بر آمد ہوا ہے کہ آج امریکی پالیسیوں میں خود کو برتر سمجھنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو کمتر، جاہل اور غیر مہذّب سمجھنے کا احساس ممکنہ شِدّت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ کسی ملک یا علاقے پر بیرونی افواج حملہ کریں اور کوئی مزاحمت ہی نہ کی جائے یعنی حملہ آوروں سے مرعوب ہو کر خاموشی اختیار کی جائے۔ انتہائی کمزور اقوام بھی تھوڑی بہت مزاحمت تو کرتی ہی ہیں۔ فلپائن کے لوگ سینیٹر البرٹ بیورج اور اُن کے معتقدین کی باتوں کو قبول کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ وہ یہ بات کیوں گوارا کرتے کہ اُن کے ملک پر حملہ کیا جائے، اُن کی سرزمین پر قبضہ کر لیا جائے؟

جب امریکی فوج نے فلپائن پر لشکر کشی کی تو اُسے ویسی ہی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جیسی مزاحمت کا سامنا اسپین کی فوج کو کرنا پڑا تھا۔ امریکی افواج نے جب یہ دیکھا کہ مزاحمت کاروں پر قابو پانا اور اُنہیں اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنا ممکن نہیں تو اُنہوں نے فلپائن میں مزاحمت کچلنے کیلئے غیر معمولی حد تک طاقت استعمال کی۔ امریکا کی یہ روش کسی بھی اعتبار سے قابل قبول قرار نہیں دی جاسکتی تھی۔ اِس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر قتلِ عام ہوا، پورا ملک شدید عدم استحکام کی نذر ہوا، معیشت اور معاشرت دونوں کا سبھی کچھ الٹ پلٹ کر رہ گیا اور فلپائن کے لوگوں کو بالآخر امریکا کی غیر معمولی طاقت کے سامنے سَر جُھکانا پڑا۔ امریکی فوجیوں کو حکم دیا گیا کہ سب کو جلا دو، سب کو مار ڈالو اور اُنہوں نے اِس حکم کی تعمیل کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ جو بھی ہاتھ آیا اُسے موت کے گھاٹ اتارنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی گئی۔ جب فلپائن کی فوج نے ہتھیار ڈالے تب تک 6 لاکھ سے زائد فلپائنی مارے جا چکے تھے۔ ملک تباہ ہو چکا تھا۔ معیشت کا کچھ ٹھکانہ نہ تھا، معاشرے میں ایسا عدم استحکام تھا کہ کسی کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اب کیا کرنا ہے، کس سمت جانا ہے۔ امریکیوں نے طاقت کے زُعم میں فلپائن کا سبھی کچھ برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

ہمیں ایسی تصویریں بھی آسانی سے مل سکتی ہیں جن میں امریکی فوجی جنگ میں مارے جانے والے فلپائنی باشندوں کی ہڈیوں کے ڈھیر پر کھڑے بہت فخر سے اپنی فتح کا اعلان اور مسرّت کا اظہار کر رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انسانی ہڈیوں کے ڈھیر پر مسرت کا اظہار محض فلپائن تک محدود نہیں رہا۔ امریکیوں نے ہر دور میں ایسے ہی تماشے دکھائے ہیں۔ امریکی افواج نے اپنے خطے میں اور اُس سے باہر جہاں بھی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے، اُس کی کوشش رہی ہے کہ اہلِ جہاں کو اُس کی بھرپور طاقت کا بخوبی اندازہ ہو جائے۔ اِس مقصد کے حُصول کیلئے کمزور اور نہتّے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ جبر کا نشانہ بنانا اُس کا مطمحِ نظر رہا ہے۔

امریکی فوج کی طرف سے طاقت کا بے دریغ اور بے لگام استعمال بالآخر کئی ممالک کی آزادی سلب کرنے کا سبب بنا۔ جو ملک آزادی، حقوق اور جمہوریت کے عظیم ترین آئیڈیلز کو حقیقی شکل دینے کیلئے دُنیا کے نقشے پر نمودار ہوا تھا اور جس کے بنیادی مقاصد میں اِنسان کی رفعت سرِ فہرست تھی اُسی نے دُنیا کا نظام تہس نہس کرنے اور معاشروں کو تلپٹ کرنے والی استعماری قوت کی شکل اختیار کر لی۔ امریکی قائدین طاقت کے اظہار کا جو کھیل جاری رکھنا چاہتے تھے اُس کا دائرہ کچھ اپنے خطے تک محدود نہ تھا۔ کیوبا تو پڑوس ہی میں تھا۔ اُسے دبوچنے کے بعد فلپائن کو مُٹّھی میں کیا گیا۔ پھر تو یہ معاملہ طول پکڑتا چلا گیا۔ 1898ء میں فلپائن، پورٹو ریکو اور گوام امریکی نو آبادی میں تبدیل ہوئے۔ دوسری طرف کیوبا کو رسمی طور پر آزادی دی تو گئی مگر اِس سلسلے میں

چند شرائط عائد کی گئیں۔ سب سے اہم شرط یہ تھی امریکی فوج پلیٹ امینڈمنٹ کے تحت کیوبا کی سرزمین پر اپنا اڈّا ہمیشہ رکھے گی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ امریکا کیوبا میں اپنی فوج رکھے گا اور اُس کی دفاعی اور خارجہ پالیسی امریکا ہی تشکیل دے گا۔

ادھر قسمت کی ستم ظریفی دیکھیں کہ نسلی برتری کے زعم میں برتر امریکا کو بالآخر افغان مجاہدین نے خاک چاٹنے پر مجبور کر دیا اور اب انہی طالبان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہے۔ غزہ میں جاری ظلم و ستم میں جو بھیانک کردار ادا کیا ہے، اس کی بھی بالآخر قیمت چکانی پڑے گی۔ حوثیوں کی جانب سے باب المندب میں جاری کاروائیوں کے جواب میں بھرپور جنگ کا خطرہ کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ حوثی جنگجوؤں کے پاس سب سے طاقتور افواج میں سے ایک ہے جس کی موجودگی سے دنیا اکثر چونک جاتی ہے۔ وہ ہر اس بین الاقوامی بحری جہاز پر میزائل داغ دیتے ہیں جس کا انہیں امریکا، برطانیہ، اسرائیل سے تعلق نظر آتا ہے، یا اگر نہیں بھی نظر آتا پھر بھی انہوں نے عالمی تجارت پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں۔ کئی بحری جہازوں کو ہزاروں میل دور تک اپنا رُخ موڑنا پڑ رہا ہے۔ امریکا کی جانب سے اُن کے اڈوں پر فضائی کاروائیاں بظاہر انہیں روک نہیں سکیں بلکہ انہوں نے امریکا اور برطانیہ سے جڑے اہداف کے خلاف جوابی کارروائیوں کا اعلان بھی کر رکھا ہے۔

بروز بدھ 19 شوال المعظم 1445ھ 28 فروری 2024ء

سوال یا زوال

قیام پاکستان کے دوران مختلف تعلیمی اداروں اوران کے سربراہوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ عجب معاملہ تو یہ ہے کہ ہر کوئی تعلیم کے مستقبل پر جہاں پریشان دکھائی دیا وہاں ابھی تک ہم یہ فیصلہ ہی نہیں کر پائے کہ ہم اپنی قوم کے نوجوانوں کی موجودہ سمت کا تعین تک نہیں کر سکے۔ آپ دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں، بی ای، بی کام، ایم کام، بی بی اے، ایم بی اے، انجینئیرنگ کے سینکڑوں شعبہ جات میں بے تحاشہ ڈگریاں اور اس کے علاوہ چار چار سال تک کلاس رومز میں ماسٹر زڈگریوں کیلئے خوار ہوتے لڑکے لڑکیاں کون سا تیر مار رہے ہیں؟ ماسوائے اس کے کہ ہم صرف دھرتی پر "ڈگری شدہ" انسانوں کے بوجھ میں اضافہ کر رہے ہیں۔ یہ تمام ڈگری شدہ نوجوان ملک کو ایک روپے تک کی پروڈکٹ دینے کے قابل نہیں ہیں۔ ان کی ساری تگ ودو اور ڈگری کا حاصل محض ایک معصوم سی نوکری ہے اور بس۔

نجانے مجھے کیوں آج جنوبی افریقا کی ایک یونیورسٹی پر آویزاں چشم کشا کتبہ یاد آگیا کہ "کسی قوم کو تباہ کرنے کیلئے ایٹم بم اور دور تک مار کرنے والے میزائل کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے نظام تعلیم کا معیار گرانے کیلئے طلبہ وطالبات کو امتحانات میں نقل کی اجازت دے دو وہ قوم خود تباہ ہو جائے گی۔ اس ناکارہ نظام تعلیم سے فارغ التحصیل ہو کر نکلنے والے ڈاکٹروں کے ہاتھوں مریض مرتے رہیں گے، انجینئر کے ہاتھوں عمارتیں تباہ ہوتی رہیں گی، معیشت دانوں کے ہاتھوں مالی وسائل ضائع ہوتے رہیں گے، مذہبی رہنماں کے ہاتھ فرقہ واریت، اتحاد واتفاق اور انسانیت تباہ ہوتی رہے گی، ججز کے ہاتھوں انصاف کا قتل ہوتا رہے گا۔ اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ نظام تعلیم کی تباہی پوری قوم کی تباہی قرار پاتی ہے"۔

یونیورسٹی کے دروازے پر آویزاں اس تحریر کی حقانیت اور سچائی سے کون انکار کر سکتا ہے بالخصوص ہم پاکستانی قوم کی تباہ حالی اور ہر شعبہ ہائے زندگی میں مسلسل گراوٹ کا جائزہ لیں تو بات سمجھ آجاتی ہے کہ ہمارا نظام تعلیم ہی اس معاشی گراوٹ اور ذہنی پستی کا ذمہ دار ہے۔ پورے ملک میں نقل مافیا کی لعنت نے اس مضبوطی سے پنجے جمائے ہوئے ہیں کہ مقامی انتظامیہ اس پر قابو پانے کی بجائے اس نمک کی کان میں نمک بن چکی ہے۔ اب تو پنجاب اور سندھ میں امتحانات سے پہلے ہونیوالے پرچے آؤٹ ہونے کی اطلاعات بھی میڈیا میں شائع ہو چکی ہیں لیکن ابھی تک اس کے تدارک کی کوششیں صرف بیانات تک محدود ہیں۔ مصدقہ ہوشربا رپورٹ کے مطابق ملک بھر میں آدھے سے زیادہ ڈاکٹر بننے والے نقل مافیا کی بدولت امتحان پاس کر کے ہسپتالوں کا رخ کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آئے دن ان ناتجربہ کار اور نالائق ڈاکٹروں کے ہاتھوں انسانی اموات کی خبریں عام ہو گئی ہیں اور بھولی بھالی عوام اپنے مریضوں کی اموات کو قدرت کا شاخسانہ سمجھ کر صبر وشکر کے ساتھ ان انسانی مجرموں کا محاسبہ کرنے سے بھی قاصر ہے۔

اگر آج پاکستان انتظامی اور حکومتی سطح پر بدترین نااہلیت کا شکار ہے تو اس کی وجہ نظام تعلیم کی ناکامی، نقل کی بہتات اور جعلی ڈگریاں ہیں۔ اس بہتی غلیظ گنگا میں ہاتھ دھونے میں صرف ڈاکٹرز، انتظامی افسران اور سیاستدان ہی شامل نہیں بلکہ نقل مار کر پاس ہونے والے ہمارے انجینئرز بھی شامل ہیں۔ تعلیمی پستی کا یہ حال ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں کا فارغ التحصیل گریجویٹ انگلش اور اردو میں نوکری کی درخواست بھی نہیں لکھ سکتا لیکن رشوت اور تگڑی سفارشوں کے ساتھ سرکاری بڑے عہدوں پر فائز ان کی کارکردگی نے ملک کے ہر محکمے کا ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے۔

معیشت کی بدحالی بھی ایسے ہی نااہل معیشت دانوں کی ذہانت کی عکاس ہے۔ اس کتبہ میں لکھی ہوئی تحریر میں مذہبی رہنماؤں کے کردار سے صاف متنبہ کیا گیا ہے اور ہم اس کی بدترین شکل پاکستانی معاشرے میں ہر جگہ اور ہر مقام پر دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے وہ مذہبی رہنما جو ملین مارچ کی دھمکیوں سے ملک کے برج الٹ دینے کے دعوے کرتے تھے، ان انتخابات میں عوام نے ان کو خوب آئینہ دکھادیا ہے اور اپنی اس ناکامی کو ذمہ دار دوسرے اداروں کو قرار دیکر قوم کو ایک مرتبہ پھر دھوکہ دیا جارہا ہے۔ یہ مذہبی رہنماؤں کی ناکامی ہی تو ہے کہ ہم آخرت کے خوف سے بے بہرہ ہو کر اس قدر گناہوں کی دلدل میں پھنسے اخلاقی پستی اور ملاوٹ کے عادی ہو چکے ہیں کہ یہاں پانی سمیت کوئی بھی چیز خالص نہیں ملتی۔

سرخ مرچوں میں اینٹوں کا برادہ ڈال کر انسانی جانوں کو ہلاک کیا جارہا ہے، دودھ کے نام زہریلا کیمیکل فروخت کیا جارہا ہے، دانستہ سیوریج اور کیمیکل ملے پانی میں سبزیاں اگا کر انسانی معدوں کو برباد کیا جارہا ہے، یہاں خربوزوں اور دیگر فروٹ کو میٹھا کرنے کیلئے سکرین کے انجکشن لگائے جاتے ہیں، کٹے ہوئے تربوز کو فروخت کرنے کیلئے مصنوعی سرخ رنگ کیا جاتا ہے، مردہ جانوروں کی چربی پگھلا کر کوکنگ آئل بنایا اور ہوٹلوں میں استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ شاید ہی کسی بیکری میں گندے انڈے اور حفظان صحت کا خیال رکھا جاتا ہو۔ میڈیکل سٹورز پر فروخت ہونے والی کسی دوائی کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ خالص ہے، ڈاکٹر انسانیت کو بھول کر پیسہ کمانے والی مشین بن چکے ہیں۔ نیا پاکستان ہو یا پرانا یہاں ہر وہ برائی، ملاوٹ، کرپشن، رشوت ستانی، نقل ستانی، جعلی ڈگریوں کا کاروبار عروج پر ہے، اس ماحول میں بھلا یہ معاشرہ کیسے ایک اصلاحی معاشرہ بن سکتا ہے۔ پاکستان کے سرکردہ لوگ یا تو نااہل ہیں یا کرپٹ ہیں، دیانت دار لوگ دور دور تک دکھائی نہیں دیتے اور نئے منتخب افراد اپنی اپنی قیمت پر دیگر جماعتوں کے پٹے اپنے گردن میں ڈال کر اپنی وفاداری کا اعلان کر رہے ہیں۔

حاجیوں کی تعداد کے لحاظ سے پاکستان دنیا میں دوسرے نمبر پر اور عمرہ کرنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے پہلے نمبر پر ہے جبکہ دنیا بھر میں ایمانداری کے انڈکس کے مطابق پاکستان کا 160 نمبر ہے۔ ورلڈ جسٹس پراجیکٹ کی سالانہ رپورٹ میں پاکستانی عدالتی نظام کو قانون کی حکمرانی کی پابندی کرنے والے ممالک میں سب سے نچلے نمبر 139 ممالک میں سے 130 ویں نمبر پر رکھا گیا ہے۔ 1500 یونٹ کو 500 یونٹ لکھنے والا رشوت خور میٹر ریڈر، خالص گوشت کے پیسے وصول کر کے ہڈیاں بھی ساتھ تول دینے والا قصائی، خالص دودھ کا نعرہ لگا کر ملاوٹ کرنے والا دودھ فروش، بے گناہ کی ایف آئی آر میں دو مزید ہیروئین کی پڑیاں لکھنے والا انصاف پسند ایس ایچ او، گھر بیٹھ کر حاضری لگوا کر حکومت سے تنخواہ لینے والا مستقبل کی نسل کا معمار استاد، کم ناپ تول کر پورے دام لینے والا دوکاندار، 100 روپے کی رشوت لینے والا عام معمولی سا سپاہی، معمولی سی رقم کیلئے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے والا وکیل، سو روپے کے سودے میں دس روپے غائب کر دینے والا بچہ، آفیسر کیلئے رشوت میں سے اپنا حصہ لے جانے والا معمولی سا چپڑاسی، کھیل کے بین الاقوامی مقابلوں میچ فکسنگ کر کے ملک کا نام بدنام کرنے والا کھلاڑی، ساری رات فلمیں دیکھ کر سوشل میڈیا پر واہیات اور جھوٹ پر مبنی پروپیگنڈے کو آگے بڑھانے والا اور فجر کو اللہ اکبر سنتے ہی سونے والا نوجوان، کروڑوں کے بجٹ میں غبن کر کے دس لاکھ کی سڑک بنانے والا ایم پی اے اور ایم این اے، لاکھوں غبن کر کے دس ہزار کے ہینڈ پمپ لگانے والا جابر ٹھیکدار، ہزاروں کا غبن کر کے چند سو میں ایک نالی پکی کرنے والا ضمیر فروش کونسلر، غلہ اگانے کیلئے بھاری بھر کم سود پہ قرض دینے والا ظالم چودھری، زمین کے حساب کتاب و پیمائش میں کمی بیشی کر کے اپنے بیٹے کو حرام مال کا مالک بنانے والا پٹواری اور ریونیو آفیسر، ادویات اور لیبارٹری ٹیسٹ پر کمیشن کے طور پر عمرہ کرنے والے ڈاکٹر، اپنے قلم کو بیچ کر پیسہ کمانے والا صحافی، منبر رسول پر بیٹھ کر دین کے نام پر چندے اور نذرانے والے مولوی اور پیر صاحبان۔۔۔۔۔ جب ہر کوئی کشتی میں اپنے حصے کا سوراخ کر رہا ہو تو پھر یہ نہیں کہنا چاہئے کہ فلاں کا سوراخ میرے سے بڑا تھا، اس لئے کشتی ڈوب گئی! سب

ہی قصوروار ہیں اور ہر کوئی سوشل میڈیا کو بغیر تحقیق کے بے تحاشہ استعمال کر کے خود کو بری الذمہ سمجھتا ہے اس دور میں اگر ہم پر نئے اور پرانے پاکستان کی گردان کرنے والے سیاستدان مسلط ہیں، تو یہ ہمارے اعمال کی سزا نہیں تو اور کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ٹیوٹا، ڈاٹسو، ڈاٹسن، ہینو، ہونڈا، سوزوکی، کاواساکی، لیکسس، مزدا، مٹسوبیشی، نسان، اسوزو اور یاماہا یہ تمام برانڈز جاپان کی ہیں جبکہ شیورلیٹ، ہونڈائی اور ڈائیو جنوبی کوریا بناتا ہے۔ ان برانڈز کے بعد آخر دنیا میں اور کون سی آٹو موبائلز ہیں جن کا دنیا میں چرچا ہے۔ آئی ٹی اور الیکٹرونکس مارکیٹ کا حال یہ ہے کہ سونی سے لے کر کینن کیمرے تک سب کچھ جاپان کے پاس سے آتا ہے اور اب کافی حد تک چین دنیا کی مارکیٹ پر چھایا ہوا ہے۔ ایل جی اور سام سنگ جنوبی کوریا سپلائی کرتا ہے۔ 2014 میں سام سنگ کا ریونیو 305 بلین ڈالرز تھا۔ "ایسر لیپ ٹاپ" تائیوان "ویت نام ہیلی کاپٹرز کارپوریشن" کے نام سے دنیا بھر میں ہیلی کاپٹر زاور جہاز بنا رہا ہے۔ محض صرف ہوا، دھوپ بنا کر بھیجتا ہے جبکہ ویت نام جیسا ملک اور پانی رکھنے والا سنگاپور دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہے اور کیلیفورنیا میں تعمیر ہونے والا اسپتال بھی اپنے استعمال کا سارا سامان اور آلات چین سے منگوا رہا ہے۔ دور نہ جائیں، خدا کو یاد کرنے کیلئے تسبیح اور جائے نماز تک ہم خدا کو نہ ماننے والوں سے خریدنے پر مجبور ہیں۔ حرمین کی تمام تجارتی مارکیٹیں اس بات کی گواہ ہیں کہ زائرینِ حرم کی کثیر تعداد کو اپنے سروں پر ٹوپیاں، ہاتھ میں تسبیح اور حرم میں نماز پڑھنے کیلئے ساتھ لے جانے والا مصلیٰ خدا کو نہ ماننے والے ممالک سپلائی کر رہے ہیں۔

دنیا کے تعلیمی نظاموں میں پہلے نمبر پر فن لینڈ، دوسرے نمبر پر جاپان اور تیسرے نمبر پر جنوبی کوریا ہے۔ انہوں نے اپنی نئی نسل کا رخ "ڈگریوں" کے پیچھے بھاگنے کی بجائے انہیں "ٹیکنیکل" تعلیم کی طرف کر دیا ہے، آپ کو سب سے زیادہ ایلیمنٹری اسکولز ان ہی ممالک میں نظر آئیں گے جس کے نتیجے میں نہ صرف ان ممالک کی معیشت دنیا کی منڈیوں پر چھا گئی ہے بلکہ ان ممالک کے ماہرین مغرب سمیت امریکا کے اہم ادارے ان سے استفادہ کر رہے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کا وقت کلاس رومز میں بورڈز کے سامنے ضائع کرنے کی بجائے حقائق کی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ ایک بہت بڑا ووکیشنل انسٹیٹیوٹ اس وقت سنگاپور میں ہے اور وہاں بچوں کا صرف بیس فیصد وقت کلاس میں گزرتا ہے باقی اسی فیصد وقت بچے اپنے اپنے شعبوں میں آٹو موبائلز اور آئی ٹی کی چیزوں سے کھیلتے گزارتے ہیں۔

دوسری طرف آپ ہمارے تعلیمی نظام اور ہمارے بچوں کا حال ملاحظہ کریں۔ آپ دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں اور اس کا قصوروار کون ہے؟ ہم اس قدر "وژنری" ہیں کہ ہم لیپ ٹاپ اسکیم پر ہر سال 200 ارب روپے خرچ کر رہے ہیں لیکن لیپ ٹاپ کی انڈسٹری لگانے کو تیار نہیں ہیں۔ آپ ہمارے "وژنری پن" کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ پوری قوم سی پیک کے انتظار میں صرف اس لئے ہے کہ ہمیں چائنا سے گوادر تک جاتے 2 ہزار کلومیٹر کے راستوں میں ڈھابے کے ہوٹل اور پنکچر کی دوکانیں کھولنے کو مل جائیں گی اور ہم ٹول ٹیکس لے لے کر بل گیٹس بن جائیں گے اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس طرح ہم جہاں ملکی قرضے اتارنے کے قابل ہو جائیں گے وہاں ہم معاشی طور پر اپنی قوم کی تقدیر سنوارنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اوپر سے لیکر نیچے تک کوئی بھی ٹیکنالوجی ٹرانسفر کروانے میں دلچسپی نہیں رکھتا ہے۔

آپ فلپائن کی مثال لے لیں۔ فلپائن نے پورے ملک میں "ہوٹل مینجمنٹ اینڈ ہاسپٹیلٹی" کے شعبے

کو ترقی دی ہے۔ اپنے نوجوانوں کو ڈپلومہ کورسز کروائے ہیں اور دنیا میں اس وقت سب سے زیادہ ڈیمانڈ فلپائن کے سیلز مینز/گرلز، ویٹرز اور ویٹرسز کی ہے یہاں تک کہ ترقی یافتہ ممالک کے بیشتر بڑے اداروں نے اپنے کال سینٹرز وہاں کھول رکھے ہیں جو اس وقت ان ملکوں کی معیشت کو بڑھانے کیلئے ان کی مارکیٹنگ کر رہے ہیں حتیٰ کہ ہمارا دشمن بھارت تک ان تمام شعبوں میں بہت آگے جا چکا ہے۔ آئی ٹی انڈسٹری میں سب سے زیادہ نوجوان ساری دنیا میں بھارت سے جاتے ہیں جبکہ آپ کو دنیا کے تقریباً ہر ملک میں بڑی تعداد میں بھارتی لڑکے لڑکیاں سیلز مینز، گرلز، ویٹرز اور ویٹرسز نظر آتے ہیں۔ پروفیشنل ہونے کی وجہ سے ان کی تنخواہیں بھی پاکستانیوں کے مقابلے میں دس دس گنا زیادہ ہوتی ہیں۔

جن قوموں نے علم کی قدر کی وہ آج خوشحال و نہال ہیں۔ ہمیں علم پر جو توجہ دینی چاہئے تھی، وہ کرپشن، ایک دوسرے کو غدار اور بددیانت کہنے پر صرف کر دی جس کے نتیجے میں آج تک ہم علم کو عام نہ کر سکے اور تعلیمی ادارے بھوتوں کے اڈے صفر نتائج کے ساتھ ہماری بربادی کا ڈھول پیٹ رہے ہیں۔ اگر تعلیمی بجٹ میں وافر حصہ مختص کر کے عام تعلیم کو عام کیا گیا ہوتا تو آج اس ملک میں کب کا حقیقی جمہوری انقلاب آ چکا ہوتا۔ اس سے بڑھ کر اور ستم ظریفی کیا ہو گی کہ مسلمان ہوتے ہوئے ہمارے ہاں تعلیم کے مدارس الگ الگ ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ عالم اسلام اُس وقت تک دنیا پر علمی راج کرتا رہا جب تک اس کے ہاں تعلیمی ادارے دو نہیں ایک تھے۔ ایک ہی ادارے سے دنیا بھر کے جملہ علوم پر دسترس رکھنے والے طلباء میدانِ عمل میں اپنے جوہر دکھانے کیلئے ہماری روشن تاریخ کا حصہ بنے جن کی تحقیقات سے استفادے کی گواہی مغرب کی یونیورسٹیوں میں ان کے مجسمے اور وہاں کی لائبریریوں میں ان کی کتابیں موجود ہیں۔

اس کی ایک مثال بغداد کا مدرسہ نظامیہ ہے جو ہارون الرشید کے عہد میں قائم ہوا اور وہاں سے ابن الہیثم اور ابن رشد جیسے سائنسدان فارغ التحصیل ہوئے جو عالم دین بھی تھے۔ ایک خاص سازش کے تحت ہمارے تعلیمی اداروں کو تقسیم کر کے ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا اور جب سے ہمارے تعلیمی ادارے دو ہوئے، ہمارے ہاں دین سے سیاست جدا ہو گئی اور چنگیزی باقی رہ گئے اور یہ چنگیزیت مختلف خوفناک روپ دھار کر مسلم امہ میں نافذ ہو چکی ہے۔ ہم دو طرح کے تعلیمی اداروں کو رواج دے کر دنیا کو دین سے آزاد کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ ایک حیرتناک تجویز ہے مگر اس کی آزمودہ مثال ہماری سنہری تاریخ میں موجود ہے۔

یہ تو ایک نکتہ نظر تھا لیکن دوسری طرف ہم نے موجودہ ملکی نظام تعلیم کی کیا درگت بنا دی ہے۔ اس وقت سب سے بڑا دولت کمانے والا کاروبار موجودہ تعلیمی ادارے بن چکے ہیں اور ملک بھر میں کھلنے والی یونیورسٹیوں اور کالجز نے بھاری فیس کے نام پر ڈگریوں کی تقسیم کا سلسلہ شروع کر کے ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کا مذموم مکروہ دھندہ شروع کر رکھا ہے۔ اپنے اپنے ادارے کے بہترین نتائج کیلئے باقاعدہ طور پر امتحانات میں پوچھے جانے والے سوالات اور طلباء کے بیٹھنے کے بورڈز کی خریداری کیلئے کروڑوں روپے کے اخراجات کا درپردہ کاروبار جاری ہے اور نتائج موصول ہونے پر لاکھوں روپے صرف کر کے میڈیا میں تشہیر کیلئے اشتہارات شائع کروا کے باقاعدہ آئندہ آنے والی نسل سے اس کی قیمت وصول کی جاتی ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ آج بھی ہماری 70 فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ ان کیلئے اول تو ضرورت بھر سکول موجود ہی نہیں، اگر ہیں تو ان کی صورتحال عبرت انگیز ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مرکزی اور صوبائی حکومتیں مل کر ایک وسیع تعلیمی کمشن بنائیں جو انقلابی بنیادوں پر کام کرے اور تعلیم کو پورے ملک میں عام کرے۔ پرائیویٹ سیکٹر میں اگر تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں تو انہیں مادرپدر آزاد نہ چھوڑا جائے۔ تعلیمی نصاب کا مکمل جائزہ لیا جائے اور سرکاری اداروں میں یکساں نصاب تعلیم رائج کیا جائے۔ فیسیں مناسب مقرر کی جائیں۔ سٹاف کی صلاحیت اور معیار کا جائزہ لیا جائے کیونکہ

اکثر و بیشتر سکول صرف پیسے بٹور رہے ہیں۔ اساتذہ کو تنخواہ کچھ دیتے ہیں اور دستخط زیادہ پر کراتے ہیں اور سب سے ضروری بات یہ کہ فوری طور پر ٹیکنیکل تعلیم کے اداروں کا ایک منظم جال بچھایا جائے جہاں ہماری نوجوان نسل کو ہنر مند بنا کر ملک و قوم اور دنیا بھر کیلئے ایک اثاثہ بنایا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارے چھوٹے بڑے تعلیمی اداروں میں نظریہ پاکستان کو باقاعدہ ایک مضمون کا درجہ دیا جائے۔

ہمارے ہاں پولیس کی طرح اساتذہ بھی اکثر سفارش پر رکھے جاتے ہیں۔ یہ سفارش کون کرتے ہیں، سب کو خبر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیہی علاقوں کے سکولوں میں بچوں کی جگہ بھینسیں گائیں پڑھنے جاتی ہیں۔ شہروں میں جو سکول ہیں ان کی تعداد میں اضافہ تو کجا، وہاں بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں کی جاتیں۔ جب تک ہم اپنے ملک میں نظریاتی اور فنی تعلیم کو عام نہیں کرتے، صالح قیادت کا بھی سامنے آنا ممکن نہیں۔ ان ناگفتہ بہ تعلیمی حالات میں بھی بعض طلبہ بڑی بڑی ایجادات کرتے ہیں مگر ان کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ ہمارے تمام اداروں پر بشمول صوبائی، قومی اسمبلیوں اور سینٹ پر اشرافیہ کا مکمل قبضہ ہے اور وہ اپنے بچوں کو بیرونی ملکوں میں تعلیم دلوا لیتے ہیں۔ اس لئے حکمرانوں (اشرافیہ) کو اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ عوام الناس کے لئے تعلیمی مواقع کتنے اور کیسے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ ہر آنے والا حکمران تعلیم کو عام کرنے کا اعلان تو ضرور کرتا ہے اور اپنے بھرپور شوق کا اظہار بھی کرتا ہے مگر صرف شوق سے تو کام نہیں چلتا۔ اگر تعلیمی اداروں کی یہی حالت رہے گی تو ظاہر ہے جعلی سندوں ڈگریوں کی خرید و فروخت بھی عام ہو گی۔ ہم جب تک علم، عالم اور تعلیم کی قدر اور انہیں عام کرنے کیلئے باقاعدہ کوششیں نہیں کریں گے، ہمارے سارے شعبے بیمار رہیں گے۔ سب سے زیادہ کام ناقص غیر معیاری اور غیر یکساں نصاب تعلیم نے خراب کیا ہے۔ حکومت پرائیویٹ سیکٹر پر اس قدر کنٹرول رکھے کہ ان پر حکومتی تعلیمی اداروں کو گمان ہو۔ چینی کہاوت ہے کہ "اگر تم کسی کی مدد کرنا چاہتے ہو تو اس کو مچھلی دینے کی بجائے مچھلی پکڑنا سکھا دو"۔ چینیوں کو یہ بات سمجھ آ گئی۔ کاش ہمیں بھی آ جائے۔

حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ "ہنر مند آدمی کبھی بھوکا نہیں رہتا"۔ خدارا! ملک میں "ڈگری زدہ" لوگوں کی تعداد بڑھانے کی بجائے ہنر مند پیدا کیجئے۔ دنیا کے اتنے بڑے "ہیومن ریسورس" کی اس طرح بے قدری کا جو انجام ہونا تھا وہ ہمارے سامنے ہے۔

بروز ہفتہ 22 شوال المعظم 1445ھ 2 مارچ 2024ء

حضور ﷺ کا روحانی فیض.....پاکستان

یہ میرے رب کی کوئی خاص حکمت عملی ہے یا کوئی آزمائش ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد جلد ہی اور اس کے باسیوں کو قوم کی پشتیبانی فرمانے والوں کی جدائی اور یتیمی کا غم برداشت کرنا پڑ گیا اور ہمیں حالات کے طوفان بلاخیز کی متلاطم لہروں کا مقابلہ کرنا پڑ گیا اور باوجود لاکھ کوتاہیوں کہ صفر سے آغاز کرنے والی یہ قوم ترقی کرتے کرتے جوہری طاقت بن چکی ہے۔ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ ہم ابھی تک اسے صحیح معنوں میں نہ تو اوفوبالعہد کی پاسبانی کر سکے اور نہ ہی قائداعظمؒ کا پاکستان بنا سکے اور اپنی قومی زندگی کے مختلف شعبوں کو بانی پاکستان کے نظریات و تصورات کے مطابق استوار نہیں کر سکے۔ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر پاکستان کی بنیاد ہی اسی لئے رکھی گئی کہ ہم ارضِ وطن کو ایسے کہف میں تبدیل کر دیں جہاں ایمانی استقامت اور دجالی فتنوں سے بچنے کیلئے ہمیں پناہ ملے۔

محمد علی جناحؒ نے اس مملکت کو حضور اقدس ﷺ کا روحانی فیضان قرار دیا تھا لہٰذا بارگاہ رسالت مآب ﷺ سے عطا کردہ اس نعمت کی قدر و منزلت اور حفاظت ہر پاکستانی پر واجب ہے۔اس کی ناقدری اور خیانت کرنے والے نہ صرف دنیا بلکہ آخرت میں بھی رسوا ہو گئے وجہ اس کی یہ ہے کہ بابائے قوم جب قائداعظمؒ حصولِ آزادی کیلئے مصروف تھے تو ان کے ذہن میں ایک آزاد اسلامی مملکت کا جو تصوّر تھا، وہ مسلمانانِ برصغیر کے سوادِ اعظم کی آرزوؤں اور امنگوں کا ترجمان تھا۔ان کے ذہن میں ایک ہی بات نقش تھی کہ برصغیر پاک و ہند میں مسلمان اپنی ایک ایسی اسلامی، فلاحی اور جمہوری مملکت قائم کریں جہاں وہ حضورِ پاکؐ کے عطا کردہ آئین کی روشنی میں زندگی گزاریں۔

اس امر کو ایک المیے سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرف ہم نے من حیث القوم اور دوسری طرف برسرِ اقتدار طبقے اور حاکمانِ وقت نے قائداعظمؒ کے تصورات کو عملی جامہ پہنانے میں مجرمانہ غفلت و کوتاہی کا مظاہرہ کیا۔اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قیامِ پاکستان کے مخالفین اور دینِ اسلام کے ناقدین نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس ملک میں لادینی نظریات کو فروغ دینے کی مہم چلائی۔یہی وجہ ہے کہ ہم آج اپنی سیاسی ابتری کے ایسے بھنور میں غوطے لگا رہے ہیں جہاں منزل دور ہوتی جا رہی ہے۔قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد کے دور میں قائداعظمؒ کے ایسے متعدد بیانات موجود ہیں جن میں بڑی صراحت سے بیان کر دیا کہ پاکستان میں نظامِ حکومت صرف اور صرف دینِ اسلام اور قرآن کی روشنی میں وضع کیا جائے گا۔

13 جنوری 1948ء کو اسلامیہ کالج پشاور میں خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا: "ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کیلئے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں"۔بابائے قوم کی تقاریر و بیانات سے یہ امر روزِ روشن کی مانند کو اضح ہو جاتا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی نظریہ حیات کے اصولوں پر مبنی ریاستی اور سماجی ڈھانچے کی تشکیل کے خواہش مند تھے اور مسلمانانِ برصغیر کیلئے محض ایک آزاد مملکت کا قیام ہی ان کا مقصود نہ تھا بلکہ اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمان وہاں آزادی کے ساتھ اپنے ضابطہ حیات اپنی تمدّنی روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ آزاد مملکت میں آئین و حکومت کے حوالے سے بھی قائداعظمؒ کے تصورات بڑے واضح تھے۔ایک مرتبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں آپ سے دریافت کیا گیا کہ پاکستان کا آئین کس طرح کا ہو گا تو آپ نے جواب میں فرمایا: میں کون ہوتا ہوں آپ کو آئین دینے والا، ہمارا آئین تو ہمیں آج سے تیرہ سو سال پہلے ہی ہمارے عظیم پیغمبر ﷺ نے دے دیا تھا۔ ہمیں تو صرف اس آئین کی پیروی کرتے ہوئے اسے نافذ کرنا ہے اور اس کی بنیاد پر اپنی مملکت میں اسلام کا عظیم نظامِ حکومت قائم کرنا ہے اور یہی پاکستان ہے"۔

قائداعظمؒ کے نزدیک دینِ اسلام نہ صرف مسلمانوں کی نجی زندگی کے رہنما اصول فراہم کرتا ہے بلکہ اپنے پیروکاروں سے اپنی پوری اجتماعی زندگی کو بھی اسلامی نہج پر استوار کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ قائداعظمؒ پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کے متمنی تھے نہ کہ ایک سیاسی، معاشی، معاشرتی اور سیکولر ریاست جیسا کہ آج کل ہمارے کچھ نام نہاد دانشور اور بزعم خویش مؤرخ ثابت کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ بابائے قوم نے اغیار کی پھیلائی ہوئی بدگمانیوں کو دور کرنے کیلئے بارہا اپنی تقاریر میں واضح کیا کہ پاکستان میں اسلام پر نظامِ حکومت کے سوا کسی دوسرے نظریے یا اِزم کی کوئی گنجائش نہ ہوگی لیکن صد افسوس کہ اس مرتبہ انتخابات میں کسی بھی سیاسی لیڈر نے اپنے منشور یا تقریر میں اس کا تذکرہ تک نہیں کیا تاہم قائد نے پاکستان کی اقتصادی پالیسی کے بارے میں اپنی تقاریر و بیانات سے یہ امر واضح کر دیا کہ آپ جاگیرداروں اور سرمایہ داری نظام کو سخت ناپسند فرماتے تھے اور پاکستان میں غرباء کیلئے معیارِ معیشت بلند کرنے کے خواہاں تھے اور پاکستان کے اقتصادی نظام کو اسلام کے غیر فانی اصولوں پر ترتیب دینا چاہتے تھے یعنی ان اصولوں پر جنہوں نے غلاموں کو تخت و تاج کا مالک بنا دیا تھا۔

11 / اگست 1947ء کو اپنے خطاب میں فرمایا: "اگر ہم اس عظیم مملکت کو خوشحال بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی پوری توجہ لوگوں اور بالخصوص غریب طبقے کی فلاح و بہبود پر مرکوز کرنی پڑے گی"۔ اس لئے ایوان اقتدار میں سستانے والوں کو یہ خبر ہو کہ سیاست ٹھہرے ہوئے پانی کا نہیں بلکہ اس کی روانی کا نام ہے۔ اپنی عقل و فراست کے ساتھ اس کے بند مضبوط بنانے کی ضرورت ہے ورنہ اس روانی کو بند کرنے میں کسی قسم کی مروت کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا ۔ اوپر کی سطح پر تبدیلیاں ہی تبدیلیاں اور نیچے؟ کیا اب بھی وہی ہم اور وہی غم ہوں گے۔ چہرے بدلنے سے کبھی مقدر نہیں بدلتے۔ تبدیلی کا عمل جب تک نچلی سطح تک نہیں جائے گا، عوام کے احساسات و جذبات اسی طرح سلگتے رہیں گے۔ مہنگائی، لوڈشیڈنگ اور آئے دن ایک دوسرے پر کرپشن، بدانتظامی اور دیگر الزامات کے ذکر پر انہیں ڈرائیں اور دوڑائیں نہ، وہ تو پہلے ہی بہت ڈرے ہوئے اور تھکے ہوئے ہیں۔ حالات و واقعات نے انہیں اس قدر ٹچی بنا دیا ہے کہ سوئی کی آواز بھی انہیں کسی دھماکے سے کم نہیں لگتی۔ رہی سہی کسر موجودہ انتخابات کے نتیجے میں قوم کے اندر تقسیم در تقسیم نے عوام کو ادھ موا کر دیا ہے۔

اس کیلئے موجودہ سرکار کو عوام کیلئے اللہ سے "کاروبار" کرنا ہوگا پھر کہیں جا کر ان کا بازار چلے گا۔ ان کی مسکراہٹ سے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ مسکراتے ہوئے چہروں کے دل بہت اداس ہوتے ہیں، ان کے تو خواب بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہوتے۔ ہر رات کو شب برات سمجھنے والوں کو یادوں کی بارات کا کیا پتہ، انہیں اس کا پہلے سے اندازہ ہو جائے تو وہ آنکھ بند کرنے سے ہی توبہ کر لیں۔ بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوتی ہیں مگر ان کے ضمیر سو رہے ہوتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو جاتی ہیں مگر ان کی تعبیر جاگتی رہتی ہے۔ بہت سے خواتین و حضرات کو آنکھوں کی "چہل قدمی" کا بڑا شوق ہوتا ہے، انہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ آنکھیں بھٹک جائیں یا کہیں اٹک جائیں۔ اسی شوق چشم میں وہ بہت سے دوسروں کے گھروں میں "نظر اندازی" کرنے والوں کو اپنی چادر و چار دیواری کے اندر بھی دیکھنا چاہئے کہ اس تاک جھانک روگ بھی لگا جاتے ہیں۔ سے دل پر کیا گزرتی ہے۔ من کا ویسے بھی دھن سے کیا رشتہ ہے، اسی لئے کہتے ہیں کہ دل نہ بھریں، یہ بھر گیا تو بہت سے سیلاب جسم کو ڈبو دیں گے۔ سیاست میں یہی سیلاب سونامی بن جاتے ہیں۔

نجانے ایک واقعہ یاد آ گیا، سوچا وہ بھی قارئین کی نذر کر دوں۔
ایک بادشاہ نے ایک عظیم الشان محل تعمیر کروایا جس میں ہزاروں آئینے لگائے گئے تھے۔ ایک مرتبہ ایک کتا کسی نہ کسی طرح اس محل میں جا گھسا۔

رات کے وقت محل کا رکھوالا محل کا دروازہ بند کر کے چلا گیا لیکن وہ کتا محل میں ہی رہ گیا۔ کتے نے چاروں جانب نگاہ دوڑائی تو اسے چاروں طرف ہزاروں کی کی تعداد میں کتے نظر آئے۔ اسے ہر آئینے میں ایک کتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کتے نے کبھی اپنے آپ کو اتنے دشمنوں کے درمیان پھنسا ہوا نہیں پایا تھا۔ اگر ایک آدھ کتا ہوتا تو شائد وہ اس سے لڑ کر جیت جاتا لیکن اب کی بار اسے اپنی موت یقینی نظر آ رہی تھی۔ کتا جس طرف آنکھ اٹھاتا اسے کتے ہی کتے نظر آتے ۔ اوپر اور نیچے چاروں طرف کتے ہی کتے تھے۔ کتے نے بھونک کر ان کتوں کو ڈرانا چاہا، دھیان رہے کہ دوسروں کو ڈرانے والا دراصل خود ڈرا ہوا ہوتا ہے ورنہ کسی کو ڈرانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جب کتے نے بھونک کر ان کتوں کو ڈرانے کی کوشش کی تو وہ سینکڑوں کتے بھی بھونکنے لگے۔ اس کی نس نس کانپ اٹھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے بچنے کا کوئی راستہ نہیں کیونکہ وہ چاروں طرف سے گھر چکا تھا۔ صبح چوکیدار نے دروازہ کھولا تو محل میں کتے کی لاش پڑی تھی۔ اس محل میں کوئی بھی موجود نہ تھا، جو اسے مارتا۔ محل خالی تھا لیکن کتے کے پورے جسم میں زخموں کے نشان تھے۔ وہ خون میں لت پت تھا۔ اس کتے کے ساتھ کیا ہوا؟؟؟؟ خوف کے عالم میں وہ کتا بھونکتا، جھپٹا دیواروں سے ٹکرایا اور مر گیا۔

ہمارے سبھی تعلقات، سبھی حوالے آئینوں کی مانند ہیں۔ ان سب میں ہم اپنی ہی تصویر دیکھتے ہیں۔ نفرت سے بھرا آدمی یہ دیکھ رہا ہوتا ہے کہ سب لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ لالچی آدمی کو یوں معلوم ہوتا ہے کہ سب اس کو لوٹنے کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ وہ اپنے لالچ کی تصویر دنیا کے آئینہ خانے میں دیکھتا ہے۔ شہوانیت کا مریض سوچتا ہے کہ ساری دنیا اسے جسم پرستی کی دعوت دے رہی ہے۔ فقیر کہتا ہے کہ ساری دنیا ایک ہی اشارہ کر رہی ہے کہ چھوڑ دو سب کچھ بھاگ جاؤ دنیا سے۔ ہم جو کچھ بھی ہیں وہی کچھ ہمیں اپنے چاروں طرف دکھائی پڑتا ہے۔ سارا جگ آئینہ ہے جس میں ہمیں اپنا آپ ہی دکھائی پڑ رہا ہوتا ہے۔

اپنے ارد گرد کے آئینوں کو اپنے عمل، کردار اور اخلاق کے ساتھ صاف رکھنے کی کوشش کریں کیوں کہ ہمارا آئینہ ہمارے لئے راہِ نجات بھی ہے اور باعث پکڑ بھی۔ میرے خیال میں کہانی کا مقصد اپنے ارد گرد کے آئینے کو اپنے عمل، کردار اور اخلاق سے صاف رکھنے کی کوشش کرنا ہے کیونکہ ہمارا آئینہ بھی ہماری نجات اور ہماری گرفت کا سبب ہے۔ پھر آج کیوں نہ اس پر عمل کریں۔

یاد رہے کہ پیارے پاکستان میں بہت سے سیاستدان اقتدار کے بغیر نہیں رہ سکتے اور اسلام آباد ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہماری بربادی میں ان لوگوں کی آبادی کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ عوام کی آراء کا احترام کرتے ہوئے مستقبل کے فیصلوں میں ایسا ماحول پیدا کیا جائے جہاں قوم کے بڑھتے اضطراب کا مداوا ہو سکے۔ اگر ہم بلوچستان میں پائیدار امن کیلئے گلزار شنبے اور ان جیسے دیگر افراد جنہوں نے میڈیا کے سامنے ہمارے سینکڑوں فوجیوں اور عوام کے قتل کا اعتراف کیا ہے، قومی مفاد سلامتی کیلئے ان کو معافی دے سکتے ہیں تو 9 مئی کے واقعات پر کم از کم ان گرفتار افراد کی رہائی کا اعلان ضرور کیا جائے جو باقاعدہ اس گناہ میں شریک نہیں اور جن کے خلاف ٹھوس شواہد اور ثبوت ہیں تو ان کو مزید کسی تاخیر کے مقدمات کی سماعت کر کے کسی انجام تک پہنچایا جائے۔

ہمارے کچھ مہرباں لوگوں کی سوچ ہے کہ مذہب کی آڑ میں اس قدر بزدل بنادو کہ وہ محرومیوں کو قسمت اور ظلم کو آزمائش سمجھ کر صبر کرلیں۔ حقوق کیلئے آواز اٹھانا گناہ سمجھیں، غلامی کو اللہ کی مصلحت قرار دیں اور قتل کو موت کا دن معین سمجھ کر چپ رہیں۔ غلام قومیں بدکرداروں کو بھی دیوتا مان لیتی ہیں اور آزاد قومیں عمر بن خطاب جیسے بے مثل حکمرانوں کا بھی محاسبہ کرتی ہیں۔ جس دن ہم نے اپنے بچوں کو یہ ذہن نشین کرادیا کہ ہمارے ہیرو وہ نہیں جو جنگ وجدل اور خون بہانے کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں بلکہ جس دن ہم نے انہیں یہ سکھانا شروع کردیا کہ ہمارے ہیرو تو وہ ہیں جو انسانی وحیوانی زندگی کا احترام اپنے رب کے خوف کا حکم سمجھ کر خود پر فرض کرلیتے ہیں، اوران کی راتیں اللہ کے خوف سے سجدوں میں جھکی رہتی ہیں اور یہ ہیرو ہمارے سائنسدان، اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد ہمارے استاد بنیں گے تو پھر ہی معاشرے سے ہمارے بچے جرائم اور تشدد سے نفرت کرنا سیکھیں گے۔ اس لئے اپنے بچوں کو حق اور باطل میں فرق سمجھاتے ہوئے ایسی زندگی سے محبت سکھائیں جو ہمیشہ کی اخروی زندگی کا زادِ راہ بن سکے۔

یہ بھی ذہن نشیں رہے کہ ارض وطن کی معاشی بدحالی اور سیاسی انتشار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بیرونی دباؤ کی وجہ سے استعمار سے جلد دوستی کی بیماری اب وبا کی شکل اختیار کرگئی ہے۔ جب تک فلسطین اور کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوگا، اس کیلئے چاہے جتنے مرضی الفاظ جمع کرلیں، "کاغذ کورا" ہی رہے گا۔ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ محبت صرف ایک بار ہوتی ہے اوراس کے بعد سمجھوتے ہی چلتے ہیں، جب تک جان ہے، جہان داری تو نبھانی ہی پڑے گی، جس میں ہار جیت چلتی رہتی ہے۔ جیتنے والوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ قوم دکھوں سے ہار رہی ہے اورآپ مخالفین کو قابو کرنے کی تعریفیں سن کر نہال ہو رہے ہیں۔ آئے دن بھوک کے ہاتھوں دلبرداشتہ ماں اپنے معصوم بچوں سمیت خود کو ٹرین سے کٹوا کر ہمارے سسٹم کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ ہمارے ہاں زندہ لوگوں کا حساب نہیں لیا جاتا تو مرے ہوئے کس کھاتے میں آئیں گے۔ امیر شہر کا تو اپنا یہ حال ہے:

امیر شہر غریبوں کا خیال کیا کرتا
امیر شہر کی اپنی ضرورتیں تھیں بہت

ہمارے ملک میں واقعی "اچھی گفتگو" کا خوفناک قحط ہے، آپ ملک کے کسی حصے میں چلے جائیں کسی فورم، کسی گروپ کا حصہ بن جائیں، آپ کو سیاسی افواہوں، سیاسی لطیفوں اور سیاسی گپ شپ کے علاوہ کچھ نہیں ملے گا اورآپ اگر کسی طرح سیاست سے جان چھڑا بھی لیں تو آپ کو کسی مذہبی گفتگو کے تالاب میں دھکا دے دیا جائے گا اور وہ ساری بات چیت بھی سیاسی گفتگو کی طرح غیر مصدقہ واقعات پر مشتمل ہوگی۔ بدنصیبی یہ ہے کہ ہمارا پورا ملک بولنے کے خبط میں مبتلا ہے، ہم میں سے ہر شخص روزانہ تین چار کروڑ لفظ بول کر سوتا ہے۔ بعض لوگوں کی اس میں بھی تسلی نہیں ہوتی چنانچہ یہ نیند میں بھی بڑبڑاتے رہتے ہیں لیکن آپ جب اس گفتگو کا عرق نکالتے ہیں تو اس میں سے شخصیت پرستی اور سیاست کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا، ہم میں سے ہر شخص اندھا دھند بولنا چاہتا ہے اور یہ اس میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ اس کی گفتگو میں سیاست اور مذہب کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا اور یہ بھی سنی سنائی اور غیر مصدقہ باتیں ہوتی ہیں۔

انسان "حیوان نطق" بولنے والا جانور ہے، یہ اظہار کرتا ہے اوراظہار کیلئے آئیڈیاز چاہیے ہوتے ہیں اورآئیڈیاز کیلئے معلومات اور علم درکار ہوتا ہے۔ علم اور معلومات کیلئے پڑھنا، گھومنا اور گھومنے اور پڑھنے والے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا پڑتا ہے اور ہم یہ کرتے نہیں ہیں لہٰذا پھر ہم کیا سنیں اور کیا سنائیں گے؟ ہم کیا گفتگو کریں گے؟ نیا خیال، نیا آئیڈیا کہاں سے آئے گا؟ ہم کیا گفتگو کریں گے؟ اس لئے اس معاشرے میں علم، معلومات، اچھی گفتگو نئے آئیڈیاز کی کمی ہے چنانچہ اس کمی نے ہمارے معاشرے میں ایک اچھی گفتگو کا بحران پیدا کردیا ہے۔ اچھی گفتگو کیلئے ضروری ہے کہ خوشامد اور تحسین میں

فرق رکھا جائے، خوشامد، جھوٹی بات اور تحسین پر خلوص بات میں بڑا فرق ہوتا ہے لوگوں کے ساتھ بات کریں تو ان کی ضرورتوں پر بات کریں اور اس کی تکمیل کا راستہ بنایا جائے، ہمیشہ دوسروں کے نقطہ ء نظر کو سمجھنے کی کوشش کریں، لوگوں میں سچی دلچسپی لیں۔

یہ آفاقی سچائی ہے کہ ہر وہ آدمی جس سے آپ ملتے ہیں، اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح آپ سے بہتر خیال کر رہا ہوتا ہے اور اس کے دل میں گھر کرنے کا یہ بہترین طریقہ ہے کہ اسے باور کرائیں کہ آپ اس کو ایک اہم شخصیت مانتے ہیں، حجت بازی سے ہمیشہ پرہیز کریں، کبھی کوئی بحث و تکرار سے نہیں جیت سکا۔ دوسروں کے نقطہ نظر سے چیزوں کو دیکھنا اور اس کے منہ سے ہاں کہلوانا بہت نفع بخش اور دلچسپ بات ہے۔ ہمیشہ دوسرے شخص کو زیادہ سے زیادہ بات کرنے کا موقع دیں، اپنے کارناموں کا تذکرہ کم سے کم کریں اور اعتدال پسندی سے کام لیں، اس دنیا میں ہم سب کو جو آواز اچھی لگتی ہے وہ ہمارے نام کی ہے، کسی آدمی کا نام اس کیلئے سب سے میٹھی اور اہم آواز ہے، یہی وجہ ہے کہ جب بھی ہم نیا پین لیتے ہیں تو سب سے پہلے اس سے اپنا نام لکھتے ہیں، لہٰذا لوگوں کو اچھے ناموں سے پکارا کریں اس سے معاشرے میں بہتری بھی آئے گی اور آپ بھی مطمئن زندگی گزاریں گے۔

بروز سوموار 24 شوال المعظم 1445ھ 4 مارچ 2024ء

مودی کا مکروہ چہرہ

الیکٹرانک میڈیا نے جس سرعت کے ساتھ اپنا وجود منوایا ہے اس نے ساری دنیا میں ہونے والی کسی بھی خبر کو پل بھر میں جہاں ناظرین کو باخبر رکھا ہوا ہے وہاں بدقسمتی سے ہمارا میڈیا، سول سوسائٹی حتی کہ اہل سیاست کے برخوردار غلط قسم کے حلقے ریاست اور ریاستی اداروں کو مختلف حوالوں سے تنقید بلکہ تنقیص کا ہدف بنانا اپنا فرض سمجھتے ہوئے میڈیا کی بے مہار آزادی کا ناجائز فائدہ بھی اٹھا رہا ہے۔ مزید بدقسمتی یہ کہ اس شوقِ فضول اور مشق لاحاصل کو وہ دانشوری اور جدت پسندی کی علامت قرار دے رہا ہے جس سیغیر ملکی بشمول بھارتی آقا بہت خوش ہیں، خود حکومت میں شامل بعض بزرجمہر فرماتے ہیں کہ طاغوتی طاقتیں عدلیہ اور بعض بااثر اداروں پر دباڈال کر اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل میں لگی ہوئی ہیں۔ اس قبیل کے بعض عناصر پاک فوج اور سول انتظامیہ میں ہم آہنگی کے خوش آئند امکانات معدوم کرنے میں مشغول ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے معاشرتی، سیاسی اور ریاستی ڈھانچے میں بہت سی کوتاہیاں ہیں لیکن اس حوالے سے بات کرتے ہوئے یہ امر بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ خدانخواستہ ہماری قومی سلامتی اور اس کے محافظ اداروں کو کوئی گزند پہنچی تو اجتماعی طور پر ملک و قوم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

اس ضمن میں بھارت میں بسنے والے کروڑوں مسلمانوں کا ہلکا سا موازنہ پیش نظر رہے تو شاید کفرانِ نعمت کے مرتکب ہمارے افراد اور گروہوں میں کچھ مثبت تبدیلی رونما ہو سکے۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں کہ بھارت کے جمہوریت اور سیکولرازم کے تمام دعوں کے باوجود 24 کروڑ کے لگ بھگ مسلمان آج بھی دوسرے ہی نہیں بلکہ تیسرے درجے کے شہری ہیں۔ ایک انسان دوست بنگالی ہندو دانشور شرت بسواش نے بی بی سی کی ہندی سروس میں بھارتی مسلمانوں کی حالت زار کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ بلاشبہ بھارت میں ڈاکٹر ذاکر حسین، فخر الدین علی احمد، ابوالکلام کو صدارت کے منصب پر فائز کیا گیا اور ممبئی کی فلم انڈسٹری میں بھی چند مسلمان اداکار اہم مقام کے حامل رہے ہیں مگر اس سے آگے بھارتی مسلمانوں کے ضمن میں کوئی اچھی خبر ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔

منموہن سنگھ نے 9 مارچ 2005 کو جسٹس سچر کی سربراہی میں مسلمانوں کا احوال جاننے کیلئے کمیٹی نے 30 نومبر 2006 کو اپنی رپورٹ میں انکشاف کیا تھا کہ بھارتی مسلمانوں کی حالت پہلے سے کہیں زیادہ بدتر ہو گئی ہے۔ بھارت کے دیہی علاقوں میں رہنے والے 94.99 مسلمان خط غربت سے نیچے اور شہری علاقوں میں 61.1 فیصد خط افلاس سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ دیہی علاقوں کے 64٪ اور شہری علاقوں کے 62٪ نے کبھی اسکول کا منہ نہیں دیکھا۔ دیہی مسلم آبادی کے 8٪ اور شہری علاقوں میں 1.3٪ مسلم گریجوایٹ ہیں اور 1.2٪ پوسٹ گریجوایٹ ہیں۔ مغربی بنگال کی کل آبادی کا 52٪ مسلمان ہیں مگر سرکاری نوکریوں میں یہ شرح صرف 4.2٪ ہے۔ آسام میں 40٪ مسلمان مگر نوکریاں 1.2، کیرالہ میں 20٪ آبادی مگر 1.4٪ کے پاس نوکریاں ہیں البتہ کرناٹک میں 2۔21٪ مسلم آبادی کے پاس نسبتاً بہتر یعنی 8.5٪ نوکریاں ہیں۔ بھارتی فوج اور متعلقہ خفیہ اداروں نے سچر کمیٹی کو سروے کی اجازت نہیں دی مگر ذرائع کے مطابق بھارت کی 41 لاکھ سے زائد فوج میں مسلم تعداد صرف 92 ہزار ہے اور ان میں سے بھی 5٪ کا تعلق مقبوضہ جموں وکشمیر کی پیرا ملٹری فورسز سے ہے، یوں بھارتی آرمی میں مسلمانوں کی تعداد تین فیصد سے بھی کم ہے اور اس میں بہت بھاری اکثریت نچلے درجے کے اہلکاروں کی ہے اور انہیں بھی شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بھارت کی سب سے بڑی اقلیت یا دوسری بڑی اکثریت کن نامساعد حالات میں زندگی گزار رہی ہے۔

بھارت میں مسلمانوں کی زبوں حالی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں اوران کی حالت زار دیکھ کر دو قومی نظریے پر یقین اور بھی پختہ ہو جاتا ہے۔ بھارت کی دگر گوں صورتحال کی سنگینی اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی کہ ہم خیال کرتے ہیں۔ اگر یاد ہو تو بھارتی وزیر مملکت برائے اقلیتی امور مختار عباس نقوی نے ریاست ہریانہ کے شہر میوات کے گرلز ہاسٹل کے افتتاح اور ایک ہائر سکینڈری اسکول کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ بھارت میں اب 57 مسلمان خط غربت سے نیچے کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور بھارت میں ذات پات، مذہب اور علاقے کی بنیاد پر تفریق آج بھی بہت گہری ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ بھارت میں اقلیتوں کیلئے غربت اور بیروزگاری سب سے بڑا چیلنج ہیں۔

بھارت میں ملکی سطح پر مسلمانوں میں شرح خواندگی 46.8 ہے، مزید براں 6 سے 14 سال کی عمر کے ہر 4 میں سے ایک بچہ یا تو اسکول جاتا ہی نہیں یا ابتدائی کلاسز سے ہی اٹھالیا جاتا ہے۔ قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر جمیل انور چودھری نے کہا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ابتری وزبوں حالی اچھوت و شودرا قوام سے بھی بدتر ہے۔ وہ الرازی ہال نیو کیمپس میں (دلت تحریک.....ماضی حال اور مستقبل) کے موضوع پر منعقدہ ایک روزہ سیمینار سے خطاب کر رہے تھے جس سے ایڈیٹر دلت وائس بنگلوروی ٹی راج شیکھر، پرنسپل سینٹ انیس کالج کیرالہ، پروفیسر راجو تھامس، پروفیسر خواجہ محمد زکریا، ڈاریکٹر سرگنگارام ہر ٹیج فانڈیشن، پروفیسر محمد یوسف عرفان اور ڈائریکٹر ساتھ ایشین سٹڈیز سنٹر، ڈاکٹر محمد سلیم مظہر نے بھی خطاب کیا۔ ایڈیٹر دلت وائس راج شیکھر نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بھارت میں مسلمانوں کو دہشتگرد، جانور اور غدار قرار دیتے ہوئے انہیں پاکستان یا قبرستان جانے کیلئے کہا جاتا ہے، دوسری طرف ہندو مسلم اتحاد کیلئے امن کی آشا جیسی ڈرامہ بازیاں کر رہے ہیں جو پاکستان کے نظریاتی وجود کو منہدم کرنے کے مترادف ہیں ۔ بھارت میں اقلیتوں کی حالت زار کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ یہ سچائی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ سیکولر کے پردے میں کٹر ہندوں نے دیگر مذاہب ماننے والوں کو عملی طور پر یرغمال بنانے کی حکمت عملی جاری رکھی ہوئی ہے۔ تقسیم ہند کو انتہاپسند ہندوں نے تاحال دل سیقبول نہیں کیا چنانچہ پاکستان اور مسلمان دشمنی کے مظاہرے آئے روز کسی نہ کسی شکل میں رونما ہوتے رہتے ہیں۔

سیاست اور میڈیا میں پاکستان دشمنی ہی ہے جس کے سبب اب تک قیام امن کی ہر کوشش ناکام ہوتی چلی آئی۔ آج صورتحال یہ ہے کہ پاکستان اور بھارت کے ایٹمی قوت بن جانے کے باوجود تنازعات پر امن انداز میں حل کرنے میں کامیاب نہ ہونا جنوبی ایشیا کے علاوہ دنیا بھر کے امن پسند لوگوں کیلئے تشویشناک بن چکا ہے۔ بھارت کی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ کانگرس کے مسلم رہنماں نے ہمیشہ مسلمانوں کو یہ یقین دلایا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد ہندو اکثریت ان پر طاقت کے بل بوتے پر مسلط نہیں ہو گی۔ ابوالکلام آزاد جیسے مسلم رہنما اپنے طور پر بھرپور انداز میں یہ مہم چلاتے رہے کہ مذہب کی بنیاد پر مستقبل کے بھارت میں ہرگز تفریق نہ برتی جائے گی مگر بدقسمتی سے ایسا کبھی نہ ہو سکا۔ آج بھی بھارت میں کئی دہائیاں گزر جانے کے باوجود کٹر ہندو مسلمانوں کی الگ شناخت دل سے تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ بابری مسجد کا واقعہ انتہاپسندی کی بدترین مثال کی صورت میں آج بھی انصاف کی منتظر ہے۔ گجرات میں مسلم کش فسادات بھارت میں اہل توحید کی زبوں حالی کا ایک اور ایسا ثبوت بن کر ابھرے ہیں کہ خود کو دنیا کی بڑی سیکولر جمہوریت کا دعویٰ کرنے والوں کے منہ پر مستقل طور پر ایک کالک بن کر تاریخ میں رقم ہو چکی ہے۔

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس سرزمین پر امن وامان سے رہنے کا حق کون دے گا جہاں خود ہندو انتہاپسندوں کی حکومت ہو۔ بھارت میں 24 کروڑ کے لگ بھگ مسلمان موجود ہیں مگر ان کی یہ تعداد بھی انہیں تحفظ اور ترقی کے مساوی مواقع فراہم کرنے میں ناکام ثابت ہو رہی ہے، واحد وجہ یہی ہے کہ ہندو مسلمانوں سے کئی گنا اکثریت میں ہیں۔ بھارت میں وقتاً فوقتاً مسلمانوں کی زبوں حالی کے بارے میں خبروں کی اشاعت سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے

کہ دانستہ طور پر ایک اللہ، ایک رسول ﷺ اور ایک قرآن کو ماننے والوں کو پس ماندہ رکھنے کی حکمت عملی جاری ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بھارت میں ایسے دینی مدارس بھی ہیں جہاں مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے ماننے والے بھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے کہ ایسی دینی درسگاہوں میں اسلام کی حقانیت کی تعلیم کس حد تک دی جاسکتی ہے۔ بظاہر یہ ناپسندیدہ نہیں کہ مسلمان، ہندو اور عیسائی بچے بیک وقت تعلیم حاصل کریں مگر دینی مدرسہ میں مذکورہ ماحول کے اثرات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

آگرہ میں انتہاپسند ہندوں نے کم و بیش دو سو مسلمانوں کو جاگیر سے بید خل کرنے کا خوف دلا کر اسلام چھوڑنے پر مجبور کیا مگر ان کو اس وقت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا جب مسلمانوں نے اپنے گھروں میں جا کر نماز کی ادائیگی اور قرآن کی تلاوت کر کے دین سے اپنی وابستگی کا برملا ثبوت دے ڈالا۔ بھارتی میڈیا میں یہ خبر آچکی کہ غریب مسلمانوں کو راشن کارڈ دینے کا لالچ دیکر انہیں ہندو بنانے کی مہم جاری ہے۔ آر ایس ایس اور اس کی دو ذیلی تنظیمیں بجرنگ دل اور دھرم جگ رن پیچ اس ضمن میں بے دریغ پیسہ خرچ کر رہی ہیں۔ مذکورہ تنظیموں نے دعوی کیا ہے کہ 75 مسلمان خاندان ہندو دھرم میں آئے ہیں۔ بھارت میں رہنے والی اقلیتوں کو ہندو بنانے کے پروگرام کو "پرکھوں کی واپسی" کا نام دیا گیا ہے۔ 2003 سے لیکر اب تک دو لاکھ 78 ہزار مسلمانوں عیسائیوں کو ہندو دھرم اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔

مذکورہ واقعہ کے خلاف پارلیمنٹ میں زبردست ہنگامہ آرائی بھی ہوئی، ایوان میں حزبِ اختلاف کے رہنماں کا مقف تھا کہ طاقت کے ذریعے مذہب تبدیل کرنے کی مہم بھارت کے سیکولر تشخص کیلئے تباہ کن ثابت ہوگی۔ بھارتی آئین میں زبردستی مذہب تبدیل کرنا قانونی طور پر جرم ہے مگر اس کے برعکس صورتحال یہ ہے کہ انتہاپسند ہندو رہنما راجیشور کا کہنا ہے کہ ساٹھ گرجاگھروں پر ان کا قبضہ ہے اور ان میں اب کوئی عبادت نہیں ہو رہی۔ انتہا پسند ہندو رہنما نے فخریہ انداز میں کہا کہ ایک دن گرجاگھروں کی دیواریں گرادیں جائیں گی اور ہمارا دیش صرف ہندو دیش ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ مودی کے برسر اقتدار ہوتے ہوئے یہ خوش فہمی کس طرح پالی جائے کہ پڑوسی ملک میں مسلمانوں سمیت دیگر اقلیتوں کیلئے زمین تنگ نہیں کی جائے گی۔ کیا ہمارے وظیفہ خور قسم کے دانشور اس اٹل حقیقت سے انکار کر سکیں گے؟

ایک رپورٹ کے مطابق مہاراشٹر میں مسلمانوں کی آبادی 10.6 فیصد جبکہ جیلوں میں ان کی تعداد 32.4 فیصد ہے۔ گجرات میں آبادی 9.06 فیصد اور جیلوں میں ان کی تعداد 25 فیصد ہے۔ آسام میں مسلمانوں کی آبادی 30.9 فیصد اور جیلوں میں ان کی تعداد 28.1 فیصد ہے۔ کرناٹک میں مسلمانوں کی آبادی 12.23 فیصد ہے اور جیلوں میں ان کی تعداد 17.9 فیصد ہے۔ نئی دہلی کی تہاڑ جیل میں 32814 قیدیوں میں سے مسلمان 5.20 ہیں۔ رپورٹ کے مطابق پولیس مسلمانوں کو شبہ اور جھوٹے مقدمات میں گرفتار کرتی ہے۔ عدلیہ میں انہیں انصاف بھی نہیں ملتا۔ مغربی بنگال میں مسلمان آبادی کا 25 فیصد ہیں۔ آسام میں مسلمانوں کی آبادی 31 فیصد ہے مگر عدلیہ میں ان کی نمائندگی 9.6 فیصد ہے۔ مقبوضہ جموں و کشمیر عدلیہ میں مسلمانوں کا تناسب 48 فیصد ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی حالت انتہائی خراب ہے۔ انہیں بہت کم سرکاری ملازمتیں ملتی ہیں۔ کیرالہ میں 5.9 فیصد مسلمان اعلی عہدوں پر فائز ہیں جبکہ مغربی بنگال میں کوئی مسلمان بھی اعلی عہدے پر فائز نہیں۔ کرناٹک میں ان کا حصہ 58 فیصد ہے۔ گجرات میں

صرف 45 فیصد مسلمان ملازم ہیں۔ تامل ناڈو میں 23 فیصد، آسام میں 11.2 فیصد، مغربی بنگال میں صرف 24 فیصد ملازم ہیں۔

خود حکومت ہند کی مقرر کردہ سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق "ترقی کے بیشتر معاملات میں مسلم برادری دوسری تمام برادریوں سے پیچھے ہے۔ مسلمانوں میں غربت اور ناخواندگی دوسروں سے زیادہ ہے۔ تعلیم کی کمی ہے اور سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں ان کی نمائندگی تشویش ناک حد تک کم ہے۔ شہری علاقوں میں مسلمان عموماً جھگی جھونپڑی والے علاقوں میں رہتے ہیں جہاں صاف پانی اور صفائی کی سہولیات بھی میسر نہیں ہیں اور سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق مودی حکومت ان کو پسماندگی میں رکھ کر ان کو خوفزدہ رکھنے کی پالیسی پر عملدرآمد کر رہی ہے۔ ہندوستان کے لوگوں میں فرقہ پرستی کا احساس پرانا ہے لیکن ہندوستان اور دیگر غیر ممالک میں کچھ ایسے واقعات ہوئے ہیں جس نے فرقہ وارانہ سوچ میں مزید اضافہ کیا ہے۔ اس طرح کی سوچ ہندوستان میں اب عام ہے اور ہندوستان کی حکومت نے کبھی اس مسئلے کے حل کیلئے کوئی باقاعدہ اقدامات بھی نہیں کئے ہیں۔

فرقہ پرستی کے خلاف جنگ کے نام پر وہ "ہندو مسلم بھائی بھائی، سب مذہب ایک ہیں" کے نعرے لگاتے رہتے ہیں لیکن یہ کسی مسئلہ کا حل نہیں ہوتا ہے ۔ حکومت کی اس ناکامی کی وجہ سے ہندو نظریاتی تنظیموں اور مسلم نظریاتی تنظیموں نے اپنے اپنے مفاد کیلئے ہندو، مسلم خلیج کا استعمال کیا اور ہندوستان کی سیکولر شبیہہ کو کبھی ابھرنے نہیں دیا۔ مسلم مخالف احساسات یا اسلاموفوبیا کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن 2001 میں امریکا میں ہونے والے بم حملے، کشمیر میں جاری جدوجہد آزادی اور حالیہ ممبئی بم دھماکوں نے ہندوستان میں مسلمان اور ہندوں کے درمیان مزید تلخی پیدا کی ہے۔ مسلمانوں او اسلام پر یہاں تک الزام عائد کئے گئے ہیں کہ اسلام خود "دہشتگردی" اور دوسرے مذہبوں کے خلاف نفرت کا سبق سکھاتا ہے جبکہ ہندوستان میں برسوں سے جاری واقعات نے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں پر ان الزامات کی روشنی میں خود بھارت کی موجودہ متعصب گروہ نے بھارت میں بسنے والی تمام اقلیتوں کو جینا محال کر رکھا ہے۔

اگر چند لمحوں کیلئے یہ بات صحیح مان لی جائے کہ ہندوستان اور دیگر ممالک میں دہشتگردانہ حملوں کیلئے بعض مسلم گروپس ذمہ دار ہیں تو اس کی وجہ ان کے اپنے خراب سماجی اور معاشی حالات کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ مسلسل ہونے والی زیادتیاں بھی ہیں جن کی وجہ سے ان میں وہ غم و غصہ ہو سکتا ہے جو ایک عرصہ دراز سے وہ برداشت کر رہے ہیں۔ لیکن کیا مودی سرکار کے سوچے سمجھے گجرات ہندو مسلم فسادات کے خلاف کوئی کاروائی ہوئی، ہزاروں مسلمانوں کو حکومتی اداروں کے زیر سرپرستی اس صدی کے بدترین فسادات میں انہیں تہہ تیغ کر دیا گیا لیکن اسے قبول کیے بغیر ایک بار پھر سیدھا نشانہ اسلام اور مسلم پر لگایا گیا۔ جب گجرات میں فرقہ وارانہ فسادات میں ہزاروں مسلمان مارے گئے تھے تب ہندو مذہب کو کیوں اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا گیا۔ اسی طرح امریکی فوج نے ہزاروں مسلمانوں کو عراق، افغانستان، کوریا اور ویتنام میں مار گرایا، اس وقت عیسائی مذہب کو ان ہلاکتوں کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا گیا۔ اب اہم سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب بھی کوئی حملہ ہوتا ہے تو مسلمانوں کو ہی کیوں نشانہ بنایا جاتا ہے۔

ہندوستانی تاریخ میں مسلمانوں کی کثیر تعداد کو صرف عجائب گھروں اور مشاعروں تک ہی کیوں محدود رکھا جا رہا ہے؟ آخر ہندو نظریاتی تنظیمیں اس قدر دیدہ دلیری سے تاریخ کو مسخ کرنے کی کیوں کوششیں کر رہی ہیں کہ "تاج محل" مغل شہنشاہ شاہ جہاں نے نہیں بنوایا تھا بلکہ تاج محل کا نام "تاجو محلیہ" اور وہ ایک ہندو راجپوت راجا کا محل تھا۔

سکولوں، کالجوں اور دفتروں میں مختلف مذہب اور ذات کے افراد ایک ساتھ کام کرتے ہیں لیکن باوجود اپنی تعلیمی قابلیت اور سخت محنت کے باوجود ترقی سے محروم رکھنے کے عذاب سے دوچار ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں ہونے والے بعض فرقہ وارانہ فسادات کے بعد بہت سے مسلمان

اپنی حفاظت کیلئے "گھیٹوز" میں رہنے پر مجبور ہیں۔ یہ مسلمان گھیٹوز میں رہ کر اپنی حفاظت سے زیادہ ان مذہبی رہنماں کے مشن کو کوستے ہیں جنہوں نے تقسیم ہندوستان کے وقت دو قومی نظریہ کی مخالفت کر کے ان کو ہندوستان میں رہنے پر مجبور کیا اور آج وہ اپنے بزرگوں کے دھوکہ کی قیمت چکا رہے ہیں۔

ہندوستان میں مسلم مخالف احساس زور پکڑ رہا ہے اور ایسے حالات میں مسلمانوں کی لڑائی لڑنے میں خود مسلمانوں کا کوئی رول نہیں ہے۔ بعض مسلم تنظیموں نے مسلمانوں کو دہشتگردی کے ساتھ جوڑنے کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ یہ مسلم تنظیمیں کسی مضبوط ہندو میڈیا سے جڑی ہوئی نہیں ہیں اور مودی حکومت نے سارے میڈیا کو خرید رکھا ہے جس کی بنا پر میڈیا مودی کی پالیسیوں کے مطابق کام کر رہا ہے اور ان کو سختی کے ساتھ مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر مکمل خاموشی اختیار کرنے کا حکم ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان مسلم تنظیموں کے نظریات بیشتر اردو اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔

ان اخبارات کو صرف مسلمان ہی پڑھتے ہیں اور غیر مسلمان اس آواز کو کبھی نہیں سن پاتے ہیں۔ علما یہ بات بار بار دہراتے ہیں کہ مسلمان دہشتگرد نہیں ہو سکتے کیونکہ اسلام کے مطابق معصوموں کی جان لینا پوری انسانیت کا خون کرنے کے برابر ہے لیکن ان کی اس بات کو سننے والے کم ہی ہیں کیونکہ ذرائع ابلاغ کے ذریعے غیر مسلم لوگ ایسے کئی مسلمانوں کی مثال دیتے ہیں جو اسلام کے نام پر اپنی کاروائیوں کو صحیح بتاتے ہیں۔ اپنا ردِ عمل بتانے کیلئے مسلم تنظیموں کی نہ مودی میڈیا میں کوئی شنوائی نہیں اور نہ ہی اس میڈیا میں کسی مسلمان کیلئے کوئی جگہ ہے۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کے ماتحت چلنے والے چند اخبارات کو مالی وسائل میں مبتلا کر کے ان کی اشاعت یا تو بالکل مختصر کر دی جاتی ہے یا پھر مالی دشواریوں میں مبتلا کر کے ان کا گلہ گھونٹ دیا جاتا ہے۔ جہاں تک پڑھے لکھے مڈل کلاس مسلم طبقہ کا سوال ہے شاید مسلمانوں کی اس لڑائی میں وہ ایک اہم کردار ادا کر سکتے تھے لیکن وہ اپنے سماجی اور معاشی معیار کو بلند کرنے میں انتھک محنت کرنے میں مصروف ہیں اور شائد اسی سے مطمئن ہیں کہ ان نامساعد حالات میں زندگی کی ڈور قائم رکھنے کیلئے جاری حالات سے معاہدہ کرنے میں ہی عافیت ہے۔ یہ ہے مودی ہندوستان کا وہ مکروہ چہرہ جس کو عالمی طور پر اجاگر کرنے کیلئے ہمارے حکومتی اداروں کا تساہل اور ہماری سیاسی جماعتوں کا غیر ذمہ دار کردار بھی شامل ہے۔

بروز بدھ 26 شوال المعظم 1445ھ 6 مارچ 2024ء

ہم پست کیوں ہو گئے ؟

کشمیریوں اور فلسطینیوں پر قیامت بیت رہی ہے اور یہاں ہماری محفلیں شگوفہ بنی ہوئی ہیں۔ یہ ہمیں کیا ہو گیا ہے ؟بستی میں ایسی بے حسی تو کبھی نہ تھی۔ درست کہ ہم آج کمزور ہیں اوران کی عملی مدد سے قاصر ہیں لیکن ہم اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ یہ دکھ امانت کی طرح سنبھال کر رکھیں اور نسلوں کو وراثت میں دے جائیں۔ کیا عجب ہماری نسلیں ہماری طرح بے بس نہ ہوں۔ وقت کا موسم بدل بھی تو سکتا ہے۔ ہم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ موسموں کے بدلنے تک اپنے زخموں کو تازہ رکھیں۔ ان سے رستے لہو کو جمنے نہ دیں۔ بھلے وقتوں کی بات ہے ابھی روشن خیالی کی مسند مسخروں کے ہاتھ میں نہیں آئی تھی۔ ہمارا ادیب دائیں اور بائیں کی تقسیم سے بے نیاز ہو کر یہ امانت نسلوں تک پہنچا رہا تھا۔

اقبال، قدرت اللہ شہاب، فیض، شورش کاشمیری، انتظار حسین، حبیب جالب، احمد ندیم قاسمی، ابن انشا، احمد فراز، رئیس امروہوی، ن م راشد، قرالعین حیدر، مظہر الاسلام، اداجعفری، یوسف ظفر، منظور عارف، ضمیر جعفری، خاطر غزنوی، محمود شام، نذیر قیصر، شورش ملک، سلطان رشک، طاہر حنفی، بلقیس محمود۔۔۔ کتنے ہی نام ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں اور نظموں میں اس دکھ کو آئندہ نسلوں کیلئیامانت کے طور پر محفوظ کر دیا۔ یہ مگر گزرے دنوں کی بات ہے۔

اب فلسطین سے دھواں اٹھتا ہے تو کوئی ایک قلم تو ہو جو نوحہ لکھے۔ کیا ہوا؟ قلم ٹوٹ گئے، سیاہی خشک ہو گئی یا احساس نے دم توڑ دیا؟ برسوں پہلے انتظار حسین کا افسانہ شرم الحرم پڑھا تھا۔ کچھ فقرے آج بھی دل میں ترازو ہیں۔ بیت المقدس میں کون ہے ؟ بیت المقدس میں تو میں ہوں۔ سب ہیں۔ کوئی نہیں ہے۔ بچے کمہار کے بنائے پتلے کوزوں کی طرح توڑے گئے، کنواریاں کنویں میں گرتے ہوئے ڈول کی رسی کی مانند لرزتی ہیں۔ ان کی پوشاکیں لیر لیر ہیں۔ بال کھلے ہیں۔ انہیں تو آفتاب نے بھی کھلے سر نہیں دیکھا تھا۔ عرب کے بہادر بیٹے بلند و بالا کھجوروں کی مانند میدانوں میں پڑے ہیں۔ صحرا کی ہواوں نے ان پر بین کیے۔

انتظار حسین کے افسانیکا نے دجالکو میں نے کتنی ہی بار پڑھا۔ یہ پیراگراف ہر دفعہ خون رلاتا ہے۔ پلنگ پہ بیٹھی اماں جی چھالیاں کاٹتے رونے لگیں۔ انہوں نے سروتا تھالی میں رکھا اور آنچل سے آنسو پونچھنے لگیں۔ ابا جان کی آواز بھر آئی تھی مگر ضبط کر گئے۔ اپنے پروقار لہجے میں شروع ہو گئے: آنحضور ﷺ دریاوں، پہاڑوں، صحراوں، سے گزرتے چلے گئے۔ مسجد اقصی میں جا کر قیام کیا۔ حضرت جبریل نے عرض کیا یا حضرت تشریف لے چلیے، آپ نے پوچھا کہاں؟ بولے کہ یا حضرت زمین کا سفر تمام ہوا۔ یہ منزل آخر تھی۔ اب عالم بالا کا سفر درپیش ہے۔ تب حضور بلند ہوئے اور بلند ہوتے چلے گئے.. ورفعنالک ذِکرک..... ابا جان کا سر جھک گیا۔ پھر انہوں نے ٹھنڈا سانس بھرا، بولے جہاں ہمارے حضور ﷺ بلند ہوئے تھے، وہاں ہم پست ہو گئے۔

لڑکپن جوانی میں بدلا اور جوانی ڈھل چلی، کنپٹیوں کے بال اب سفید ہو رہے ہیں اور عائشہ اب چہچہاتی ہے کہ بابا آپ تو بڈھے ہو گئے لیکن یہ فقرہ آج بھی نیزے کی انی کی طرح وجود میں پیوست ہے جہاں ہمارے حضور ﷺ بلند ہوئے تھے، وہاں ہم پست ہو گئے۔ عشروں پہلے بھی یہ فقرہ پڑھا تو آگے پڑھا نہ گیا۔ آج بھی یہاں پہنچتا ہوں تو آنکھوں میں دھند اتر آتی ہے. سید علی گیلانی کا نورانی اور پرعزم چہرہ سامنے آن کھڑا ہو جاتا ہے اور افسانہ ایک طرف رکھ دیتا ہوں۔

منیر نیازی والا معاملہ درپیش ہوتا ہے: اس کے بعد اک لمبی چپ اور تیز ہوا کا شور۔ لمحہ موجود کی روشن خیالی کا تو سارا بانکپن ہی مسلمانوں پر غرانے اور غراتے رہنے میں ہے۔ میں مگر بھلے وقتوں کی بات کر رہا ہوں جب روشن خیالی کی مسند ابھی مسخروں کے ہاتھ نہیں آئی تھی تب فیض نے فلسطینی مجاہدوں کیلئے ایک ترانہ لکھا تو قرآن کی آیت کو عنوان بنا دیا: لاخوف علیھم۔

ابن انشا کی دیوارِ گریہ پڑھیے، فیض کی سرِ وادیِ سینا کو دیکھیے، ادا جعفری کی مسجد اقصیٰ پر نگاہ ڈالئے، منظور عارف کے آئینے کے داغ دیکھئے، احمد فراز کے بیروت کو دیکھئے، رئیس امروہوی کا فدیہ اور محمود شام کی بنت اقصیٰ دیکھئے، آپ کو سطر سطر یہ دکھ تازہ ملے گا۔ انہوں نے اس دکھ کو اگلی نسلوں تک امانت کے طور پر پہنچایا لیکن آج کیوں قحط الرجال ہے، یہ میں نہیں بلکہ بھارت کی بدنام زمانہ جیل میں صعوبتیں برداشت کرنے والی میری مجاہدہ بہن سیدہ آسیہ اندارابی اور اس کے ساتھ قید فہمیدہ اور نسرین پوچھ رہی ہیں اور میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

اس امانت میں صرف درد کا احساس ہی نہیں وقت کے موسموں کے بدلنے کی آس بھی ہے۔ یہی نقش ہم بھولتے جا رہے ہیں۔ یہ نقش کیسے یاد رہتے ہیں؟ ماوں کی لوریاں انہیں تازہ رکھتی ہیں، نصاب تعلیم تذکیر کا کام کرتا ہے، ادیب اور شاعر کا قلم اسے سنوارتا رہتا ہے۔ ماوں کے پاس اب وقت نہیں، باپ کی جانے بلا، فلسطین اور کشمیر کیا ہے؟ نصاب تعلیم اجنبی ہو چکا اور ادیب و شاعر گونگے ہو چکے۔

ایک یلغار ہے جس نے سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ فلسطین کی بات کرنا اب دقیانوسی رویہ ہے کہ عرب جو خود کو فلسطین کا وکیل سمجھتے تھے، نہ صرف اس کا مقدمہ ہار چکے بلکہ خود کو اس وکالت نامے سے آزاد کر کے اس کا نام بھی سننا انہیں گوارہ نہیں۔ ان کی ترجیحات تو اپنے اقتدار کو طول دینا، قومی دولت کو اغیار کے خزانوں میں محفوظ کرنا کہ مشکل وقت میں کام آئے گی۔ قصر سفید کا فرعون اب کھل کر اسرائیل کا مربی بن کر سامنے آگیا ہے ۔ عربوں کو صدام اور معمر قذافی کے عبرتناک انجام سے ڈرایا جاتا ہے لیکن وہ یہ بھول گئے کہ جب بھیڑ کو ذبح کر دیا جائے تو اس کی بلا سے کہ اس کی بوٹیوں کا سائز کیا ہو گا یا پھر اس کے گوشت کا قیمہ بنایا جائے گا۔

مقبوضہ کشمیر کی وولر جھیل کے کنارے سید علی گیلانی اپنی سوانح حیات لکھ چکا اور اب بھی بھارتی بنئے کے سینے پر بیٹھ کر اپنے لاکھوں چاہنے والوں اور سرفروشوں کے درمیان علی الاعلان یہ دعوی کرتا ہے کہ "ہم ہیں پاکستانی، پاکستان ہمارا ہے" لیکن کیا کشمیریوں کا قصور بھی یہ ہے کہ وہ تاریخِ عالم میں ان چند پرعزم، بلند حوصلہ، حق پرست، حریت پسند اور جذبہ اِستقلال سے سرشار اقوام میں سرِ فہرست ہیں۔ جو سات لاکھ سے زائد بھارتی درندوں کے ظلم سے نہ تو خوفزدہ ہیں اور نہ ہی ان کے سامنے سر تسلیم خم کیا ہے۔ 1947 سے لیکر آج تک ان پر زندگی تنگ کر دی گئی ہے جو بلاشبہ ہندو بنئے ڈوگرہ راج کا تسلسل ہے۔ گمنام اجتماعی قبریں، بے گناہ شہدا، معصوم یتیم، بیوہ و نصف بیوہ عورتیں، نابینا بچے، جوان، معذور و بے سہارا بوڑھے اور لہولہان وادی کشمیر بھارتی مظالم کا منہ بولتا ثبوت ہیں لیکن وہ آج بھی اقوام عالم کے سب سے بڑے

ادارے اقوام متحدہ جو ان دنوں بڑی طاقتوں کی ایک لونڈی کا کردار ادا کر رہی ہے، سے اپنا وہ جائز حق مانگ رہے ہیں جو اس ادارے میں اقوام عالم کے اتفاق رائے سے دنیا کی چند بڑی طاقتوں کے بطور ضامن، ان کو دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ آج بھی بنیادی انسانی حقوق سے محروم کشمیری خاموش زبانوں، نابینا آنکھوں، بہتے زخموں، لٹی

عزتوں اور بے بس ہاتھوں میں جوان لاشے اٹھائے ضمیرِ عالم کو جھنجھوڑنے کی ناکام مگر پر امید کوشش میں مصروف وشکوہ کناں ہیں۔

1948ءمیں اقوامِ متحدہ نے اس دن انسانی حقوق کے تحفظ اور آگاہی کیلئے 48 ممالک کی رضامندی سے 30 دفعات پر مشتمل عالمی منشور جاری کیا تھا-اس منشور کے تحفظ، بہتری اور عمل درآمد کو یقینی بنانے کیلئے ایک مستقل کمیشن برائے انسانی حقوق بھی قائم کیا گیا تھا-انسانی حقوق کے اس عالمی منشور میں بنیادی انسانی حقوق مثلاً انسانی آزادی، مساوی حیثیت، آزادانہ نقل و حرکت، آزادی اظہار، باوقار زندگی، سماجی تحفظ کا حق، مذہبی آزادی اور تشدد، ظلم و ستم، غیر انسانی اور توہین آمیز سلوک یا سزا کا نشانہ نہ بنائے جانے کو یقینی بنایا گیا ہے- گو کہ اِس دن دنیا بھر میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے خلاف آواز بلند کی گئی، مگر سوائے پاکستان و دیگر چند ممالک کے، اقوامِ عالم نے کشمیر و فلسطین میں ہونے والی اندوہ ناک انسان دشمنی کو ہمیشہ کی طرح پسِ پشت ڈالے رکھا ہے۔

مقبوضہ جموں و کشمیر میں آرمڈ فورسز سپیشل پاور ایکٹ (افسپا)، جموں و کشمیر پبلک سیفٹی ایکٹ اور ٹیررازم اینڈ ڈسرپٹیو ایکٹیویٹیز ایکٹ (ٹاڈا ایکٹ) جیسے کالے قوانین کے تحت لائسنس ٹو کل کی حامل 7 لاکھ سے زائد بھارتی فوج ایک لاکھ سے زائد کشمیریوں کو شہید کر چکی ہے جبکہ کم و بیش 20 ہزار کے قریب لوگ بالخصوص نوجوان لاپتہ ہیں جن کے متعلق خدشہ ہے کہ وہ کسی کال کوٹھڑی میں بھارتی ظلم و جبر کا شکار ہو رہے ہوں گے۔ بھارت انسانی حقوق کی عالمی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل کے گمنام قبروں کی تحقیقات کے حوالے سے آزاد تحقیقاتی کمیشن کا مطالبے کو بار بار رد کر چکا ہے انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیم ایشین سینٹر فار ہیومین رائٹس کی حالیہ رپورٹ کے مطابق مقبوضہ وادی کی جیلوں میں بڑی تعداد معصوم بچوں کی ہے جو بین الاقوامی و بھارتی نجی قوانین کے مطابق بچوں کے حقوق کی واضح خلاف ورزی ہے-جولائی 2016 میں کشمیری حریت پسند برہان مظفر وانی کی شہادت نے کشمیریوں کی جدوجہدِ حقِ خودارادیت میں ایک نیا جذبہ و جنون بھرتے ہوئے بھارت کی تمام گھناؤنی سازشوں کو ناکام بنا دیا ہے۔

مسلمانوں کے دکھ پر رونا اب انتہاپسندی بن چکا۔ اب تو مطالعہ پاکستان بھی مسخروں کے مزاح کا عنوان بن چکا، بیانیہ اب وہی ہے جو مغرب سے آتا ہے اور مسلمانوں کے حقوق انسانی نہیں ہوتے۔ ہم نے اپنے نصاب کو جانے کن کن فضولیات سے بھر رکھا ہے۔ کیا اس میں فلسطین کے محمود درویش کی دو نظمیں ہم شامل نہیں کر سکتے۔ میں انگریزی ادب کا بھی طالب علم رہا ہوں اور ورڈزورتھ، کیٹس، بائرن، شیلے، ییٹس، براوننگ، ہارڈی، جان ڈن، شیکسپیئر، ملٹن سمیت کتنوں کو پڑھ رکھا ہے لیکن جو بات محمود درویش میں ہے وہ ان میں کہاں۔ محمود درویش، نزاد قبانی، سمیع قاسم، فوزی اسمر، حنا ابو حنا ، توفیق زیاد، توفیق فیاض، امین حبیبی، ایک کہکشاں آباد ہے ہمیں جس کا علم ہی نہیں۔ سمیع قاسم کی نظم ارمتو کمال ہے۔"ابدا علی هذاالطریق، ر ایاتنا بصر الضریر "ہمیشہ سے اس راستے پر ہمارے پرچم اندھوں کیلئے بصارت بنے ہیں۔

محمود درویش کہتا ہے: و یشتمنا اعادینا، هلا! همج هم، عرب.نعم عرب۔ اور ہمارے دشمن ہماری توہین کرتے ہیں، نہیں، وہ عرب ہیں، ہاں، عرب ہیں۔ ہمارے دشمن آوازے کستے ہیں، یہ عرب ہیں، یہ اجڈ ہیں اور وحشی۔ ہاں سن رکھو ہم عرب ہیں۔ درویش کے "اناشیدکو با "کا تو جواب نہیں۔ ذرا نزاد قبانی کی یہ نظم دیکھئے: آل اسرائیل! ایسا اترانا بھی کیا؟ گھڑی کی سوئیاں آج رک گئیں تو کیا ہوا کل یہ پھر سے چل پڑیں گی۔ زمین کے چھن جانے کا غم نہیں باز کے پر بھی جھڑ جایا کرتے ہیں۔ طویل تشنگی کا بھی ڈر نہیں کہ پانی ہمیشہ چٹانوں کی تہہ میں ہوتا ہے۔ تم نے فوجوں کو ہرا دیا لیکن تم شعور کو شکست نہیں دے سکے۔ تم نے درختوں کی چوٹیاں کاٹ ڈالیں جڑیں مگر باقی ہیں۔ ہم آج بے بس سہی، مگر جڑیں تو باقی ہیں۔ ان جڑوں کی آبیاری

تو ہم کر ہی سکتے ہیں۔ ہم اپنے دکھوں کا مداوا نہیں کر سکتے لیکن ہم ان دکھوں کو سنبھال کر تو رکھ سکتے ہیں۔ ہم اس امانت کو اگلی نسل کو تو سونپ سکتے ہیں۔ کیا عجب ہماری نسلیں ہماری طرح بے بس نہ ہوں۔ وقت کا موسم بدل بھی تو سکتا ہے۔

محمود درویش نے کہا تھا: اے میرے وطن میری زنجیروں نے مجھے عقاب کی سختی اور رجائی کی نرمی سکھائی معلوم نہ تھا ہماری کھال کے نیچے طوفان جنم لیں گے اور دریاوں کا وصل ہو گا انہوں نے مجھے کوٹھڑی میں قید کیا میرے دل نے وہاں مشعلیں فروزاں کر دیں انہوں نے دیوار پر میرا نمبر لکھا لیکن دیواریں مرغزار ہو گئیں انہوں نے میرے جلاد کی تصویر بنائی، روشن زلفوں سے اسے چھپالیا میں نے شکست کو اٹھا کر پٹخ دیا اور فاتحین نے تو صرف زلزلوں کو جگایا ہے۔ ہم کیسے بھول جائیں جہاں ہمارے حضور بلند ہوئے تھے، وہاں ہم پست ہو گئے۔

یہ دکھ ہماری اگلی نسل کی امانت ہے۔ آپ کے آنگن میں بچے کھیل رہے ہوں گے۔ انہیں بلایئے، پاس بٹھایئے اور یہ دکھ ان کی رگِ جاں میں انڈیل دیجیے کہ جہاں ہمارے حضور بلند ہوئے تھے، وہاں ہم پست ہو گئے اور ہاں ان تمام نوحوں میں بھارتی درندوں کی بے رحم سنگینوں کا شکار، خونِ حق سے تربتر کشمیر ہم نے کہاں کھو دیا؟ اس کی یادیں اب کیوں دھندلا رہی ہیں؟ ہر روز وہاں کے نوجوان اپنے سروں پر سبز ہلالی پرچم کو اپنا کفن سجا کر راہِ عدم کو روانہ ہونے میں تفاخر محسوس کر رہے ہیں۔ وقت رخصت ان کے چہروں کی مسکراہٹ پتہ دے رہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے خالق کے حضور اس کے انعامات سے خوش و خرم اور راضی ہو کر ابدی اور دائمی زندگی کی کامیابی کے پروانوں کے تمغوں سے سرفراز کر دیئے گئے ہیں۔ ہزاروں نوجوانوں کے دلوں میں شوقِ شہادت کے جذبوں سے معمور جوانیاں میدانِ عمل میں اتر آئی ہیں وہاں ارضِ جنت سے آسیہ اندرابی نمودار ہو کر متعصب شیطانوں اور ظالم کافروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آتش حریت سے پکار اٹھی ہے کہ:

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

آسیہ کو اس کی دو نوجوان ساتھیوں سمیت بھارت کی سب سے بدترین جیل کی کال کوٹھڑیوں میں قید تنہائی میں ڈال کر اس کے عزم کو شکست دینے کی کوشش کی جارہی ہے جبکہ بزدل بنیا جانتا ہے کہ آسیہ نے ساری عمر ثابت قدمی کی وہ زریں مثال قائم کی ہے کہ پچھلی کئی دہائیوں سے اس کے شوہر ڈاکٹر قاسم کو بے گناہی کے جرم میں آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دینے کے باوجود اس کے پائے استقامت میں کوئی لرزش نہیں آئی۔ اس علیل مجاہدہ کو جیل کی کوٹھڑی میں جہاں انتہائی ضروری ادویات سے محروم کر دیا گیا ہے وہاں کال کوٹھڑی میں قید تنہائی میں ناقص اور مضر صحت غذا بھی سلاخوں سے پلاسٹک کی تھیلیوں میں ڈال کر دھکیل دی جاتی ہے۔ یقیناً میری مجاہدہ بہن اپنے رب کے اس وعدے پر ایمان کی حد تک یقین لا چکی ہے: اور آخرت تمہارے لیے پہلی (حالت یعنی دنیا) سے کہیں بہتر ہے اور تمہیں پروردگار عنقریب وہ کچھ عطا فرمائے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے! (الضحیٰ:4-5) اسی لئے وہ آج ہندو درندوں کے تعذیب و ابتلا کو انتہائی بہادری سے برداشت کر رہی ہے۔

ہمارا میڈیا کس قدر آسانی سے ان کو بھولنے کے جرم عظیم کا مرتکب ہو رہا ہے۔ میرے آقا نبی اکرم ﷺ جنہیں میرے رب نے سب جہانوں کیلئے رحمت بنا کر مبعوث فرمایا، ان کے سینہ مبارک پر نازل الہامی اور آخری کتاب قرآن حکیم کا یہ پیغام کیوں بھول گئے کہ.....وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا: اور تم کو کیا ہوا ہے کہ خدا کی راہ میں اور ان بیکس مردوں اور عورتوں اور

بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو دعائیں کیا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہم کو اس شہر سے جس کے رہنے والے ظالم ہیں نکال کر کہیں اور لے جا اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا حامی بنا اور اپنی ہی طرف سے کسی کو ہمارا مددگار مقرر فرما(النساء:75)

پاکستان کو ریاست مدینہ بنانے والے میرے رب کا یہ اٹل فیصلہ بھی ذہن نشیں کر لیں کہ.....اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ،وَ لَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَ لَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ: کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے سے چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ اللہ کو تو یہ ضرور دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون!(العنکبوت:2۔3)

اور ہاں یہ بھی سن لو" وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَ عَمِلَ صَالِحًا وَّ قَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ: اور اس سے بہتر کس کی بات ہے جس نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا اور خود بھی اچھے کام کیے اور کہا بے شک میں بھی فرماں برداروں میں سے ہوں(الفصلات:33۔41)

یقیناً ان حالات میں دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ جہاں ہمارے حضور ﷺ بلند ہوئے تھے، وہاں ہم پست ہو گئے۔

بروز جمعتہ المبارک 28 شوال المعظم 1445ھ 8 مارچ 2024ء

غلامی کا طوق؟

کوئی امریکا اور ان کے اتحادیوں سے پوچھے کہ سات سمندر پار سے ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے کبھی مشرق وسطیٰ کبھی خلیج کی ریاستوں کبھی جنوبی ایشیا اور سینٹرل ایشیا میں لاؤ لشکر اور ساز شیں لیکر کیوں نازل ہوتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قوتیں موت فروخت کرنے اور زندگی خریدنے آتی ہیں۔ ان کی اس خواہش میں مہم جوئی توسیع پسندی مجرمانہ کاروبار طاقت کا بیجا استعمال اور مذہبی جنونیت کا عنصر بھی شامل ہے اگر ان قوتوں کو انسان اور انسانیت امن وآشتی سے الفت ہوتی، اگر انہیں غربت جہالت مفلسی بیماری سے نفرت ہوتی تو یہ دنیا جنت کا نظارہ پیش کر رہی ہوتی۔ ان مقاصد کو پانے کیلئے جنگ وجدال، آگ وخون کے سمندر سے دنیا کو نہیں گزرنا پڑتا، نہ گولہ بارود کی ضرورت ہوتی بس صرف جیو اور جینے دو، انسان اور انسانیت کے اعلیٰ اصولوں کی پاسداری طاقتور اور کمزور کا برابری کی بنیاد پر احترام بلا امتیاز رنگ ونسل ومذہب، باہمی احترام کسی قوم کی آزادی اس کی سرحدوں کے تقدس کو تسلیم کرنا بنیادی شرائط ہیں اور ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ کسی کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کرنا بہت ضروری ہے مگر موت کے سوداگر اور زندگی کے خریدار یہ نام نہاد امن وآشتی کے دعویدار جنہوں نے اپنے ملکوں کے چاروں طرف طویل اور دیو قامت حفاظتی دیواریں اور فصیلیں بنا رکھی ہیں، ان میں بسنے والے انسان بھی نظر آتے ہیں اور انسانیت سے بھی واقف ہیں، آزاد بھی ہیں اور گولہ بارود کے زہر سے محفوظ بھی۔ غریب بھوک و افلاس وبیماری کے مارے کمزور ناتواں انسان اور ممالک بچارے کیا ان کی سرحدوں میں دراندازی کر سکیں گے۔ یہ شیطانی قوت تو ان شکار کی تلاش میں محو پرواز خونخوار عقابوں کو حاصل ہے جو جہاں چاہیں حملہ آور ہو جائیں اور انسان اور انسانیت کے جسم سے بوٹی بوٹی نوچ لیں۔

خونی عقابوں کا ٹولہ جو ننگے بھوکے انسانوں کی لاش کو گولہ بارود میں بھون کر نوچنے والے دہشتگرد عقاب اپنے ہی ہاتھوں ستائے ہوئے انسانوں میں دہشت گرد تلاش کر کے شکار کرنے پر آمادہ اور بضد ہیں۔ ان دہشتگرد عقابوں کے اپنے بھی کوئی اصول نہیں ہیں اور شکار کی تلاش میں کبھی خود بھی دست و گریباں ہوتے رہے ہیں۔ 1950ء میں برطانیہ فرانس اور امریکا نے ایک سہ فریقی معاہدہ کیا تھا جس کے تحت مشرق وسطیٰ کی تمام سرحدوں کی سلامتی کی ضمانت اس شرط پر دی گئی تھی کہ کوئی فریق جارحیت کا ارتکاب نہیں کرے گا مگر حرص وہوس کے مارے مغرب کو کہاں قرار۔ 6 سال ہی اس معاہدے کو گزرے تھے کہ برطانیہ اور فرانس نے نہر سویز پر حملہ کر دیا، یہ ایک الگ داستان ہے۔ سر دست امریکا اور اس کے موجودہ اتحادیوں کے تین بنیادی مفادات زیرِ قلم ہیں۔

پہلا مفاد یہ ہے کہ خلیج کے ممالک سے جہاں سے دنیا کی 60 فیصد تیل کی ضرورت پوری ہوتی ہے ان کے وسائل پر قبضہ کر کے اس علاقہ میں ان کی اجارہ داری قائم ہو۔ (اس دوڑ میں سوویت یونین بھی شامل رہا ہے) امریکی پالیسی کے تحت امریکا اسرائیل کی سلامتی کی ضمانت فراہم کرنے کے علاوہ اس کی آزادی اور وجود کو اس قدر مضبوط کرنا چاہتا ہے کہ اسرائیل کے خوف سے عرب ممالک پریشان اور دبے رہیں اور اس کی آڑ میں امریکی پالیسوں کو عربوں پر مسلط کیا جاتا رہے، جبکہ دوسری حکمت عملی یہ ہے کہ بعض عرب ریاستیں جن میں سعودی عرب، مصر، اردن اور خلیج کی دیگر بادشاہت اور حاکمیت پر مشتمل ریاستوں کے اقدار کے تحفظ اور اسرائیلی خوف سے نجات دلانے کی یقین دہانی پر نام نہاد دوستی کے نام پر امریکا نے ان کی معیشت اقتصادیات اور دفاعی شعبوں پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی ہے، سلامتی کے خوف میں مبتلا سعودی عرب سمیت دیگر خلیجی ریاستوں میں امریکی فوجیں موجود ہیں۔

ایک طرف امریکی فوجوں اور ساماں حرب کے اخراجات ان ممالک کو برداشت کرنے پڑرہے ہیں تو دوسری طرف امریکی فوجوں کی ان ریاستوں میں موجودگی اسرائیل کیلئے تحفظ اور سلامتی کا باعث ہیں۔

ایران میں انقلاب کے بعد امریکا اپنے ایک معتمد سے محروم ہوگیا۔ اس تبدیلی کے باعث امریکا نے سریع الحرکت فوج تیار کی جس کا مقصد خلیج اور ساری دنیا میں اپنے مفادات کا تحفظ بذریعہ طاقت کرنا تھا۔ عراق، شام، لبنان امریکی تسلط سے آزاد مگر سوویت یونین کے زیر اثر تھے۔ ایران کو کھونے کے بعد امریکا نے عراق کو اپنے حصار میں لے لیا چونکہ ایران عراق میں سرحدی و دیگر ایشوز پر شدید اور دیرینہ اختلافات اور تنازعات تھے، امریکا اس کا فائدہ اٹھا کر ایران کے انقلاب کو ناکام بنانے کیلئے دونوں میں تصادم کرانے میں کامیاب ہوگیا۔ 8 سالہ عراق ایران جنگ نے دونوں ملکوں کو شدید جانی ومالی نقصانات سے دوچار کیا جبکہ اسلحہ ساز فیکٹریاں رکھنے والے امریکا سمیت دیگر ممالک نے ان دونوں ممالک کو 83 بلین ڈالر کا اسلحہ فروخت کیا۔

ایران کو بھی سرحدی تنازعات اور دیگر دعوؤں کی تکمیل کی صورت صدام اقتدار کے خاتمے میں نظر آئی۔ جنگ کی بساط بچھائی گئی۔ خلیج کی ریاستوں کو عدم تعاون کا سگنل دیا گیا، خلیج سے باہر اسلامی ملکوں کو جنگ میں شرکت کی دعوت دی گئی یا غیر جانبدار رہنے کا حکم صادر کیا گیا۔ مغربی اتحادیوں کے یہاں جنگ کا طبل بجایا گیا۔ دورانِ ریہرسل خلیجی ریاستوں کو اپنے تحفظ کے نام پر اسلحہ خریدنے کا حکم دیا گیا۔ اس خلیجی جنگ کی وجہ سے امریکی دفاعی صنعتوں کو تقریباً 210 بلین ڈالر صرف خلیجی ممالک کی طرف سے ملے تھے جس میں سعودی عرب نے تقریباً 60 بلین ڈالر کا اسلحہ امریکا سے خریدا اور بعد ازاں ٹرمپ کے دور حکومت میں 300 بلین ڈالر کے معاہدوں پر بھی دستخط ہوئے اور اسی آڑ میں اسرائیل کو اپنے جہازوں کیلئے سعودی سرزمین کے اوپر سے گزرنے کی بھی اجازت دلائی گئی۔

یہ معاملہ یہاں رکا نہیں بلکہ اسرائیل کو مسلم ممالک سے تسلیم کروانے کے سلسلے میں یو اے ای، بحرین، اردن اور دیگر ممالک نے نہ صرف سفارتی طور پر تسلیم کیا بلکہ اب تجارتی تعلقات بھی مستحکم کئے جارہے ہیں۔ اسرائیل نے ان عرب ممالک میں نہ صرف اپنے سفارت خانے قائم کرلئے ہیں بلکہ اپنی شہریوں کے ذریعے تجارتی تعلقات کے نام پر اپنے دفاتر بھی قائم کرلئے ہیں۔

ادھر دوسری طرف امریکی ایماء پر اسرائیل عراق سے چھیڑ چھاڑ اور فلسطینیوں پر مظالم کی رفتار بڑھا چکا تھا۔ ماسوائے دو تین ممالک کے تمام خلیجی ریاستیں عراق کے خلاف امریکا کے پہلو میں کھڑی تھیں۔ امریکی ایماء پر کردوں کی تحریک میں تیزی آچکی تھی۔ امریکی خفیہ ایجنسیاں اور ادارے فرقہ وارانہ صوبائیت لسانیت اور علاقائیت کے سوئے ہوئے فتنے کو جگانے میں کامیاب ہوچکے تھے۔ عراقی تینوں افواج میں نفاق کی سازشیں کامیاب ہوچکی تھیں۔ سیکولرازم اور اشتراکیت کا پرچار کرنے والے صدام حسین کا خیال تھا کہ وہ مختلف المذاہب اور فرقہ واریت اور صوبائیت کے فتنے کو ختم کرکے ایک عراقی قوم پرست عوام تیار کرچکے ہیں۔ اظہار رائے کی آزادی سے محروم عراقیوں کے اندر پکنے والا لاوا تب سامنے آیا جب امریکا جو عراق پر ایٹمی و کیمیائی ہتھیاروں کی موجودگی کا الزام لگا کر (جو برآمد نہ کرسکا جس پر امریکی خارجہ سیکرٹری کولن پاؤل نے اقوام متحدہ میں اور ٹونی بلیئر نے معافی مانگ کر اپنی غلطی کا اعتراف بھی کرلیا ہے) اپنی پوری قوت اور طاقت کے ساتھ عراق پر حملہ آور ہوا، اور عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی پورا

عراق آگ وخون میں نہلا کر ہزاروں سال پرانی تہذیب کا خاتمہ کر دیا۔ ہزاروں عراقی بلا امتیاز بوڑھے، جوان بچے خواتین بے رحمی سے شہید کر دیئے گئے مقدس مقامات کو نشانہ بنایا گیا۔ مظالم کے ایسے خوفناک پہاڑ توڑے گئے کہ ساری دنیا نے ابو غریب جیل میں مسلمانوں کی غیرت کے جنازے نکلتے دیکھے۔

عراقی فرقہ واریت صوبائیت اور علاقائیت کی بنیاد پر باہم متصادم ہوئے۔ عراقی عوام یکجہتی برقرار نہ رکھ سکے اور عراق کی افواج نے صدام سے غداری کی۔ تمام جہاز، میزائل اور سامان حرب دھرا کا دھرا رہ گیا۔ امریکا کو لتاڑنے پر صدام کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ تین دہائیوں کے بعد مصر میں منتخب حکومت نے اپنی خود مختاری کا جونہی احساس دلایا فوری طور پر اس کا دھڑن تختہ کر کے اپنا نمائندہ سامنے لے آئے۔ ان حالات میں امریکا اور مغرب یہ سمجھتے ہیں کہ اسرائیل کو خلیجی ممالک کے علاوہ دیگر اسلامی ملکوں سے تسلیم کا عمل اور بھی آسان ہو گا۔ خلیجی ممالک سے دوستی کی آڑ میں باقی ماندہ فلسطین پر قبضہ بھی آسان ہو جائے گا۔ آج ہم غزہ میں جو صورتحال دیکھ رہے ہیں، یہ اسی کا شاخسانہ ہے کہ خود اقوام متحدہ کا سیکرٹری جنرل دنیا بھر کے ممالک کے سامنے اپنی بے بسی کا شور مچا رہا ہے۔

خلیجی ممالک کو ڈرانے دھمکانے کیلئے ایک دفعہ پھر ایران کے ساتھ امریکا اور مغرب کی ایٹمی پروگرام پر مفاہمت کی پھلجڑی چھوڑ دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی خلیجی ریاستوں کے بادشاہوں اور حکمرانوں کو یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ تمہارے اقتدار کو اس وقت تک کوئی خطرہ نہیں جب تک وہ امریکا اور مغرب کے تابعدار ہیں البتہ یمن کے مسئلے پر ایران اور عرب ممالک میں مستقل مخاصمت برقرار رکھی جائے گی تاکہ اسلحے کی فروخت کا سلسلہ جاری رہے۔ اس جاری سنگین صورتحال میں مسلم ممالک کو سر جوڑ کر سوچنا ہو گا کہ انہوں نے امریکا اور مغرب کی غلامی کرنی ہے یا پھر تائب ہو کر اللہ کی غلامی اختیار کرنی ہے۔

بروز اتوار 30 شوال المعظم 1445ھ 10 مارچ 2024ء

استقبال رمضان.....روزے کی حقیقی روح

مثالی ذریعہ روزہ "صبر وضبط' ایثار و ہمدردی اور ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ سلوک کی دعوت دیتا ہے۔ اسے تزکیہ نفس اور قربِ الٰہی کا قرار دیا گیا ہے ۔ اسلام دین فطرت ہے، اس نے ایسی جامع عبادات پیش کیں کہ انسان ہر جذبے میں اللہ کی پرستش کر سکے اور اپنے مقصدِ حیات کے حصول کی خاطر حیاتِ مستعار کا ہر لمحہ اپنے خالق ومالک کی رضاجوئی میں صرف کر سکے۔ نماز، زکوٰۃ، جہاد، حج اور ماہِ رمضان کے روزے ان ہی کیفیات کے مظہر ہیں۔

مسلمانوں کو رمضان المبارک کے عظیم الشان مہینہ کا شدت سے انتظار رہتا ہے، اور اس کی تیاری شعبان المعظم کے مہینے سے شروع ہو جاتی ہے۔ یہ مہینہ رحمت، برکت اور مغفرت والا مہینہ ہے، نیکی اور ثواب کمانے والا مہینہ ہے، بخشش اور جہنم سے خلاصی کا مہینہ ہے، اسی مہینہ میں بندے کو اپنے رب سے قربت کا عظیم موقعہ ہاتھ آتا ہے۔ اس مہینے میں رضائے الٰہی اور جنت کی بشارت حاصل کرنے کے مواقع بڑھ جاتے ہیں، ذرا تصور کیجئے جب آپ کے گھر کسی اہم مہمان کی آمد ہوتی ہے تو ہم اور آپ کیا کرتے ہیں؟

ہم بہت ساری تیاریاں کرتے ہیں۔ گھر کی صاف صفائی کرتے ہیں، گھر آنگن کو خوب سجاتے ہیں، خود بھی زینت اختیار کرتے ہیں اور اہل وعیال کو بھی اچھے کپڑے پہناتے ہیں، پورے گھر میں خوشی کا ماحول ہوتا ہے، بچے خوشی سے اچھل کود کرتے ہیں۔ مہمان کی خاطر تواضع کیلئے ان گنت پر تکلف سامان تیار کئے جاتے ہیں۔ جب ایک مہمان کیلئے اس قدر تیاری تو اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا مہمان رمضان کا مہینہ ہو تو اس کی تیاری کس قدر ہونی چاہیے۔

نبی کریم ﷺ نے شعبان کے اخیر میں اس مہینہ کی عظمت اور شان وشوکت کو اس لیے بیان فرمایا تاکہ لوگوں کو اس کی قدر ومنزلت کا علم ہو سکے اور وہ رمضان کے اعمال کو کماحقہ ادا کر سکیں۔ رمضان المبارک کا مہینہ دراصل تربیت کا مہینہ ہے، جس میں بھوکا رہنے، اور دوسروں کی بھوک اور تکلیف کو سمجھنے کی تربیت ہوتی ہے۔ سخت سے سخت حالات کا سامنا کرنے کی تربیت ہوتی ہے۔ اللہ کی عبادت، اللہ کا ذکر، اور اللہ کا دھیان حاصل کرنے کی مشق کی جاتی ہے۔ اس کے روزے اور تراویح اس تربیتی مہینہ کا نصاب ہے، اسی کو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: يٰٓاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَاكُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ: اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسے پچھلی امتوں پر فرض ہوئے تھے تاکہ تم پرہیز گار بنو۔" (البقرہ:183) یعنی روزہ کا مقصد نفس کی تربیت ہے، کہ آدمی کے اندر ضبط کی صلاحیت پیدا ہو، تقویٰ ہو، اور وہ اپنے آپ کو گناہوں سے بچا سکے۔ اس کورس پر اگر کوئی عمل کر لیتا ہے تو بقیہ گیارہ مہینوں میں اس کیلئے عبادت کرنا اور گناہوں سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔

رمضان کے روزوں کا مقصد جیسا کہ مذکورہ آیات میں بیان کیا گیا ہے، پرہیز گاری کا حصول ہے۔ ماہِ رمضان کے ایّام ایک ماہِ رمضان مومن کی تربیت اور ریاضت کے ایّام ہیں۔ وہ رمضان کے روزوں اور عبادات سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر سکتا ہے۔ مسلمان حضورِ اکرم ﷺ سے محبت کا اظہار آپ کی پیروی اور اتباع سے کرتا ہے اور اپنی روح ونفس کا تزکیہ کرتا ہے، تاکہ زندگی کے باقی ایّام میں وہ تقویٰ اختیار کر سکے اور اپنے مقصدِ حیات یعنی اللہ کی بندگی اور اس کی رضاجوئی میں اپنی بقیہ زندگی کے دن بسر کر سکے۔ دیکھا جائے تو تمام عبادات انسان کے کسی نہ کسی جذبے کو ظاہر کرتی ہیں۔ نماز خوف کو ، زکوٰۃ رحم کو، جہاد غصہ وبرہمی اور غضب کو حج تسلیم ورضا کو اور روزہ اللہ تعالیٰ سے محبت کو باقی عبادات کچھ اعمال کو بجالانے کا نام ہیں، جنہیں دوسرے بھی دیکھ لیتے ہیں اور جان لیتے ہیں۔ مثلاً نماز رکوع وسجود کا نام ہے اور اسے باجماعت ادا کرنے کا حکم ہے، جہاد کفار سے جنگ کا نام ہے، زکوٰۃ کسی کو کچھ رقم

یامال دینے سے ادا ہوتی ہے لیکن روزہ کچھ دکھا کر کام کرنے کا نام نہیں بلکہ روزہ تو کچھ نہ کرنے کا نام ہے۔ وہ کسی کے بتلائے بھی معلوم نہیں ہوتا بلکہ اس کو تو وہی جانتا ہے، جو رکھتا ہے اور جس کیلئے رکھا گیا ہے۔ لہٰذا روزہ بندے اور اللہ کے درمیان ایک راز ہے، محب صادق کا اپنے محبوب کے حضور ایک نذرانہ ہے جو بالکل خاموش اور پوشیدہ طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اسی لئے تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کریم نے اپنے روزے دار بندوں کیلئے ایک بے بہا انعام کا اعلان فرمایا ہے، وہ یہ کہ "روزے دار "روزہ میرے لئے رکھتا ہے، اور میں خود اس کی جزا ہوں۔ اللہ رب العزت خود کو جس عمل کی جزا فرما رہا ہو تو اس کی عطا اور انعام واکرام کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ روزہ دراصل بندے کی طرف سے اپنے کریم مولا کے حضور ایک بے ریا ہدیہ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اتنے عظیم انعام واکرام کا اعلان فرمایا ہے۔

رمضان المبارک کے بہت سے فضائل وخصائص ہیں، ان میں سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ رمضان المبارک کے مہینے میں قرآنِ مجید نازل ہوا، اور قرآن پاک میں سال کے تمام مہینوں میں صرف ماہِ رمضان کا نام صراحتاً آیا ہے۔ اس سے رمضان المبارک اور قرآن پاک میں گہری مناسبت اور زیادہ تعلق ثابت ہوتا ہے، قرآن اور رمضان المبارک میں ایک گہری نسبت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس ماہِ مبارک میں بالخصوص شب وروز قرآنِ کریم کی زیادہ تلاوت ہوتی ہے۔ ماہِ رمضان المبارک وہ ہے جس کی شان میں قرآن کریم نازل ہوا، دوسرے یہ کہ قرآنِ کریم کے نزول کی ابتداء ماہِ رمضان میں ہوئی۔ تیسرے یہ کہ قرآنِ کریم رمضان المبارک کی شبِ قدر میں لوحِ محفوظ سے آسمان سے دنیا میں اتارا گیا اور بیت العزت میں رہا۔ یہ اسی آسمان پر ایک مقام ہے، یہاں سے وقتاً فوقتاً حسبِ اقتضائے حکمت جتنا منظورِ الٰہی ہوا، حضرت جبریل امین علیہ السلام لاتے رہے اور یہ نزول تقریباً تئیس (23) سال کے عرصے میں پورا ہوا۔

بہر حال قرآنِ مجید اور ماہِ رمضان المبارک کا گہرا تعلق ونسبت ہر طرح سے ثابت ہے اور یہ بلاشبہ اس ماہِ مبارک کی فضیلت کو ظاہر کرتا ہے۔ روزہ اور قرآن مجید دونوں شفیع ہیں اور قیامت کے دن دونوں مل کی شفاعت کریں گے۔ حضرت عبداللہ بن عمر راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ روزہ اور قرآن مجید بندے کیلئے شفاعت کریں گے۔ روزہ کہے گا کہ اے میرے رب! میں نے کھانے اور خواہشوں سے دن میں اسے روکے رکھا، تو میری شفاعت اس کے حق میں قبول فرما، قرآن کہے گا کہ اے میرے رب! میں نے اسے رات میں سونے سے باز رکھا تو میری شفاعت اس کے حق میں قبول فرما۔ دونوں کی شفاعتیں قبول ہوں گی۔

حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رمضان برکت کا مہینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے روزے تم پر فرض کئے ہیں، اس میں جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور سرکش شیطانوں کے طوق ڈال دیئے جاتے ہیں اور اس میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے جو اس کی بھلائی سے محروم رہا، وہ کل بھلائی سے محروم رہا۔ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۭ تَنَزَّلُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۙ سَلٰمٌ ۛ هِىَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ: شبِ قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ فرشتے اور رُوح اُس میں اپنے ربّ کے اِذن سے ہر حکم لے کر اُترتے ہیں۔ وہ رات سراسر سلامتی ہے طلوعِ فجر تک (القدر: 3-5)

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "آدمی کے ہر نیک کام کا بدلہ دس سے سات سو گنا تک دیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا مگر روزہ میرے لئے ہے اور اس کی جزا میں خود دوں گا کیونکہ بندہ اپنی خواہشات اور کھانے پینے کو میری وجہ سے ترک کرتا ہے۔

روزہ دار کیلئے دو خوشیاں ہیں، ایک افطار کے وقت اور ایک اپنے رب سے ملنے کے وقت اور روزے دار کے منہ کی بو اللہ عزوجل کے نزدیک مشک سے زیادہ پاکیزہ (خوشبودار) ہے اور روزہ ڈھال ہے اور جب کسی کا روزہ ہو تو نہ وہ کوئی بے ہودہ گفتگو کرے اور نہ چیخے، پھر اگر اس سے کوئی گالی گلوچ کرے یا لڑنے پر آمادہ ہو تو یہ کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں۔

اس ماہِ مبارک کی خصوصی عبادت روزہ ہے جس کا مقصد تزکیہ نفس یعنی اپنے نفس کو گناہوں سے پاک کرنا اور تقویٰ حاصل کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں گناہوں سے بچنا اور نیکیوں کی طرف رغبت کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جس نے ماہِ رمضان المبارک کے روزے ایمان و احتساب کے ساتھ رکھے اور جس نے رمضان میں نمازِ تراویح اور ایمان و احتساب کے ساتھ شب بیداری کی، اللہ تعالیٰ اس کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔

اس ماہِ رمضان المبارک کا تقدس اور احترام کرنا سب مسلمانوں کا انفرادی اور اجتماعی فریضہ ہے۔ یاد رکھئے جس طرح قرآنِ کریم رمضان المبارک کی شبِ قدر میں لوحِ محفوظ سے آسمان سے دنیا میں اتارا گیا، اسی رات کو اس دنیا کے نقشے پر پاکستان کا معرضِ وجود میں آنا ایک معجزے سے کم نہیں۔ اس لئے ہم سب کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ رمضان المبارک کے شب و روز کی عبادات میں اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا بھی شکر ادا کریں لیکن کیا کریں یہ بات کہے کالم بھی مکمل نہیں ہوتا کہ ماہِ رمضان کی آمد پر کچھ بدبختوں نے ذخیرہ اندوزی کر کے بیچاری عوام کو مہنگائی کے عذاب سے دوچار کر دیا ہے، ان ظالم ذخیرہ اندوزوں کو کڑے ہاتھوں لیکر ان کی بیخ کنی کر کے غریب اور بیکس عوام کو مہنگائی کی لعنت سے بچایا جائے جبکہ برطانیہ میں ہر بڑے سٹور میں رمضان کی آمد پر روزمرہ کی خوردہ نوش کی قیمتوں کو نصف قیمت تک سستا کر دیا گیا ہے۔ میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں رمضان کریم کی برکتوں اور رحمتوں سے مستفیض ہونے کا سلیقہ اور توفیق عنائت فرمائے۔ ثم آمین

میری طرف سے تمام قارئین کو ماہِ رمضان مبارک ہو! میری اللہ سے دعا ہے کہ ہماری خطاؤں کو معاف فرمائے اور اس ماہِ رمضان کا احترام نصیب فرمائے۔ ثم آمین

بروز سوموار یکم رمضان الکریم 1445ھ 11 مارچ 2024ء

عقل کی عیاری، عشق کی حیرانی

جس زمین پر بدکاری ہو گی، پھر وہ زمین اس بدتر گناہ سے پاک ہونے کی دعائیں مانگتی ہے اور وہ تبدیلی چاہے عذاب کی صورت میں ہو، کسی وبا کی صورت میں ہو، کوئی سیلاب ان بستیوں کو بہالے جائے، اس کو پھر روکا نہیں جاسکتا۔ ابھی کل کی بات ہے، اللہ نے اپنی فوج کا ایک انتہائی چھوٹا سپاہی جس کو خوردبین کے بغیر دیکھنا ممکن نہیں، کرونا کی شکل میں زمین پر اتار دیا۔ وہ جو سائنس کے کمالات پر بڑا ناز رکھتے ہیں، بڑے تکبر سے خود کو سپر پاور کہتے ہوئے دنیا کو منٹوں میں نیست و نابود کرنے کی دھمکیاں دیتے تھے، میرے رب کے اس ادنی سپاہی نے ان سب متکبر طاقتوں کو خاک چاٹنے پر مجبور کر دیا اور پھر ایسا مجبور کر دیا کہ خود اپنے خاندان کے وہ افراد جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، جونہی کرونا کا ٹیسٹ پازیٹو آیا، اسے یا تو فوری ہسپتال روانہ کر دیا یا پھر گھر میں الگ تھلگ کر دیا اور کوئی اس کے قریب نہیں پھٹکنے کی جرات نہیں کرتا تھا۔ فلک نے یہ مناظر بھی دیکھے کہ اپنی بیہودہ طاقت کے زعم میں مسلم خواتین کے سروں سے پردہ ختم کرنے والے خود منہ چھپانے پر مجبور ہو گئے، الامان الحفیظ!

یہ لاء آف نیچر ہے، یہ عدالت کا فیصلہ نہیں ہے، یہ فطرت کا فیصلہ ہے۔ اس زمین پر قدرت کے دو قانون ہیں، ایک فطرت ہے اور دوسری شریعت، شریعت میں رحم ہے مگر فطرت اس کے بالکل برعکس ہے، فطرت میں رحم بالکل نہیں۔ جو دنیا میں کرو گے ویسا بھرو گے۔ یہ قانون فطرت ہے کہ باپ کو گالیاں دو گے، بیٹا تمہیں اس سے زیادہ گالیاں دے گا، ماں کو گھر سے نکالو گے، بڑا بیٹا تمہیں بے عزت کر کے گھر سے نکالے گا۔ یہ لاء آف نیچر ہے۔ شراب پیو گے تو خطرناک جسمانی و روحانی بیماریوں میں ضرور مبتلا ہو گے، گردے فیل ہوں گے۔ یہ ناممکن ہے کہ آدمی شراب یا اور کوئی قبیح نشہ کرے اور اس کے بعد صحت مند رہے۔ یاد رکھیں کہ فطرت کے اندر بخشش نہیں ہے، رحم نہیں ہے لیکن شریعت کے اندر گنجائش موجود ہے۔ اللہ چاہے تو ہماری توبہ استغفار قبول کر کے ہماری بخشش فرمادیں لیکن لاء آف نیچر میں ممکن نہیں۔ دنیا اس بات کی گواہ ہے کہ اس دھرتی پر موجود دو سب سے بڑے اور عظیم گھر حرمین کو بھی بند کرنا پڑ گیا نیویارک، لندن اور پیرس کی مشہور سڑکوں پر ویرانیوں نے ایسے ڈیرے ڈالے کہ تاریخ نے دہائی دینا شروع کر دی۔

اگر کوئی قوم قبیلہ خاندان غافل ہے، سست ہے، جاہل ہے تو سمجھ لیں کہ وقت اس سے انتقام لے گا کیونکہ زمین سستی کو گوارہ نہیں کرتی، وہ تمام پودے سوکھ جاتے ہیں جو سستی سے پروان چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ درخت سوکھ جاتے ہیں جو مفید نہیں ہوتے۔ وہ جانور درخت اور دیگر نباتات باقی نہیں رہیں گے جو مفید نہیں ہیں وہ دائما صوف کی طرح مٹ جائیں گے۔ یہاں پھل دار درختوں کی دیکھ بھال اور پرورش کی جاتی ہے، انہی جانوروں کی افزائش کی جاتی ہے جن سے سے فائدہ موصول ہوتا ہے، یہ لا آف نیچر ہے کہ اس دنیا میں وہی جئے گا جو کام کر کے اپنا مفید ہونا ثابت کرے گا۔ جس کے بازوں میں محنت کی سکت ہو گی، وہی جئے گا۔ یاد رکھیں! ناکارہ سروں پر تاج نہیں سجائے جاتے، اگر غلطی سے کسی ناکارہ سر پر ایسا تاج آجائے تو جلد ہی تاج سمیت اس دھرتی کے بوجھ کو سنگلاخ زمین اپنے پیٹ میں دبا کر اس کی ہڈیوں کو بھی خاک اور بے نشان بنا دیتی ہے بلکہ پیس کر پاؤڈر بنا دیتی ہیں۔ اور یہ بھی یاد رکھیں کہ کاٹنے والے قدم کبھی تخت پر براجمان نہیں ہوا کرتے۔ مارکیٹیں ان کے ہاتھوں میں نہیں ہوتیں جو رات گیارہ اور بارہ بجے تک اپنی دوکانوں پر اونگھتے رہتے ہیں، یہ دنیا بڑی خطرناک ہے، یہاں انتقامی کاروائیاں عروج پر ہیں، یہاں غفلت کی سزا موت ہے۔

مشہور روسی دانشور اور ناول نگار ٹالسٹائی کا شہرہ آفاق ناول "وار اینڈ پیس" پڑھنے کا موقع ملا۔ اس ناول میں جہاں بہت سی باتیں خالص باطنی و روحانی

تعبیرات پر مبنی ہیں، وہی اس کا متصوفانہ جملہ: "ہم صرف اتنا جان سکتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں جانتے، یہ انسانی عقل کی معراج ہے"۔ اپنی انا کے بت کو ایک طرف رکھے بغیر عقل کی محدود فطرت نظر نہیں آتی اور یہ ایمان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے۔ کیوں یہ جملہ بار بار سننے کو ملتا ہے کہ سادہ لوگ ایمان کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ کبھی سوچا بھی ہے کہ ان کا ایمان کیوں اتنا مضبوط ہوتا ہے؟ صرف اس لیے کہ انہوں نے کوئی بہت مضبوط انا کے بت نہیں بنا رکھے ہوتے اور فطرت کے قریب رہنے سے عقل کی محدودیت کا ادراک ہوتا ہے۔ ایمان کیلئے علم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کون کہتا ہے کہ عالم ہونے سے ایمان مضبوط ہوتا ہے؟ کیا اسلامی تاریخ میں سارے عالم مظبوط ایمان والے لوگ تھے؟ اب اس بحث میں کاہے کو پڑنا۔ ایمان جھوٹی انا کے بت کو پاش پاش کرنے سے مضبوط ہوتا ہے۔ وہ جسے مولانا روم کہتے ہیں کہ بیٹا "عقل کی عیاری کو بیچ اور عشق کی حیرانی کو خرید"۔ جہاں حیرانی کے میدان شروع ہوتے ہیں وہی سے ذات حق کے عرفان کا آغاز ہوتا ہے۔

میرا اللہ سائیں کوئی آسمان پر بیٹھا (معاذاللہ) بوڑھا آدمی نہیں ہے جو ہر لمحہ آدم کے بیٹے پر صرف اس لیے نگاہ رکھے ہے کہ کب یہ غفلت کرے اور کب وہ اسے اس کی سزا میں دوزخ میں ڈال دے یا غفلت نہ کرے اور وہ اس پر جنت کے باغ کا دروازہ ہوا میں اڑتے وجود (ملائکہ) سے کھلوا کر اس کو جزا کے طور پر اس میں داخل کر دے۔ نہ ہی میرا اللہ سائیں (معاذاللہ) کوئی سانتا کلاز ہے جو آپ کی احمقانہ "خواہشات کی فہرست" کو پورا کرتا پھر رہا ہو۔ میرا اللہ سائیں تو اس کائنات کا، اس "کاسموس" کا خالق ہے، وہ جس کی رحمت نے اپنی لپیٹ میں ہر ایک مخلوق کو لے رکھا ہے، ہر دل کو تھام رکھا ہے، وہ جس کے ہاتھ میں میرے ہر زخم میرے ہر درد کی شفا ہے۔ وہ جس کا چہرہ، میں جہاں نگاہ دوڑاتا ہوں، دیکھتا ہوں۔ وہ جو ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے۔ وہ جس کے حضور میں اپنی کمیوں کوتاہیوں پر معافی مانگنے میں سست ہو جاتا ہوں مگر وہ جو مجھے بخشنے اور میری ستاری کرنے میں ہمیشہ جلدی کرتا ہے۔ میرا رب تو وہ ہے جو بہت ہی غفور ہے، میرا رب تو وہ ہے جو ستار ہے۔ میرا رب وہ ہے جس کے سامنے جھک جاؤں تو دنیا کی تمام بلندیاں میرے قدموں میں آن گرتی ہیں۔

میرا رب تو رحیم ہے، کریم ہے، رحمن ہے۔ آپ کو یہ خبر ہو کہ رحمن تو مبالغہ کا صیغہ ہے کہ اس قدر رحم کرنے والا کہ وہ خود اعلان کرتا ہے کہ اگر زمین و آسمان کے درمیان جو خلا ہے، اسے تو معصیت اور اپنے گناہوں سے بھر بھی دے جو ممکن نہیں لیکن میرے لئے یہ ممکن ہے کہ میں نہ صرف معاف کر دوں بلکہ اسے حسنات سے بھر دوں، اگر تو اخلاص سے توبہ کر لے۔ میرا رحمٰن رب بندے کو اپنی رحمتوں سے شرابور کہتے ہوئے یہ بھی وعدہ فرماتا ہے کہ اگر تیرے گناہ ریت کے ذروں اور سمندر کے جھاگ سے بھی زیادہ ہوں تو میرے لئے تجھے معاف کر دینا کوئی مشکل نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ تو اپنی خطاؤں پر نادم ہو کر استغفار کر کے میرے دامن میں پناہ مانگ لے:

رحمت یہ چاہتی ہے کہ اپنی زباں سے
کہہ دے گناہ گار کہ تقصیر ہو گئی

اور رحیم کا مختصر ترین معنی یہ ہے کہ جس سے نہ مانگا جائے، تو اسے غصہ آئے گویا ہمیں تو ہر وقت صرف اپنے اللہ سے مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔ بھلا اللہ سائیں سے بڑھ کر کون دلوں کا بھید جانتا ہے، وہ تو ایسا عطا کرنے والا کہ اس کے بعد کسی اور کی احتیاج باقی نہیں رہتی اور وہ کسی کو بالکل نہیں بتاتا لیکن

اس کے برعکس انسان کے آگے ہاتھ پھیلانے والا ساری دنیا کے سامنے صد امحتاج، ذلیل ورسوا ہو جاتا ہے اور اس کی ضروریات بھی پوری نہیں ہوتیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمام خزائن کا مالک میرا رب ہے لیکن اس کے باوجود او فو بالعہد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے آئی ایم ایف اور دیگر اداروں سے اپنے قرضوں کے سود کی ادائیگی کیلئے بھی کشکول تھامے سربسجود ہیں تو اس کی سزا تو مل کر رہے گی۔

بی بی رابعہ بصری نے کیا ہی خوب ارشاد فرمایا: صالح تمہیں کس نے کہا کہ کبھی اللہ کا دروازہ بھی بند ہوتا ہے۔ اللہ کا دروازہ تو ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ میرا اللہ سائیں تو وہ ہے جس کا دروازہ کھلا رہتا ہے، وہ جو میرا غفور وستار ہے۔ اس سمیع کے سامنے فریاد کرنے میں جھجک کیسی، جو البصیر ہے اور اس کے سامنے جھوٹ کیسا، جو العلیم ہے۔ میرا اللہ سائیں وہ قدیر ہے جسے چاہے عزت بخش دے جسے چاہے ذلت۔ ماہِ رمضان الکریم کی آمد آمد ہے، اللہ سے خوب مانگنے کا بڑا زبردست مہینہ ہے، توبہ استغفار کے ساتھ ساتھ غزہ اور کشمیر کے علاوہ امت مسلمہ کے مصائب دور کرنے کی گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ ہچکولے کھاتا پاکستان بھی آپ کی عملی دعاؤں کا منتظر ہے کہ اس کی تخلیق بھی رمضان کریم کی 27ویں، انتہائی مبارک شب کو ہوئی تھی۔

اگر میری کوئی بات گراں گزرے تو اس کیلئے معذرت..... کبھی کبھار چھوٹا منہ اور بڑی بات سرزد ہو جاتی ہے اور یہ مختصر تحریر آپ کے سامنے رکھ دی ہے کہ "شائد ترے دل میں اتر جائے میری بات"۔ سلامت رہیں۔

بروز بدھ 3 رمضان الکریم 1445ھ 13 مارچ 2024ء

ماہِ رمضان، ماہِ تربیت

وہ تھے ہی ایسے۔ سمندر کو کوزے میں بند کر دینے والے۔ کیسی خوب صورت اور دل کش بات کی تھی انہوں نے۔ اور کوئی ایک بات، بس سنتے جایئے اور ان میں سے چند ایک پر عمل کی توفیق مل جائے تو کیا کہنے واہ۔ میرا رب ان سے راضی تھا۔ اسی لئے تو وہ ایسی باتیں کرتے تھے۔ یہ خوش نصیبی ہے، توفیق ہے، عطا ہے۔ بس جسے چاہے نوازدے۔ ہاں یہ تعلق ہے۔ ہاں یہ ہے خوشی۔ ہاں یہ ہے رب کا اپنے بندے اور بندے کا اپنے خالق سے تعلق، مخلوق اور خالق کا رشتہ، تصویر اور مصور، جدھر دیکھتا ہوں میں، ادھر تو ہی تو ہے۔ ایک دن کہا: کم ظرف انسان دوسروں کو خوش دیکھ کر ہی غم زدہ ہو جاتا ہے۔ وہ یہ برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ لوگ خوش رہیں۔ وہ ان کی خوشیوں کو برباد کرنے پر تُل جاتا ہے۔ اس کی خوشی یہ ہے کہ لوگ خوشی سے محروم ہو جائیں۔ وہ اپنے لئے جنت کو وقف سمجھتا ہے اور دوسروں کو دوزخ سے ڈراتا ہے۔

ایک بخیل انسان خوش رہ سکتا ہے، نہ خوش کر سکتا ہے۔ سخی سدا بہار رہتا ہے۔ سخی ضروری نہیں کہ امیر ہی ہو۔ ایک غریب آدمی بھی سخی ہو سکتا ہے، اگر وہ دوسروں کے مال کی تمنا چھوڑ دے۔ جن لوگوں کا ایمان ہے کہ اللہ کا رحم اس کے غضب سے وسیع ہے، وہ کبھی مغموم نہیں ہوتے۔ وہ جانتے ہیں کہ غربت کدے میں پلنے والا غم اس کے فضل سے ایک دن چراغِ مسرت بن کر دلوں کے اندھیرے دور کر سکتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ پیغمبر بھی تکالیف سے گزارے گئے لیکن پیغمبر کا غم امت کی فلاح کیلئے ہے۔ غم سزا ہی نہیں غم انعام بھی ہے۔ یوسف کنویں میں گرائے گئے، ان پر الزام لگا انہیں قید خانے سے گزرنا پڑا لیکن ان کے تقرّب اور حُسن میں کمی نہیں آئی۔ ان کا بیان احسن القصص ہے۔ دراصل قریب کر دینے والا غم دور کر دینے والی خوشیوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ منزل نصیب ہو جائے تو سفر کی صعوبتیں کامیابی کا حصہ کہلائیں گی اور اگر انجام محرومی منزل ہے تو راستے کے جشن ناعاقبت اندیشی کے سوا کیا ہو سکتے ہیں۔

زندگی کا انجام اگر موت ہی ہے تو غم کیا اور خوشی کیا؟ کچھ لوگ غصے کو غم سمجھتے ہیں، وہ زندگی بھر ناراض رہتے ہیں۔ کبھی دوسروں پر کبھی اپنے آپ پر، انہیں ماضی کا غم ہوتا ہے۔ حال کا غم ہوتا ہے اور مستقبل کی تاریکیوں کا غم، ایسے غم آشنا لوگ دراصل کم آشنا ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ گزرے ہوئے زمانے کا غم دل میں رکھنے والا کبھی آنے والی خوشی کا استقبال کرنے کیلئے تیار نہیں ہو سکتا۔ ان کا غم امربیل کی طرح ان کی زندگی کو ویران کر دیتا ہے۔ یہ غم، غم نہیں یہ غصہ ہے۔ یہ نفرت ہے۔ غم تو دعوتِ مژگاں ساتھ لاتا ہے اور چشمِ نم آلود ہی چشمِ بینا بنائی جاتی ہے۔ غم کمزور فطرتوں کا راکب ہے اور طاقتور انسان کا مرکب۔ خوشی کا تعاقب کرنے والا خوشی نہیں پا سکتا۔ یہ عطا ہے مالک کی، جو اس کی یاد اور اس کی مقرر کی ہوئی تقدیر پر راضی رہنے سے ملتی ہے۔ نہ حاصل نہ محرومی، نہ غم، نہ خوشی نہ آرزو نہ شکست، آرزو یہ بڑی خوش نصیبی ہے۔ اپنے نصیب پر خوش رہنا چاہئے۔ اپنی کوششوں پر راضی رہنا چاہئے اور کوششوں کے انجام پر بھی راضی رہنا چاہئے۔ دوسرے انسانوں کے نصیب سے مقابلہ نہیں کرنا چاہئے۔ جو ذرہ جس جگہ وہیں آفتاب ہے"۔

ہے ناں کوزے میں دریا کو بند کرنا۔ اس کے بعد رہ ہی کیا جاتا ہے بات کرنے کو۔ مگر ہم انسان ہیں، کلام کئے بغیر کیسے رہ سکتے ہیں اور کرنا بھی چاہئے۔ دیکھئے آپ ماہ رمضان المبارک میں بھوک پیاس برداشت کر رہے ہیں، آپ کی اپنی راتیں رب کا کلام سننے اور پڑھنے میں گزر رہی ہیں۔ کس لئے؟ اس لئے ناں کہ ہم سب کا رب ہم سے راضی ہو جائے۔ ہم سب نے اپنی حیثیت کے مطابق خلقِ خدا کی خبر گیری کی، دادرسی کی۔ سب کچھ دیا بھی رب کا ہے اور ہم

اسے لوٹایا بھی۔ جب سب کچھ اس کا ہے تو پھر ہم نے کیا کمال کیا۔ لیکن میرا رب کتنا بلند و بالا عظمت و شان والا ہے کہ آپ نے مخلوق کی خدمت نے پھر کی اور وہ آپ کا نگہبان بن گیا۔ اور جس کا وہ نگہبان بن جائے پھر اسے کسی اور کی ضرورت نہیں رہتی، قطعاً نہیں رہتی۔

نبی کریم ﷺ کی تعلیمات سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ روزے دار کو اپنے اعمال، قول و فعل کی عام دنوں سے زیادہ احتیاط کرنی چاہیے۔ جیسے جھوٹ، لڑائی جھگڑے، کسی کو بُرا بھلا کہنے سے اجتناب برتنا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی روزے کی حالت میں تم سے لڑائی چغلی، غیبت، کرے، تو بس اتنا کہہ دو کہ "مَیں روزے سے ہوں۔" ایک اور جگہ فرمایا کہ "اللہ کو تمہارے بھوکا پیاسا رہنے کی ضرورت نہیں۔" احادیث کی رُو سے پتا چلتا ہے کہ چاہے کوئی کتنا ہی بُرا برتاؤ کیوں نہ کرے، مگر روزے دار کو اپنے غصّے پر ضبط رکھنا چاہیے۔ درحقیقت روزہ تو باطنی بیماریوں جیسے غیبت، بداخلاقی، بدکلامی وغیرہ کا خاتمہ کرتا اور نفس کو پاک کرتا ہے۔ نبی محترم ﷺ کی ایک حدیث ہے کہ "بہت سے لوگ ہیں، جن کو روزے سے محض بھوک و پیاس ملتی ہے۔" یعنی انہیں روزے کی اصل روح، صبر و برداشت، تحمّل، سکون اور اللہ کا قرب حاصل نہیں ہوتا۔

صدقِ دل سے بتایئے کہ ہمارے کسی عمل یا زندگی کے کسی شعبے سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم میں سے کتنے لوگ ماہِ رمضان کے احترام میں بُرے کاموں، بدزبانی، غصّے، چیخ پُکار اور گالم گلوچ وغیرہ سے اجتناب کرتے ہیں؟ فقط ایک لمحے کیلئے سوچیے کہ روزہ ہمیں کیا سبق دیتا ہے؟ وہ تو ہم پر اللہ کا احسان ہے، جو ہمیں رمضان کے ذریعے ضبط، صبر و برداشت، تحمّل، درگزر، خوش اخلاقی، صلۂ رحمی اور نیکی کی ترغیب دی گئی۔ یہ ماہِ مبارک صرف بھوکا پیاسا رہنے کا نام نہیں، بلکہ اس کا مقصد انسانی کردار کا سنوار و نکھار ہے۔ تاہم، روزے کی حالت میں اگر صبر و برداشت کا سبق نہیں سیکھا، جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، ظلم کرنا، دوسروں کا حق مارنا نہیں چھوڑا، تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ ہم کھانا پینا چھوڑ کر بھوکے پیاسے رہیں۔

"فاقوں" کی کوئی اہمیت یا قدر نہیں۔ اچھا چلیں، صرف کل کے روزے کا محاسبہ کرکے بتائیں کہ کیا آپ کا ضمیر مطمئن یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے ہے کہ آپ نے واقعی روزے کا حق ادا کر دیا؟ اپنے والدین، بیوی، بچّوں، ماتحتوں، ساتھیوں، رشتے داروں، پڑوسیوں کے ساتھ نرمی سے پیش آئے؟ اپنے ماتحت کی معمولی غلطی پر چراغ پا تو نہیں ہوئے، پکوڑوں میں نمک کی کمی زیادتی پر بیوی کو کھری کھری تو نہیں سنائیں؟ ایک ذرا سی چپقلش پر خاوند پر لعن طعن تو نہیں کی، صفائی میں کوتاہی پر کام والی کو تنخواہ کاٹنے کی دھمکی تو نہیں دی؟ صدقہ خیرات کے نام پر پھٹے پرانے، بوسیدہ کپڑے، جوتے ہی تو نہیں نکالے؟ گرمی، بھوک پیاس کا غصّہ ٹریفک میں گالم گلوچ کے ذریعے تو نہیں نکلا؟ "میرا روزہ نہ ہوتا تو... میرا روزہ نہ ہوتا تو..." کی گردان تو نہیں کرتے رہے؟ اگر ان تمام سوالوں کا جواب "ہاں" ہے، تو یقین جانیے آپ روزہ نہیں، فاقہ کر رہے ہیں۔ اُس ذاتِ باری تعالیٰ کی عبادت، حمد و ثناء، تعظیم و تکریم کیلئے تو فرشتے ہی کافی ہیں، لیکن یہ اُس کا ہم گناہ گاروں پر احسان ہے کہ ہمیں اپنے گناہوں میں لُتھڑے دل بدلنے کا موقع عطا کیا۔

ارے! ہماری کیا اوقات کہ کسی کی مدد کر سکیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ وہ صدقہ، خیرات و زکوٰۃ کے ذریعے ہمارے مال کو پاک کرتا ہے۔ ہمارے دنیا کی چکاچوند اور بے حسی سے متاثرہ سخت دل روزے کی وجہ سے نرم پڑنے لگتے ہیں کہ اس طرح ہمیں اُن لوگوں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے، جنہیں عام دنوں میں تو کیا، تہواروں پر بھی دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی۔

رمضان کہنے کو تو مہمان ہے، مگر یہ ماہِ رحمت درحقیقت ہمیں یہ احساس دلانے آتا ہے کہ پورا سال اللہ تبارک و تعالیٰ ہم پر جو اپنی بے شمار نعمتوں کی بے

حساب بار شیں کرتا رہتا ہے، ہمیں ان کی صحیح قدر نہیں ہوتی اور محض ایک مہینہ صرف دن کے اوقات میں ان نعمتوں سے دُوری ہمیں ان کی اہمیت بتادیتی ہے، کیونکہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ ہر اس چیز کی قدر کرتا ہے، جو اس کی پہنچ سے دُور ہو۔ پھر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ افراد، بالخصوص نوجوان رمضان کا پورا مہینہ تو باقاعدگی سے نمازوں اور دیگر عبادات کا اہتمام کرتے ہیں، مگر عید کا چاند نظر آتے ہی ایسے غافل ہوتے ہیں، جیسے شیطان ان ہی کے انتظار میں تھا۔ یاد رکھیے! رمضان رحمتیں، برکتیں، گناہوں کو بخشوانے، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا تو مہینہ ہے ہی، لیکن یہ "ماہِ تربیت" بھی ہے، یعنی اس ماہ جتنے نیک اعمال اور عبادات کی جاتی ہیں، اگر وہ سال کے گیارہ مہینے ہمارے معمولات میں شامل نہیں ہوتیں، تو یہ افسوس کا مقام ہے۔ اگر رمضان المبارک میں اپنائے گئے اچھے اعمال کا اثر ہماری روز مرّہ زندگیوں پر نہیں پڑ رہا، تو یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ ہمیں رمضان کریم کی اصل روح کو پہچاننا ہو گا۔ اپنا محاسبہ کرنا ہو گا کہ اس جیسا پاکیزہ مہینہ بھی اگر ہماری زندگیوں میں مستقل تبدیلی نہیں لا پا رہا تو کمی کیا اور کہاں ہے۔ رمضان تو اپنی بہاریں ویسے ہی لیے ہوئے آتا ہے، مسئلہ تو ہم میں، ہماری سمجھ اور ہمارے کردار میں ہے۔ انسان چونکہ مادی اور جسمانی پہلو کے علاوہ معنوی اور روحانی پہلو کا بھی حامل

ہے تو ان پہلوؤں کے کمال تک پہنچنے کیلئے خاص طریقہ کار ہیں، معنوی پہلو کی پرورش اور طاقت کا ایک طریقہ تقویٰ اور پرہیز گاری ہے، یعنی اگر انسان اپنے آپ کو معنوی پہلو کے لحاظ سے ترقی دینا چاہے اور مطلوبہ طہارت و کمال تک پہنچنا چاہے، تو اسے اپنی نفسانی خواہشات پر غالب ہونا پڑے گا اور کمال کے راستے میں موجودہ رکاوٹوں کو یکے بعد دیگرے ہٹانا ہو گا اور جسمانی لذتوں اور شہوتوں میں مصروفیت سے بچنا پڑے گا۔

تقویٰ ہر اس آدمی کی زندگی کا لازمہ ہے جو عقل کے حکم کے تحت زندگی بسر کرتا ہو اسعاد تمندانہ حیات تک پہنچنا چاہتا ہے۔ دینی اور الٰہی تقویٰ یہ ہے کہ انسان ان اصول پر عمل پیرا ہو جن کو دین نے زندگی کیلئے مقرر کیا ہے اور گناہ سے اپنے آپ کو بچائے۔ انسان کو اپنی روح میں ایسی کیفیت اور طاقت پیدا کرنی پڑے گی جو اسے گناہ سے سامنا ہوتے ہوئے، گناہ سے محفوظ کر لے یہاں تک کہ تقویٰ کی طاقت کے ذریعے اپنے نفس اور نفسانی خواہشات پر غلبہ پالے اور اپنے دامن کو اللہ کی معصیت اور گناہ کرنے سے آلودہ نہ کرے قرآن مجید کی نظر میں ہر عبادت کی قبولیت کی شرط تقویٰ اور پرہیز گاری ہے، جہاں ارشاد الٰہی ہے: إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّـهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ۔ اللہ صرف صاحبان تقویٰ کے اعمال کو قبول کرتا ہے۔

تقویٰ کیلئے مؤثر اور مفید ایک عمل، روزہ ہے جس کی مشق کرتے کرتے انسان اس بات کو سیکھ لیتا ہے اور سمجھ جاتا ہے کہ اپنی لگام کو ہوا و ہوس کے ہاتھوں میں نہ تھمادے اور یہ بالکل عین تقویٰ ہے۔ روزہ کا مقصد تقویٰ کا حصول ہے، قرآن کریم میں پروردگار کا ارشاد ہے: يَاأَيُّهَاالَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَاكُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ، صاحبانِ ایمان تمہارے اوپر روزے اسی طرح لکھ دیئے گئے ہیں جس طرح تمہارے پہلے والوں پر لکھے گئے تھے شاید تم اسی طرح متقی بن جاؤ"۔

چونکہ روزہ کا مقصد تقویٰ حاصل کرنا ہے تو انسان روزہ رکھنے سے کچھ چیزوں سے پرہیز کرنے اور بعض لذتوں سے محروم رہنے کی مشق کرتے ہوئے حرام سے پرہیز کرنے اور اللہ کے احکام کو بجالانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ جب انسان کا گناہ سے سامنا ہوتا ہے تو وہاں تقویٰ اختیار کرنا چاہیے اور تقویٰ اختیار کرنا پختہ ارادہ کے بغیر ممکن نہیں، روزہ کا ہدف چونکہ تقویٰ کا حصول ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ روزہ ایسی چیز ہے جو انسان کو گناہ سے بچاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: الصَّوْمُ جُنَّةٌ مِنَ النَّار، روزہ (جہنم کی) آگ کے سامنے ڈھال ہے۔

تقویٰ اور روزے کا آپس میں اتنا گہرا تعلق ہے کہ تقویٰ کے معنی اپنے آپ کو بچانا اور روکنا ہے، اور روزہ کا مطلب بھی امساک اور ایک طرح کا اپنے آپ

کو بچانا ہے۔ ان کا آپس میں فرق یہ ہے کہ تقویٰ، ہر اس چیز سے نفس کو بچانا ہے جو انسان کے نفس اور تقویٰ کو نقصان پہنچاتی ہے، لیکن روزہ خاص مقرر کردہ چیزوں سے پرہیز ہے جو روزہ کے باطل ہونے کا باعث ہیں اور روزہ دار کو تقویٰ تک پہنچنے میں رکاوٹ ہیں۔ اس تعریف کے مطابق تقویٰ اور اس کے مصادیق کی حد، روزہ کی حد سے زیادہ وسیع ہے۔ لہذا ان چیزوں سے بچنا جو روزہ کو باطل کرتی ہیں، تقویٰ تک پہنچنے کا سبب ہے۔ اس بات کے پیش نظر کہ روزہ کے ذریعے انسان کو تقویٰ حاصل کرنا ہے تو اگر روزہ کی حالت میں ایک طرف سے انسان کو کھانے پینے اور دیگر کچھ کاموں سے منع کیا گیا ہے تو دوسری طرف سے ایسے اعمال بجالانے کا حکم بھی دیا گیا ہے جو ایمان و عمل کی مضبوطی کا باعث ہیں، جیسے واجب و مستحب نمازیں پڑھنا، قرآن کریم کی تلاوت، صلوات، استغفار، دعا و مناجات، غریبوں کی مدد، صلہ رحمی، اخلاق کو اچھا کرنا اور کئی دیگر اعمال۔

ہم انسان ہیں۔ خطاکار ہیں۔ ہم لاکھ چاہیں کہ دل آزاری نہ کریں۔ کسی کی عزت نفس پامال نہ کریں۔ کسی کو دکھ نہ دیں۔ لیکن ہو جاتی ہے غلطی۔ لیکن انسان وہ ہے جو اپنی غلطی مانے اور جس کی حق تلفی ہوئی ہے اس سے معذرت کرے۔ وہ انسان جو تائب ہو جائے وہی منزل پر پہنچتا ہے۔ رمضان المبارک کے پر مسرت موقع پر ہم سب کو چاہئے کہ رنجشیں ختم کر دیں۔ ہو جاتا ہے، انسان ہے، سو معاف کر دیں انہیں گلے سے لگائیں۔ جو روٹھ گئے ہیں، انہیں منائیں اس دکھ بھری زندگی میں دن ہی کتنے ہیں کہ ہم اسے جہنم بنادیں۔ میرا ایک بہت پاگل سا دوست ہے بہت باکمال لیکن بالکل ان پڑھ، میرا رب اسے سلامت رکھے۔ ہر وقت ایک ہی بات کرتا ہے "دوداں دی زندگی تے فیر انھیری رات" ایک دن ہم نے پوچھا رب سے معافی کیسے مانگیں تو کہا بہت آسان ہے۔ اس کے بندوں کو معاف کرو اور پھر رب سے کہو، میں تو تیرا بندہ ہو کر تیری مخلوق کو معاف کرتا ہوں، تُو تو ہم سب کا رب ہے، ہمیں معاف کر دے۔ سو معاف کر دیئے جاؤ گے جو کسی بندے بشر کو معاف نہ کرے۔ خود کیسے معاف کر دیا جائے گا۔

آپ سب بہت خوش رہیں۔ میرا رب آپ کی زندگی سکون و آرام سے بھر دے۔ آپ سدا مسکرائیں، آپ کی زندگی میں کوئی غم نہ آئے۔ بہار آپ کا مقدر بن جائے۔ ہر شب شبِ برأت بن جائے۔

میں شیشہ گر نہیں، آئینہ سازی تو نہیں آتی
جو دل ٹوٹے تو ہمدردی سے اس کو جوڑ دیتا ہوں

بروز جمعرات 4 رمضان الکریم 1445ھ 14 مارچ 2024ء

دہشتگرد کون؟

جوں جوں پاکستان میں انتخابات قریب آرہے ہیں، اپنے بیرونی آقاؤں کے اشارے پر دہشتگرد خودکش حملوں کی صورت میں ابتری پھیلانے کیلئے ارضِ وطن کو خون میں رنگین کرنے کیلئے سرگرم ہوگئے ہیں۔ مستونگ اور گردوپیش کے دوسرے علاقے میانوالی، ڈیرہ غازی خان، بنوں، وزیرستان اور کرم ایجنسی کے علاوہ چترال تک روح فرسا خبریں پڑھنے کو مل رہی ہیں اور جوابی طور پر ہمارے محافظ دلیری سے اپنی جانیں قربان کرکے اس وطن عزیز کی حفاظت فرمارہے ہیں۔ گویا پاکستان جو ضرب عضب اور ردالفساد آپریشنز میں پاکستان سے ان دہشتگردوں سے صفایا کرنے میں مصروف ہے، ایک مرتبہ پھر پیغام دیا جارہا ہے کہ ان دہشتگردوں کا مکمل صفایا ہونا ابھی باقی ہے۔ یادرہے کہ پاکستانی فوج کے سربراہ جنرل عاصم نے گزشتہ دنوں بھارت کو ایک سے زیادہ مرتبہ واضح پیغامات بھی دیئے ہیں کہ پاکستان اپنی لازوال قربانیوں سے ان دہشتگردوں کا خاتمہ کرنے میں مصروف ہے اور ان طاقتوں کو بالآخر منہ کی کھانی پڑے گی لیکن دشمن اس وقت چاروں اطراف سے اپنی سازشوں میں مصروف ہے۔

جو بائیڈن کا افغانستان سے یوں رسوا ہوکر انخلاء کا دکھ چھپائے نہیں چھپتا جبکہ افغانستان سے جان چھڑانے کے بعد ان کو حقائق کی طرف لوٹ کر اپنی سابقہ پالیسیوں پر تدبر کرنا ضروری تھا لیکن وہ تو فوری طور پر اسی خطے میں اپنے اتحادیوں کے ساتھ روس کے ساتھ محاذآرائی میں مشغول ہوگئے اور یوکرین کی پشت پر ہاتھ رکھ کر ہزاروں افراد کو اپنے مفادات کی بلی چڑھادیا اور اب یوکرین کے ساتھ ساتھ روس بھی اس جنگ سے جان چھڑانے کیلئے تو بیتاب ہیں لیکن امریکا ابھی ایک اور دھکہ دینے کیلئے سرگرم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کیلئے اپنے پرانے مہروں کو استعمال کرکے پاکستان میں 8 فروری کو ہونے والے انتخابات کو سبوتاژ کرنے کے عمل میں مصروف ہے۔ بالخصوص حالیہ غزہ میں اسرائیل کی جانب سے وحشیانہ قتل وغارت کی جس طرح حمائت میں بائیڈن، اور اس کے ہمنواؤں کا شرمناک کردار ہے، خود ان کے اپنے ملکوں میں لاکھوں افراد کے مظاہروں نے اس کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔

یہ سارا بیانیہ میڈیا میں درجنوں مرتبہ زیر بحث بھی رہا حتی کہ خود امریکا میں کئی دانشوروں، امور سیاسی تجزیہ نگاروں نے جو بائیڈن کے اس رویے کو بداخلاقی اور سیاسی عقل سے عاری بھی قرار دیا لیکن آج تک بائیڈن کے رویے میں تبدیلی کی بجائے مسلسل ایسے ریمارکس کئی دیگر ملکوں کے خلاف بھی استعمال کرکے ان سیاسی تجزیہ نگاروں کی آراء کو درست ثابت کردیا ہے کہ بائیڈن طاقت کے بل بوتے پر تمام مسائل کا حل اپنی مرضی کے تابع دیکھنا چاہتے ہیں۔ بائیڈن کے اس بیانیہ میں ایک لفظ "دہشتگردی" جو اس فاعل کے صیغے کے ساتھ استعمال ہوا ہے، انتہائی مبہم اور غیر واضح ہے، دہشتگردی کیا ہے؟

آج کی دنیا میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ "دہشتگردی" ہے۔ انسائیکلوپیڈیا بتاتا ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں آج یہ سب سے زیادہ لکھا اور پڑھا جانے والا لفظ ہے جو کرۂ ارض کی ہر زبان میں ترجمے کی صورت گردش کررہا ہے۔ اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن ہر جگہ آپ کو اس لفظ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ لفظ ہماری سماجی زندگی کی گفتگو میں ہر طرح سے دخیل ہے۔ دنیا بھر کے اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علموں کی زبان پر ہے۔ استادوں، صحافیوں اور دانشوروں کی گفتگو کا محور یہی لفظ "دہشتگردی" ہے۔ انٹرنیٹ کی دنیا میں داخل ہوتے ہی آپ کا سامنا اس لفظ سے ہوتا ہے۔ آج یہ لفظ دہشتگردی بغیر کسی ٹھوس وضاحت اور تعریف کے عالمی طاقتوں کی اجارہ داری کی نذر ہوگیا ہے۔ کوئی بھی ملک، تنظیم، گروہ یا بااثر شخصیت اپنے ملک

کو بین الاقوامی سطح پر ذلیل کر کے اپنا ضمیر بیچ کر اپنی عزت نیلام کر کے اپنے ہی شہریوں کی نظر میں اپنے آپ کو رسوا کر کے اگر عالمی طاقتوں کے مفادات کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے تو اس ملک اور گروہ کے جنگجو حریت پسند کہلاتے ہیں اور اعلیٰ عہدیداروں کو نوبل پرائز اور امن ایوارڈز دیئے جاتے ہیں اور خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے لیکن اگر کسی کا مردہ ضمیر بیدار ہو جاتا ہے، اپنے ملک کو ترقی یافتہ ممالک کی فہرست میں شامل کرنے کیلئے منصوبہ بندی اور دیگر ممالک سے معاہدے کیے جاتے ہیں، خیرات کا کشکول توڑ کر معیشت کو مستحکم کرنے کا ارادہ کیا جاتا ہے، ملک کو دہشتگردی سے پاک کرنے کیلئے اقدامات کیے جاتے ہیں، خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی جاتی ہے، اپنے ملک کے انفرادی اور اجتماعی مفادات کو عالمی طاقتوں کی چاپلوسی پر ترجیح دی جاتی ہے تو وہی لوگ جو پہلے عالمی طاقتوں کی نظر میں حریت پسند کہلاتے تھے، وہی دہشتگرد، جھوٹے اور دھوکے باز کہلاتے ہیں۔

پاکستان ہی کی مثال لے لیجئے، برسوں سے لیکر آج تک تیل کے حصول کیلئے امریکی جنگ کو اپنی جنگ سمجھ کر فرنٹ لائن اتحادی کا رول ادا کیا جس سے ہمارا اپنا ملک دہشتگردی کی زد میں آ گیا۔ مزید نقصان یہ ہوا کہ عالمی میڈیا میں پاکستان کو اسٹیٹ آف ٹیرر قرار دے دیا گیا۔ تیل کے ذریعے امریکی معیشت کو جلا بخشنے کیلئے اپنے ہی ہاتھوں اپنی قوم کے نوجوانوں کو دہشتگردی کی آگ میں دھکیل دے دیا گیا لیکن جب اسٹیٹ آف ٹیرر کو (اسٹیٹ آف پیس اینڈ لو) میں تبدیل کرنے کا ارادہ کیا گیا تو ہم دھوکے باز اور جھوٹے ٹھہرے۔

جب اپنی لازوال قربانیوں سے اپنے ملک سے دہشتگردی جیسی لعنت کو ختم کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کر لی اور یہ تمام دہشتگرد پاکستان کی سرزمین پر یا تو مار دیئے گئے یا پھر فرار ہو کر افغانستان کی سرزمین کے اس علاقے میں جا بسے جہاں خود امریکی افواج کی عملداری تھی اور ان کی ناک کے نیچے بھارتی "را" انہیں پاکستان میں دہشتگردی کیلئے استعمال کرنے کیلئے باقاعدہ اڈے قائم رکھے تھے اور ایک مرتبہ پھر انہیں گمراہ لوگوں کو استعمال کرنے کیلئے کام شروع ہو چکا ہے، اور پاکستان کے ٹھوس شواہد فراہم کرنے کے باوجود ان کے خلاف کاروائی سے اجتناب کیا جا رہا ہے لیکن جب بھی "ڈومور" کے احکامات ماننے کی بجائے اقوام عالم سے "ڈومور" کا جائز مطالبہ کیا گیا تو جواب میں تحسین کی بجائے الٹا اس پر جھوٹ اور دھوکہ دہی کا الزام ایک فاتر العقل کی طرف سے لگا دیا گیا۔

افغانستان کی مثال لے لیجئے۔ روس کے ساتھ برسرپیکار افغان طالبان کو مالی تعاون کے ساتھ ساتھ امریکا کی طرف سے اسٹنگر میزائل اور جدید قسم کا اسلحہ فراہم کیا جاتا رہا جس کی مدد سے تقریباً دس سال تک بے سروپا طالبان روس کے ساتھ زور آزمائی کرتے رہے بالآخر روس انتہائی بری طرح شکست کھا کر نہ صرف اپنا بوریا بستر سمیٹ کر چلا گیا بلکہ اسی کے بطن سے چھ اور مسلم ریاستوں کا قیام عمل میں آ گیا اور امریکا دنیا میں واحد سپر پاور بن گیا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس لازوال قربانیوں کو تسلیم کرتے ہوئے تباہ حال افغانستان اور پاکستان کی ہر ممکن مدد کی جاتی لیکن امریکا فوری طور پر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کر واپس چلا گیا لیکن اس مشکل حالات میں یہ پاکستان ہی تھا جس نے افغانستان میں قیامِ امن کیلئے اپنی تمامتر کوششوں کو جاری و ساری رکھا اور کسی حد تک انہی افغان طالبان نے افغانستان میں جاری خونریزی پر قابو پا کر پرامن حکومت کی بنیاد رکھی اور دنیا نے یہ تسلیم کیا کہ انہی طالبان کے دورِ حکومت میں منشیات اور دیگر جرائم پر قابو پا لیا گیا لیکن جونہی روس سے الگ ریاستوں جہاں قدرتی معدنی گیس اور تیل کے وافر ذخائر کے خزانوں کا انکشاف ہوا تو امریکا ایک مرتبہ پھر ان کے حصول کیلئے راہداری کیلئے افغانستان کو استعمال کرنے کیلئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے لیکن طالبان امریکا کی بے وفائی کے مناظر بھول نہ پائے تھے، اس لئے انہوں نے اپنی شرائط پر معاملہ طے کرنے کی کوشش کی جو ایک خود مختار ملک کا حق ہے جو امریکا نے طاقت کے نشہ میں ماننے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ افغان حکومت کو تبدیل کرنے کیلئے سازشیں شروع کر دیں۔ جب امریکا اپنی ان سازشوں میں

کامیاب نہ ہو سکا تو اس نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کا افسانہ گھڑ لیا اور وہی طالبان جو کبھی حریت پسند کہلاتے تھے، اسامہ بن لادن کو پناہ دینے کے الزام میں امریکی بربریت، درندگی اور سفاکی کا نشانہ بنے اور دہشتگرد کہلائے۔

امریکا کو اپنے علاوہ تمام مسلم دنیا بالخصوص پاکستان دہشتگرد دکھائی دیتا ہے اور کیوں نہ دکھائی دے کہ امریکا بار بار انسانیت سوز مظالم اور درندگی کا مظاہرہ کرنے سے باز نہیں آرا۔ کسی بھی ملک کیلئے جو غلط راہ پر چل پڑے، مسلمان ملک وملت سے خائف ہونا ایک فطری امر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کیلئے غلط کام کرنے پر ایک خوف ڈال دیا ہے۔ اسی خوف کے زیر اثر بائیڈن یا کسی بھی شخص کا پاکستان کے خلاف اپنی کاروائیاں جاری رکھنا کوئی عجب بات نہیں۔ اس کو تو ایک مثال سے یوں سمجھ لیجئے کہ ایک چور کسی گھر میں ڈاکہ ڈالتا ہے، پولیس کو اطلاع ہوتی ہے تو چور کو رنگے ہاتھوں گرفتار کرنے کیلئے چور اور پولیس کا آمنا سامنا ہوتا ہے۔ اس وقت چور کیلئے پولیس دہشتگرد ہوئی کیونکہ چور کیلئے پولیس کے ہاتھوں گرفتاری کی دہشت اور خوف ایک طبعی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا اور اسرائیل کے دلوں میں پاکستان کی انتہائی دہشت چھپی ہوئی ہے، اسی لئے تو مختلف مواقع پر اس خوف کا اظہار کیا جارہا ہے۔

جب 1967ء کی جنگ میں عربوں کی شکست پر یہودیوں نے فرانس میں جشن منایا، اس وقت کے اسرائیلی وزیر اعظم بن گوریان نے ایک تقریب میں واشگاف اعلان کیا کہ "یہودی تحریک کیلئے پاکستان کو نظر انداز کرنا انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، اس لئے ہمارے لئے پہلا ہدف پاکستان ہونا چاہئے کیونکہ پاکستان ایک نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے اور یہی نظریہ ہماری منزل مقصود کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ ہمارے لئے انتہائی ضروری ہے کہ ہم جلد از جلد پاکستان کے خلاف ٹھوس اور پر زور اقدامات کا آغاز کریں"۔ بہر حال یہ تو ہمیشہ پاکستان سے خوفزدہ رہیں گے لیکن عوامی سطح پر دہشتگردی کی اصطلاح سمجھنے کیلئے نہ تو امریکا کی کسی ڈکشنری میں اس کی ٹھوس تعریف اور وضاحت ملتی ہے نہ امریکا کے کسی صدر، اس کے کسی اتحادی ملک کے سربراہ یا وزیر اعظم، سیاستدان یا قانون دان نے دہشتگردی کی ٹھوس تعریف کرنے کی زحمت گوارہ کی ہے۔ کرے بھی کیوں، کہ اسے اپنے حق میں استعمال جو کرنا ہے۔

دہشتگرد کا لفظ پہلی مرتبہ 1790ء میں پہلی مرتبہ انقلاب فرانس کے دوران استعمال ہوا جبکہ امریکا کی آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق اس کی وضاحت کچھ یوں کی گئی ہے:

The use of violent actions in order to achieve political aims or to force and government to act.

"شدید مقاصد کیلئے یا حکومت کو عمل کرنے پر مجبور کرنے کیلئے تشدد کے کاموں کا استعمال"۔ اسی وضاحت اور تعریف کو مد نظر رکھتے ہوئے امریکا کو عالمی دہشتگرد کہنا یقیناً انصاف کا تقاضہ ہے۔ میری بات سے میرے ملک کے بعض دور اندیش، روشن خیال اور ترقی پسند حضرات یقیناً اختلاف کریں گے لیکن شاید کوئی مندرجہ ذیل حضرات کی تائید کی بناء پر ہی ہمارے مؤقف سے اتفاق کرلے۔

امریکی جنگ آزادی کے دوران برطانوی حکومت کی طرف سے بینجمن فرینکلن اور جارج واشنگٹن کو عالمی دہشتگرد قرار دیا گیا تھا۔ 20 ستمبر 2006ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس وینزویلا کے صدر ہوگو چیواز نے جارج بش کو شیطان اور دہشتگرد قرار دیا تھا۔ دسمبر 2005ء میں "دی آئرش ٹائمز" کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے بولویا

کے صدر ایوو مورالس نے جارج بش کو دہشتگرد قرار دیا تھا۔ جنوری 2006ء میں امریکا کے مشہور موسیقار ہیری بیلا فونٹی نے جارج بش کو دنیا کا سب سے بڑا دہشتگرد قرار دیا تھا۔ اگست 2005ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر جارج گیلوے نے جارج بش کو دنیا کا سب سے بڑا دہشتگرد قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ جارج بش اور ٹونی بلیئر کے ہاتھ ان لوگوں کی نسبت زیادہ خون آلود ہیں جو ورلڈ ٹریڈ سنٹر یا لندن میں دہشتگردی کے واقعات میں ملوث پائے گئے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ اگر کوئی شخص کسی بے گناہ انسان کو تکلیف پہنچائے بغیر جارج بش اور ٹونی بلیئر پر خودکش حملہ کرے گا تو یہ عین انصاف ہو گا ۔25 جولائی 2006ء نیدرلینڈ کی نوبل انعام یافتہ بیٹی ویلیمز نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ "مجھے جارج بش کو قتل کرنے کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے"۔

اپنی خونخواری، درندگی، سفاکی اور بربریت کو دنیا کی نظروں سے چھپانے اور اپنے مذموم مقاصد کے حصول میں اسلام اور مسلمانوں کو راستے سے ہٹانے کیلئے اسلام کو دہشتگردی سے جوڑنے اور اسے ایک خطرناک اور خونخوار مذہب کے طور پر پیش کرنے کیلئے پر زور پروپیگنڈہ اور سر توڑ ناکام کوششیں کی جارہی ہیں جس کیلئے ماہانہ کروڑوں ڈالرز خرچ کئے جاتے ہیں اور مسلمانوں میں سے سلمان رشدی جیسے ملعون لوگ پیدا کرنے اور خریدنے کی کوششیں کی جاتی ہیں لیکن اسلام کے مطالعے سے لوگ یہ بات سمجھ جاتے ہیں کہ اسلام عالمگیر امن کا داعی ہے اور پر امن معاشرے کیلئے مختلف مذاہب کے ہوتے ہوئے بھی باہمی محبتوں کا وجود ضروری ہے۔ اسی محبت کے جذبے کو فروغ دینے کیلئے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مختلف مقامات سے مٹی کو جمع کر کے تخلیق فرمایا۔ اس حقیقت کو جاننے کے بعد پروپیگنڈہ سے متاثر افراد فطری طور پر اسلام قبول کرنے پر رضامند ہو جاتے ہیں۔ یورپ میں سرعت سے اسلام قبول کرنے والوں کی یہی وجہ ہے۔ یورپ میں اسلام کے تیزی سے پھیلاؤ کو روکنے اور اس کے آگے بند باندھنے کیلئے متبادل راستے کے طور پر ہر مسلمان دہشتگرد نہیں لیکن ہر دہشتگرد مسلمان ہے" کے نعرے کو عالمی میڈیا میں فروغ دیا جارہا ہے جس نے اسلام کی طرف رغبت رکھنے والے غیر مسلموں اور ہمارے بعض دانشوران اور ترقی یافتہ طبقے کو بھی کسی حد تک متاثر کیا ہوا ہے جسے حقیقت اور تاریخ کے آئینے میں جانچنے کی ضرورت ہے تاکہ غیر مسلموں کو اسلام پر مطمئن کرنے کا سامان ہو سکے اور یہ ہمارے لئے مزید استقامت کا سبب بنے۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں ہونے والے دہشتگردی کے واقعات کا اگر جائزہ لیا جائے تو حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ 13 مارچ 1881ء کو ایک دہماکے میں روس کے بادشاہ الیگزینڈر دوم کو قتل کیا گیا جبکہ اس کے ساتھ ہی 20 دیگر افراد بھی ہلاک ہو گئے۔ یہ واقعہ ایک غیر مسلم شخص کے ہاتھوں پیش آیا۔ 4 مئی 1886ء کو شکاگو میں ایک لیبر ریلی کے دوران دہماکہ ہوا جس میں 12 / افراد ہلاک اور 7 زخمی ہوئے جس کی ذمہ داری انارکسٹ نے قبول کی جو کہ ایک غیر مسلم تھا۔ 6 ستمبر 1902ء کو ایک غیر مسلم شخص نے امریکا کے صدر ویلیم میکنلے کو قتل کر دیا۔ یکم اکتوبر 1920ء کو مسیحی برادری سے تعلق رکھنے والے دو افراد ضیمز اور جوزف نے ٹائمز اخبار کی عمارت کو دہماکے سے اڑا دیا جس میں 21 افراد ہلاک ہو گئے۔

28 جون 1914ء کو آسٹریلیا کے آرکوڈوک اور اس کی بیوی ایک بوسینائی سرب کے ہاتھوں قتل ہوئے جو جنگ عظیم اوّل کا پیش خیمہ بنا۔ 16 / اپریل 1925ء کو بلغاریہ کی کیمونسٹ پارٹی نے بلغاریہ کے "سینٹ نیڈیلا" چرچ میں دہماکہ کیا جس میں 50 / افراد ہلاک اور 500 / افراد زخمی ہو گئے، اس کو بلغاریہ کی سب سے بڑی دہشتگردانہ کاروائی شمار کیا جاتا ہے۔ 9 / اکتوبر 1934ء کو یوگوسلاویہ کے کنگ الیگزینڈر اوّل کا ایک غیر مسلم سیکورٹی گارڈ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ 3 / ستمبر 1969ء کو برازیل میں امریکی سفیر کو ایک غیر مسلم شخص نے اغواء کر کے قتل کر دیا۔ 30 جولائی 1969ء کو جاپان میں ایک غیر مسلم نے امریکی سفیر پر چاقو سے حملہ کر کے زخمی کر دیا۔ انیس اپریل 1995ء کو مسیحی برادری کے دو افراد ٹی موتھی اور ٹیری نے اوکلوہاما شہر کی فیڈرل بلڈنگ میں دہماکہ کیا جس میں 166 / افراد کی جانیں ضائع ہو گئیں اور 100 سے زیادہ افراد زخمی ہوئے۔ 1941ء سے لیکر 1948ء تک

مختلف یہودی تنظیموں کی دہشتگردی کے تقریباً260واقعات نوٹ کیے گئے۔22جولائی1946ء کو دائیں بازو کے صہیونی لیڈر مینہم بیگن نے یروشلم میں واقع برطانوی ایڈمنسٹریشن ہیڈ کوارٹر کنگ داؤد ہوٹل میں دھماکے کروائے جس میں 91/افراد ہلاک اور40/افراد سے زائد زخمی ہوئے جسے برطانیہ نے عظیم دہشتگرد قرار دیا جبکہ 1978ء میں اسی عظیم دہشتگرد کو نوبل پرائز سے نوازا گیا۔9مئی1978ء کو ایک غیر مسلم کے ہاتھوں اٹلی کے ایلڈو مور کا قتل ہوا۔20مارچ1995ء کو"کلٹ موومنٹ آم"نامی تنظیم کے رکن اور بدھ مت سے تعلق رکھنے والے ایک شخص نے ٹوکیو کی ایک شاہراہ میں زہریلی گیس چھوڑدی جس سے 12/افراد ہلاک اور ہزاروں متاثر ہوئے۔

امریکا میں گزشتہ سو سال کے دوران"آئرش ری پبلکن آرمی"کے ہاتھوں دہشتگردی کے متعدد واقعات دیکھے گئے۔1972ء میں تین دھماکے کیے جس میں20افراد ہلاک اور سو سے زائد شدید زخمی ہوگئے۔1974ء میں دو دھماکے کئے جس میں 25 سے زائد ہلاک اور100 سے زائد زخمی ہوئے۔ 1995ء میں مانچسٹر کے شاپنگ مال میں ایک زبردست قسم کا دھماکہ ہوا جس میں کئی درجن افراد ہلاک اور200 سے زائد زخمی ہوئے۔اگست1998ء میں بین بریج کے دھماکے میں30 سے زائد زخمی ہوگئے۔اسپین اور فرانس میں"ای ٹی اے"(اوسکاڈی ٹاسکاٹاسونا)دہشتگردی کے36واقعات میں ملوث پایا گیا۔یادرہے ان تمام واقعات میں ایک بھی مسلمان ملوث نہیں تھا بلکہ تمام ملزمان غیر مسلم تھے۔

پانچ جون1984ء کو امرتسر بھارت میں اندین فورسز نے گولڈن ٹیمپل پر حملہ کیا جس میں سینکروں سکھ افراد کو بیدردی سے مار دیا گیا جس کا انتقام لینے کیلئے اندرا گاندھی کو ان کے اپنے ہی سکھ گارڈ نے 31/اکتوبر1984ء کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔بیسویں صدی میں 2/اکتوبر2004ء کو عیسائی دہشتگردوں نے 44/ہندوؤں کو قتل کر دیا جس میں انہوں نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ اب تک ہندو جنونیوں نے ہمارے کئی گرجاگھروں کو آگ لگائی ہے اور ہمارے کئی عیسائی راہبوں کو زندہ جلادیا گیا اوعلاوہ ازیں مسلسل عیسائیوں کو جبراً ہندو بنانے کا عمل جاری ہے جس پر بھارتی حکومت نے چپ سادھ رکھی ہے۔اسی طرح1990ء سے لیکر2006ء تک شمالی مشرقی انڈیا کی ایک تنظیم یونائیٹڈ لبریشن فرنٹ آف آسام کو دہشتگردی کے749واقعات میں ملوث پایا گیا۔بھارت کے600علاقوں میں سے150 علاقوں پر یعنی ایک تہائی بھارت پر محیط نیپال کی ماؤ تنظیم نے سات برسوں میں دہشتگردی کے 99 واقعات سرانجام دیئے۔اس کے علاوہ بھی بیسیوں واقعات ایسے ہیں جن میں آپ کو کسی مسلمان کا نام تک دکھائی نہیں دے گا اوراگر کہیں پر دعویٰ کیا گیاہے تو وہ بے جااور بلاثبوت ہے اوراگر دعویٰ ٹھوس ثبوتوں کی بنیاد پر ہے تب بھی یہ حملہ آور کا ذاتی فعل ہے،جو مذہب اسلام نماز کیلئے وضو میں زائد پانی بہانے کی اجازت نہیں دیتا وہ بھلا کسی بے گناہ کے قتل کی اجازت کیسے دے سکتا ہے بلکہ کسی ایک بے گناہ کے قتل کو تو ساری امت کے قتل سے تشبیہ دی کر شدید مذمت کرتا ہے۔

یوگنڈا میں"لارڈ سالویشن آرمی"کے نام سے عیسائیوں کی دہشتگرد تنظیم موجود ہے۔سری لنکا میں تامل ٹائیگرز کے نام سے دہشتگرد تنظیم جو اس خطے میں خودکش حملوں میں کافی مشہور ہے،وہ ایک ہندو مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔پنجاب بجرنگ دل کے نام سے سکھوں کی تنظیم پائی جاتی ہے جو یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اب تک بھارتی سیکورٹی وفورسز نے تین لاکھ سے زائد بے گناہ سکھوں کو قتل کیا ہے جس کی بناء پر وہ اب بھارت سے الگ خالصتان بنانا چاہتی ہے جس کو بھارت نے دہشتگرد تنظیم قرار دے رکھا ہے لیکن ان میں سے کسی کو بھی ہندو دہشتگرد،عیسائی دہشتگرد یا سکھ دہشتگرد کہہ کر پکارنے یا سننے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا بلکہ ان کی دہشتگردی کو ان کی تنظیموں کے نام سے منسوب کیا جاتا رہا ہے تاہم کسی بھی جگہ ایک ناسمجھ مسلمان کی چھوٹی سی غلطی کو بھی اسلام سے منسوب کر دینا کہاں کا انصاف ہے۔فافھم وتدبر

عراق، لیبیا، افغانستان، فلسطین، لبنان اور کشمیر میں اب تک لاکھوں افراد قتل کر دیئے گئے ہیں اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ عراق پر امریکا اور اس کے اتحادیوں نے جو بہانہ بنا کر اس کو تاراج اور تین ملین سے زائد بے گناہ افراد کو شہید کر دیا گیا، اس بہانے کو سب سے پہلے خود امریکی جنرل نے اقوام متحدہ میں اس غلطی کو تسلیم کیا، بعد ازاں ٹونی بلیئر نے میڈیا پر آ کر اس غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے معافی مانگی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا اس معافی کی تلافی ممکن ہے؟ عراق جیسے قدیم ملک کی تہذیب کو نابود کر دیا گیا، تیس لاکھ افراد کو بمباری کی بارش نے تہس نہس کر دیا، خاندان اجڑ گئے، کاروبار و تجارت کا نام و نشان نہیں بچا۔ کیا کسی عالمی ادارے نے امریکا اور برطانیہ کے ان جنگجو رہنماؤں کے خلاف کسی جنگی عدالت میں مقدمہ چلانے کی قرارداد منظور کی؟ اگر یہی ظلم کسی مسلمان ملک یا مسلم رہنماء سے سرزد ہوتا تو کیا اس کو بھی اسی طرح ہلکے پیٹ برداشت کر لیا جاتا؟ سزا دینا تو درکنار ان ظالم درندوں کو مجرم تک قرار نہیں دیا گیا۔

افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف امریکا سمیت تمام مغرب انہی افغان لڑنے والوں کو مجاہدین کے نام سے پکارتا تھا اور ہر قسم کے جنگی اسلحے سے روس کے خلاف امداد فراہم کرتا رہا لیکن آج یہی کام امریکا کے خلاف جاری ہے اور ایک اطلاع کے مطابق امریکا نے روس سے کہیں زیادہ خوفناک بمباری میں منی ایٹم بم کے ساتھ ساتھ فاسفورس بم استعمال کر کے پانچ ملین افغانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ہنوز یہ سلسلہ اب غزہ میں جاری ہے لیکن منافقت کا یہ عالم ہے کہ اپنے اس دہرے کردار پر شرمندہ ہونے اور اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے انہی مجاہدوں کو دہشتگرد قرار دے دیا گیا۔ یہی معاملہ فلسطین میں جاری و ساری ہے جہاں اسرائیل جیسا ظالم درندہ صفت پچھلی 6 دہائیوں سے نہ صرف ان کی سرزمین پر ناجائز قابض ہے بلکہ ہر آئے دن ان مظلوم فلسطینیوں کو گاجر مولی طرح کاٹ رہا ہے لیکن امریکا اعلانیہ اس کی پشت پناہی پر نہ صرف کھڑا ہے بلکہ اقوام متحدہ کی منظور قراردادوں کو پس پشت ڈال کر اپنا سفارت خانہ یروشلم میں منتقل کر کے اس نے دنیا کو کیا پیغام دیا ہے؟ کیا ٹرمپ کے اس غیر قانونی اقدامات کو اقوام عالم میں کسی نے چیلنج کیا؟ یکطرفہ طور پر ایران کے ساتھ کئے گئے جوہری معاہدے کے پرزے اڑا دیئے گئے اور اس پر مستزاد دنیا بھر کے ان تمام ملکوں کو دھمکا کر ایران کو دنیا میں تنہا کرنے کی پالیسی پر عملدرآمد کرانے پر سرگرم ہے جو ایران کے ساتھ کھڑے ہیں۔

بھارت بھی خطے میں امریکا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے طاقت کے بل بوتے پر اپنے تمام ہمسایہ ممالک پر اپنا ایجنڈا مسلط کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ اقوام متحدہ کی تمام قراردادوں کے پرخچے اڑاتے ہوئے اب تک کشمیریوں کو حق خودارادیت دینے کی بجائے ایک لاکھ سے زائد کشمیریوں کو شہید کر چکا ہے۔ جانوروں کو شکار کرنے والی ممنوعہ پیلٹ گن کا بے دریغ استعمال کر کے سینکڑوں کشمیریوں کو بصارت سے محروم کر چکا ہے۔ کیا اقوام متحدہ یا کسی بھی مغربی ملک نے بھارت کو دہشتگرد ملک قرار دینے کے بارے میں سوچا بھی ہے؟ اگر یہی عمل پاکستان یا کسی اور مسلمان ملک میں رونما ہوتا تو کیا امریکا اور مغربی ممالک کی لونڈی اقوام متحدہ اب تک خاموش تماشائی رہتی؟ لیکن اگر کہیں بدقسمتی سے کچھ مسلمان دہشت گردی میں ملوث پائے جاتے ہیں تو معدودے چند مسلمانوں کی وجہ سے ان کے دین کی تعلیمات سے انکار کرنا انتہائی پرلے درجے کی بیوقوفی اور حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ ایک شخص کو گاڑی چلانا نہیں آتی اور وہ کسی اعلیٰ کمپنی کا بہترین اور نئے گاڑی میں بیٹھ کر کسی کھمبے میں جا مارتا ہے اور بعد میں اس کمپنی کو موردِ الزام ٹھہرائے کہ اس نے گاڑی ٹھیک نہیں بنائی تو کیا ہم اس اناڑی ناہنجار شخص کی بات پر یقین کرنے کیلئے تیار ہوں گے؟ کوئی احمق ہی ہو گا جو اس کی بودی دلیل پر قہقہہ نہ لگائے کیونکہ کھمبے سے گاڑی کا جا ٹکرانا گاڑی کی نہیں بلکہ چلانے والے کی ناسمجھی اور کم علمی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان دہشت گردی اور انتہاء پسندی کے واقعات میں ملوث پایا جائے تو اس کی وجہ اسلام کی تعلیمات نہیں بلکہ اس مسلمان کا اسلام سے لاعلمی کا نتیجہ

ہے۔اس کے باوجود مذہب کے تناظر میں درندگی، سفاکی، بربریت اورانسانوں پر ہونے والے مظالم اورزیادتیوں کا جائزہ لیا جائے تب بھی دیگر ناانصافیوں اورانسانیت کا خون بہانے ے حوالے سے مسلمانوں کی تقصیرات ہیچ نظر آنے لگیں گی۔

جرمنی کے ایڈولف ہٹلر نے ساٹھ لاکھ لوگوں کا قتل عام کیا جو ایک عیسائی تھا۔دوسری عالمی جنگ جو جرمنی، اٹلی، فرانس، برطانیہ، جاپان، آسٹریلیا، کینیڈا ،نیوزی لینڈ، انڈیا، سوویت یونین، چائنا اورامریکا کے مابین لڑی گئی، اس جنگ میں تمام ملکوں کی افواج کے ہاتھوں ہلاکتوں کی تعداد کم از کم پانچ کروڑ اور زیادہ سے زیادہ آٹھ کروڑ بتائی جاتی ہے، ان میں کوئی ایک بھی مسلمان ملک شامل نہیں۔سوویت یونین کے جوزف سٹالن نے دو کروڑ لوگوں کا خون بہایا جن میں ایک کروڑ چالیس لاکھ افراد کو بھوک اور پیاس سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔چائنا کے ماؤزے تنگ نے ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک کروڑ ساٹھ لوگوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔اس باب میں مسولینی نے بھی حصہ لیا اور چار لاکھ افراد کا قتل عام کیا۔ میکسی میلین نے انقلاب فرانس کے دوران چار لاکھ لوگوں کو قتل کیا، ان میں کوئی ایک بھی مسلمان نہیں بلکہ یہ تمام عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والے تھے۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اشوکا نے کلنگا کی جنگ میں ایک لاکھ افراد کو قتل کیا تھا جو ایک ہندو تھا۔اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ عراق کے صدام کے ذمہ بھی کئی ہزار لوگوں کا خون ہے اورانڈونیشیا کے محمد سوہارتو نے بھی تقریباً پانچ لاکھ لوگوں کو قتل کرنے کا اعزاز اپنے نام کیا ہے لیکن یہ تعداد باقی تمام جنگوں اور دہشتگردی کے واقعات جو غیر مسلموں کے ذریعے انجام پائے کے مقابلے میں کئی گنا کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

ان تاریخی حقائق سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ دہشتگردی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اوراسے کسی بھی مذہب کی تعلیمات سے جوڑنا قرین انصاف نہیں۔ہاں! ایک بات ضرور ہے اگر مستقبل قریب یا بعید میں دہشتگردی کیلئے کسی مذہب کا نیا نام کے انتخاب پر غور کیا جائے تو دہشتگردی کے مذہب کا نیا نام اسرائیل یا امریکا ہونا چاہئے اور دہشتگردوں کے کمانڈروں کے نام جارج واشنگٹن، جارج بش، ٹونی بلیئر، ٹرمپ، بائیڈن، نیتن یاہو اور مودی ہونے چاہئیں کیونکہ ان کی اپنی آکسفورڈ ڈکشنری کی تعریف کے مطابق یہ حضرات عالمی دہشتگرد قرار دیے جا چکے ہیں۔اس تناظر میں سب سے بڑے جھوٹے، مکار کہلائے جانے کے لائق یہ حضرات ہیں جو انسانیت اور مذہبی رواداری کا ڈھونگ رچا کر مساوات کا علم ہاتھ میں لیے ساری دنیا کو ویران کرنے چل پڑے ہیں۔

بروز ہفتہ 6 رمضان الکریم 1445ھ 16 مارچ 2024ء

اعتماد و اعتبار

مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ ہم پچھلی سات دہائیوں سے ایک ایسی شکستہ کشتی کے سوار ہیں جن کے پتوار ہمیشہ سے اناڑی ملاحوں کے ہاتھ میں رہے ہیں اور وہ کشتی کو کنارے پر لگانے کی بجائے خطرناک طوفانوں کے لرزہ خیز بھنور میں پھنسا کر خود راہِ فرار اختیار کر لیتے ہیں اور مسافر (قوم) ان دھوکہ بازوں سے جاں بخشی کیلئے سجدوں میں مناجات میں تو مصروف رہتی ہے لیکن آگے بڑھ کر ان کے ہاتھوں سے پتوار چھین کر اس کشتی کا رخ کنارے کی طرف موڑنے کی کوئی کوشش نہیں کرتی۔ ان حالات میں بڑے سوز و گداز اور چیخ و پکار کے ساتھ پچھلی کئی دہائیوں سے ہر روز اپنے کالمز میں پوری قوت کے ساتھ ڈھول پیٹ کر سوئی ہوئی قوم کو جگانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ یہ قوم سونے کی ایکٹنگ کر رہی ہے جس کو جگانے کیلئے اب اسرافیل کے صور کی ضرورت ہے۔

دو برس قبل لندن میں عالمی مالیاتی اداروں کی طرف سے تیسری دنیا کے ذمے بے تحاشہ واجب الادا قرضوں کی ادائیگی کی مشکلات کے بارے میں ایک سیمینار منعقد کیا گیا جس میں تیسری دنیا کے 29 ممالک اور ترقی پذیر ملکوں کے پانچ ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی، مجھے انتہائی دکھ کے ساتھ یہ بتانا پڑ رہا ہے کہ اس اجلاس میں ہمارے مقتدر حلقوں کی لاپرواہی کا یہ عالم تھا کہ کوئی ایک بھی نمائندہ اس میں شامل نہیں ہوا۔ اس اجلاس کا لب لباب ایک فقرے میں بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے خود آئی ایم ایف کے نمائندے نے شکائتی انداز میں یہ کہا کہ آپ کی حکومت کو کس نے روکا ہے کہ وہ اس معاہدے کو قوم کے سامنے لے آئے جس پر عمران خان کی حکومت نے جن شرائط پر دستخط کئے تھے لیکن اپنی حکومت کو خطرے میں دیکھ کر اس نے اس معاہدے کے پرزے کر دیئے۔ آپ اگر تحریری معاہدوں کا یہ حال کرتے ہیں تو پھر ہم آپ پر دوبارہ اعتماد کیوں کریں۔ پاکستان کوئی عام ملک نہیں بلکہ ایک نیوکلیئر طاقت کا حامل ملک ہے اور کیا دیوالیہ ہونے کی صورت میں عالمی پابندیوں کا بوجھ اٹھا سکے گا جبکہ آپ کے ملک کے پچاس فیصد اثاثے تو ہمارے ہاں گروی پڑے ہوئے ہیں۔ آپ ہماری ویب سائٹ پر جا کر ان تمام معاہدوں کی تفصیلات کیوں نہیں پڑھتے جہاں ہم نے ان تمام شرائط پر حکمرانوں کے دستخط شائع کر رکھے ہیں۔ یقین کریں کہ اس کی یہ گفتگو سن کر مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور میں اب تک ندامت کے بحر قلزم میں غوطے کھا رہا ہوں۔ خدارا، اب بھی وقت ہے کہ چہرے نہیں، نظام بدلیں۔ نئے اور پرانے پاکستان کے نعرے لگانے والے چہروں نے ہمیں برباد کر کے رکھ دیا ہے اور اب ایک مرتبہ پھر ڈوبتی کشتی کے پتوار انہی کے ہاتھوں میں تھما دیئے ہیں۔

جب بھی کوئی سرکار گڈ لائف کے پنجرے کی اسیر ہوئی، اس کے نتیجے میں خلقت صرف حقیر ہوئی۔ عوام کے سامنے اپنے تمام عیوب، ناکامیاں گزشتہ حکومت پر ڈال کر جان نہیں چھڑائی جا سکتی۔ صرف ماضی کے ہی تذکرے نہ کریں، عوام کے علم میں سب کچھ ہے، اب باتوں کی بجائے عمل کر کے دکھائیں، عوام کو دیئے گئے ریلیف سے ہی ان کے گریف ختم ہوں گے۔ انسان کے جذبات ناقابل تسخیر ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی تو سوچیں کہ ان کے درد کے فاصلوں کو کیسے کم کرنا ہے۔ فاصلے تو ایک ہی جسم میں دل و دماغ کے درمیان دشمنی لگا دیتے ہیں۔ ایسے میں دل اپنا نہ دماغ حالانکہ ان کی ورکنگ ریلیشن شپ سے ہی قدم آگے بڑھتے ہیں۔ اب اس بیمار سوچ کو ذہن سے کھرچ کر نکالنا ہو گا کہ ان دونوں کی لڑائی میں ہمارا فائدہ ہے۔ سیلاب اور زلزلہ لوگ جھونپڑی اور محلات میں کوئی لحاظ نہیں رکھتا۔ سرکار کا دعوی ہے کہ ہم نے ملک کو دیوالیہ سے بچا لیا ہے۔ اگر یہ واقعی پاکستان پہلے سے بہتر ہو گیا ہے، تو تب مانیں گے۔

تمہیں ملنے سے بہتر ہو گیا ہوں
میں صحرا تھا سمندر ہو گیا ہوں

صحرا میں سراب بھی کسی خوبصورت خواب سے کم نہیں دکھائی دیتا جس کی مرہون منت آنکھیں امید سے ""تربتر "رہتی ہیں۔ امید کسی حال میں بھی نہیں ٹوٹنی چاہئے بصورت دیگر انجام اس عمارت کی طرح کا ہوتا ہے جو لمحوں میں مسمار ہو جاتی ہے۔ امید کو بارود کے ساتھ ساتھ "نمرود" سے بھی بچانا ہوتا ہے کیونکہ یہ زندگی کی سب سے واضح علامت ہوتی ہے۔ یہ وہ سورج ہے جو رات کو بھی روشن رکھتا ہے۔ امید ٹوٹ گئی تو سمجھو کہ قسمت ہی پھوٹ گئی۔ اب میڈیا پر اس طرح فتح کے ڈونگرے برسائے جا رہے ہیں جیسا کہ جلد ہی شہد اور دودھ کی نہریں بہنا شروع ہو جائیں گی لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سننے کو مل رہا ہے کہ ملکی معیشت کے لئے سخت فیصلے کرنے پڑے اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ صرف چہرے ہی بدلے ہیں۔ اپنے ہیں۔ اوپر تبدیلی آگئی ہے مگر نیچے اسی طرح کے سخت فیصلے ہوں گے ؟ گستاخی معاف! اداروں کی توقیر کا خیال نہ کیا تو کل کلاں خود بھی بے آبرو ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔

جب کبھی اسلامی معیشت کا نام لیا جائے تو چاروں طرف سے خود ساختہ معاشی ماہرین کی طرف سے غریبوں کی فلاح و بہبود کیلئے سیون اسٹار ہوٹلز میں پھولوں سے سجی میزوں پر منرل واٹر اور قیمتی کھانوں کے بے تحاشہ اخراجات کے بعد پروگرامز کی ایک لمبی فہرست ترتیب دی جاتی ہے جس میں ایسے پلان شامل کر دیئے جاتے ہیں جن سے اہل اقتدار کیلئے لوٹ مار کا ایک لامتناہی سلسلہ مستور ہوتا ہے جبکہ حقیقتاً اسلامی معیشت کا خلاصہ تین مختصر فقروں میں بیان کیا جا سکتا ہے اور اس پر اگر نیک نیتی سے عملدرآمد کیا جائے تو اس کے بہترین نتائج سے ملک و ملت کی تقدیر بدلی جا سکتی ہے۔

اسلامی معیشت کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ ملک کا سب سے بڑھیا آدمی معاشی اعتبار سے سب سے گھٹیا زندگی گزارے جیسے کہ خلفائے راشدین عملاً ایسا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں مدینہ منورہ میں مفلسین مساکین کی ایک فہرست تیار کی گئی اور ان کی درجہ بندی کی گئی۔ جب فہرست تیار ہو گئی تو سب سے پہلے نمبر پر جو نام آیا جو سب سے زیادہ مفلس تھا، وہ خود خلیفہ وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ عوام اپنے بڑوں کو دیکھ کر ان کے طرز زندگی کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان سے برابری کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ وہ اسی کو معیار بناتے ہیں جس سے عوام میں حرص اور لالچ بڑھتی ہے۔ پیسہ جمع کرنے کی ہوس بڑھتی ہے جس کے نتیجے میں حلال و حرام جائز ناجائز کی تمیز ختم ہو جاتی ہے اور معاشرے میں جھوٹ، فراڈ، رشوت، سود خوری، ذخیرہ اندوزی وغیرہ وغیرہ ساری مصیبتیں در آتی ہیں اور جب سب سے بڑھیا لوگ یعنی حکمران وغیرہ سب سے نیچے والا معیار زندگی اپنائیں گے تو پھر کسی بھی شخص غربت افلاس وغیرہ پر کوئی شرمندگی اور احساس محرومی نہیں ہوتا۔

دوسرا اصول اسلامی معیشت کا یہ ہے کہ دولت کو بالکل بھی کسی بھی طرح جمنے نہ دیا جائے کہ وہ کسی ایک جگہ پر جم کر رہ جائے بلکہ اس کو توڑتے رہیں تاکہ ملکی دولت پر چند اشخاص کا قبضہ نہ رہے۔ لہذا سب سے پہلے موجودہ بنک کے سودی نظام کو ختم کرنا ہو گا۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ لوگ بینکوں میں پڑا سارا پیسہ باہر نکال کر مارکیٹ میں لائیں گے کاروبار کریں گے، کارخانے لگائیں گے جس سے ایک تو بیروزگاری ختم ہو گی دوسری طرف مقابلے کی فضا قائم ہو گی جس سے ہر کوئی اپنی چیز بہتر سے بہتر اور سستی سے سستی بنانے کی کوشش کرے گا اور اس سے عالمی سطح پر ملکی پیداوار سب سے سستی بھی ہو گی اور معیاری بھی۔۔ یہ دو کام حکومت اور حکمران طبقہ کے کرنے کے ہیں۔

تیسرا اصول اسلامی معیشت کا یہ ہے کہ ضرورت سے زائد چیزیں پیسہ اپنے پاس نہ رکھا جائے بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس کی مخلوق پر خرچ کرتے رہیں، اپنے رشتہ داروں ماتحتوں نوکروں پڑوسیوں پر خرچ کریں جس کے نتیجے میں وہ بھی پورے اخلاص کے ساتھ آپ کے کام کاروبار میں مدد بھی کریں گے اور اس کے بڑھنے کی تمنا بھی کریں گے اور دعائیں بھی دیں گے۔ بجائے اس کے کہ وہ غربا اور مساکین سے آپ سے حسد کریں اور نقصان پہنچانے کی کوشش کریں، چوری کریں، ڈاکہ ڈالیں اور رہزنی کر کے نقصان پہنچائیں۔ بس یہی اسلامی معیشت ہے اور اس کیلئے ضروری ہے کہ آپ کا موجودہ نظام مکمل طور پر بدلا جائے۔ آج معاشی اور اقتصادی بدحالی اور سیاسی ابتری کی وجہ صرف سیاستدان ہی نہیں بلکہ ہم خود بھی ہیں جو ان کو بار بار آزمانے کے باوجود ان پر اعتبار کرتے ہیں۔

بروز بدھ 10 رمضان الکریم 1445ھ 20 مارچ 2024ء

وطن، کفن اور دفن

ایوان اقتدار میں سستانے والوں کو یہ خبر ہو کہ سیاست ٹھہرے ہوئے پانی کا نہیں بلکہ اس کی روانی کا نام ہے۔ اپنی عقل و فراست کے ساتھ اس کے بند مضبوط بنانے کی ضرورت ہے ورنہ اس روانی کو بند کرنے میں کسی قسم کی مروت کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا۔ اوپر کی سطح پر تبدیلیاں ہی تبدیلیاں اور نیچے ؟ کیا اب بھی وہی ہم اور وہی غم ہوں گے۔ چہرے بدلنے سے کبھی مقدر نہیں بدلتے۔ تبدیلی کا عمل جب تک نچلی سطح تک نہیں جائے گا، عوام کے بد انتظامی اور دیگر الزامات کے ذکر پر انہیں احساسات و جذبات اسی طرح سلگتے رہیں گے۔ مہنگائی، لوڈشیڈنگ اور آئے دن ایک دوسرے پر کرپشن، ڈرائیں اور دوڑائیں نہ، وہ تو پہلے ہی بہت ڈرے ہوئے اور تھکے ہوئے ہیں۔ حالات و واقعات نے انہیں اس قدر ٹچی بنا دیا ہے کہ سوئی کی آواز بھی انہیں کسی دھماکے سے کم نہیں لگتی۔

اس کیلئے موجودہ سرکار کو عوام کیلئے اللہ سے "کاروبار" کرنا ہو گا پھر کہیں جا کر ان کا بازار چلے گا۔ ان کی مسکراہٹ سے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ مسکراتے ہوئے چہروں کے دل بہت اداس ہوتے ہیں، ان کے تو خواب بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہوتے۔ ہر رات کو شب برات سمجھنے والوں کو یادوں کی بارات کا کیا پتہ، انہیں اس کا پہلے سے اندازہ ہو جائے تو وہ آنکھ بند کرنے سے ہی توبہ کر لیں۔ بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوتی ہیں مگر ان کے ضمیر سو رہے ہوتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند ہو جاتی ہیں مگر ان کی تعبیر جاگتی رہتی ہے۔ بہت سے خواتین و حضرات کو آنکھوں کی "چہل قدمی" کا بڑا شوق ہوتا ہے، انہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ آنکھیں بھٹک جائیں یا کہیں اٹک جائیں۔ اسی شوق چشم میں وہ بہت سے روگ بھی لگا جاتے ہیں۔ دوسروں کے گھروں میں "نظر اندازی" کرنے والوں کو اپنی چادر و چار دیواری کے اندر بھی دیکھنا چاہئے کہ اس تاک جھانک سے دل پر کیا گزرتی ہے۔ من کا ویسے بھی دھن سے کیا رشتہ ہے، اسی لئے کہتے ہیں کہ دل نہ بھریں، یہ بھر گیا تو بہت سے سیلاب جسم کو ڈبو دیں گے۔ سیاست میں یہی سیلاب سونامی بن جاتے ہیں۔

پیارے پاکستان میں بہت سے سیاستدان اقتدار کے بغیر نہیں رہ سکتے اور اسلام آباد ان کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہماری بربادی میں ان لوگوں کی آبادی کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ ارض وطن کی معاشی بدحالی اور سیاسی انتشار کا فائدہ اٹھاتے ہوئی بیرونی دباؤ کی وجہ سے استعمار سے جلد دوستی کی بیماری اب وبا کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ جب تک ان اقتدار کے بھوکوں کا علاج نہیں ہو گا، اس کیلئے چاہے جتنے مرضی الفاظ جمع کر لیں، "کاغذ کورا" ہی رہے گا۔ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ محبت صرف ایک بار ہوتی ہے اور اس کے بعد سمجھوتے ہی چلتے ہیں، جب تک جان ہے، جہان داری تو نبھانی ہی پڑے گی، جس میں ہار جیت چلتی رہتی ہے۔ جیتنے والوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ قوم دکھوں سے ہار رہی ہے اور آپ مخالفین کو قابو کرنے کی تعریفیں سن کر نہال ہو رہے ہیں۔ رمضان الکریم کے مہینے میں بھی بھوک کے ہاتھوں دلبرداشتہ ماں اپنے معصوم بچوں سمیت خود کو ٹرین سے کٹوا کر ہمارے سسٹم کو کاٹ کر رکھ دے وہاں ان زندہ مردم خور گدھوں کا حساب کون لے گا؟

یہ ذہن نشیں رہے کہ وردی والے چوکیدار نہیں بلکہ یہ میرے اور آپ کی طرح اس ملک کے بیٹے اور مالک ہیں۔ ان کو تنخواہ یہ ملک جو ہم سب کا باپ ہے ، دیتا ہے، کوئی فصلی نسلی سیاستدان نہیں۔ ہم اپنے گھروں میں سکون کی نیند سو رہے ہوتے ہیں تو یہ ہماری سلامتی کو یقینی بنانے اور ہمارے کل پر اپنا آج

قربان کر رہے ہوتے ہیں۔ شمالی وزیرستان کے علاقے میر علی میں لیفٹیننٹ کرنل کاشف اور پانچ بہنوں کا اکلوتا نوجوان بھائی، کیپٹن احمد بدر سمیت سات جوان شہید ہو گئے۔ سوال یہ ہے کہ ہم کتنی دیر اور اپنے جوان لاشے اٹھائیں گے اور ان کی کھلے عام تضحیک برداشت کریں گے ؟؟

جس آئی ایس آئی کا کوئی ایجنٹ آج تک پکڑا نہیں گیا۔ جس آئی ایس آئی نے سویت یونین کے بارہ ٹکڑے کر کے دریائے آمو کے اس پار پھینک دیا۔ جس آئی ایس آئی کے متعلق بھارتی سابق آرمی چیف بپن راوت اعتراف کر چکا کہ وزیر اعظم، آرمی چیف، سکریٹری دفاع ٹاپ سکریٹ میٹنگ سے فارغ ہو کر باہر آتے، تب تک اندر کی باتیں سرحد پار پہنچ چکی تھیں۔ جس آئی ایس آئی سے متعلق پینٹاگون کے ترجمان کرنل ڈیوڈ لیپن نے کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ افغانستان میں ہمیں مارنے والا بہت چالاک اور شاطر ہے۔

جس آئی ایس آئی نے را، موساد، سی آئی اے وغیرہ کے کئی مشترکہ مشن ناکام کر ڈالے، جس آئی ایس آئی نے افغانستان میں "راما اور را" کی حفاظت میں بیٹھے اسلم اچھو، تاجو مری، رحیم مری جیسے دہشت گردوں کو دبوچ لیا۔ جس آئی ایس آئی نے ایرانی سرکاری وردی میں ملبوس مشہور بلوچ دہشت گردوں کو واصل جہنم کر دیا۔ جس آئی ایس آئی نے نیپال کھٹمنڈو سے لیکر بھوپال، چندی گڑھ، جے پور، بنگلور، پونہ، چنائی سے شارجہ دبئی تک بھارتی خفیہ ایجنسی کے جاسوسوں کو دھول چٹائی۔ جس آئی ایس آئی نے خفیہ ایجنسیوں کی تاریخ میں سب سے بڑے رینک کے آفیسر کرنل کلبھوشن یادیو کو دبوچنے سے لیکر رویندرا کوشک، ونود سانھی، گربخش رام، رام راج، سربجیت سنگھ تک درجنوں خطرناک جاسوسوں کو دبوچ لیا۔ حیرت ہے وہ آئی ایس آئی حامد میر کو گولیاں مارتی ہے اور نشانہ خطا جاتا ہے اور حامد میر بچ جاتا ہے۔

مجھے سابقہ آرمی چیف سے بھلے درجنوں شدید ترین اختلافات ہیں لیکن اسی باجوہ نے اسلام آباد میں صحافیوں سے خصوصی ملاقات میں ایک سوال کے جواب میں حامد میر کو مخاطب کر کے سوال کیا کہ "آپ کو جس پر شک ہے، آپ اس کے خلاف ایف آئی آر کیوں درج نہیں کرواتے، ظہیر الاسلام پر شک ہے تو وہ اب ریٹائرڈ ہو چکے ہیں، ان کے خلاف رپورٹ کیوں نہیں کرتے۔ حامد میر تم یہ کیوں نہیں بتاتے کہ تم پر قاتلانہ حملہ جس نے کروایا وہ بلوچستان کے اختر مینگل کے چھوٹے بھائی جاوید مینگل کا بیٹا نورالدین مینگل ہے۔"

نورالدین مینگل کو انڈیا نے پاکستان کے خلاف پراپیگنڈہ کیلئے ڈبلیو ئن نیوز چینل کی طرف سے کوورتیج دی ہے کیونکہ یہ لوگ وہی زبان بولتے ہیں جو انڈیا کی زبان ہے اور وہی کام کرتے ہیں جو انڈیا ان سے پیسہ دے کر کروانا چاہتا ہے۔ قوم کو معلوم ہونا چاہئے کہ اختر مینگل اتنے نفرت آمیز لہجہ میں تقاریر کیوں کرتا ہے اور اس پراپیگنڈے کو بڑھانے کیلئے اپنے سیاسی عہدے کا استعمال کیوں کرتا ہے۔ اختر مینگل کبھی اس کے خلاف بھی بولا جنہوں نے سیکورٹی فورسز کے اہلکاروں اور بلوچ شہریوں کی جانیں لی ہیں، ہے ہمت ؟ نہیں، کبھی نہیں بولے گا کہ اس شخص کا مقصد آئین کا نام لے لے کر انتشار پھیلانا اور اپنے بیرونی آقاؤں کو خوش کرنا ہے۔ محب وطن بلوچ سمجھ چکے ہیں کہ یہ پاکستان کے نام پر دھبہ ہیں۔ یہ ملکی سلامتی کے ذمہ دار اداروں پر قومی اسمبلی میں منہ کھولتے ہیں اور پھر آزادی نہ ہونے کا رونا بھی روتے ہیں۔ آزادی اس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ اس سب کے باوجود یہ سب کھلے پھر رہے ہیں دوسری طرف اختر مینگل کا بھتیجا لشکر بلوچستان کے نام سے کی جانے والی کارروائیوں میں سیکورٹی فورسز کے جوانوں اور معصوم بچوں کی جان لے رہا ہے ۔ آخر حامد میر کس کے اشارے پر ان کو اپنے پروگرامز میں بلا کر سیکورٹی اداروں پر کھلے عام تنقید کرواتا ہے۔ کیا آئی ایس آئی اس قدر بے خبر ہے اور اس قدر ناتجربہ کار ہے کہ اس کے بندے صحیح طریقے سے ٹارگٹ کو شوٹ بھی نہیں کر سکتے۔ یہ کیسی آئی ایس آئی ہے جو اسد طور نامی ٹوٹل ایک تھپڑ کی

اوقات کے بندے کے گھر میں گھس کر صرف کہنی میں کہنی مار کر بھاگ جاتی ہے۔ وہ آئی ایس آئی شہباز گل، مبشر زیدی، گل بخاری، وقاص گورائیہ کو مارنا چاہتی تھی لیکن یہ لوگ آئی ایس آئی کو سوتا چھوڑ کر امریکا و یورپ بھاگ گئے۔

اس ملک کی سرحد کو کوئی چھو نہیں سکتا
جس ملک کی سرحد کی نگہبان ہیں آنکھیں

یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے جس کا خمیازہ پورا ملک اور قوم بھگت رہی ہے کہ ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت اپنے من پسند فرد کو قوم کا مسیحا اور اقتدار میں لانے کیلئے ہزاروں افراد کو سوشل میڈیا میں تربیت دیکر پروپیگنڈہ کا مکروہ جال بچھایا گیا، جس کیلئے تمام ملکی وسائل اور اداروں کو بلا جھجھک اپنی اس ناجائز پالیسی کی حمائت کیلئے جھونک دیا گیا اور اس وقت اس بات کو مکمل نظر انداز کر دیا گیا کہ کل کلاں یہی زہر میں ڈوبا ہوا خنجر انہی کی پشت میں گھونپنے کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ یقیناً اس گھناؤنی سازش کے ذمہ داروں کے خلاف کھلی عدالت میں مقدمہ چلانے کی شدید ضرورت ہے۔ آج یہی افراد جن کے منہ کو دشمنوں کے راتب کا نشہ لگ چکا ہے، وہی ملک اور بیرونِ ملک میں بیٹھے یہاں کی نوجوان نسل کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور ملک کے سب سے اہم ادارے کے خلاف زہر اگلنا اب ایک فیشن اختیار کر چکا ہے۔

کیا آپ نہیں سمجھتے کہ جب عدلیہ اپنی آئینی ذمہ داری یعنی انصاف سے پہلو تہی فرما کر سیاست میں دخل اندازی کر سکتی ہے تو فوج جس کا کام ہی ملکی سلامتی ہے کس طرح سے اندرونی اور بیرونی ملک دشمن عناصر سے لاتعلق رہ سکتی ہے؟ جب اسرائیل، بھارت اور امریکا کی خفیہ ایجنسیز پاکستان کے سیاستدانوں کو خرید سکتی ہیں، الیکشن میں پیسہ لگا سکتی ہیں، تو پھر آئی ایس آئی کا کیا کردار ہونا چاہئے؟ جس دن پاکستان کے سیاستدان، پاکستان سے غداری ترک کر دیں گے، را اور سی آئی اے کی مدد سے الیکشن میں دھاندلی بند کر دیں گے، تسلی رکھیں، اس دن سے فوج اور آئی ایس آئی بھی سیاست میں ان کی راہ روکنا بند کر دے گی۔ تب تک کیلئے اپنے منہ بند رکھیں۔

جن کو آئی ایس آئی کی سیاست میں دخل دینے پر اعتراض ہے، وہ پہلے ان سیاستدانوں کو پٹہ ڈالیں کہ جو "موساد، را اور سی آئی اے کے کہنے پر ملک و قوم سے غداری کے مرتکب ہوتے ہیں۔ میمو گیٹ، زرداری، نواز شریف، الطاف حسین، اسفندیار، اچکزئی اور سب سے بڑھ کر 9 مئی جیسی بدترین سازش کے مرتکبین کے راء اور سی آئی اے سے رابطے حلال ہیں کیا۔۔۔؟؟؟ اب ایک طرف آئی ایم ایف ملک میں مذاکرات کیلئے پہنچا ہوا ہے لیکن اس سے قبل ہی ان اداروں بشمول یورپی یونین کو خطوط لکھنے کی جرات تو یہود و ہنود کو نہیں ہوئی بلکہ وہ تو خوش ہیں کہ ان کا کام یہاں ایک جماعت کر رہی ہے۔
اچھی طرح سمجھ لیں کہ آئی ایس آئی "مار خور" ہے یعنی آستین کے سانپوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پکڑنا اور ہلاک کرنا، اس کی ڈیوٹی ہے، چاہے یہ سانپ ٹی ٹی پی کے ہوں، ایم کیو ایم میں، یا پھر دوسری جماعتوں میں یا میڈیا میں۔ 1971ء میں راء مکمل طور پر پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کو خرید چکی تھی۔ شیخ مجیب الرحمن کی غداری اگر تلہ سازش کیس میں سالوں پہلے پکڑی جا چکی تھی۔ جب غداروں کو پھانسیاں دینے کے بجائے الیکشن میں جتوایا جائے، تو پھر "سقوط ڈھاکہ" ہی ہوتے ہیں۔

امریکا میں الیکشن سی آئی اے کی مرضی کے بغیر نہیں جیتا جا سکتا، روس میں کے جی بی حکومت بناتی ہے، برطانیہ میں ایم آئی فائیو اور ایم آئی سکس کی طاقت کا کس کو نہیں پتا، انڈیا میں را کی مرضی کے بغیر کوئی سیاستدان بیان تک نہیں دے سکتا لیکن اگر ایسا آئی ایس آئی کرے تو سب منہ پھاڑ کر گالیاں دیتے ہیں۔ آخر کیوں؟ فرق یہ کہ ان ممالک میں اتنی اجازت نہیں کے فوج اور ایجنسیز پر تنقید کر سکیں، جیل بھیج دیا جاتا ہے، سکینڈل بنا دیا جاتا ہے،

کیریئر ختم کروادیا جاتا ہے، ایکسیڈنٹ میں مروادیا جاتا ہے لیکن یہ سہولت بھی ہماری فوج اور آئی ایس آئی نے دی ہوئی ہے ہمارے ملک میں سب کو کہ جی بھر کر تنقید کرو، گالیاں دو دفاعی اداروں کو۔

امریکا میں حال ہی میں ریٹائرسی آئی اے ڈائریکٹر کو امریکا کا سیکرٹری آف اسٹیٹ بنایا گیا ہے، اسرائیلی فوج کے کافی لوگ سیاست میں ہیں، گورنمنٹ میں، کہیں پر شور سنا کے ایسا کیوں؟ یہ قائدہ بہت اچھی طرح سمجھ لیں۔ فوج اور آئی ایس آئی صرف اس وقت سیاست اور الیکشن میں دخل نہیں دیں گے کہ جب تک غیر ملکی دشمن خفیہ ایجنسیاں بھی دخل نہ دیں۔ جب سیاستدان غدار ہوں، تو محب وطن "مارخور" کو مجبوراً سیاسی بساط میں بھی دشمنوں کو شکست دینی پڑتی ہے۔ یادرکھیں ہم سب پاکستانی، پاکستان آرمی ہیں، ہم سب آئی ایس آئی ہیں۔

پاکستان میں دہشتگردی، کبھی فرقہ وارانہ دہشتگردی کی زیادہ تر کارروائیوں میں کالعدم تحریک طالبان پاکستان (ٹی ٹی پی) اور بلوچ علیحدگی پسند ملوث ہیں۔ ان سب کے پیچھے ایک ہی ہاتھ ہے اور وہ ہے ٹرائیکا (امریکا، اسرائیل اور بھارت)۔ دوسری جانب پینٹاگون خود اعتراف کرچکا ہے کہ امریکا نے افغان فوج کو مجموعی طور پر 4 لاکھ 27 ہزار 300 جنگی ہتھیار فراہم کئے، اور امریکی فوج کے انخلا کے وقت مزید 3 لاکھ ہتھیار افغانستان میں ہی باقی رہ گئے۔ سوال یہ ہے کہ ٹی ٹی پی کے دہشتگرد پاکستان میں دہشتگردی کی کاروائیوں میں یہی اسلحہ استعمال کررہی ہے جس کے ثبوت ایک پھر سامنے آرہے ہیں۔ اب بھی افغانستان میں ٹی ٹی پی کے 5 سے 6 ہزار دہشتگرد سرگرم ہیں جن کو بھارت فنڈنگ کررہا ہے۔ ان کی فیملیز کو کاؤنٹ کیا جائے تو یہ تعداد 70 ہزار ہے۔ ان سب کی کفالت افغانستان میں نئی وجود میں آنے والی عبوری طالبان حکومت نہیں کرسکتی۔ اتنے زیادہ اخراجات ٹرائیکا پاکستان میں دہشتگردی کیلئے اٹھاتا ہے جس کی تصدیق گزشتہ دنوں کالعدم بلوچ نیشنل آرمی کے ایک علیحدگی پسند لیڈر سرفراز بنگلزئی نے ہتھیار ڈالتے ہوئے قومی میڈیا کے سامنے اعتراف کیا کہ بھارت علیحدگی پسندوں کو فنڈنگ کرتا ہے۔

پاکستان کی طرف سے کئی مرتبہ بھارت کے پاکستان میں دہشتگردی میں ملوث ہونے کے ثبوت اقوام متحدہ اور امریکا سمیت دنیا کے بڑے بڑے فورمز پر رکھے گئے مگر کہیں سے بھی سنجیدہ اور ٹھوس نوٹس نہیں لیا گیا۔ کیا اقوام عالم یہ سوچ رہی ہیں کہ پاکستان بھارت کو اسی کی زبان میں جواب دے؟ دہشتگرد جہاں سے بھی آتے ہیں ان کے پیچھے جو بھی ہے ان دہشتگردوں کو پاکستان کے اندر موجود سہولت کاروں کی خدمات بھی میسر رہتی ہیں۔ ان سہولت کاروں سے آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے تو دہشتگردی میں کمی آسکتی ہے۔ دہشتگردی کے مکمل خاتمے کیلئے قومی اتفاق رائے ضروری ہے۔ ماضی میں نیشنل ایکشن پلان بنایا گیا تھا۔ اس پر بھی اس کی روح کے مطابق عمل اور جدید تقاضوں کے تحت اس میں تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے۔

ایک کہاوت ہے کہ جہاز بندرگاہ میں زیادہ محفوظ رہتے ہیں مگر جہاز اس لئے نہیں بنائے گئے کہ وہ بندرگاہ میں کھڑے رہیں۔ انسان اگر اپنے ٹھکانے پر بیٹھا رہے، وہ نہ سفر کرے، نہ کوئی کام شروع کرے، نہ کسی سے معاملہ کرے، تو ایسا آدمی بظاہر محفوظ اور پرسکون ہی ہوگا مگر انسان کو پیدا کرنے والے نے اس لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ پرسکون طور پر ایک جگہ رہے اور پھر وہ قبر میں چلا جائے۔ انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ کام کرے، وہ دنیا میں ایک زندگی کی تعمیر کرے، اس مقصد کیلئے اس کو دنیا کے ہنگاموں میں داخل ہونا پڑے گا۔ وہ ہارنے اور جیتنے کے تجربات اٹھائے گا۔ اس کو کبھی نقصان ہوگا اور کبھی فائدہ

۔اس قسم کے واقعات کا پیش آنا عین فطری ہے، اور ایسے واقعات و حوادث کا اندیشہ ہونے کے باوجود انسان کیلئے یہ مطلوب ہے کہ وہ زندگی کے سمندر میں داخل ہو اور اپنی جدوجہد میں کمی نہ کرے۔

مزید یہ کہ پرسکوں زندگی کوئی مطلوب زندگی نہیں کیونکہ جو آدمی مستقل طور پر سکون کی حالت میں ہو اس کا ارتقاء رک جائے گا۔ ایسے آدمی کے امکانات بیدار نہیں ہوں گے۔ ایسے آدمی کی فطرت میں چھپے ہوئے خزانے باہر آنے کا موقع نہ پا سکیں گے۔ اس کے برعکس ایک آدمی جب زندگی کے طوفان میں داخل ہوتا ہے تو اس کی چھپی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ وہ معمولی انسان سے اوپر اٹھ کر غیر معمولی انسان بن جاتا ہے۔ پہلے اگر وہ چھوٹا سا بیج تھا تو اب وہ ایک عظیم الشان درخت بن جاتا ہے۔ زندگی جدوجہد کا نام ہے، زندگی یہ ہے کہ آدمی مقابلہ کر کے آگے بڑھے۔ زندگی وہ ہے جو سیلاب بن جائے نہ کہ وہ جو ساحل پر ٹھہری رہے۔

یاد رکھیں کہ شیر اور شارک دونوں پیشہ ور شکاری ہیں لیکن شیر سمندر میں شکار نہیں کر سکتا اور شارک خشکی پر شکار نہیں کر سکتی۔ شیر کو سمندر میں شکار نہ کر پانے کی وجہ سے ناکارہ نہیں کہا جا سکتا اور شارک کو جنگل میں شکار نہ کر پانے کی وجہ سے ناکارہ نہیں کہا جا سکتا۔ دونوں کی اپنی اپنی حدود ہیں جہاں وہ بہترین ہیں۔ اگر گلاب کی خوشبو ٹماٹر سے اچھی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے کھانا تیار کرنے میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایک کا موازنہ دوسرے کے ساتھ نہ کریں۔ آپ کی اپنی ایک طاقت ہے اسے تلاش کریں اور اس کے مطابق خود کو تیار کریں۔ کبھی خود کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں بلکہ ہمیشہ خود سے اچھی اُمیدیں وابستہ رکھیں۔

یاد رکھیں ٹوٹا ہوا رنگین قلم بھی رنگ بھرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اپنے اختتام تک پہنچنے سے پہلے خود کو بہتر کاموں کے استعمال میں لے آئیں۔ وقت کا بدترین استعمال اسے خود کا دوسروں کے ساتھ موازنہ کرنے میں ضائع کرنا ہے۔ مویشی گھاس کھانے سے موٹے تازے ہو جاتے ہیں جبکہ یہی گھاس اگر درندے کھانے لگ جائیں تو وہ اس کی وجہ سے مر سکتے ہیں۔ کبھی بھی اپنا موازنہ دوسروں کے ساتھ نہ کریں اپنی دوڑ اپنی رفتار سے مکمل کریں۔ جو طریقہ کسی اور کی کامیابی کی وجہ بنا، ضروری نہیں کہ آپ کیلئے بھی سازگار ہو۔ کریم و رحیم رب کے عطاء کردہ تحفوں نعمتوں اور صلاحیتوں پر نظر رکھیں اور اُن تحفوں سے حسد کرنے سے باز رہیں جو اللہ نے دوسروں کو دیے ہیں۔

صاحب علم ہمیشہ اپنے طور طریقوں اور عادت و اطوار سے پہچانا جاتا ہے۔ جس طرح سورج کبھی یہ اعلان نہیں کرتا کہ وہ آسمان پر آ چکا ہے اسی طرح ایک صاحبِ علم اور حقیقت کا ادراک کرنے والا کبھی شور اور بے تکے پن سے اپنی شناخت نہیں چاہتا بلکہ اس کی گفتگو اور عمل اس کی شخصیت اور علم کی پہچان بن جاتے ہیں۔ نیک بونے کی احساس کمتری کا یہ عالم ہے کہ وہ ہمیشہ خود کو بڑا کر کے پیش کرتا ہے لیکن پست قامتی جسمانی ہو تو کوئی عیب نہیں لیکن عقلی ہو تو کبھی بھی روا نہیں رکھی جاتی۔ اس لیے وہ گدھا جو خود کو اونچی آواز کی بنا پر شیر سمجھنا شروع کر دے تو عین وقت پر خاموش شیر کو دیکھ کر اس کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔

یقیناً مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقتور ہے لیکن اسی عظیم یعنی رب کریم نے ہی اس عظیم مملکت خداداد کو معجزاتی طاقتوں سے نوازا ہے جس کی حفاظت کرنے والوں کو رب نے اس ڈیوٹی پر مامور کر رکھا ہے۔

وطن کی پاسبانی جان و ایماں سے بھی افضل ہے

میں اپنے ملک کی خاطر کفن بھی ساتھ رکھتا ہوں

بروز جمعرات 11 رمضان الکریم 1445ھ 21 مارچ 2024ء

رب کا انعام....پاکستان

علامہ اقبال کا کلام انسانی فکر و عمل کی تاریخ کا نہائت دقیق تجزیہ ہے۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی بصیرت کی بنا پر تاریخی حوادث سے متعدد دور س نتائج اخذ کئے، بعض وہ نتائج بھی جو ابھی رونما نہیں ہوئے تھے۔ ان کا یہ شعر مبنی بر حقیقت ہے:

حادثہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے

بر صغیر کے مسلمانوں کی تاریخ پر اقبال نے خصوصیت کے ساتھ توجہ دی، انہوں نے دیکھا کہ یہ وسیع و عریض خطہ مدت تک مسلمانوں کے فکر و عمل کی عظیم جولانگاہ بنا رہا اور انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ ایک عظیم الشان اسلامی معاشرہ تشکیل کیا جس کے برجستہ تمدنی نقوش ناقابل محو ہیں۔ مسلمان یہاں اگرچہ دوسری اقوام کی نسبت تعداد میں کم اور مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے لیکن عقیدہ توحید نے انہیں ہمیشہ اسلام کے رشتہ وحدت میں منسلک رکھا۔ متعدد مسلمان خاندانوں نے یہاں ایک ہزار سال تک حکومت کی، ان میں غزنوی، غوری، خلجی، تغلق، لودھی اور مغل خاندان زیادہ معروف ہیں۔ یہ حکومتیں اگرچہ مذکورہ خاندانوں کے نام سے منسوب تھیں لیکن چونکہ وہ اسلامی اصولوں کی اساس پر استوار کی گئیں اور اسلامی اقدار کی حفاظت اور نشر واشاعت کیلئے کوشاں رہیں، اس لئے انہیں اسلامی حکومتوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے حکمران مسلمان تھے اور دین اسلام کو اپنی حکومت کا تشخص اور طرہ امتیاز قرار دیتے تھے۔ وہ اپنی قائم کردہ عدالتوں میں اسلامی قوانین رائج کرتے، مدرسوں اور مساجد کی تاسیس کرتے اور ان میں اسلامی تعلیمات و روایات اور مسلمانوں کی زبان و ادب کو فروغ دیتے، اکثر سلاطینِ وقت صوفیا اور علما کی عزت و تکریم کرتے اور ان سے ہدایات حاصل کرتے، صوفیا ہمیشہ سلاطین کو رعایا کے ساتھ عدل و احسان کی تلقین فرماتے۔

محمد بن قاسم کے بعد محمود غزنوی نے مسلمانوں کیلئے ہندوستان کے دروازے کھول دیئے، محمود غزنوی نے دہلی کو مسلم حکومت کا دارلسلطنت قرار دیا۔ تمام مسلمان بادشاہوں اور حکمرانوں نے اپنی حکومت کی شناخت دین اسلام کو قرار دیا اور ہر ایک نے اپنے آپ کو دین کے مبلغ و محافظ اور اس کی عظمت کے مظاہر و موید کے طور پر ملقب کیا، اس حوالے سے اکثر سلاطین کے القاب قابل ملاحظہ ہوں مثلاً معزالدین غوری، قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، رکن الدین فیروز شاہ، غیاث الدین بلبن، علاؤالدین محمد شاہ، ظہیر الدین بابر، نصیر الدین ہمایوں، جلال الدین اکبر، نورالدین جہانگیر، شہاب الدین شاہجہان اور محی الدین اورنگزیب عالمگیر وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین تخت نشینی کے وقت یہ اصرار کرتے تھے کہ وہ دین سلام کے تحفظ اور ترویج میں ہمیشہ کوشاں رہیں گے۔ اگر کوئی بادشاہ دینی امور کی اشاعت میں کچھ کوتاہی کرتا تو صوفیا اور علما اسے متنبہ کرتے اور اس کی اصلاح کی بھرپور کوشش کرتے۔ صوفیا میں نظام الدین اولیائ، بہاالدین ذکریا، شرف الدین بو علی قلندر، جلال الدین بخاری، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ سلاطین وقت کو اسلامی احکام کی تعمیل کی تاکید فرماتے رہے۔

بر صغیر کی تاریخ سے متعلق جن عظیم حکمرانوں کو علامہ اقبال نے خراجِ تحسین ادا کیا ان میں محمود غزنوی، اورنگ زیب عالمگیر، احمد شاہ ابدالی اور ٹیپو سلطان خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ اشخاص ہیں جنہوں نے پرچم توحید کو ہمیشہ بلند رکھا اور باطل قوتوں سے نبرد آزما ہوئے۔ اٹھارویں صدی میں جب مسلمانوں کا عظیم الشان معاشرہ بادشاہوں اور امیروں کی اخلاقی بے راہروی کی بنا پر فتنہ و فساد اور انتشار کا شکار ہوا تو اقتدار انگریزوں کے ہاتھوں

میں چلا گیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی بیداری میں سر سید احمد خاں، شبلی نعمانی، مولانا حالی، اکبر الہ آبادی اور سب سے بڑھ کر علامہ اقبال نے نہائت اہم کردار ادا کیا۔ علامہ اقبال نے ہندو قوم کے تاریخی کردار اور اس کے عصری خطرناک عزائم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کے دین و مذہب، جان و مال اور تہذیب و تمدن کی حفاظت کیلئے اپنی فکری اور عملی توانائیاں وقف کر دیں، انہوں نے فرمایا:

"آئندہ نسلوں کی فکر کرنا ہمارا فرض ہے، ایسا نہ ہو کہ ان کی زندگی گونڈ اور بھیل اقوام کی طرح ہو جائے اور رفتہ رفتہ ان کا دین اور کلچر اس ملک میں فنا ہو جائے"۔ علامہ اقبال نے برصغیر میں مسلمانوں کیلئے ایک آزاد مملکت کا تصور ہزار سالہ اسلامی تمدن کی حفاظت اور بقا کیلئے پیش کیا، ان کے نزدیک مذہب قوت کے بغیر محض ایک فلسفہ ہے۔ انہوں نے فرمایا "اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام ایک تمدنی قوت کے طور پر زندہ رہے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کرے"۔

علامہ اقبال اسلام کے بغیر مسلمان کی زندگی کا تصور بھی نہیں کرتے تھے، وہ مسلمانوں کی آزادی کی حفاظت صرف نفاذِ اسلام کیلئے چاہتے تھے۔ انہوں نے فرمایا: "اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاست سے محض آزادی اور اقتصادی بہبود ہے اور حفاظتِ اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں جیسا کہ آج کے قوم پرستوں کے رویئے سے معلوم ہوتا ہے تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی بھی کامیاب نہ ہوں گے"۔ ہماری تاریخِ ادب میں علامہ اقبال آزادی وطن کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ اس حوالے سے ان کے ساز سخن کے نغمات حریت و استقلال ہیں لیکن وہ اسلام کے بغیر آزادی وطن کا تصور بھی نہ کرتے تھے۔ انہوں نے بڑے غیورانہ لہجے میں فرمایا:

"اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا دار لکفر ہے ایسا ہی رہے یا اس سے بھی بدترین ہو جائے تو مسلمان ایسی آزادی وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے"۔ علامہ اقبال نے برصغیر میں ایک آزاد اسلامی ریاست کی تشکیل کا مطالبہ محض اس لئے کیا تھا کہ شریعت اسلامی کا نفاذ ہو سکے تاکہ اس کے نتیجے میں ہر شخص کو معاش کی ضمانت مل سکے۔ اس بارے میں انہوں نے قائداعظم کے نام خط میں لکھا..... شریعت اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے لیکن کسی ایک آزاد اسلامی ریاست یا چند ایسی ریاستوں کی عدم موجودگی میں اسلامی شریعت اسلامیہ کا نفاذ اس ملک میں محال ہے۔

انہوں نے مسلمانوں پر واضح کیا کہ برصغیر میں مسلمانوں کی نجات کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ ہندوستانی قومیت کے تصور کو ترک کر کے اسلامی قومیت کو اپنی شناخت بنائیں کیونکہ اسلام ہی انہیں موجودہ تباہ کن حالات سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں پر اسلام کے احساناتِ عظیم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزوِ ترکیبی تھا جس سے مسلمانانِ ہند کی حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات و عواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے اور جن سے متفرق اور منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز اور معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے"۔

حکیم الامت کا سب سے بڑا کارنامہ جس کی بنیاد پر پاکستان قائم ہوا، یہ ہے کہ انہوں نے ہندی قومیت کے تصور کی مکمل نفی کی اور مسلمانوں میں اسلامی قومیت کا شعور پیدا کیا۔ اقبال جغرافیائی وطن پرستی کے سخت مخالف تھے کیونکہ یہ ان کے نزدیک وحدتِ ملی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ انہوں نے اسلام کو زندگی بخش قوت قرار دیتے ہوئے فرمایا: اسلام ایک زندہ قوت ہے جو ذہنِ انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے جس کا

عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی حیثیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے ۔اسلام بحیثیت مذہب کے دین وسیاست کا جامع ہے، یہاں تک کہ ایک پہلو سے دوسرا پہلو کا جدا کرنا حقائق اسلامیہ کا خون کرنا ہے۔

اقبال کیلئے اسلام ہی مسلمان کی زندگی ہے، کوئی مسلمان اسلام سے باہر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا۔ انہوں نے فرمایا: اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، جو نسبت انگلستان کو انگریزوں سے اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے، وہ اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ رسالتِ محمدیہ کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ہمارے عقیدے کے مطابق بحیثیت مذہب کے اللہ تعالی نے اسلام کو بذریعہ وحی نازل کیا لیکن ایک معاشرت یا ملت کے طور پر اسلام کا وجود کلیتاً رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکات کا رہینِ منت ہے۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادی سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

۱۹۱۹ء میں ایک خط میں لکھا: خدا کی راہ میں مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں نے کیا، لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا اس سے بڑھ کر ہونا چاہئے تھا اور زندگی تمام و مکمل نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بسر ہونی چاہئے تھی،،۔ اقبال اسلام کے ابدی حقائق پر محکم ایمان رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی اسلام کی تفسیر وتوضیح میں صرف کی تاکہ مسلمان عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق اس کی لامتناہی برکات سے مستفیذ ہوں۔ حضرت علامہ کے نزدیک اسلام ہی مسلمانوں کا بہترین مدافع اور محافظ ہے۔ اسلام مسلمانوں سے اپنے تحفظ کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ انہیں تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ مسلمانوں کے ملک وملت اور جان ومال کی حفاظت صرف اسلام سے وابستگی میں ہے۔ انہوں نے فرمایا:

"ایک سبق جو میں نے تاریخِ اسلام سے سیکھا ہے، یہ ہے کہ آڑے وقت میں اسلام ہی نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا، مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی،،۔ اس دین کی حقانیت اور اہمیت کے بارے میں رقمطراز ہیں:،، میری طلب وجستجو صرف اس بات پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصدِ وحید ذات پات، رتبہ ودرجہ، رنگ ونسل کے تمام امتیازات مٹا دینا ہے"۔

اسلام تمام نوعِ انسانی کے حقوق کا احترام کرتا ہے۔ اس دین میں اسود واحمر، عربی اور عجم اور بندہ وآقا کی تمیز کچھ حکم نہیں رکھتی۔ اقبال اس جاہلانہ تصور کو سختی سے مسترد کرتے ہیں کہ اسلام کو معاشرتی حیثیت سے نکال کر شخصی ضابطہ بنا دیا جائے۔ انہوں نے ۱۹۳۰ء کے تاریخی خطبے میں فرمایا: کیا آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم عجمی اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظامِ سیاست کے بجائے ان قومی نظامات

کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہ رہتا ہو..... اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نصب العین سے الگ نہیں، دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم وملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کو ترک کرنا بھی لازم آئے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کیلئے بھی ایسے نظامِ سیاست پر غور کرنے کیلئے آمادہ ہو گا جو کسی ایسے وطن یا قومی اصول پر مبنی ہو جو اسلام کے اصولی اتحاد کے منافی ہو۔

حضرتِ علامہ کے نزدیک اسلام ہی عالمِ انسانیت کیلئے فلاح اور امن کا دستور ہے، اسلام ایک سوشل نظام ہے جو حریت و مساوات کے ستونوں پر کھڑا ہے اور اس وقت احترامِ انسانی کیلئے سب سے بڑی نعمت ہے۔ اسلام کا مطالبہ وفاداری صرف خدا کیلئے ہے، تخت و تاج کیلئے نہیں اور چونکہ ذاتِ باری تعالیٰ تمام زندگی کی روحانی اساس ہے اس لئے اس کی اطاعت کا دراصل مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ہی فطرتِ صحیحہ کی اطاعت کرتا ہے۔

حضرتِ اقبال کے نزدیک "اسلام" ایک عالمگیر سلطنت کا یقیناً منتظر ہے جو نسلی امتیازات سے بالاتر ہو گی اور جس میں شخصی اور مطلق العنان بادشاہوں اور سرمایہ داروں کی کوئی گنجائش نہ ہو گی۔ حضرتِ علامہ نے مسلمانوں کے تاریک ترین ایام میں اپنی قوتِ ایمانی سے فرمایا: "دنیا میں کارفرما قوتیں اکثر اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں لیکن "**لیظہرہ علی الدین کلہ** " کے دعوی پر میرا ایمان ہے کہ انجام کار اسلام کی قوتیں کامیاب اور فائز ہوں گی"۔

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب ہو جائے گی
اس قدر ہو گی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ وطن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوہ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمہ توحید سے

حضرتِ علامہ اقبال نے مسلمانوں کے تحفظ و بقا کیلئے جو راستہ دکھایا، قائداعظم مسلمانوں کے قافلے کو لیکر اس پر چل پڑے اور بہت قلیل عرصے میں منزل حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے یعنی پاکستان..... اسلام کا پاکستان، ہمیشہ زندہ رہنے والا پاکستان۔ قائداعظم نے علامہ اقبال کو کیا خوب خراجِ تحسین پیش کیا ہے: اقبال سے بہتر اسلام کو کسی نے نہیں سمجھا، میں نے ان سے زیادہ وفادار اور اسلام کا شیدائی کسی کو نہیں دیکھا۔ اقبال اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اسلام زندہ ہے اور بلاشبہ اسلام ہمیشہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

آج 23 مارچ کا تاریخ ساز اور یادگار دن ہے اور اس حوالے سے علامہ اقبال، قائداعظم اور اس کیلئے دی گئیں قربانیوں کو یاد کرنے کا دن ہے کہ کیا واقعی ہم اسی پاکستان میں سانس لے رہے ہیں جس کا وعدہ ہم نے اپنے رب سے کیا تھا؟

بروز ہفتہ 13 رمضان الکریم 1445ھ 23 مارچ 2024ء

بد دیانت کامیاب

پچھلے کئی برسوں سے مسجد میں اجتماعی افطاری کے ایمان افروز افطاری کی یوں تو کئی یادیں ایسی ہیں جن کو یاد کر کے اک سحر طاری ہو جاتا ہے۔ ایک ایسی ہی تقریب میں اچانک شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی، میزبان نے تعارف کروانے کی کوشش کی مگر شاہ صاحب نے ایک عجیب وارفتگی سے گلے لگالیا، ان کی گرمجوشی قابل دید تھی اور ادھر میرا بھی یہی حال تھا۔ "آپ تو ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں۔" میں نے جواباً عرض کیا کہ "میں شاہ صاحب کو نہ جنہوں نے ہمیشہ صرف جانتا ہوں بلکہ دل سے ان کی قدر بھی کرتا ہوں۔ ان کا تعلق ان چند سیاستدانوں سے ہے جو کبھی جاری سیاسی قواعد سے دور رہے، ایمانداری، خلوص اور نیک نیتی کو زادِ راہ جانا، جنہوں نے ہر دور میں سیاست کو کچھ نہ کچھ دیا، اس سے وصولی کی کوشش نہیں کی۔" شاہ صاحب نے میرا شکریہ ادا کیا اور ہم دونوں ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ شاہ صاحب اپنا سیاسی اتار چڑھاؤ بتانے لگے، انہوں نے سیاست کیسے شروع کی، الیکشن کیسے لڑا، کیسے وزیر بنے، رشوت اور لوٹ کھسوٹ سے بچنے کیلئے انہیں کون کون سے پاپڑ بیلنے پڑے۔ انہیں الیکشن میں کیسے ہروایا گیا اور آخر میں انہوں نے پارٹی کیسے چھوڑی، وغیرہ وغیرہ۔

میرے علم میں دو چار ایسے واقعات بھی ہیں جس کی وجہ سے میرے دل میں ان کیلئے بے حد احترام ہے۔ میں نے ایک بار پھر ان کی ایمانداری کی تعریف کی، انہوں نے تڑپ کر میری طرف دیکھا اور ٹھنڈے ٹھار لہجے میں بولے "میں اپنی اس ایمانداری، اس اصول پسندی اور اخلاص پر نہ صرف شرمندہ ہوں بلکہ بیوی اور اولاد کے طعنوں کی زد میں رہتا ہوں۔" میں نے انہیں حیرت سے دیکھا، وہ گویا ہوئے "تجربے اور وقت نے ثابت کیا اس ملک میں جن لوگوں نے کچھ کمالیا وہی صحیح رہے، جنہوں نے موقع کھو دیا وہ پچھتاتے رہے، دیکھ لیں ایمانداری کا صلہ، آج میرے ہاتھ میں سیاست ہے نہ ہی مال"۔ ہم وقت اور موقع سے دیر تک اس شرمندگی اور پچھتاوے پر گفتگو کرتے رہے۔ شاہ صاحب نے بیسیوں مثالیں دیں، لوگ کیسے خالی ہاتھ سیاست میں آئے، فائدہ اٹھایا، فرش سے عرش تک جا پہنچے اور آج نہ صرف عیش کر رہے ہیں بلکہ دوبارہ حکومتی غلام گردشوں کا اہم حصہ ہیں۔

احتساب کے درجنوں محکمے بنے، ان کے خلاف کیس اور ریفرنس بھی دائر ہوئے لیکن انہیں کوئی فرق نہیں پڑا، ان میں سے کچھ نے دے دلا کر جان چھڑا لی اور کچھ مک مکا کر کے ایک دفعہ پھر ایماندار سیاستدان کا تمغہ حاصل کر چکے۔ چند ایک حضرات قانون کے مورچے میں پناہ گزیں ہوئے لیکن بالآخر انہوں نے بھی وفاداریاں تبدیل کر کے جان اور مال بچالئے اور پیچھے رہ گئے ہم جیسے بے وقوف! ہم اپنے اصولوں پر ڈٹے رہے، خدا خوفی سے ملک کی کو میرے خدمت کو اپنا ایمان بنائے رکھا، لیکن مال بنانے والوں کو میرا وجود کب گوارہ تھا، سازشوں کے جنگل میں پھنسا رہا اور میرے ہی دفتر کے افراد خلاف استعمال کر کے مجھے اس قدر تنگ کیا گیا کہ میں نے گھٹ گھٹ کر مرنے سے بہتر یہی سمجھا کہ اس پتھر کو چوم کر علیحدہ ہو جاؤں، جس کے نتیجے میں میرا دامن خالی تھا اور خالی ہی رہا، اب ہم جیسے گھاٹ کے رہے اور نہ ہی انہیں گھر نصیب ہوا تاہم آپ جیسے دوست احباب چند لمحوں کیلئے ہماری ایمانداری کی تعریف کے پُل باندھ کر پھر سے تڑپا دیتے ہیں۔

میر صاحب ایک ریٹائرڈ بیوروکریٹ تھے۔ 35 سال اقتدار اور اختیار کے کوریڈور میں رہے، کس کس قیمتی پوسٹ اور کیسے کیسے سنہرے عہدے پر رہے لیکن کیا مجال کہ ایمان اور ایمانداری کو ہاتھ سے جانے دیا ہو لہٰذا جب ریٹائر ہوئے تو سر چھپانے کیلئے چھت تک نہیں تھی، جو پس انداز تھا وہ لاہور کے بدنام زمانہ ایڈن بلڈرز کے فراڈ کی نذر ہو گیا، عدالتوں کے دھکے کھاتے رہے لیکن فراڈ کرنے والا اس وقت کے چیف جسٹس کا داماد تھا، اس لئے اس کا کوئی

بال تک بیکا نہ کر سکا۔ یہ الگ بات ہے کہ جب اس فراڈیئے کی موت واقع ہوئی تو متاثرہ افراد آج تک اس کی قبر پر جوتے برساتے ہیں لیکن میر صاحب نے اپنی اپنی ساری زندگی پنشن اور دکھ میں گزار دی۔ ہر صبح بیوی کے طعنوں اور اولاد کے شکوؤں سے آنکھ کھلتی اور رات کو حالات کے بوجھ اور ضروریات کی گرانی تلے بند ہوتی، میر صاحب نے بھی آخری زندگی پچھتاوے میں گزاری، وہ بھی کہا کرتے تھے "نیکی بندے کو وہاں کرنی چاہئے جہاں نیکی کی کوئی وقعت ہو، جس معاشرے میں ایمانداری کا دوسرا نام بے وقوفی ہو وہاں ایمانداری سے پرہیز لازم ہے، افسوس مجھے دورانِ ملازمت اس بات کا احساس تک نہ ہوا"۔

یہ شاہ صاحب ہوں یا میر صاحب، ہمارے معاشرے میں ایسے کردار بکھرے پڑے ہیں، ہم سب کی زندگی میں کوئی نہ کوئی شاہ صاحب، کوئی نہ کوئی میر صاحب ضرور ہوں گے، یہ لوگ پہلے اکثریت میں ہوتے تھے لیکن اب اقلیت کی شکل اختیار کرتے جارہے ہیں۔ ہر آنے والا دن ایسے لوگوں کی نعشوں پر طلوع ہو رہا ہے، وہ لوگ جو کبھی ضمیر کو عدالت سمجھتے تھے، جنہیں محسوس ہوتا تھا سب آنکھیں بند ہو جائیں تو بھی ایک آنکھ انہیں مسلسل دیکھتی رہتی ہے، جو یہ سوچتے تھے دنیا عارضی کھیل ہے اور اس کھیل میں سب کچھ ہار دینا بے وقوفی ہے اور جو یہ کہتے تھے اطمینان سے بڑی کوئی دولت اور سچائی سے بڑی کوئی طاقت نہیں، وہ لوگ اس معاشرے سے تیزی کے ساتھ سمٹتے جارہے ہیں، یہ معاشرہ، یہ ملک ان لوگوں سے خالی ہوتا جارہا ہے، اس ملک میں ایمانداری کی زمین بڑی تیزی سے سیم اور تھور کا شکار ہوتی جارہی ہے۔

ہمارے ملک میں این آر او اور پاناما کے انکشافات نے ایمانداری، سچائی اور خلوص کا جنازہ نکال کر رکھ دیا اور اب یہ اوصاف ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے ۔ این آر او کو اپنے لئے ایک مثال بنا کر ایسی کھلے عام لوٹ مچائی کہ الامان الحفیظ! الزمات اور انکشافات کی ایسی غلیظ تھیلی بیچ چوراہے میں رکھ دی گئی کہ قوم سکتے میں آگئی۔ ان الزامات اور انکشافات میں بھی کئی آدھے سچ اور جھوٹ شامل کر کے قوم کی توجہ ان خطرات سے ہٹادی گئی جس کی آگہی سے عوام کو اپنے وطن کے بارے میں اپنے دوستوں اور دشمنوں کی تمیز ہو رہی تھی۔ ایک ہی وار میں اپنے تمام مخالفین کو بدنام کرنے کی بڑے زور و شور سے مہم شروع کر دی گئی اور ملک کی تقدیر سے ایسا کھلواڑ کیا گیا کہ ایک ایٹمی قوت کا مالک ہاتھ میں کشکول لئے خیرات اور بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ملک کی اس بربادی میں اربوں روپے کی دیہاڑی لگانے والے اب عوام کی کمزور یادداشت کے سبب عیش کر رہے ہیں۔

حیرت اس بات پر ہے کہ پاناما لیکس کے شور و غل میں جن افراد کو ہٹایا گیا، اسی پاناما کے مقدمات میں سنائی گئی تمام عدالتی سزاؤں کو دبیز گرد کے نیچے دبا کر دوبارہ مسند اقتدار کا تاج پہنا دیا گیا حالانکہ اس وقت پاناما کیس کے سلسلے میں ایسے سنگین الزامات اور انکشافات بھی سامنے آئے جس کی تحقیقات پر ملک کے کروڑوں روپے کے اخراجات اٹھ گئے لیکن بڑی مہارت کے ساتھ این آر او کی طرح پاناما کیس کو بھی دفن کر دیا گیا۔ کیا پاناما کیس بنانے والوں، اس کی تحقیقات کرنے والوں، عدالتی کاروائی میں قوم کے کروڑوں روپے کے اخراجات کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ کیا ان ججز کے ساتھ ان تمام افراد کے خلاف کوئی کاروائی ضروری نہیں جنہوں نے اس ملک کو اپنے مفادات کیلئے کنگال کر دیا۔

ہمارے ملک میں پہلے ہی ایمانداری، وفاداری اور خلوص ختم ہوتا جارہا ہے۔ یہ لوگ جو پچھتاوے کی سڑک پر قدم رکھ رہے ہیں ان کیلئے بھی کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ ہم اگر انہیں کچھ دے نہیں سکتے تو کم از کم ان کا حوصلہ تو ضرور بڑھا سکتے ہیں، ان کو عزت تو دے سکتے ہیں، ان کی نیکی اور ایمانداری کا اعتراف تو کر سکتے ہیں، لوگ بجھتے چراغوں کی پھڑ پھڑاتی لو بچانے کیلئے اپنے ہاتھ جلا بیٹھتے ہیں، ہم کیسے لوگ ہیں ہمارے سامنے زندگی کے بھانبھڑ میں برف کاشت کی

جارہی ہے لیکن ہم خاموشی سے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ یادرکھئے! اگر ہم نے بھی ایمان اور نیکی کے ان چراغوں کی حفاظت نہ کی تو ہماری اولاد نیکی اور ایمان کے الفاظ تک سے واقف نہیں ہوگی۔ یہ معاشرہ یہ ملک "بددیانت کامیاب" لوگوں کا ملک، موقع سے فائدہ اٹھانے والے لوگوں کا معاشرہ ہوگا۔ ہمیں فی الفور ان لکڑہاروں کا محاسبہ کرنا ہوگا جو ہمارے ملک کے تمام درختوں کو کاٹنے کیلئے کندھے پر کلہاڑیاں لئے تیار کھڑے ہیں!

یقین کیجئے! جب کلہاڑا (امریکا) جنگل میں درخت (مسلمانوں) کاٹنے آیا، تو درخت بولے: کلہاڑی کا دستہ (مسلمان لیڈر) ہم میں سے ہے۔

بروز سوموار 15 رمضان الکریم 1445ھ 25 مارچ 2024ء

پھر دیر کس بات کی!

ہاں حالات تو خراب ہیں، بہت خراب..... لیکن کیوں ہیں؟ میں نہیں جانتا، سوچتا ضرور ہوں اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں اصل نہیں ہوں جعلی ہوں۔ ایک کشتی کی بجائے بہت سی کشتیوں میں سوار ہوں۔ ایک راستہ چھوڑ کر بہت سے راستوں پر گامزن ہوں۔ ادھورا اور نامکمل ہوں میں۔ میں اپنا اعتماد کھو بیٹھا ہوں اور سہاروں کی تلاش میں ہوں۔ میں اتنا تو جانتا ہی ہوں کہ بیساکھیوں سے میں چل تو لوں گا لیکن دوڑ نہیں سکوں گا پھر بھی بیساکھیوں کا سہارا۔۔۔ میں گلے اور شکوے شکائت کرنے والا بن گیا ہوں۔ مجھے یہ نہیں ملا۔ میں وہ نہیں پا سکا، ہائے اس سماج نے تو مجھے کچھ نہیں دیا، میں گلے اور شکوے شکائت کرنے والا بن گیا ہوں... مجھے یہ نہیں ملا، میں وہ نہیں پا سکا، ہائے اس سماج نے تو مجھے کچھ نہیں دیا، میرے راستے کی دیوار بن گیا ہے۔

میں خود ترسی کا شکار ہوں، میں چاہتا ہوں کہ ہر کوئی مجھ پر ترس کھائے، میں بہت بیچارہ ہوں، میرا کوئی نہیں۔ میں تنہا ہوں، مجھے ڈس رہی میری اداسی... ..ہائے میں مر گیا، ہائے میں کیا کروں، میں مجسم ہائے ہوں۔ میں کیا ہوں، میں کون ہوں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ عجیب سے مرض کا شکار ہوں میں۔ بس کوئی مجھے سہارا دے، کوئی میرا ہاتھ تھامے، کوئی مری پتا سنے..... بس میں اور میری کا چکر۔ میں اس گرداب میں پھنس گیا ہوں اور نکلنے کی کوشش کی بجائے اس میں غوطے کھا رہا ہوں۔ میں حقائق سے انکھیں چرا کر خواب میں گم ہوں۔ ہر شے بس مری دسترس میں ہو، جبکہ میں جانتا ہوں کہ میں کن کہہ کر فیکون نہیں دیکھ سکتا، پھر بھی.....!

میں اس پر تو کبھی غور ہی نہیں کرتا کہ میں نے کیا دیا لوگوں کو! اس سماج کو میں نے کیا دیا! میں دینا جانتا بھی ہوں یا مجھے بس لینا ہی آتا ہے؟ کبھی نہیں سوچا میں نے۔ مجھے خود سے فرصت ملے تو سوچوں بھی ناں! میں نے کسی سے محبت کا دعویٰ کیا، جینے مرنے کی قسمیں کھائیں اور پھر اسے دھوکا دیا، اس کے اعتماد سے کھیل گیا۔! میں اسے کوئی جرم نہیں سمجھتا۔ کسی نے مجھ سے ہمدردی کی، میرا ساتھ دیا، مجھے اپنے کام میں شریک کیا اور میں نے کیا کیا؟ جب میرا ہاتھ کشادہ ہوا تو اسے چھوڑ کر دوسروں کے پاس جا بیٹھا، میں نے اپنی چرب زبانی سے لوگوں کی جیبوں سے پیسے نکالے، انہیں سہانے خواب دکھائے، مفلوک الحال لوگوں کو جعلی پلاٹ فروخت کر دیئے، کسی غریب نے قرض لے کر مجھے پیسے دیئے کہ میں اسے باہر بھیج دوں تا کہ اس کا ہاتھ کشادہ ہو، میں نے کسی اور کے ہاتھ بیچ ڈالا، اس کا پورا مستقبل تباہ کر ڈالا۔

میں نے اپنا پیٹ بھرنے کیلئے ہر وہ کام کیا جس پر مجھے شرم آنی چاہیے لیکن میں اترائے پھرتا ہوں۔ میں نے بڑے لوگوں سے تعلقات بنائے اس لئے کہ وہ میرے کرتوتوں میں میری معاونت کریں۔ میں نے غنڈوں اور بدمعاشوں کی فوج تیار کی اور خاک بسر لوگوں کو زندہ درگور کر دیا اور پھر بھی میں معزز ہوں۔ میں نے بینکوں سے فراڈ کے ذریعے بھاری رقوم کا ہیر پھیر کیا اور کئی ایکڑ پر محیط فارم ہاؤس بنا کر اس میں عیش و عشرت سے رہنے لگا، اپنے جرائم کو میں دیکھتا ہی نہیں ہوں۔ میں نے قبرستان میں کئی مردے دفن کئے اور خود کبھی نہیں سوچا کہ مجھے بھی یہاں آنا ہے۔ میں نے جعلی ادویات بنائیں، انہیں فروخت کیا اور اپنی تجوریاں بھر لیں، میں نے مذہب کو پیسہ کمانے کا ذریعہ بنا لیا۔ میں ایک بہت اچھا بہروپیا ہوں جو ایسا روپ دھارتا ہے کہ اصل کا گمان ہو۔ میں نے لوگوں کی فلاح و بہبود کا کام بھی اس لئے کیا کہ لوگوں میں میری واہ واہ ہو اور سماج میں میری وقعت بڑھے اور پھر اس کو بھی پیسے کمانے کا ذریعہ بنا لیا۔ میں نے چند روپوں کا راشن تقسیم کیا اور اپنی اس سستی شہرت کیلئے اس سخاوت کی تصاویر بنوا کر اخبارات کو جاری کیں، ان کو بار بار دیکھ کر

اپنے نفس کو خوب موٹا کیا۔ میں نے رشوت لی، حق تلفی کی، ہر ناجائز کام کیا اور جائز کام والوں کو راستہ ہی نہیں دیا جب تک میری جیب نہ بھر دی انہوں نے۔ عجیب ہوں میں، بندہ نفس، بندہ مکر و فریب، بندہ حرص و ہوا۔

ہم سب مجرم ہیں، کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں، اگر کسی نے مجھے گالی دی میں نے اس کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا اور جب اللہ کے قانون کو توڑا گیا تو بس میں تبصرہ کرتا رہ گیا، مسجدیں بموں سے اڑادی گئیں اور معصوم و یتیم بچیوں کو فاسفورس بموں سے بھسم کر دیا اور میں بس ٹی وی کے سامنے بیٹھا دیکھتا رہا۔ میں نے ملک اور اس میں رہنے والے معصوم لوگوں کیلئے آخر کیا کیا؟ سوائے جمع زبانی خرچ کے!

پھر جب میں ہلکان ہو گیا، مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں اس عذاب سے جو میں نے اپنی غلط کاریوں کی بدولت خرید اہے اس سے نجات کیسے حاصل کروں۔ تب میں نے پہلے اقرار کیا اپنی خطاؤں کا اپنے رب کے سامنے اور پھر عزم کیا: نہیں اب میں بندہ نفس نہیں، بندہ رب بننے کی کوشش کروں گا۔ یہ بہت مشکل ہے، بہت زیادہ..... لیکن میں نے اپنے رب کو سہارا بنالیا اور میرے زخم بھرنے لگے، پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ میں نے تہیہ کر لیا کہ میں اپنے لئے نہیں خلق خدا کیلئے زندہ رہنے کیلئے کوشش کروں گا۔

رب کریم کا سہارا پکڑ لیں تو مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ بہت الجھن ہونے لگتی تھی کہ میں عذاب اور آزمائش میں فرق کیسے کروں، تب میں نے اپنا مسئلہ ان کے سامنے رکھ دیا، بہت دیر تک دیکھتے رہے، مسکراتے رہے اور پھر ایک ہی چٹکی میں یہ مشکل بھی حل کر دی: دیکھ بہت آسان ہے عذاب اور آزمائش میں فرق رکھنا، جب کوئی پریشانی، مصیبت، دکھ یا کوئی مشکل آئے اور وہ تجھے تیرے رب کے قریب کر دے تو سمجھ لے یہ آزمائش ہے اور جب کوئی پریشانی، مصیبت، دکھ یا کوئی مشکل تجھے رب سے دور کر دے تو سمجھ لے یہ عذاب ہے، توبہ کا وقت ہے، ضرور کر توبہ اور جلدی کر اس میں!

ہمارے چاروں طرف کیا ہو رہا ہے، ہمیں خود دیکھنا اور سوچنا چاہیے، ہم اجتماعی آزمائش میں مبتلا ہیں یا اجتماعی عذاب میں؟ رمضان الکریم شروع ہو چکا ہے "پس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت سے انکار کروگے"۔ مجھے اپنے اندر سے کہیں یہ آواز آرہی ہے کہ "پلٹ آ، یہ جہنم سے رہائی کا مہینہ، توبہ کا بہترین موقع، گریہ وزاری کرنے کی راتیں، لیلتہ القدر کو ڈھونڈنے کا بہانہ، اپنے رب کی طرف پلٹنے کا وقت، جلدی کر نادان، ایسا نہ ہو کہ دروازے پر منادی دینے والا پھر نہ لوٹے! اس کا وعدہ ہے کہ تو ایک قدم میری طرف آ، میں دس قدم آؤں گا، تو تیز چل کر آ، میں دوڑ کر آؤں گا۔ میرے کریم رب کی محبت ستر ماؤں کی محبت سے تو شروع ہوتی ہے۔ اس کا وعدہ ہے کہ میرے تیرے گمان کے، مطابق ہوں، مجھ سے جیسا گمان کرے گا، مجھے ویسا ہی پائے گا.... پھر دیر کس بات کی؟

بروز منگل 16 رمضان الکریم 1445ھ 26 مارچ 2024ء

خوابوں کی تعبیر

اللہ کی جانب سے نہ کوئی دنیا کی حقیقتوں کو جانتا ہے اور نہ ہی اپنے ارد گرد بکھرتی قوموں اور تباہ ہوتی ہوئی قوتوں کو دیکھتا ہے۔ عذاب کے فیصلوں اور نصرت کے مظاہروں کو دیکھنے کیلئے کسی تاریخ کی کتاب کھولنے یا عاد و ثمود کی بستیوں کا مطالعہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ابھی کل کی باتیں ہیں۔ میرے اللہ کا فرمان ہے کہ جب ہم کسی قوم پر کوئی آفت نازل کرتے ہیں تو وہ اس کی مادی توجیہات کرنے لگ جاتا ہے۔ کوئی سوچ سکتا تھا کہ دنیا کی ایک ایٹمی خلاؤں تک ہو، جو دنیا میں پچاس سے زیادہ کیمونسٹ سپر طاقت جس کے پاس اس ساری دنیا کو کئی مرتبہ تباہ کرنے کا سامان موجود ہو، جس کی تسخیر تحریکوں کی برملا مدد کرتا ہو، بے خانماں، بے سروساماں افغان مجاہدوں نے صرف اپنے رب کے بتائے ہوئے حکم جہاد کے ذریعے اس کے چھ ٹکڑے کر دیئے۔

کسی ایک محاذ پر شکست کے بعد قومیں متحد ہو جایا کرتیں ہیں، انتقام کیلئے، اپنے آپ کو مزید طاقتور کرنے کیلئے، لیکن جو مسلمان قوم جہاد سے منہ موڑ لے تو قدرت اس قوم کیلئے زوال ور سوائی کا فیصلہ صادر کر دیتی ہے۔ ان کو نفرت، تعصب، بھوک، افلاس اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہونے کا مزا چکھا دیا جاتا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امریکا 1901ء سے چین، فلپائن، کوریا، ویت نام، جنوبی امریکا دنیا کے دیگر 39 ممالک سے ذلیل و رسوا ہو کر نکلا ہے لیکن وہ طاقت کے پجاری جن کا دل ہی نہیں مانتا کہ اس کائنات پر ایک اور حکمران طاقت ہے جس کا یہ وعدہ ہے کہ اگر تم مجھ پر یقین کرو تو تم قلیل بھی ہو گے تو زیادہ طاقت پر غالب آؤ گے۔ یہ لوگ پھر بھی توجیہات کرتے ہیں لیکن آخر میں انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔

قدرت نے ہر انسان کے سینے میں ایک چھوٹا سا ایٹم بم "دل" کی شکل میں نصب کر رکھا ہے۔ یہ چھوٹا سا لوتھڑا پہاڑوں سے ٹکرا جانے کی ہمت رکھتا ہے اگر اس میں صرف ایک رب کا خوف موجود ہو، سارا باطل اس سے لرزاں اور خوفزدہ رہتا ہے، لیکن اگر اس میں دنیا کا خوف بٹھا لیں تو ہر دن رسوائی کی موت آپ کی منتظر رہتی ہے۔ جو مسلمان قوم جہاد سے منہ موڑتی ہے تو ہر دن رسوائی کی موت اور دیگر مصائب اس کے منتظر رہتے ہیں۔ ہم ایک جوہری قوت ہوتے ہوئے بھی لوگوں سے اپنے امن کی بھیک مانگ رہے ہیں اور دوسری طرف دنیا نے خود اپنی آنکھوں سے یہ مشاہدہ کیا کہ تمام جوہری طاقتوں نے افغان طالبان سے مذاکرات کیلئے کس بے بسی کے ساتھ راستہ ڈھونڈا، اور پھر افغان مجاہدین جنہوں نے صرف جہاد کا سہارا لیکر اپنے وجود کو منوایا اور سپر طاقتوں کا سر پر تاج سجائے کس طرح ان بے خانماں مجاہدین کی شرائط پر اپنی تذلیل اور شکست وریخت کا سفر باندھا۔

دہشتگردی، شر پسندی اور تخریب کاری پر قابو پانے کے دعوے بھی عجیب ہیں، ہر روز میڈیا پر ان دہشتگردوں، شر پسندوں اور تخریب کاروں کو کچل دینے کے تبصرے اور تجزیئے سنتا ہوں تو حیرت میں گم ہو جاتا ہوں۔ اس دنیا کے نقشے میں کوئی اقتدار کی کرسی پر بیٹھا ہوا شخص کسی ایک ملک کی بھی نشاندہی کر سکتا ہے جو فخر کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتا ہو کہ وہ دہشتگردی پر قابو پانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ امریکا سے برطانیہ، پورا یورپ، عراق سے لیکر سری لنکا تک، بھارت سے لیکر افغانستان تک، سب حکومتیں بے بس ہیں، مجبور ہیں، لاچار ہیں لیکن کوئی اس بے بسی اور کمزوری کو قبول نہیں کر رہا بلکہ ایسے ہی تجزیوں اور تبصروں پر عملدرآمد کی بناء پر اس دلدل میں پھنستے جا رہے ہیں لیکن ضربِ عضب اور ردّالفساد آپریشنز نے اپنی جانوں کی قربانیوں سے سر کر کے دکھا دیا لیکن دشمنوں کو یہ گوارہ نہ ہو سکا اور اب وہ نئی چالوں سے ملک کے امن کو سبوتاژ کرنے کیلئے سازشوں میں مصروف ہیں جس کا ہر روز منہ توڑ جواب بھی دیا جا رہا ہے۔ کوئی یہ ماننے کیلئے تیار نہیں کہ مقلب القلوب صرف ایک ذات پروردگار ہے جو دلوں کو بدلتا ہے، ان کو محبت سے

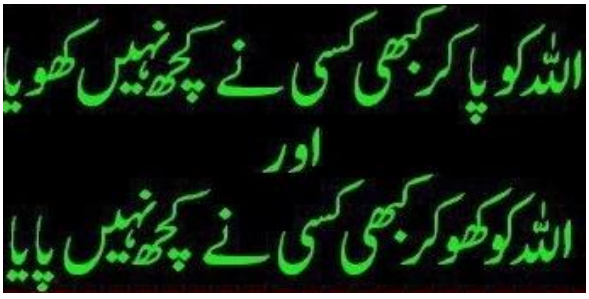

بھر دیتا ہے لیکن امریکا، اسرائیل اور بھارت نے تو نفرت سیکھی ہے لیکن دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ جس قوم میں یہ بلا نازل ہوئی وہ اپنی پوری صلاحیت کے باوجود اس سے نہیں لڑ سکی۔

امریکا اور مغربی ممالک (جن کے گھٹنوں کو چھو کر ہمارے حکمران دن رات بھیک مانگ رہے ہیں) جو جدید ٹیکنالوجی رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، جہاں ہزاروں افراد اپنی اس ٹیکنالوجی کی بدولت دہشتگردوں کی بو سونگھتے رہتے ہیں جہاں کوئی شہری اپنے پڑوسی میں کسی لمبی داڑھی والے کو دیکھ لیں تو فوراً پولیس کو آگاہ کرتے ہیں، باہر سے آنے والوں کو گھنٹوں ایئرپورٹ پر سیکورٹی کے نام پر ذلیل کیا جاتا ہے، کیا وہاں یہ سب ختم ہو گیا؟ یا ان کے شہران خطروں سے محفوظ ہو گئے ہیں؟ یا ان کا خوف کم ہو گیا؟ ہرگز نہیں، ہم تو ایک آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیا دنیا کے کسی خطے میں ایسا ہوا ہے؟ ویت نام، لاؤس، فلسطین، سری لنکا، چلی، نکاراگوا، کمبوڈیا، کہاں کسی نے میڈیا پر ایسی دوکانداری چمکائی ہے؟ لیکن شاید یہ خود کو بہت طاقتور اور دانشور سمجھتے ہیں۔ درپردہ ہمارے کچھ سیاسی لیڈر اور دشمن تو یہی چاہتے ہیں کہ بلوچستان اور خیبر پختونخواہ (فاٹا) میں جاری آپریشن ناکام ہوں، عوام کا خون اور بہے، اور گھرانے ماتم کدہ بن جائیں، اور لوگ اس آگ میں جھلس جائیں اور پھر مجبور ہو کر سر جھکا کر ان کی ہر بات، ہر مطالبہ مان لیں۔ جوہری اثاثوں اور کشمیر سے مکمل دستبرداری اور بھارت کی غلامی اختیار کر لیں لیکن وقت نے یہ ثابت کیا ہے کہ ایسا نہ کبھی پہلے ہوا تھا اور نہ ہی آئندہ ہو گا۔

کشمیریوں کے جہاد نے بھارت کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں لیکن عالمی طاقتوں نے چین کے خلاف گھیرا تنگ کرنے کیلئے بھارت کو استعمال کرنے کیلئے ایک گہری سازش کے تحت مسئلہ کشمیر کو ختم کرنے کیلئے ہمارے حریص مقتدر افراد کو استعمال کیا۔ سابقہ امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ نے ایک ہی وقت میں اس وقت کے ہمارے آرمی چیف قمر باجوہ اور وزیر اعظم عمران خان کو قصر سفید میں طلب کر کے اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ جس کے فوری چند دنوں کے بعد مودی نے خود اپنے آئین کی دھجیاں اڑاتے ہوئے کشمیر کی خصوصی حیثیت کو ختم کرتے ہوئے اسے بھارت میں شامل کرنے کا اعلان کر دیا۔

عمران خان نے اپنے دورہ امریکا کی واپسی پر اسلام آباد ائیرپورٹ پر ہی خود کو کشمیر کا وکیل بتاتے ہوئے اپنی جماعت کا میلہ سجالیا اور کسی بھی قسم کے مظاہروں کو سختی سے کچلنے کا عندیہ دے دیا اور قمر باجوہ نے درجن بھر ملکی صحافیوں کو بلا کر بھارت کے مقابلے میں اپنی کمزوریوں کا ذلت آمیز اعتراف کر کے قوم کا سر شرم سے جھکا دیا۔ لیکن کیا اس تمام سازش کے بعد کشمیریوں نے ہار مانی ہے؟ بالکل نہیں۔

گزشتہ دنوں جنرل (ر) غلام مصطفیٰ اور میں مسجد نبوی میں بیٹھے تھے کہ ہمارے ساتھ بیٹھے ایک بھارتی مسلمان نے بڑے دکھ کے ساتھ یہ کہا: "میرا تعلق راجستھان انڈیا سے ہے، آپ نے پاکستان تو بنالیا لیکن تمام پاکستانی انڈیا میں چھوڑ آئے۔ ہم آپ سے کچھ نہیں مانگتے لیکن خود کو اتنا مضبوط کر لیں کہ انڈیا میں رہنے والے مسلمانوں کا تحفظ ہو سکے۔ آپ کے کمزور ہونے کی بناء پر ہندو مہاسبھائیوں کے ہاتھوں اب ہماری عزت بھی محفوظ نہیں رہی۔ مجھ سے چند مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں کی بھی ملاقاتیں رہیں اور ان کے جذبات تو تحریر بھی نہیں کئے جاسکتے تاہم ان کا پاکستان کے ساتھ محبت کا جذبہ اب بھی اس قدر جوان ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

اہل نظر پچھلے کئی ماہ سے خبردار کرتے چلے آرہے ہیں۔ رب کریم کے سامنے اپنی عاجزی، بے بسی کی دعائیں اور جہاد سے منہ موڑنے پر استغفار کی

ضرورت ہے۔ جن کے دلوں میں امریکا کا خوف اور ہاتھوں میں کشکول ہے، ان کے تکبر ٹوٹنے کا وقت آپہنچا ہے۔ کیا ٹائی ٹینک کے ڈوبنے کا وقت آن پہنچا ہے؟ سنا ہے جب جہاز ڈوبنے کا وقت ہوتا ہے تو چوہے سب سے پہلے جہاز چھوڑتے ہیں لیکن اب تو شاید ان چوہوں کا مقدر بھی ہمیشہ کیلئے غرق ہونا ٹھہر گیا ہے۔ کیا خوابوں کی تعبیر کا وقت آن پہنچا ہے؟

جب تک نہ جلے دیپ شہیدوں کے لہو سے
سنتے ہیں کہ جنت میں چراغاں نہیں ہوتا

بروز بدھ 17 رمضان الکریم 1445ھ 27 مارچ 2024ء

دھوکہ ہی دھوکہ

ہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں کا چکر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بس میں کا چکر۔ دھوکا ہی دھوکا اور خود فریبی۔ دربارِ عالیہ میں مسندِ نشین خوشامد پسند حکمران اور چاپلوس مشیرانِ کرام... راگ رنگ کی محفلیں، نائونوش کا دور اور عوام کا درد و غم یکساں کیسے ہو سکتے ہیں! ہو ہی نہیں سکتے۔ نہیں جناب آپ نے بجا ارشاد فرمایا... آپ ہی تو صحیح فرماتے ہیں... آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں آپ کے ارشاداتِ عالیہ۔ دُرِ نایاب ہیں آپ، نجات دہندہ اور زمین پر خدا کا سایا۔ رحمتِ باری تعالیٰ اور اوتارِ زمانہ ہیں آپ سرکار آپ جئیں ہزاروں سال سدا جئیں کا نعرہ۔ اور خود فریبی میں رچا بسا فریب خوردہ انسان۔ اتنی آوازوں میں کون اپنے آپ میں رہتا ہے۔ جامے سے باہر ہو ہی جاتا ہے۔

لیکن کون جیا ہے سدا! کوئی بھی نہیں۔ سب کو چلے جانا ہے۔ زندگی پر موت کا پہرہ ہے۔ نہیں بچا کوئی۔ کوئی بھی تو نہیں بچا۔ لیکن کون سمجھائے جب قلب سیاہ ہو کر پتھر بن جائے چاہے دھڑکتا ہی ہو، اس سے کیا ہوتا ہے! ہاں پتھر تو پتھر ہوتا ہے۔ فریب ہی فریب اور دھوکا ہی دھوکا۔ زمین پر پاؤں ٹکنے ہی نہیں دیتا یہ دھوکا۔

چاہے کچھ کر لیں... ہاں کچھ بھی، نہیں بچ سکا کوئی بھی موت کے منہ سے۔ بے حس و سفاک موت، کسی کو خاطر میں نہ لانے والی۔ ہاں وہ کسی کی بھی دھمکی نہیں سنتی، کسی کے نام و نسب، منصب و جاگیر سے اجنبی موت۔ لیکن پھر بھی جیئے جیئے سدا جیئے کا خمار۔ ایسا نشہ جو سارے نشے کو دو آتشہ اور سہ آتشہ کر دے۔ آہ نہیں بچا کوئی۔

آگ و خون کی بارش کرنے والے بھی اور مظلوم، معصوم اور مقہور بھی۔ نہیں کوئی نہیں بچا۔ لیکن پھر سب ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں۔ تب خیال آتا ضرور ہے لیکن ساعت و لمحات بیت چکے ہوتے ہیں، سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاتا ہے، پھر پل کی خبر نہیں ہوتی حالانکہ سامان سو برس کا دھرا ہوتا ہے۔ وہ مجھے اکثر کہتا ہے کوالٹی لائف ہونی چاہیے۔ ہاں وہ اسی طرح کی زندگی بسر کرتا ہے۔ ہر چیز وافر اور وقت نپا تلا۔ لیکن کیا یہ ہے کوالٹی لائف! اچھی نوکری کیلئے بہترین تعلیم حاصل کرنا۔ پھر پیسے جمع کرنا اور کرتے ہی چلے جانا۔ پھر ایک خوب صورت لڑکی سے شادی۔ ایک آسائشوں بھرا گھر اور اس کے لان میں بچھی ہوئی آرام دہ کرسی پر جھولتے ہوئے گپ شپ۔

بس یہ ہے آج کی کوالٹی لائف۔ کیا یہی ہے زندگی! میرا ایک دیہاتی دوست بہت ہنستا اور کہتا تھا: کچھ لوگوں کی زندگی پتا ہے کیسی ہوتی ہے؟ میں کہتا نہیں پتا۔ تو کہنے لگتا: ان کی زندگی ہوتی ہے "نہ ہم کسی کے نہ ہمارا کوئی"۔ کسی سے کوئی مطلب ہی نہیں... بس میں، میں اور میں کا چکر۔

زندگی موت کی امانت ہے۔ ان کا یہ جملہ ہر وقت میری سماعتوں میں رس گھولتا ہے۔ میں اکثر ان سے ملتا تھا۔ بس ہر وقت ایک ہی بات تھی ان کی، پیٹ کی نہ ماننا یہ کبھی نہیں بھرتا۔ دنیا بھر کی نعمتیں اس پیٹ میں ڈال لے، اگر ایک وقت کا فاقہ آ گیا تو ہٹ دھرمی سے کہنے لگتا ہے میں نے تو آج تک کچھ کھایا ہی نہیں۔ پیٹ بھی ایک جہنم ہے۔ کیا تشبیہ ہے یہ۔ زندگی موت کی امانت ہے، مت بھولنا۔ ہم اگر بھول بھی جائیں تب بھی کیا ہو گا؟ کچھ نہیں۔ خود کو فریب دیں گے۔ موت تو ہمیں نہیں بھولتی۔ زندگی کے ساتھ ہم سفر موت، کبھی نہیں مہلت دیتی۔ آ کر رہتی ہے۔

بس ایک فرق ہے۔ کس نے کس طرح موت کا استقبال کیا۔ بس یہ ہے اصل۔ ایک دن انہوں نے مجھے کہا تھا: دیکھ، سامان اول تو ہونا ہی نہیں چاہیے اور اگر ہو بھی تو بس مختصر۔ دیکھ، موت کی گاڑی زندگی کے ساتھ ہی روانہ ہوتی ہے، تجھے کسی اسٹیشن پر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا کوئی وقت ہی نہیں جو تجھے معلوم ہو۔ لیکن آتی بروقت ہے۔ اس لیے بس چھوٹی سی گٹھڑی سے زیادہ جمع نہ کرنا، موت کی ٹرین آئے تو بس ہنس کھیل کر سوار ہو جانا۔ ہونا تو ہے، تو پھر ہنس کھیل کر کیوں نہیں۔ اور پھر ان کا نعرۂ مستانہ گونجتا "کوئی بھی نہیں بچے گا، آ آ مجھے تو تیار پائے گی"۔ انسان اور بندۂ عاجز لیکن طاقت کے زعم میں لتھڑا ہوا۔ فریب خوردہ سمجھ ہی نہیں پاتا، بس اتنی طاقت کے نشے میں چُور چلا تا رہتا ہے: یہاں سے ماریں گے، وہاں ماریں گے، کوئی نہیں بچے گا، نہیں چھوڑیں گے، بس ماریں گے ہم، ہلاک کر دیں گے۔ اور پھر آگ و خون کی بارش برستی ہے اور موت کا ہر کارہ پروانۂ اجل تقسیم کرنے لگتے ہے، اور پھر سب رخصت ہو جاتے ہیں، سب نے ہونا ہے رخصت۔

مجھے یاد آیا، اُس کی گردن تن سے جدا کرنے لگے تو پکارنے لگا: رب کعبہ کی قسم، میں تو کامیاب ہو گیا۔ ہاں یہ بھی ایک موت ہے، بارود کی بارش میں معصومیت کا قتل عام۔ کوئی بھی نہیں بچے گا جناب۔ زندگی موت کی امانت ہے اور مہلتِ عمل بہت تھوڑی۔ دنیا دھوکا ہے، سراسر دھوکا۔ کسی کی رہی نہ رہے گی، اپنے اپنے حصے کی آگ اور اپنے اپنے حصے کے پھول لے کر سب چلے جائیں گے۔

بس دیکھ کہیں تُو اپنے لیے آگ ہی آگ تو جمع نہیں کر رہا۔ اس کی ماں نے اس ریگستان کی ٹھنڈ سے بیتاب ہو کر اس سے کہا تھا: جا آگ لا۔ بہت دیر بعد وہ خالی ہاتھ لوٹا اور ماں کے حضور رد ست بدستہ عرض گزاری:
"ماں کہیں سے آگ نہیں ملی"

تب ماں نے تلخ ہو کر پکارا "جا کر جہنم سے ہی لے آتا۔" تو پھر اپنا سر خم کیا اور عرض کی "ماں وہاں بھی گیا تھا، میں نے وہاں کے نگراں سے کہا مجھے کچھ آگ درکار ہے، تب اس نے مجھے کہا جا اپنا رستہ لے، ہر انسان اپنی آگ دنیا سے خود لے کر یہاں آتا ہے۔

جناب اب بھی وقت ہے، نہ جانے مہلتِ عمل کب ختم ہو جائے۔ زندگی کی ہمسفر ہے موت۔ نہ جانے کہاں اچک لے۔ کچھ بھی تو نہیں رہے گا۔ بس نام رہے گا اللہ کا۔

کبیر سریر سرائے ہے، موت سووت تُو دن رین

بروز جمعرات 18 رمضان الکریم 1445ھ 28 مارچ 2024ء

نئی ڈیل

قرون وسطیٰ میں بصرے کا ایک چور عباس بن الخیاط بہت نامور ہوا، اس کی وارداتوں نے بصرہ اور اس کے اطراف میں ایک عرصے تک اہل ثروت کے ہوش اُڑائے رکھے۔ پولیس نے لاکھ جتن کئے مگر عباس کسی طور بھی ہاتھ نہ لگا۔ ایک روز اپنی ہی معمول سی غفلت کے نتیجے میں گرفتار ہوا تو اسے بصرے کی جیل میں یوں زیر حراست رکھا گیا کہ چوبیس گھنٹے سوا من وزنی بیڑیوں میں جکڑا رہتا۔ عباس کی گرفتاری کے بعد کچھ عرصے تک تو بصرے میں امن رہا مگر ایک روز نواحی شہر ایلہ میں ایک بہت بڑی واردات ہو گئی جس میں شہر کے ایک نامی گرامی تاجر کے گھر سے لاکھوں کے جواہرات چرا لئے گئے، متاثرہ تاجر کا گھر کسی طور بھی ایک قلعے سے کم نہ تھا جہاں واردات کا تصور ہی محال تھا، نتیجہ یہ کہ گویا بصرے کی پوری چیمبر آف کامرس دہل گئی، متاثرہ تاجر نے بصرے میں تمام تاجروں کے ساتھ ایک میٹنگ کی اور اگلے روز اعلان کر دیا کہ اس کے گھر ہونے والی واردات کے پیچھے حاکم بصرہ کا ہاتھ ہے، ورنہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی سرکاری سرپرستی کے بغیر کوئی عام چور اتنی بڑی واردات کر سکے۔

یہ حربہ کامیاب رہا، حاکم شہر نے کوتوال شہر اور اس کے ماتحتوں کا جینا حرام کر دیا اور حکم دیا جس طرح بھی ممکن ہو چور کو گرفتار کیا جائے اور مال برآمد کیا جائے۔ پولیس سر توڑ کوشش کے باوجود کیس حل کرنے میں ناکام رہی اور جونہی کوتوال نے حاکم کے سامنے ناکامی کا اظہار کیا تو حاکم بھڑک گیا اور اعلان کیا کہ اگر کوتوال مال مسروقہ کی برآمدگی میں مزید ایک ماہ ناکام رہا تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ اپنی جان کو یوں خطرے میں پا کر سیدھا ایل گیا اور وہاں صبح و شام عباس بن الخیاط کی خدمت شروع کر دی۔ چوتھے ہفتے عباس نے اس سے پوچھا "خدمت تو بہت ہو گئی اب مقصد بتاؤ؟" اس نے سارا ماجرا بیان کر کے کہا "میری جان خطرے میں ہے اس کیس کو حل کرنے میں میری مدد کرو اور صرف اتنا بتاؤ کہ اتنی بڑی واردات کرنے کی اہلیت رکھنے والے چور اس علاقے میں کون کون ہیں؟" عباس مسکرایا اور بولا: غیرت مند لوگ دوستوں کی مخبریاں نہیں کیا کرتے"۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا دامن اُٹھایا اور مسروقہ جواہرات نکال کر یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے کہ "تیری خدمت کے سبب تیرا حق مجھ پر واجب ہو چکا اور غیر تمند لوگ کسی کا حق اپنی جانب نہیں چھوڑتے یہ جواہرات لے، بصرے سے فرار ہو جا اور ساری زندگی عیش کر"۔ کوتوال جیل سے نکلا اور سیدھا حاکم کے پاس جا پہنچا، جواہرات پیش کر کے برآمدگی کا تمام احوال بھی بیان کر دیا۔

حاکم نے مال اس کے مالک کے حوالے کیا اور اگلے روز عباس کو جیل سے اپنے ہاں طلب کیا، اپنے گھر پر اس کی بیڑیاں کھلوائیں، اسے غسل کروایا، اعلیٰ درجے کا لباس زیب تن کروایا اور پورا دن مختلف انواع کے ماکولات و مشروبات سے تواضع کی، رات ہوئی تو اپنے ہی عالیشان بیڈ روم میں اسے سلا دیا۔ اگلا دن طلوع ہوا تو پاس بلایا اور کہا "میں جانتا ہوں کہ اگر ایک لاکھ کوڑے بھی تمہیں لگوا دوں، تب بھی تمہاری زبان نہیں کھلوا سکتا مگر میں نے کل سے تمہیں اپنا ذاتی مہمان بنا رکھا ہے، ہر لحاظ سے تمہاری مہمان داری کی ہے اور اکرام میں کوئی کمی نہیں چھوڑی، میں وعدہ کرتا ہوں تمہاری سزا معاف کر دوں گا اور جیل سے بھی خود کو رہا سمجھو، بس ازراہ مہربانی صرف اتنا بتا دو کہ جیل میں رہتے ہوئے یہ واردات کیسے کی؟" عباس مسکرایا اور کہا "یہ معاملہ ذرا گھمبیر ہے، اس کیلئے باقاعدہ "ڈیل" کرنی ہو گی جس میں میرے ساتھیوں کو بھی تحفظ حاصل ہو"۔

حاکم مان گیا اور یوں بصرے کے چور اور حاکم کے مابین آج کی زبان کے مطابق ایک "قومی مفاہمتی آرڈی نینس" کے خدوخال طے ہونے شروع ہوئے۔ "ڈیل" کے مطابق عباس نے یہ شرط منوائی کہ اس کے اور اس کے ساتھیوں کے تمام اگلے پچھلے جرائم معاف ہوں گے اور اس سے گزشتہ چوریوں کا مال

اور حساب کتاب نہیں لیا جائے گا جبکہ حاکم نے یہ شرط منوائی کہ وہ اور اس کے ساتھی توبہ کریں گے اور گارنٹی دیں گے کہ آئندہ چوری کی کوئی بھی واردات نہیں کریں گے۔ عباس اور حاکم نے ایک دوسرے کی شرائط مان لیں "ڈیل" کی پاسداری کے وعدے بھی کر لئے اور حلف بھی اُٹھا لئے۔ چنانچہ "مفاہمتی آرڈی نینس" کا اجرا ہوتے ہی عباس نے اپنی آخری چوری کا پورا ماجرا بیان کر دیا کہ کس طرح جیلر کو ایک ہزار اشرفیاں بطور رشوت دے کر وہ جیل سے رات ہوتے ہی نکلا اور کس طرح اس قلعے کا حفاظتی نظام درہم برہم کر کے اسی رات جواہرات چرا کر حسب وعدہ سورج نکلنے سے قبل جیل واپس آ گیا، حاکمِ بصرہ نے عباس کو رہائش مہیا کر دی اور اس کیلئے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا تاکہ اس کی تمام ضروریات پوری ہوتی رہیں جبکہ عباس اور اس کا گروہ بھی "ڈیل" کی تاحیات پاسداری کرتا رہا اور یوں اہل بصرہ کو ہمیشہ کیلئے چوری کی وارداتوں سے نجات مل گئی۔

پرانے وقتوں کے وہ انسان چونکہ ترقی یافتہ نہ تھے بلکہ پورے ہی "دقیانوسی" تھے اس لئے ان کے چور بھی معاشرے کے مجموعی مزاج کے مطابق "وضعدار" تھے، وہ غیرت کی بات بھی کیا کرتے تھے اور وعدوں کی پاسداری میں بھی اپنی پوری زندگی بتا دیا کرتے تھے۔ ہم آج کے انسان ہیں نہایت ترقی یافتہ اس لئے پرانے وقتوں کی وہ "خرافات" ہم میں نہیں پائی جاتیں البتہ ایک مسئلے میں ہم بھی اہل بصرہ کے ہم پلہ ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اہل بصرہ کی طرح چوری کی ایسی وارداتیں ہوتی ہیں جنہیں ثابت کرنا محال ہو جاتا ہے۔ میرا اشارہ ان بیوقوفوں کی جانب ہرگز نہیں جو دڑے سے دو ہزار کی ٹی ٹی منگواتے ہیں اور اس کے زور پر کسی امیر کے گھر سے لاکھوں یا بڑا تیر مارا تو کسی بینک سے کم و بیش دس کروڑ کروڑ لوٹ لیتے ہیں اور مہارت کا یہ حال ہوتا ہے کہ اگلے ہی دن پولیس افسر سینہ تان کے اعلان کر رہا ہوتا ہے کہ "ہم ملزمان کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں" اور پھر ایک روز تو پولیس مقابلے میں مارے جاتے ہیں یا گرفتار ہو کر سلاخوں کے پیچھے پہنچ جاتے ہیں۔

میرا اشارہ ان کی جانب ہے جو واردات سے قبل بھی محترم یا محترمہ ہوتے ہیں، واردات کے دوران بھی ان کا مقام یہی ہوتا ہے اور واردات کے بعد تو کرہ ارض پر ان سے بڑا "مظلوم" کوئی نہیں ہوتا۔ وہ بڑے دھڑلّے سے ٹی وی کی کھڑکی سے ہمارے گھروں میں جھانک کر منہ چڑاتے ہیں کہ اگر ہم چور ہیں تو مقدمات میں ثابت کیوں نہیں ہوا۔ ان کی وارداتوں کا حجم اتنا بڑا ہوتا ہے کہ بیرونِ ملک محلات کے محلات تعمیر ہو جاتے ہیں، دائمی وارنٹ جس عدالت نے جاری کئے ہوتے ہیں، وہی ان کو ان مقدمات میں بری بھی کر دیتی ہے۔ ایک کروڑ پاؤنڈ سے زائد مالیت کا تو ان کا صرف ایک نیکلس ہوتا ہے، ان کے گھوڑوں کی خوراک وہ من سلویٰ ہوتا ہے جس کا تصور دورِ حاضر کا عام شہری تو کجا، گئے وقتوں کے جلال الدین اکبر نے بھی نہ کیا ہو گا۔ انہیں بھنڈی کھانے کی خواہش ہو تو پی آئی اے کا خصوصی طیارہ "کلو" بھنڈی بیرون ملک پہنچانے کو فضا میں بلند ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسے ایماندار بھی ہمارے نصیب میں آئے کہ ملک سے لوٹی ہوئی رقم واپس ملی تو اس کے مقابلے میں اسی مالیت کا ایک نام نہاد روحانی ٹرسٹ اپنے نام بنوا لیا۔ توشہ خانہ کی کیا بات کی جائے، اس کو تو سب ہی نے نانا جان کی حلوائی کی دوکان سمجھ کر خوب استفادہ کیا۔ ان سب کی گاڑیاں بلٹ پروف اور دل شرم پروف ہوتے ہیں۔ آج بھی کبھی کبھار سوشل میڈیا یہ خبر اچھال دیتا ہے کہ جلد ہی ایک اور نئی حیران کن ڈیل کی توقع ہے تاکہ موجودہ مقتدر حلقے بھی معاہدوں کی پاسداری کرتے رہیں۔

اس ملک کے سابق جابر حاکم وفاسق کمانڈو پرویز مشرف نے ایک "مفاہمتی آرڈی نینس" کا اعلان کیا تھا جو یقیناً ایک "ڈیل" کا نتیجہ تھا۔ یہ آرڈی نینس پانچ صفحات پر مشتمل تھا اور ہر صفحے پر باوجود کوشش کے کوئی شق اس مفہوم کی نہ تھی کہ حاکم وقت نے بھی حاکم بصرہ کی طرح شہریوں کو آئندہ کیلئے چوریوں سے تحفظ دلا دیا ہو اور نہ ہی آج بھی وقت کے عباس بن الخیاط اس موڈ میں نظر آرہے ہیں کہ یقین کیا جاسکے کہ تائب ہو چکے ہیں۔ سو اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہم سے تو اہل بصرہ اچھے رہے۔ کاش ہمیں بھی حاکمِ بصرہ کا مفاہمتی آرڈی نینس نصیب ہوتا؟ جہاں عدالتِ عالیہ اس آرڈیننس کے موجد اور اس سے استفادہ کرنے والوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکی بھلا بیچاری بھوکی ننگی عوام مایوسی میں کس کا دروازہ پیٹے گی۔

بروز جمعتہ المبارک 19 رمضان الکریم 1445ھ 29 مارچ 2024ء

یومِ یتیم اور یومِ الدین

عید پھر آئے گی اور چلی جائے گئی۔ یہ تو خوشی کا موقع، اللہ کے انعام پر شکر ادا کرنے کا دن۔ لیکن جب میں اپنے وطن کے ان بے شمار لوگوں کو دیکھتا ہوں جن کے پاس عید کے دن بھی پیٹ بھر کر کھانے کو اور نہ ان کے بچوں کیلئے، نئے تو کیا صاف ستھرے کپڑے بھی نہیں ہیں اور ایسے لوگ بھی تو بے شمار ہیں جو اللہ کی عطا کردہ بے شمار نعمتوں سے اگر کچھ حصہ ان کو دے دیتے جو بے وسیلہ ہیں تو ان کے چہروں پر بھی مسکراہٹ آجاتی، ان کی آنکھوں سے اداسی ایک دن کیلئے ہی سہی، مفقود ہو جاتی اور خوشیاں رقص کرنے لگتی۔ مجھے مدینہ منورہ کا وہ یتیم بچہ یاد آرہا ہے جس کے سر پر رحمت العالمین رسول اکرم ﷺ نے ہاتھ رکھا تو گویا اسے دنیا کی سب سے بڑی نعمت مل گئی تھی۔ کیا اس کے امتیوں کو رحمت العالمین رسول اکرم ﷺ کی یہ سنت یاد نہیں رہی؟

کیا قرآن کریم میں یہ نہیں کہا گیا کہ "تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ) میں خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو۔" اور پھر فرمایا "تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں اکساتا"۔ یعنی نہ اپنے نفس کو اس کام پر آمادہ کرتا ہے اور نہ اپنے گھر والوں سے کہتا ہے کہ مسکین کو کھانا دیا کریں اور نہ لوگوں کو مسکین کی مدد پر اکساتا ہے۔ سبحان اللہ! رب العزت نے یتیموں اور مسکینوں سے بد سلوکی کرنے اور کھانا نہ دینے یا دوسروں کو اس کیلئے آمادہ نہ کرنے کا تعلق "یوم دین" کو جھٹلانے سے جوڑا ہے۔ یعنی یتیموں اور مسکینوں کی مدد نہ کرنے والے وہ ہیں جو یوم آخرت اور جزا و سزا پر ایمان نہیں رکھتے اور ظاہر ہے انہیں مسلمان نہیں کہا جا سکتا تو گویا مسلمان ہونے اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ یتیموں کو گلے لگایا جائے، ان سے شفقت سے پیش آیا جائے اور یتیموں، ناداروں اور مسکینوں کو خود بھی کھانا کھلایا جائے اور دوسروں کو اس پر آمادہ کرنے کیلئے باقاعدہ مہم بھی چلائی جائے۔

ان آیات مبارکہ کی روشنی میں آج اپنے اپنے کردار اور عمل کا جائزہ لیجئے۔ بیشک بنیادی ذمہ داری تو حکمرانوں کی ہے جو عوام سے ٹیکس اسی لئے وصول کرتے ہیں کہ عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کیا جائے۔ بینکوں کے ذریعے سال پورا نہ ہونے اور نصاب کو نہ پہنچنے والی رقم پر بھی زکوۃ کاٹ لی جاتی ہے تاکہ ناداروں پر صرف کی جائے لیکن پھر بھی ناداروں غریبوں اور مسکینوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا مسلمانوں کے حکمران یوم آخرت پر یقین نہیں رکھتے یا نظام زکوٰۃ صحیح طور پر نافذ نہیں کر سکے۔

اپنے طراف میں نظر ڈالئے آپ کو کتنے ہی نادار، مسکین اور یتیم بچے کوڑے پر رزق تلاش کرتے نظر آجائیں گے۔ معصوم بچے جو کچرے میں پھینکے گئے گلے سڑے اناروں سے اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کرتے ہیں، ایسے بچے ہر جگہ اور ہر شہر میں آپ کو ملیں گے۔ "کیا تم نے دیکھا ان لوگوں کو جو جزا و سزا کو جھٹلا رہے ہیں"۔ کیا ہم بھی تو ان میں شامل نہیں؟ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک مسلم معاشرے میں، ایک اسلامی ملک میں جگہ جگہ ننگے بھوکے لوگوں کی بھیڑ نظر آئے اور معاشرہ ان سے آنکھیں چرا لے؟ فرمان الٰہی تو یہ ہے کہ مسلمان اس وقت تک نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک وہ اپنی ایسی چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ نہ کر دیں جو ان کو بہت عزیز و محبوب ہیں۔ ہم روزے رکھ کر، نماز پڑھ کر، حج اور عمرے کی ہر سال سعادت حاصل کر کے خود کو نیکو کاروں میں شمار تو کرتے ہیں، پڑوسی بھوکا ہو، محلے میں یتیم، مسکین اور نادار بیوائیں بے سہارا ہوں اور ہم عمرے کیلئے دوڑے چلے جائیں جو فرض نہیں ہے، حج بھی زندگی میں صرف ایک بار مخصوص شرائط کے ساتھ فرض کیا گیا ہے پھر بھی کتنے ہی لوگ فخریہ گنواتے ہیں کہ انہوں نے کتنے حج کر لئے۔ گھر کے باہر نام کی تختی پر جلی حروف میں "الحاج" لکھوا رکھا ہے، ہر کسی سے "حاجی صاحب" سننے میں سرشاری محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ تو بتائیں

کہ اللہ کی راہ میں کتنا خرچ کیا، کتنے یتیموں، ناداروں اور مسکینوں کو سہارا دیا ،اپنی کتنی محبوب اشیاء اللہ کی راہ میں خرچ کر دیں، ایسا ہوتا تو آج کوڑے کے ڈھیر پر یہ بچے نظر نہ آتے جنہیں دیکھ کر یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ یہ انسان کے بچے ہیں یا پھر اسی کوڑے کرکٹ اور کچرے کا حصہ !

اللہ کا شکر ہے کہ کئی تنظیمیں ان حالات میں بھی یتیم، مسکین اور نادار بیواؤں کی نہ صرف خود مدد کر رہی ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اکسا رہی ہیں ۔شاید اسی لئے زلزلے آ آ کر پلٹ جاتے ہیں اور آسمان سے بارش بھی برس جاتی ہے کہ کھیتیاں سوکھنے نہ پائیں لیکن ہر کوشش ناکافی ہے کہ غربت میں اضافے اور یتیموں مسکینوں ناداروں کی تعداد بڑھانے کی منظم مہم اس سے کہیں زیادہ شدید ہے۔ آگے بڑھئے آپ کو اپنے عزیزوں رشتہ داروں میں ایسے سفید پوش، نادار غریب مل جائیں گے جو آپ کی توجہ اور مدد کے طالب ہیں۔ ان کی مدد کرتے ہوئے ان کی عزت نفس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ جب میں نے بالآخر ان سے عزت نفس کے خیال رکھنے کا بہترین طریقہ دریافت کیا تو حسب عادت مسکرائے کہ پگلے دنیا میں سب سے آسان کام بھی یہی ہے اور سب سے مشکل بھی۔ "آپ آسان زباں میں کیوں نہیں بتاتے، ایسے جواب سے تو الجھن بڑھتی ہے؟" فرمانے لگے "مشکل اس لئے ہے کہ اپنے کسی عزیز یا رشتہ دار کو دیتے ہوئے دل کے کسی گوشے میں برتری کا احساس ہر نیکی برباد کر دینے کا احتمال رہتا ہے لیکن اگر یہی کام اس طرح کیا جائے کہ اس عزیز یا رشتہ دار کو پتہ نہ چلے کہ یہ مدد آپ کر رہے ہیں، یہی کام اپنے کسی ایسے دوست کے ذریعے کریں جو ان کیلئے اجنبی ہو تو پھر دونوں اطراف میں خیر باقی رہتی ہے۔

ہم اپنی زیست کے پیہم مسرت خیز لمحوں سے ایک ساعت ہی سہی، انہیں صرف یاد ہی کر لیں جو ہماری سلامتی کیلئے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنی جانیں قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ کیا عید کے موقع پر دشمنوں کے ہاتھوں یتیم بنائے جانے والوں بچوں اور خاندانوں کیلئے بھی ہمارے پاس کچھ ہے؟

بروز ہفتہ 20 رمضان الکریم 1445ھ 30 مارچ 2024ء

گستاخی کی سزا موت

خروشچیف جب سوویت یونین کا صدر بنا تو اس نے پارلیمنٹ میں اپنے پہلے خطاب میں اسٹالن اور اس کی پالیسیوں پر تنقید شروع کر دی۔ اس کا کہنا تھا کہ اسٹالن میں برداشت نہیں تھی، وہ ایک آمر تھا، ظالم تھا، اختلاف کرنے والے ساتھیوں تک کو دشمن سمجھ لیتا تھا۔ اس کے خوشحالی اور معاشی استحکام کے دعوے بھی جھوٹے تھے اور سوویت یونین کو جتنا نقصان اسٹالن نے پہنچایا، اتنا سارا سرمایہ دار دنیا مل کر نہیں پہنچا سکی۔ خروشچیف جب ان خیالات کا اظہار کر رہا تھا تو معزز ارکان میں سے کسی نے چٹ پر کچھ لکھا اور ان تک پہنچا دیا۔ خروشچیف نے ایک لمحے کیلئے رک کر چٹ پڑھی، لکھا تھا "آپ کو اسٹالن کے قریب رہنے کا موقع ملا، جب وہ سوویت یونین کو نقصان پہنچا رہا تھا تو آپ نے اس کو روکا کیوں نہیں؟" خروشچیف کا چہرہ سرخ ہو گیا، اس نے وہ چٹ ایوان کی طرف لہرائی اور سخت غصے میں چیخا "یہ کس گستاخ نے لکھا؟" ایوان میں پن ڈراپ سائی لینس ہو گیا۔ تمام ارکان خوف سے خاموش اور سر جھکائے بیٹھے رہے۔

خروشچیف دوبارہ چلایا "میں پوچھ رہا ہوں یہ کس گستاخ نے لکھا ہے؟" ایوان میں خاموشی رہی تو خروشچیف نے قہقہہ لگایا، چٹ پھاڑی اور اس کے پرزے ہوا میں اچھال کر بولا "جب اسٹالن سوویت یونین کو نقصان پہنچا رہا تھا تو ہم بھی اس وقت ایسی ہی چٹیں لکھا کرتے تھے اور خاموش رہتے تھے"۔ یہ اقتدار کی ٹریجڈی ہے، شاہوں کی قربت میں بڑے سے بڑا عالم، بڑے سے بڑا فلاسفر، بڑے سے بڑا دانشور جب حلقہ بگوش شاہ ہو جاتا ہے تو پھر وہ اختلاف کی طاقت کھو بیٹھتا ہے۔ بادشاہوں کی صحبت میں تو کلمہ حق کہنے کیلئے بھی شاہ کی اجازت درکار ہوتی ہے، لہٰذا جب تک اقتدار کا سورج سوا نیزے پر رہتا ہے، بڑے سے بڑا حق گو بھی فقط چٹیں لکھنے اور جلالِ شاہی کے وقت سر جھکا کر چپ چاپ بیٹھے رہنے پر اکتفا کرتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے اِس وقت سر اٹھانے کی جرأت کی تو جان سے جاؤں گا، اگر جان بچ گئی تو قربتِ شاہی سے ضرور ہاتھ دھونا پڑیں گے اور ظاہر ہے ایوانِ اقتدار سے باہر کھڑے سیاستدانوں اور دریا کے خشک کناروں پر پڑی مچھلیوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

قربتِ شاہی میں زندگی بسر کرنے والے لوگ اس ماحول اور اس ماحول کے پروٹوکول سے اتنے آشنا ہوتے ہیں کہ اگر کبھی بادشاہ سلامت انہیں خود بھی اختلاف کا حق عنائت کر دیں تو بھی وہ چٹ لکھنے تک ہی محدود رہتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اختلاف کا یہ حق کسی وقت بھی گستاخی میں تبدیل ہو سکتا ہے اور اقتدار کے ایوانوں میں گستاخی کی سزا موت ہوتی ہے، جسمانی یا سیاسی موت! اللہ کا شکر ہے کہ پچھلے چار عشروں سے زائد میں یہ گستاخی کا عمل برملا اپنے نام اور تصویر کے ساتھ کر رہا ہوں اور اخبارات بھی دلیری کے ساتھ من و عن میرے اس گستاخ عمل کا ساتھ دے رہے ہیں لیکن ایسا نہیں کہ مجھے ان مشکلات کا سامنا نہیں اٹھانا پڑا بلکہ نہ صرف عمل کے کڑے احتساب سے بھی کئی مرتبہ گزرا ہوں بلکہ اس کی بھاری قیمت بھی چکانی پڑی ہے لیکن ہمیشہ اللہ اور اپنے آقا ﷺ کے دامن میں عافیت کا سہارا نصیب ہو جاتا ہے۔

وہ کہتے ہیں ڈاکوؤں کے کسی سردار نے ڈاکے کا ایک منصوبہ بنایا، اپنے ساتھیوں کے سامنے رکھا اور آخر میں پوچھا، کسی کو اعتراض ہو تو کھڑا ہو جائے، میں بڑا البرل سردار ہوں، میں اختلافِ رائے کو ہمیشہ پسند کرتا ہوں۔ سردار کا اعلان سن کر پورے یقین کے ساتھ ایک نوجوان ڈاکو ہمت کر کے کھڑا ہوا اور جرأت سے بولا "یہ ایک بالکل خام منصوبہ ہے"۔ سردار نے جیب سے اپنا پستول نکالا، نوجوان ڈاکو کے سر کا نشانہ لیا اور ساری گولیاں اس کے بھیجے میں

اتار دیں، نوجوان پیچھے کی طرف گرا، سردار نے پستول کی نالی میں پھونک ماری اور پسینہ پونچھتے ہوئے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر بولا "کسی اور کو اعتراض ہو تو وہ بھی کھڑا ہو جائے۔"

یوں تو ہماری عدلیہ کی تاریخ جسٹس منیر اور ناظم الدین کے نام سنتے ہی موجودہ تنازع تک کا سفر قوم کیلئے کسی بھی تعجب کا باعث نہیں بلکہ ہماری اسی قوم نے مشرف جیسے ڈکٹیٹر کے ہاتھوں ڈوگر کورٹ کو "گوبر کورٹ" قرار دیکر مسترد کر دیا تھا۔ قوم اور وکلاء برادری نے جسٹس افتخار کا جس دلیری کے ساتھ جو تاریخ ساز مظاہرہ کیا، اور چوہدری افتخار اور ان کے ساتھیوں نے جو قوم کو سہانے خواب دکھائے، اس کے بعد قوم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئی تھی کہ اگر خلفائے راشدین کا نہیں تو یقیناً عمر بن عبد العزیز کا دور دیکھنے کو ملے گا لیکن "اَے بَسا آرزُو کہ خاک شُدَہ" (ہماری تمام آرزوئیں تو مٹی میں مل گئیں)، خود چوہدری افتخار کے بیٹے اور داماد کے ہاتھوں ہی قوم کی ان تمام خواہشات کا بڑی دھوم دھام سے جنازہ پڑھا گیا۔

رہی سہی کسر پاناما کیس میں نکل گئی اور ابھی اس ندامت سے نجات نہیں ملی تھی کہ ثاقب نثار جیسا کم ظرف بابا رحمتے کا نقاب پہن کر اسی عدلیہ کی دھجیاں اڑاتا چلا گیا اور جہاں اپنے بھائی کی ہم آواز بن کر ملک کے ایک آرٹ ہسپتال کا بیڑہ غرق کر کے بیرون ملک سے وطن کی محبت میں سرشار ڈاکٹروں کا راستہ ہمیشہ کیلئے مسدود کرنے کے جرم عظیم کا مرتکب ہوا وہاں جانبدارانہ انصاف کی ایک تاریخ رقم کر گیا۔ اس کی بدعنوانی کا ایک گواہ خود اسلام آباد میں مضبوط ثبوتوں کے ساتھ انصاف کا طلب گار رہا لیکن اس کا منہ دھمکیوں سے بند کرنے کیلئے اپنے اختیارات استعمال کرنے کیلئے ان کی خدمات حاصل کرتا رہا جنہوں نے بعد ازاں اپنی مرضی کے فیصلوں کی شکل میں اپنا معاوضہ وصول کیا۔ آج تک کسی کو توفیق نہ ملی کہ ان تمام ججز کو عدالت میں کٹہرے میں کھڑا کر کے ان سے ملک کی بربادی کا حساب لیا جاتا بلکہ اب بھی لاکھوں روپے کی ماہانہ مراعات کے ساتھ مزے لوٹ لے رہے ہیں۔

ان کے جانشین بھی اسی راستے پر چلتے ہوئے عدلیہ جیسے ادارے پر ایک بوجھ بن کر قوم کی تقدیر کے ساتھ کھلواڑ کرتے رہے۔ خود قاضی فائز عیسیٰ کا سارا معاملہ بھی قوم کے سامنے ہے لیکن شوکت صدیقی کی ثابت قدمی کے ساتھ بھی تو یہ سلوک اسی عدالت نے کیا جس عدالت نے برسوں بعد سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس نسیم حسن شاہ کے بیان کو درست تسلیم کرتے ہوئے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کی سزا دینے کے فیصلے میں ججز پر دباؤ کو تسلیم کیا۔ اسی طرح سابق چیف جسٹس عطا بندیال اور ان کے خاندان کی خواتین کا بھی ایک سیاسی جماعت کے ساتھ میڈیا میں جو چرچا رہا، اس سے بھی قوم واقف ہے کہ قوم کے فیصلے عدالتوں کی بجائے گھر کی خواتین کی مرضی سے انجام پانے لگے۔

پاکستان میں عدالتی امور میں بیرونی مداخلت کی تاریخ نئی نہیں ہے۔ شوکت عزیز صدیقی کی حال ہی میں بحالی کے فیصلے کو مثال بنا کر اسلام آباد ہائیکورٹ کے چھ ججز نے آئی ایس آئی کے دباؤ سے متعلق سپریم جوڈیشل کونسل کو تفصیلی خط لکھا، جس کے ذریعے آئی ایس آئی سمیت انٹیلی جنس ایجنسیوں اور انتظامیہ کی عدالتی امور میں مداخلت سے متعلق تحقیقات کا دائرہ وسیع کرنے کی درخواست کرتے ہوئے جوڈیشل کونسل کا اجلاس طلب کرنے کو کہا ہے۔ ججوں کی جانب سے تحریر کردہ اس خط میں عدالتی امور میں آئی ایس آئی اور دیگر انٹیلی جنس اداروں کی طرف سے براہ راست مداخلت اور ججوں کو ہراساں کرنے کے الزامات عائد کیے گئے ہیں۔ اس خط نے ایک ایسی بحث کو جنم دیا ہے کہ عدالتوں کے متنازع فیصلے کسی حد تک بیرونی یا اسٹیبلشمنٹ کے دباؤ کے تحت سنائے جاتے ہیں۔

اس خط کے منظر عام پر آنے کے بعد پاکستان کے چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ کی سربراہی میں سپریم کورٹ کا فل کورٹ اجلاس بھی منعقد ہوا، جس کے

بعد ہنگامی طور پر جمعرات کو وزیر اعظم شہباز شریف اپنے وزیر قانون کے ہمراہ چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ سے سپریم کورٹ میں ملاقات کیلئے پہنچ گئے جہاں اس معاملے کی مزید تحقیقات کا اعلان کرتے ہوئے وزیر اعظم نے انٹیلی جنس اداروں کی مداخلت پر قابو پانے کی یقین دہانی کروائی ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ اس چائے کی پیالی میں آنے والے طوفان کا انجام کیا ہوتا ہے۔

حالیہ تاریخ میں سابق وزیر اعظم نواز شریف اوران کی بیٹی اوراس وقت وزیر اعلیٰ پنجاب مریم نواز شریف کے خلاف پانامہ کیس سے متعلق جسٹس ریٹائرڈ شوکت عزیز صدیقی کے آئی ایس آئی پر مداخلت کے الزامات ہوں یا "واٹس ایپ" کے ذریعے مشترکہ تحقیقاتی ٹیم بنانے کی خبریں، ٹرائل کورٹ کے جج سے ملاقات کر کے کیمروں کی نظر میں آنے والے ایک "کرنل صاحب" ہوں یا پھر خود چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ کے خلاف صدارتی ریفرنس، یہ سب وہ واقعات ہیں جن سے عدالتی امور میں غیر ضروری مداخلت کی بحث کو جنم دیا ہے جس میں نچلی عدالتوں اوراسلام آباد ہائی کورٹ کے ججز پر دباؤ کے بارے میں چند واقعات کا ذکر شامل کیا گیا ہے۔ اس خط میں نچلی عدالت کے ایک جج کی شکایت کا بھی قصہ شامل ہے جس نے اسلام آباد ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کے سامنے آئی ایس آئی اہلکاروں کی شکایت لگائی اور پھر بعد میں اس سیشن جج کو "او سی ڈی" بنا دیا گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ملک کی دیگر ہائیکورٹ کے ججز کو بھی ایسی ہی صورتحال کا سامنا ہے۔ ججز کے کوڈ آف کنڈکٹ میں رہنمائی نہیں دی گئی ہے کہ ایسی صورتحال میں ججز کا کیا ردعمل ہو؟ اور اس کے علاوہ یہ بھی واضح نہیں کہ ججز اس طرح کی مداخلت کو کیسے ثابت کریں۔

ججز کا مطالبہ ہے کہ عدلیہ کی آزادی کو یقینی بنانے کیلئے ادارہ جاتی "رسپانس" کی ضرورت ہے۔ گزشتہ برس 10 مئی 2023 کو بھی ہائیکورٹ ججز نے چیف جسٹس کو خط لکھا تھا کہ آئی ایس آئی والوں کی مداخلت پر توہین عدالت کی کارروائی شروع کی جائے۔ اس خط میں اسلام آباد ہائی کورٹ کے جسٹس شوکت عزیز صدیقی کو انٹیلی جنس ادارے کی مداخلت کا بتانے پر 11 اکتوبر 2018 کو عہدے سے برطرف کیے جانے کا بھی حوالہ دیا گیا تھا اوراب سپریم کورٹ نے 22 مارچ کے فیصلے میں جسٹس شوکت صدیقی کی برطرفی کو غلط قرار دیا اور انہیں ریٹائرڈ جج کہتے ہوئے شوکت صدیقی پر عائد کردہ الزامات کی تحقیقات کرانے کی مکمل حمائت کا اعادہ کیا۔

خط میں پوچھا گیا کہ عدلیہ کی آزادی کو "انڈرمائن" کرنے والے کون تھے؟ اوران کی معاونت کس نے کی؟ سب کو جوابدہ کیا جائے تاکہ یہ عمل دہرایا نہ جا سکے۔ اس کے علاوہ ججز کے کوڈ آف کنڈکٹ میں کوئی رہنمائی نہیں کہ ایسی صورتحال کو کیسے رپورٹ کریں۔ خط میں مطالبہ کیا گیا کہ اس سلسلے میں تحقیقات کا دائرہ وسیع ہونا چاہیے کہ کہیں اب بھی تو اس طرح کی مداخلت جاری نہیں؟ کہیں کیسز کی سماعت کیلئے مارکنگ اور بینچز کی تشکیل میں اب بھی تو مداخلت جاری نہیں؟ یہ بھی انکوائری ہونی چاہیے کہ کیا سیاسی کیسز میں عدالتی کارروائی پر اثرانداز ہونا ریاستی پالیسی تو نہیں؟ کہیں انٹیلی جنس اداروں کے ذریعے ججز کو دھمکا کر اس پالیسی کا نفاذ تو نہیں کیا جارہا ہے کہ ملک میں درپردہ ڈکٹیٹرشپ کو من وعن تسلیم کر لیا جائے؟

اس خط میں کہا گیا ہے کہ آئی ایس آئی کے آپریٹوز نے پٹیشن ناقابل سماعت قرار دینے والے ججز پر دوستوں، رشتہ داروں کے ذریعے دباؤ ڈالا اور جج شدید ذہنی دباؤ کے باعث ہائی بلڈ پریشر کا شکار ہو کر ہسپتال داخل ہوئے اور یہ معاملہ اسلام آباد ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس پاکستان کے علم میں لایا گیا، جس پر چیف جسٹس کو آئی ایس آئی کے ڈی جی کی طرف سے یقین دہانی کروائی گئی کہ آئی ایس آئی کا کوئی آفیشل ہائیکورٹ کے کسی جج کو "اپروچ"

نہیں کرے گا، لیکن اس کے باوجود آئی ایس آئی کے آپریٹوز کی مداخلت جاری رہی۔ ججز کی طرف سے لکھے گئے خط میں جج کا نام تو نہیں لکھا گیا تاہم یہ کہا گیا کہ جج کے بیٹے اور فیملی کے لوگوں کی سرویلنس کی گئی اور بعد ازاں جج کے برادر نسبتی کو مسلح افراد نے اغوا کیا، حراست کے دوران الیکٹرک شاک لگائے گئے اور وڈیو بیان ریکارڈ کرنے کے بعد 24 گھنٹوں کے بعد چھوڑا گیا۔

خط میں ایک ہائیکورٹ جج کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں ریفرنس دائر کر کے استعفی دینے پر دباؤ ڈالا گیا۔ اس خط میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایک جج سرکاری گھر میں شفٹ ہوئے تو ان کے ڈرائنگ روم اور ماسٹر بیڈ روم میں کیمرے نصب تھے اور کیمرے کے ساتھ سم کارڈ بھی موجود تھا، جو آڈیو اور وڈیو ریکارڈنگ کسی جگہ ٹرانسمٹ کر رہا تھا۔ جج کے ماسٹر بیڈ روم میں بھی کیمرا لگا تھا، جج اور اس کی فیملی کی پرائیویٹ وڈیو اور "یو ایس بی" بھی ریکور ہوئی۔

سپریم کورٹ سے حال ہی میں دوبارہ بحال ہونے والے جسٹس ریٹائرڈ شوکت عزیز صدیقی کے مطابق سپریم جوڈیشل کونسل کوئی ایڈوائزری فورم نہیں ہے بلکہ یہاں تو ججز کے کنڈکٹ کے خلاف امور زیر غور لائے جاتے ہیں۔ عدالت میں مداخلت پر جج کو خود پتا ہونا چاہیے کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ اب یہ اہم ہو گیا ہے کہ اب سپریم جوڈیشل کونسل اس پر کیا ردعمل دیتی ہے۔ یاد رہے کہ شوکت عزیز صدیقی نے آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل فیض حمید سمیت آئی ایس آئی کے سینیئر افسران پر یہ الزامات عائد کیے تھے کہ وہ پانامہ مقدمات میں نواز شریف اور مریم نواز کے خلاف فیصلہ دینے کیلئے ان کے گھر آ کر اسلام آباد ہائیکورٹ کا چیف جسٹس بنانے کی پیشکش بھی کی تھی۔ یہ وہی فیض حمید ہیں جن پر ملک کے انتہائی سنئیر صحافی ابصار عالم انتہائی خوفناک الزامات لگا چکے ہیں کہ کس طرح اس شخص نے اپنے عہدے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک کے ایک اہم ڈویلپر کے گھر میں رات کی تاریکی میں حملہ کر کے وہاں مرد خواتین کو اغوا کر لیا گیا اور بعد ازاں اربوں روپے کی پراپرٹی برطانیہ میں بیٹھے اپنی ایک ایجنٹ خاتون کے نام منتقل کروالی گئی لیکن آج تک ان کے خلاد کسی کو تحقیق تک کرنے کی جرات نہیں ہوئی۔

لاہور ہائیکورٹ کی سابق جج ناصرہ اقبال کے مطابق "وہ اور ان کے شوہر جاوید اقبال لاہور ہائیکورٹ کے جج رہ چکے ہیں۔ ان کے پاس کبھی کوئی آئی ایس آئی یا خفیہ ایجنسی کا اہلکار نہیں آیا اور نہ کبھی انہوں نے ایسا کوئی واقعہ اپنے شوہر سے سنا ہے۔ جب ججز خود کوئی "فیورز" نہ مانگیں تو دوسری طرف سے بھی کسی کو جرات نہیں ہوتی کہ وہ جج کو دباؤ میں لائے۔ جب جج پر فیصلے کیلئے کوئی دباؤ ڈالے تو ایسے میں جج کو توہین عدالت کی کارروائی عمل میں لانی چاہیے۔ جب جج یہ ظاہر کریں گے کہ وہ دلیر ہیں اور انہیں کوئی لالچ نہیں ہے تو پھر کوئی ان کے قریب بھی نہیں آئے گا۔ تاہم اب اسلام آباد ہائی کورٹ کے ججز نے ٹھیک راستہ چنا ہے اور اب چیف جسٹس کو اس پر تحقیقات کرنا ہوں گی۔

یہ ذہن نشین رہے کہ جب جج فرمائشیں کرتے ہیں اور اپنے خاندان والوں تک کیلئے بھی پروٹوکول مانگتے ہیں اور مرضی کے تبادلے اور تقرریاں تک کراتے ہیں، جس کے بعد دوسری طرف سے بھی فرمائشیں آنے کا سلسلہ تو شروع ہو گا۔ سیاسی مقدمات میں خود ج۔جز کو بھی ایک "گاڈ کمپلیکس" ہے اور انہیں یہ لگتا ہے کہ وہ وزرائے اعظموں کو بھی گھر بھیج سکتے ہیں اور انہوں نے ماضی میں ایسا کیا بھی ہے۔

سابق اٹارنی جنرل اشتر اوصاف کے مطابق اس خط میں ججز کا اپنا ذاتی مقصد بھی شامل ہو گیا ہے۔ سپریم جوڈیشل کونسل وہ فورم ہی نہیں جسے یہ خط لکھا جاتا ۔ اب یہ معاملہ سامنے آ گیا ہے اور چیف جسٹس کو اس پر از خود نوٹس لے لینا چاہیے۔ لاہور ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن کی سابق سیکریٹری نے بھی کہا ہے کہ ججز نے یہ خط لکھ کر بہت اچھا کیا ہے۔ ان کی رائے میں ہونے والے یہ واقعات بہت واضح تھے مگر اب اس خط نے ان پر مہر ثبت کر دی ہے۔ ججز عام

طور پر ملازمت کے بعد تو انٹرویوز میں ایسے اعتراف کرتے ہیں مگر دوران ملازمت ایسا بہت کم ہی ہوتا ہے۔ اگر نسین حسن شاہ اپنے دورِ ملازمت میں ہمت کر کے کسی قسم کا دباؤ قبول نہ کرتے تو آج کسی حد تک عدلیہ کے چہرے پر لگے ہوئے ایسے شرمناک داغ نہ ہوتے۔ وہ تو اپنے عہدے سے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی کرکٹ بورڈ کی سربراہی جیسے منصب کی مراعات وصول کرتے رہے اور جب کچھ نہ بچا تو میدان میں اپنی صفائی کیلئے ایسا بیان داغ دیا جو تاریخ میں ان کی بھی بدنامی کا طوق بنا رہے گا۔ اب بال چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ کی کورٹ میں ہے کہ وہ اس بوجھ سے کیسے سرخرو ہوتے ہیں یا پھر نمک کی کان میں نمک بن کر وہ بھی تاریخ میں اپنا نام درج کرو کے رخصت ہو جائیں گے۔ اب بار کونسل کو بڑھ کر ججز کی حمایت کرنی چاہیے تاکہ تاریخ کا دھارا درست کرنے میں مدد ملے۔

ایک اور وکیل کے مطابق سپریم جوڈیشل کونسل میں تو عام طور پر ججز کے خلاف لکھا جاتا ہے مگر یہاں ججز نے خود لکھ دیا ہے۔ مجھے لگتا ہے بار اور بینچ میں بہت خلیج ہے۔ ایک طرف جج اپنے گھر کے حصول کیلئے درخواست پر خود ہی سماعت کر رہے ہوتے ہیں تو پھر ان کے لکھے گئے خط کو بھی زیادہ اہمیت نہیں مل سکتی۔ جب ہائیکورٹ کے ججز نے اپنی عدالت کے چیف جسٹس کو خط لکھا تھا تو پھر اس وقت جسٹس میاں گل حسن اورنگزیب نے بھی دستخط کیے تھے مگر اب جو خط کونسل کو لکھا گیا ہے اس میں وہ شامل نہیں ہیں۔ دراصل یہ مہم وکلا کے ذریعے سے چلنی چاہئے۔ اس خط کے ذریعے چیف جسٹس قاضی فائز عیسیٰ کے خلاف محاذ آرائی نظر آتی ہے کہ یا وہ انٹیلیجنس ایجنسیوں کے خلاف لڑیں یا پھر اپنے ججز کو ناراض کر دیں۔ ایک جج کے خلاف ریفرنس دائر کر کے دباؤ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب خط کے ذریعے تو معاملہ حل نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ بات تو تحقیق طلب ہے کہ جج کے "لینڈ مافیا" سے تعلقات ہیں یا نہیں ہیں۔

ادھر اسلام آباد ہائی کورٹ ججز خط سے پیدا صورتحال پر سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن نے اپنے اعلامیے میں کہا ہے کہ سپریم کورٹ بار قانون کی حکمرانی پر یقین رکھتی ہے اور ججز کے خط میں مذکورہ واقعے پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کرتی ہے۔ عدلیہ اور ججوں کی نجی زندگی میں مداخلت کی نہ صرف مذمت ہونی چاہیئے بلکہ اس کے خلاف کارروائی بھی ہونی چاہیے۔ سپریم کورٹ بار عدلیہ کی آزادی پر یقین رکھتی ہے اور عدلیہ کی آزادی کے خلاف کوئی ایکشن برداشت نہیں کرے گی۔ ملک بھر کی دیگر بار ایسوسی ایشنز نے بھی مختلف انداز میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے جوڈیشل کونسل کی تشکیل کا مطالبہ کرتے ہوئے اس معاملے کو جلد از جلد حل کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ عالمی طور پر ہماری عدلیہ کی کارکردگی کے بارے میں مختلف عالمی سروے میں کیا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اب تو اس سنگین معاملے کے بعد یقیناً ایک ایسا تاثر ابھرے گا جو ملک کی ساکھ کیلئے انتہائی نقصان دہ ہو گا۔ اس لئے ضروری ہو گیا ہے کہ اس معاملے کی شفاف انکوائری کروائی جائے اور جو لوگ اس معاملے میں ملوث ہیں ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ قوم اس بات کی منتظر ہے کہ ہماری اسی عدلیہ نے سابقہ آرمی چیف باجوہ اور فیض حمید کو طلب کر رکھا ہے، اس پر اب تک کیا پیش رفت ہوئی ہے؟ کیا ان کو بھی سابقہ آرمی چیف مشرف کی طرح ایک مقدس گائے قرار دیکر بچا لیا جائے گا؟

آج کل کیا کیا کرشمے آدمی کے ساتھ ہیں
دل کسی کے ساتھ تلواریں کسی کے ساتھ ہیں
بھیڑ کوئی ہو، تماشہ کوئی، ہنگامہ کوئی
خوف کے مارے ہوئے ہیں، ہر کسی کے ساتھ ہیں

ہمارا اصل ریزرو بینک

"تم نے اس سال ٹانگوں کی زکوٰۃ دی"۔ انہوں نے عجیب سوال پوچھا۔ میں پریشان ہو کر رک گیا، سامنے لندن کا مشہورِ زمانہ خوبصورت باغ ریجنٹ پارک اپنی جولانی پر تھا، شام دھیرے دھیرے کھڑکیوں میں اتر رہی تھی، درختوں، پھولدار پودوں کی ہریالی میں برسات کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ ہم چند لمحوں میں پارک کے اندر بنے خوبصورت ٹریک پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے، وہ مجھے جینوا سوئٹزرلینڈ کے مضافات کی شاموں کے قصے سنا رہے تھے۔ وہ ایک ہفتہ پہلے گرمی کی چھٹیاں گزار کر لوٹے تھے، شام بھی خوبصورت تھی، منظر بھی لاجواب تھا اور گفتگو بھی زندگی سے بھرپور تھی۔ ہم چلتے چلتے پارک کے سب سے اونچے کونے میں پہنچ چکے تھے جہاں سے لندن شہر کا کچھ حصہ نظر آنے لگا لیکن چلتے چلتے نجانے ان کے دل میں کیا آیا، وہ رکے اور ایک لایعنی سوال داغ دیا۔ کیا تم نے اپنی آنکھوں کی زکوٰۃ دی ہے؟ "میری خاموشی میں حیرت بھی تھی اور پریشانی بھی۔ بابا جی نے خوشبودار نفیس دلپذیر چھڑی سے آنکھوں، کانوں اور زبان کا ٹیکس تو دے ہی دیا ہو گا۔" اور ہنس کر بولے "اچھا پھر تم نے اپنے بازوؤں، ہاتھوں، جوتے کی نوک کر یدی

چھوڑ میری پریشانی خوف میں بدل گئی، مجھے محسوس ہوا، بابا جی کا تعلق ان لوگوں سے ہے جن کا دماغ ایسے خوبصورت پارک کے اس بلند کونے پر کام کرنا دیتا ہے۔ میں نے ڈرے ہوئے پرندے کی طرح آگے پیچھے دیکھا، دور دور تک کوئی بندہ بشر نہیں تھا، صرف گھنے درخت تھے، جھاڑیاں تھیں اور سامنے پارک کے قدموں میں لندن شہر تھا، وہ تھے اور میں تھا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں کرنٹ سا سرکنے لگا، مجھے لگا وہ ابھی آگے بڑھیں گے، میری گردن دبوچیں گے اور مجھے مار کر کسی جھاڑی میں پھینک دیں گے۔ وہ میری کیفیت بھانپ گئے، انہوں نے قہقہہ لگایا اور آہستہ آہستہ واپس چلنے لگے۔ میں بھی ذرا فاصلہ رکھ کر چلنے لگا۔

"تین سال پہلے" ان کی آواز نشیب میں لڑکھڑاتی چٹان کی طرح میری سماعت سے ٹکرائی "تین سال پہلے جب ایک شخص نے مجھ سے یہ سوال پوچھا تو میرے بھی یہی احساسات تھے لیکن غور کیا تو میں نے جانا پاگل تو میں اس سوال سے پہلے تھا، تم بھی اسی نتیجے پر پہنچو گے"۔ میرا شک حقیقت میں بدل گیا، مجھے یقین ہو گیا کہ بابا جی حقیقتاً پاگل ہو چکے ہیں۔ میں نے زندگی میں ان کے منہ سے ایسی لایعنی اور بے سروپا باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔ تھوڑی دیر کیلئے رکے اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولے "دیکھو! ہم معاشرتی زندگی میں جو کچھ کماتے ہیں حکومت اس میں سے اپنا حصہ وصول کرتی ہے، یہ حصہ وہ ماحول کو پہلے سے بہتر، پہلے سے زیادہ ساز گار بنانے پر صرف کرتی ہے تاکہ ہم مزید کما سکیں، زیادہ بہتر زندگی گزار سکیں، حکومت کے اس حصے کو ہم ٹیکس کہتے ہیں۔ مذہب بھی ہماری سالانہ بچتوں، ہماری کمائیوں میں سے کچھ حصہ طلب کرتا ہے، اسے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ ہم ہر سال ٹیکس دیتے ہیں، زکوٰۃ نکالتے ہیں، یہ ہمارا فرض بھی ہے اور ہماری ذمہ داری بھی، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں"!

انہوں نے آگے بڑھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی تصدیق چاہی، مجھے ان کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی وحشت نظر آئی، میں نے فوراً ہاں میں سر ہلا دیا۔ وہ ہنسے اور چھڑی کو تلوار کی طرح ہوا میں لہرایا اور آگے چل پڑے۔ ہم اپنا اصل فرض، اپنی اصل ذمہ داری بھول جاتے ہیں۔ مجھے ان کی آواز جھاڑیوں سے الجھتی محسوس ہوئی، ہماری ٹانگیں ہیں، یہ قدرت کا معجزہ ہیں، بہت بڑا انعام، بہت بڑی نوازش ہیں۔ میں نے لوگوں کو ٹانگوں کے بغیر زندگی گزارتے بھی دیکھا، یقین کرو اس زندگی کو زندگی اور انسانوں کا انسان کہتے ہوئے دل دکھ سے اور الفاظ خون سے بھر جاتے ہیں۔

ہمارے بازو ہیں، ہماری زندگی کا آدھا گلاس ان کے بغیر خالی ہے، ہاتھ ہیں، ہم ان کے بغیر زندگی کو زندگی نہیں کہہ سکتے، ذرا سوچو! جو شخص انگلیوں سے

برف کی ٹھنڈک اور گرم کپ کی حدت محسوس نہیں کر سکتا، اس کی زندگی کتنی ادھوری ، کتنی نامکمل ہے، ہماری آنکھیں ہیں، سامنے برٹش ٹیلی کام ٹاور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے، دیکھو اس بلند ٹاور کے اوپر سے اترتی شام تک قدرت کے کتنے ہزار رنگ، کتنے لاکھ عکس ہیں، زندگی ان رنگوں اور عکسوں کے بغیر مکمل سمجھی جاسکتی ہے؟ نہیں، بالکل نہیں۔ میں جب تک اپنی پوتی کی آنکھوں میں تیرتی چمک نہ دیکھ لوں، مجھے اپنے ہونے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ پھولوں کے رنگ، برسات کی اڑتی پھوار، وہ سامنے خوبصورت رنگوں سے مزین نظر آنے والی قوسِ قزاح، کروٹیں بدلتا آسمان اور جھیلوں میں لرزتے کانپتے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے دائرے ہی میرے لئے زندگی ہیں۔ یہ آنکھیں نہ ہوں تو ہاتھوں کو رنگ ٹٹولنے پڑیں، چڑھتے سورج اور گہری ہوتی شام کے معانی ایک ہو جائیں۔

ایک گھنٹے میں بارہ کھرب چالیس ارب اسی کروڑ بہتر لاکھ شعاعیں پھینکنے والا سورج دو ملی میٹر پتلی میں غروب ہو جائے۔ ہمارے کان ہیں، ذرا سنو! تمہارے کان ان سرسراہتی ہوا کی درختوں سے سرگوشیاں سن رہے ہیں، پتوں کی پازیب تم سے کچھ کہہ رہی ہے، وہ دیکھو ڈیزی کے پھول سے تتلی اڑی ، اس کے پروں کی سرسراہٹ سنو، اس سرسراہٹ میں زندگی ہے۔ سامنے پارک کے قدموں میں بہتے شہر سے آوازیں اٹھ اٹھ کر تم تک پہنچ رہی ہیں، ذرا سوچو! ایک لمحے کیلئے سوچو، یہ ساری آوازیں گونگی ہو جائیں، تمہارے کان پتھر ہو جائیں، تم کچھ نہ سن سکو، تمہیں پانی تو نظر آئے، اس کے وجود سے اڑتی جھاگ بھی دکھائی دے، لیکن تم ان کی آواز نہ سن سکو تو تمہاری زندگی کتنی بہری، کتنی گونگی ہو۔ ادھورا ہونے کا شدید احساس کہاں کہاں تمہارا راستہ روکے، لوگ تمہیں آواز کی بجائے ہاتھ لگا کر متوجہ کریں اور تم ٹھوکروں اور ٹھڈوں کو آواز سمجھو۔ اور ہماری زبان ہے، یہ زبان ہماری سوچ، ہمارے خیال کو خدوخال دیتی ہے۔ انہیں ملکوتی حسن، انہیں جسم اور انہیں بدن عطا فراہم کرتی ہے۔ انہیں لفظوں، تشبیہوں اور استعاروں کا لباس دیتی ہے۔ یہ زبان نہ ہو تو لفظ نہ ہوں، لفظ نہ ہوں تو خیال کہیں سوچ کی گھاٹیوں ہی میں دم توڑ دیں، نہ میں تمہیں کچھ کہہ سکوں اور نہ تم مجھ سے کچھ سن سکو۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے اور آنکھیں بند کر کے نجانے کس سوچ میں ڈوب گئے!

میں ان کے خیالات کی روانی میں بہتا جا رہا تھا کہ دوبارہ گویا ہوئے "میرے دوست یہ ٹانگیں، یہ بازو، یہ ہاتھ، یہ آنکھیں، یہ کان اور یہ زبان ہمارا اصل ریزرو بینک ہیں، ہماری زندگی کی ساری کمائی، ہماری ساری پونجی اسی میں جمع ہے۔ اس میں سے کوئی ایک لاکر ہمیشہ کیلئے لاک ہو جائے تو ہماری پونجی، ہماری کمائی ضائع ہو جائے گی، ہم کنگال ہو جائیں گے، ہم مفلس اور قلاش ہو جائیں گے۔ غریب وہ نہیں ہوتا جس کے پاس زادِ راہ نہیں ہوتا، غریب وہ ہوتا ہے جس کے پاس پاؤں نہیں ہوتے۔ اپنے ان پاؤں، ان ٹانگوں، ان بازوؤں اور ان آنکھوں کا ٹیکس دو، ان کی زکوٰۃ نکالو۔ اگر نہ نکالی تو قدرت یہ ٹیکس، یہ زکوٰۃ اسی طرح وصول کرے گی جس طرح حکومتیں قرقی کے ذریعے وصول کیا کرتیں ہیں"۔ وہ خاموش ہو گئے تو میں نے ان کی طرف دیکھا تو وہ اپنا منہ دوسری طرف کر کے اپنی بہتی آنکھوں کے اشک مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہے تھے اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اچانک قرقی کا نوٹس میرے ہاتھ میں تھما دیا ہے۔

یہ ٹیکس، یہ زکوٰۃ دی کیسے جاتی ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ سوال کیا؟ "ہاں" انہوں نے چھڑی گھمائی "سال میں ایک ویل چیئر، لکڑی کی ایک ٹانگ، ایک بازو، ایک اندھے کی آنکھوں کا آپریشن، ایک آلہ سماعت، خاموشی سے کسی سفید پوش بیمار کے علاج کے اخراجات کی ادائیگی، کسی غریب بیوہ کی بچی کی

شادی کے مصارف برداشت کرنا یا پھر کسی یتیم بچے کی کفالت کی ذمہ داری اٹھانا، زندگی کے اس ریزرو بینک کی زکوۃ ہے اور بہت سارا شکر اور ڈھیر ساری توبہ اس کمائی، اس پونجی کا صدقہ "۔ وہ خاموش ہوئے، انہوں نے کچھ سوچا اور پھر آہستہ سرد ہوتی آواز میں بولے "ہم کتنے بے وقوف ہیں، جو دنیا میں کماتے ہیں، اس کا ٹیکس تو ساری عمر بھرتے رہتے ہیں لیکن جو دولت انعام میں ملتی ہے، جو کچھ ہمیں قدرت عطا کرتی ہے، اس کا ہم شکر تک ادا نہیں کرتے ۔ افسوس ہمارے پاس آنکھیں ہیں، لیکن ہمیں اندھوں کا اندھا پن دکھائی نہیں دیتا، اپنے مولا کے رنگ نظر نہیں آتے! جب تمہاری آنکھیں اپنے مولا کے رنگ دیکھنے اور سمجھنے کے قابل ہو جائیں تو پھر اپنے مولا کے رنگ سمیٹتے ہوئے تمہیں اپنا دامن بھی تنگ نظر آئے گا۔ تمہارے من کے خزانے میں ان رنگوں کی اس وقت بہتات ہو گی جب تم ان رنگوں کو اپنے بہن بھائیوں میں بلا تفریق تقسیم کرنے کو اپنا شعار بنالو گے "۔

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ.....! پس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے!

اے چشمِ شوق خونِ جگر لا اچھال کر
سنتا ہوں ان کو اشکِ ندامت پسند ہے

بروز بدھ 24 رمضان الکریم 1445ھ 3/ اپریل 2024ء

خود احتسابی

میں ہمیشہ دل کی بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں آپ سے۔ خود کو کبھی حرفِ اول و آخر نہیں سمجھا میں نے۔ میں انکسار سے نہیں کہہ رہا کہ میں کچھ نہیں جانتا، واقعی ایسا ہی ہے۔ میں لوگوں سے گفتگو کرتا ہوں، انہیں پڑھتا ہوں۔ ہاں میں بہت کتابیں پڑھتا ہوں اور ہر طرح کی آج بھی میرے پاس ہزاروں کتب ہیں لیکن اس کے باوجود وسیع المطالعہ ہونے کا دعویٰ دار کبھی بھی نہیں رہا۔ میں نے بہت کچھ دل لگا کر پڑھا ہے اور کچھ سے میں سرسری گزرا ہوں۔

میں کوئی دانشور نہیں ہوں، عام سا بندہ ہوں۔ میرے رب کا کرم ہے کہ مجھے بہت سے اہل علم و فضل کی صحبت حاصل ہے۔ ان سے خوب بحث مباحثہ کی کیفیت بھی رہتی ہے۔ بس یہ کرم ہے میرے رب کا، توفیق ہے میرے پالنہار علیم و خبیر کی۔ میں تو اپنے قارئین اور بچوں سے بھی بہت سیکھتا ہوں اور کھلے دل سے اس کا اعتراف بھی کرتا ہوں۔ اس کا اظہار اکثر آپ کو میری تحریروں میں بھی ملے گا۔ آج کل تو چھوٹے بچوں سے روزانہ کوئی نہ کوئی بات سیکھنے کو ملتی ہے۔ میں بہت سے معاملات میں کورا ہوں، ہمارے بچے بہت ذمہ دار اور سمجھدار ہیں۔ منافقت سے مبرا، بالکل صاف سیدھی اور آسان زبان میں عمدگی کے ساتھ حالات پر تبصرہ کرتے ہیں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے اور کرنا بھی چاہئے۔

ہمارا ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہم اعتراف نہیں کرتے، تسلیم نہیں کرتے، ہم غلطی کرتے ہیں اور اس پر دلیل لاتے ہیں۔ یہ تو کہا گیا ہے کہ احسان کرو اور بھول جاؤ، مت جتلاؤ لیکن یہ کب کہا گیا ہے کہ جس پر احسان کیا جائے وہ بھی اپنے محسن کا تذکرہ نہ کرے! اسے ضرور اپنے محسن کا ذکر کرنا چاہئے اور بہت پیار سے کرنا چاہئے جبکہ ہم نہ تو اعتراف کرتے ہیں اور نہ ہی ہم میں غلطی تسلیم کرنے کی خُو ہے۔ غلطی ہو جائے تو ہمیں کھلے دل سے تسلیم کرنا چاہئے کہ ہم غلطی پر تھے۔ ہم انسان ہیں، ہو گئی ہم سے غلطی، ہمیں نادم ہونا چاہئے، پشیمان ہونا چاہئے، معذرت کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کرنی چاہئے لیکن ہم نہیں کرتے۔ ہمارے اندر ایک بہت بے حس اور سفاک آدمی رہتا ہے، وہ ایک ٹنڈ منڈ درخت ہے، بغیر پھل کے، جھکتا ہی نہیں ہے۔ ہاں بہت سی باتیں اور معاملات ایسے ہیں کہ سر کٹ جائے تو غم نہیں، جھکنا نہیں چاہئے۔ خاک بسر انسانوں کے سر ظالموں کے سامنے کیوں جھکیں؟ جھوٹ، فریب، دغابازی، مکاری اور عیاری کے سامنے کیوں جھکیں؟ باطل کے سامنے سر تو بلند رہنا ہے، لیکن انسان کو جھکا ہوا ہی رہنا چاہئے۔ جب پھل لگ جاتے ہیں تو شجر جھک جاتے ہیں۔

اسلام نے عبادات کا جو تصور دیا ہے، کیا وہ اپنا اثرات نہیں رکھتا؟ کیا یہ رب نے ویسے ہی کہہ دیا ہے؟ یہ انسان کو انسان بناتا ہے، اسے ثمر بار کرتا ہے، اور اگر ہم سب کچھ کرتے ہوئے یہ پھل نہیں پاتے تو سوچنا چاہئے کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ رب کے فرمان میں تو نہیں ہو سکتی، ہم میں ہی ہے، تو وہ ہمیں تلاش کرنی چاہئے۔ ہم دوسروں کے عیب تلاش کرتے رہتے ہیں اور ہمیں اتنی مہلت ہی نہیں کہ اپنے عیبوں کو کھوج سکیں۔ ہمیں پردہ پوشی کا حکم دیا گیا ہے، تشہیر کی بجائے اس سے بچنا چاہئے، بس!

میرے رب کی تو ہے یہ ساری کائنات، سب کچھ، سارے موسم، سارے ماہ و سال، اور وہ سب کچھ جو نظر آتا ہے اور جو پوشیدہ ہے..... سب کچھ رب کا ہے، لیکن یہ جو ماہ رمضان ہے اسے اس نے کتنی چاہ سے، پیار سے کہا ہے کہ یہ میرا ہے، میں خود دوں گا اس کا صلہ۔ ہم بھی جب کسی سے کہیں کہ ہیں تو بہت سے لوگ میرے ارد گرد لیکن یہ جو فلاں ہے، یہ بہت خاص ہے، میرا ہے تو دل کتنا شاد ہو جاتا ہے خوشی سے، مسرت سے، تو یہ بہت خاص ہے کہ میرے رب نے کہا ہے یہ میرا ہے۔ ہم نے اپنی نیند قربان کی ہے، ہم سحری میں اٹھتے ہیں اور سورج ڈھلنے تک بھوکے پیاسے رہتے ہیں، کیوں؟ اس لئے

ناں کہ میرے رب نے کہہ دیا ہے۔ میرے رب کو کیا ملتا آپ کی بھوک سے، پیاس سے، سجدوں سے، تلاوت سے، کچھ بھی تو نہیں ملتا اسے۔ بس وہ دیکھتا ہے کہ بندے نے سر تسلیم خم کر لیا۔ اور پھر کریم اتنا ہے کہ توفیق بھی خود دیتا ہے، ورنہ ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔

روزہ ہمیں برداشت سکھاتا ہے، ایثار سکھاتا ہے، غم خواری سکھاتا ہے، قربانی سکھاتا ہے، ضبط نفس کا درس دیتا ہے، میرے اندر تکبر کے بت کو توڑتا ہے، ہمیں بندہ نفس بننے سے بچاتا ہے، بندوں سے محبت کرنا سکھاتا ہے۔ جس تربیت کی انسان کو ضرورت ہے، وہ مکمل جامع شکل میں ہم تک پہنچاتا ہے، یہ ہے رمضان۔ لیکن کیا ایسا ہی ہے؟ ہم روزانہ اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہم نے برداشت کرنا سیکھا؟ ہم نے حق تلفی سے دامن بچایا؟ ہم نے دل آزاری چھوڑ دی؟ ہم نے معذرت کی اور آئندہ وہ کام نہ کرنے کا عہد کیا؟ ہم نے انسانوں کی خدمت کی؟ ہم نے صبر کیا؟ ہم نے اپنے نفس کو پچھاڑا؟ نہیں ناں..... ہم اب بھی ایسے ہیں، اپنی انا کے بت کے پجاری۔ اگر ہم روزہ، نماز، حج زکوۃ اور عمرے کر کے بعد بھی ویسے کے ویسے ہی ہیں تو بیکار ہے ناں یہ سب کچھ..... کیا حاصل اس کا! مجھے بتایئے؟

اندر آلودہ، باہر پاکیزہ تے توں شیخ کہاویں
راہ عشق دا سوئی دا نکہ دھاگہ ہووے تے جاویں

اس پنجابی شعر کا ترجمہ بھی ملاحظہ فرمالیں:

تم کیسے اپنے اندر غلاظت چھپا کر خود کو دنیا کے سامنے ایک نیک بزرگ کے طور پر پیش کرتے ہو
عشق کا راستہ تو سوئی کا وہ سوراخ ہے کہ تم دھاگہ بن کر ہی اس کے اندر سے گزر سکتے ہو (یعنی عاجزی، مسکینی اور شرمندگی کا راستہ اپنا کر ہی اللہ کے ہاں مقبولیت پا سکتے ہو۔

مجھے تو خود پر توجہ دینی چاہئے کہ میرے اندر کوئی گڑبڑ ہے، میرے اندر ہے کوئی خرابی! میں خود کو چھوڑ کر دوسروں کے پیچھے پڑا رہتا ہوں، مجھے تو خود کو دیکھنا چاہئے، مجھے اپنا محاسبہ کرنا چاہئے، نہیں کرتے ناں ہم ایسا! بس دوسروں کو ڈستے رہتے ہیں۔ ہمیں بندہ بننا چاہئے اور ہم خدائی لہجے میں بات کرتے ہیں۔ نہ عجز ہیں ہم میں اور نہ انکساری، نہ رحم دلی نہ خلوص، اصل درکار ہے میرے رب کی بارگاہ میں، وہاں جعلی کا گزر نہیں ہے، بالکل بھی نہیں۔ ہم روزہ رکھ کر دوسروں سے ایسا برتاؤ کرتے ہیں جیسے ہم نے کوئی احسان کر دیا ہے۔ میں سر تا پا غصے میں لتھڑا ہوا ہوں، میں آگ اگل رہا ہوں اور پھر میں روزے سے بھی ہوں، عجیب بات ہے۔

اگر ہم نے اس ماہ میں زیادہ نہیں صرف ایک کام کر لیا کہ اپنی خامیوں پر نظر ڈال لی اور انہیں دور کرنے کی کوشش کی۔ یہ بہت مشکل تو ہے لیکن رب کی توفیق سے تو کوئی کام مشکل نہیں رہتا، وہ رحمت ہے اور رحمت آسانی کا نام ہے۔ مجھے یہ بات آج ہی طے کر لینی چاہئے کہ میں بندہ نفس نہیں، بندہ رب بنوں گا۔ اپنے اندر کے بت کو پاش پاش کر کے باہر پھینکنا ہے۔ اگر میں اس میں کامیاب ہو گیا تو میں سمجھوں گا کہ میں نے اس ماہ رمضان کی برکتیں سمیٹ لی ہیں۔ اگر نہیں تو بس خسارہ ہے..... بہت نقصان..... ناقابل تلافی۔ بس میں بھوکا پیاسا، ٹنڈ منڈ درخت، بغیر کسی پھل پھول کے۔ میں ایمانداری سے سمجھتا ہوں کہ اگر آپ اپنے رب سے نیکی پر چلنے کا راستہ مانگیں تو وہ کریم رب کبھی بھی آپ کی خواہش کو رد نہیں کرے گا بلکہ وہ آپ کے گرد و پیش میں ایسے ساتھی مہیا کر دیتا ہے جو خاموشی سے آپ کی اصلاح کرتے رہتے ہیں

میں بھی ایسے افراد کی تلاش میں رہتا ہوں اور میرا رب مجھ پر ایسا فضل عطا فرماتا ہے کہ ایسے افراد کی صحبت عطا فرما دیتا ہے کہ ان کے ساتھ بیٹھنا، ان سے بات چیت کرنا بلکہ ان کو دیکھنا بھی دل کے سکون کا باعث بن جاتا ہے۔

میرے ایک ایسے ہی مربی اور دوست ایک افغان نژاد پروفیسر عبدالکریم صاحب ہیں، جن کی رفاقت نے مجھے مالا مال کر دیا ہے۔ ان کا روشن اور مسکراتا ہوا چہرہ جب گفتگو کرتا ہے تو ان کا ہر الفاظ دل میں اتر جاتا ہے حالانکہ وہ مجھ سے اردو میں گفتگو میں دقت محسوس کرتے ہیں اور میں شدید خواہش کے باوجود فارسی بولنے سے قاصر ہوں۔ مجھے ایک مرتبہ انہوں نے بڑی محبت سے نصیحت فرمائی کہ آپ ہمیشہ اپنے موبائل فون پر قرآن پڑھتے ہیں، آپ کیوں براہ راست اللہ کی کتاب کو ہاتھ میں تھام کر قرآن کی تلاوت کرتے کہ اس سے اللہ کی کتاب سے محبت و احترام کا رشتہ بڑھ جاتا ہے۔ یقین کریں کہ اس دن کے بعد میں نے عملاً محسوس کیا کہ یہ چھوٹی سی نصیحت میں کس قدر بڑا اسبق پنہاں ہے، ہاں البتہ اگر آپ جب کبھی سفر یا حضر میں ہوں تو وہاں بیکار بیٹھنے کی بجائے اپنے موبائل فون پر قرآن پڑھیں تو اس میں کوئی حرج نہیں اور ایک مرتبہ انہوں نے دو رکعت نوافل "صلاۃ المسجد" پڑھنے کی ایسی نصیحت فرمائی کہ اب یہ عمل زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ کیا آپ بھی ایسے کرم فرماؤں کی سنگت کی دعا کرتے ہیں جو ہماری عقبیٰ و آخرت کی نجات کا وسیلہ بن جائیں۔

اپنے رب کو راضی کرنے کا بہترین مہینہ اور موقع ہے۔ یاد رہے کہ روزِ جزا کے دن رب یہ سوال ضرور کرے گا کہ میرے بندے، میں بھوکا اور پیاسا تھا مگر تو نے مجھے نہ کھانا کھلایا اور ہی میری پیاس بجھانے میں میری مدد کی تو بندہ حیراں و پریشاں رب سے نہ کہے گا کہ اے دونوں جہانوں کے پالنہار! تو خود رزاق ہے تو میرا کریم رب یہ فرمائے گا کہ میرے فلاں بندے نے میرے نام کا واسطہ دیکر تجھ سے کھانا کھلانے کی درخواست کی، فلاں نے پیاس کی حالت میں پانی کی گزارش کی لیکن تیرے کان پر جوں تک نہ رینگی حالانکہ تیرے پاس میرا ہی سب کچھ دیا ہوا تھا تو بندے کے پاس ماسوائے شرمندگی کے اور کچھ نہ ہو گا۔

غزہ، افغانستان اور کشمیر میں ہزاروں گھرانے جہاں اس عید پر اپنے شہداء کو یاد کر کے اشک بہائیں گے وہاں غربت و عسرت کی وجہ سے اس عید پر فاقے کی کیفیت ہو گی جبکہ یہود و ہنود کی طرف سے عائد کردہ غیر انسانی پابندیوں کی بناء پر بیرونِ ممالک سے کسی خیراتی ادارے کو اجازت نہیں کہ وہ اس مشکل گھڑی میں اپنے بہن بھائیوں کی دستگیری کیلئے پہنچ سکے۔ لیکن اس کے باوجود کچھ ادارے جان جوکھوں میں ڈال کر ان فاقہ کشوں تک پہنچنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ اہل خیر سے درخواست ہے کہ وہ فوری طور پر ان کی مدد کو پہنچیں۔ عید کی حقیقی خوشی حاصل کرنے کا اس سے بہترین موقع پھر نہ ملے گا۔ آپ ان بیکسوں کیلئے آسانیاں فراہم کریں، یقیناً میرا رب تو کئی گنا بڑھا کر واپس کرتا ہے۔ هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ، نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے پھر اے جن و انس، اپنے رب کے کن کن اوصافِ حمیدہ کا تم انکار کرو گے (سورۃ الرحمٰن 60-61)

بہت خوش رہیں آپ، سدا خوش رہیں۔

کچھ بھی تو نہیں، فنا ہے، فنا ہے ہر جا فنا ہے۔ بس نام رہے گا اللہ کا۔

تو کیا خود سے بھی شرمندہ نہیں میں

نہیں ایسا نہیں، ایسا نہیں میں

برابر ہے مرا ہونا، نہ ہونا
جو اپنے عہد میں مسیحا نہیں میں

بروز 2 جمعرات 25 رمضان الکریم 1445ھ 4/ اپریل 2024ء

جرمِ عظیم

چند عشرے کتنا فرق ڈال دیتے ہیں۔90ء کی دہائی کے وسط میں امریکیوں(اور بعض دیگر اقوام) کو یقین تھا کہ امریکی لبرل جمہوریت مستقبل میں دنیا پر چھاجائے گی۔وار سا پیکٹ پاش پاش ہو چکا تھا۔لاطینی امریکا کے آمر انتخابات کرا رہے تھے۔انسانی حقوق کے تصورات پھیل رہے تھے اور لبرل ادارے پروان چڑھ رہے تھے۔انسانیت کا مستقبل جمہوریت سے وابستہ دکھائی دیتا تھا۔فرانسس فوکویاما کے مشہور جملے ''انسانیت اپنا نقطۂ عروج پا چکی "اور "یہاں تاریخ اختتام پذیر ہوتی ہے'' دنیا بھر میں عمومی سیاسی سوچ کا حصہ بن چکے تھے۔ٹامس فریڈمین ہم سب کو بتا رہے تھے کہ سبھی سرمایہ دارانہ نظام کو اپنا چکے ہیں اور یہ کہ اس نظام کا اہم ترین کھلاڑی امریکا ہے۔

یہ بات قابل فہم ہے کہ تین امریکی صدور نے انہی تصورات کو سراہا،اپنایا اور آگے بڑھایا۔کلنٹن کی قومی سلامتی پالیسی روابط رکھنے اور اپنا حلقہ اثر وسیع کرنے کے گرد گھومتی تھی۔اس کا اعلانیہ مقصد جہاں تک ہو سکا،جمہوریت کا پھیلاؤ تھا۔بظاہر جارج ڈبلیو بش لبرٹی ڈاکٹرائن رکھتا ہو اطاقت کا ایسا توازن چاہتا تھا جو آزادی کی حمایت کرے۔اس نے اپنے دوسرے افتتاحی خطاب میں اسے امریکا کا مقدس مشن قرار دیا لیکن ''ورلڈ آرڈر ''جیسی لعنت کا سرخیل بھی وہی ہے۔اوباما نے اس ہدف کا محتاط جائزہ لیا،تاہم تمام تر احتیاط کے باوجود اس نے لیبیا اور شام میں ''عرب بہار "کے نام پر آمریتوں کے خلاف کارروائی کی لیکن مقصد ''ورلڈ آرڈر "کی تکمیل تھا۔اس نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کو بتایا کہ اپنے رہنما چننے اور اپنے مقدر کا تعین کرنے سے زیادہ بنیادی حق کوئی اور نہیں اس نے 2010ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کو بتایا کہ اپنے رہنما چننے اور اپنے مقدر کا تعین کرنے سے زیادہ بنیادی حق کوئی اور نہیں لیکن الجزائر میں ہونے والی مغربی ممالک کی کاروائی میں امریکا کا درپردہ ساتھ ان کے دوغلے پن کو چھپا نہیں سکا۔اس طرح گزشتہ تین دہائیوں سے امریکا کو یقین تھا کہ دنیا مزید لبرل،قابل احتساب اور جمہوری گورننس کی طرف بڑھ رہی ہے اور اس پر کسی کو بھی کوئی شک نہیں ہونا چاہیے لیکن مصر کی منتخب حکومت کو ختم کر کے السیسی کو برسر اقتدار لانے میں جو گھناؤنا کردار ادا کیا گیا وہ بھی ساری دنیا کے سامنے ہے۔

لیکن پھر کیلنڈر پر 2017 کا صفحہ پلٹا اور امریکیوں کو یکایک احساس ہوا کہ فردِ واحد کی حکومت کا دور واپس آ چکا ہے۔روس میں آمریت کا راج ہے۔چینی رہنما شی جن پنگ بھی اپنی طاقت مستحکم کر چکے ہیں۔بعض حلقے انہیں چیئرمین ماؤزے تنگ سے بھی زیادہ بااثر قرار دیتے ہیں۔ٹرمپ کے یہودی نژاد داماد "جیرالڈ "اور سعودی ولی عہد کے بہت ہی قریبی دوست اور موجودہ دور کے "لارنس آف عربیا "نے ولی عہد کے خصوصی محل میں بیٹھ کر ایک ایسا پلان تیار کیا جس کے بعد سعودی ولی عہد نے احتساب کی آڑ میں اپنے سیاسی مخالفین کا نہ صرف صفایا کر دیا بلکہ ان پر کرپشن کے الزامات لگا کر ان سے سینکڑوں بلین ڈالر بھی وصول کئے اور ان کی یہ تحریک اب بھی چل رہی ہے۔وہ ملک کی زیادہ تر طاقت اپنے ہاتھوں میں لے چکے ہیں۔

مصر پر ایک مرتبہ پھر انتہائی سفاک اور بدعنوان فوجی آمریت مسلط ہے اور بنگلہ دیش کی خونی ڈائن کی طرح السیسی بھی اسلام پسندوں کو درجنوں کے حساب سے پھانسی پر لٹکانے کا عمل جاری رکھے ہوئے ہے اور امریکا سمیت کسی بھی یورپی یونین کے ممبر ملک کو یہ توفیق نہیں کہ پھانسی کی ان سزاؤں پر ان دونوں ممالک کا ہاتھ روک سکیں جبکہ پاکستان میں ہزاروں بے گناہ معصوم پاکستانیوں کے قاتل دہشتگردوں کو پھانسی دینے پر انہیں سخت تکلیف پہنچتی ہے اور انسانی حقوق کی تلافی پر پاکستان کو معاشی دھمکیوں سے خوفزدہ کیا جاتا ہے۔اب ایک مرتبہ پھر ملکی سیاست کی چائے کی پیالی میں طوفان برپا کرنے کیلئے

عدلیہ کے ججز کا خط میدان میں لایا گیا ہے تا کہ خوف کے طوفانوں میں اس شکستہ کشتی کے ایٹمی طاقت جیسے پتوار چھین لئے جائیں جو ان کا دیرینہ خواب ہے۔

اس وقت مشرق وسطیٰ میں بظاہر داعش کی آندھی بیٹھ چکی ہے لیکن گاہے بگاہے جہاں اس کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے، اس کو زندہ کر کے اپنا کام لیکر دوبارہ سلا دیا جاتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ ابھی تک عراق اور شام میں کس قسم کی حکومتیں قائم ہوں گی جو واقعی آزادی کے ساتھ اپنے ملک کی تعمیر و ترقی کیلئے مکمل آزاد ہو کر کام کر سکیں گی لیکن اگر مستقبل میں ایسی کوئی کوشش بھی ہوئی تو یہ بات البتہ یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ یہ حکومتیں جمہوری ہرگز نہیں ہوں گی۔ مشرقی یورپ ابھی تک مکمل طور پر جمہوری نہیں۔ ہنگری اور پولینڈ یقینی طور پر ایسی آمریت کی راہ پر گامزن ہیں جہاں یورپی یونین درپردہ مکمل طور پر کھلی آنکھوں سے اپنے ایجنڈے پر کام کر رہی ہے تاہم یہ ریاستیں کھل کر لبرل تصورات کی نفی تو کر رہی ہیں، ایسا کرنے سے ممکن ہے کہ وہ یورپی یونین کی رکنیت کیلئے نااہل ہوں لیکن شاید ان کے پیش نظر کچھ اور مقاصد ہوں جو فی الحال عالمی سیاست کے منظر نامے سے اوجھل رکھے جا رہے ہیں۔

اس عالمی ماحول میں امریکی حکومت کیا کہہ سکتی ہے؟ اس کیلئے ڈونلڈ ٹرمپ جیسے ضدی اور انا پرست کی حکومت کے ان اقدامات کو ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے کہ اقتدار میں آتے ہی اس نے امریکی قوم کی فوقیت کو اپنا منشور مافوق الفطرت قرار دیکر امریکا کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ فوری طور پر کئی ملکوں کو راندہ درگاہ بنا کر بالخصوص مسلم دشمنی کا پہلی مرتبہ واشگاف انداز میں نہ صرف اعلان کیا بلکہ اپنے ہمسایہ ملکوں کے درمیان بھی ہزاروں میل دیوار بنانے کا ناممکن اعلان کر کے شہرت حاصل کرنے کا آسان پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ عرب بادشاہوں کو کھلے عام آئینہ دکھانا شروع کر دیا کہ ان کا اقتدار امریکی مدد کا محتاج ہے اور بدلے میں ان آمریتوں اور فرد واحد کی حکومتوں کیلئے ستائشی الفاظ کے ساتھ ساتھ اربوں ڈالر کے دفاعی معاہدے معرضِ وجود میں آگئے۔ معاملہ یہاں پر ہی ختم نہیں ہوا بلکہ اسرائیل کو پہلی مرتبہ عرب ممالک میں نہ صرف تسلیم کروایا گیا بلکہ عربوں کا صدیوں پر محیط تہذیب و تمدن بھی بتدریج دم توڑ رہا ہے اور خود سعودی عرب میں ہزاروں میل پر محیط ایک ایسا نیا صوبہ تیزی سے تعمیر ہو رہا ہے جو ایک خبر کے مطابق عیاشی میں مشہور امریکی ریاستوں ہوائی اور الاسکا کے بھی پیچھے چھوڑ دے گا۔

امریکا کو نسلی بنیاد پر تقسیم کرنے والے اس پاگل رہنماء کو بظاہر ان آمریتوں سے کوئی شکوہ یا شکائت نہیں رہی بلکہ وہ انہیں رشک بھری نگاہوں سے نہ صرف دیکھتے رہے بلکہ ان کی مکمل پشت پناہی میں اس کی غلامانہ سوچ کو بھی ہوا دیتے رہے کہ اُن ریاستوں میں حکمرانوں کا نہ کوئی احتساب ہوتا ہے اور نہ ہی کسی آئینی قدغن کا پہرا۔ اس میں کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ اسی لئے یہ صدر (ٹرمپ) اپنے ہاں نظام انصاف کو ہدفِ استہزا بناتے رہتے ہیں ۔ انہیں اس بات کا دکھ ہے کہ نظامِ انصاف پر ان کا زیادہ کنٹرول کیوں نہیں رہا۔ اگر آپ کو یاد ہو تو ٹرمپ نے ایف بی آئی کے "جیمز کومی" کو محض اس لیے نکال باہر کیا تھا کہ وہ صدر پر اپنی وفاداری ثابت کرنے میں ناکام رہا تھا۔ ٹرمپ نے اُنہیں امریکی صدارتی انتخاب میں روس کی تکنیکی مداخلت کی تحقیقات روکنے کا حکم دیا تھا۔

اپنے دورِ اقتدار میں ٹرمپ یہ تاثر دیتا رہا کہ ان کے ہوتے ہوئے ریاستی اداروں کی ضرورت نہیں۔ وہ جو چاہتے ہیں کر سکتے ہیں، ان پر کوئی پابندی درست نہیں لیکن ٹرمپ یہ کیوں بھول گئے کہ امریکی حکومت نے طویل عرصے تک اپنے ہاں جمہوریت کا جو دفاع کیا ہے، اس کو اتنی جلدی آسانی کے ساتھ ریورس نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے بھی اہم بات یہ کہ اس نے طویل مدت تک جمہوریت کیلئے قربانیاں دی ہیں اور یہ مزید قربانیاں بھی دے سکتی ہے۔ یہ

کہنے کی ضرورت نہیں کہ ٹرمپ کا رویہ امریکا کی سیاسی روایات سے کھلا انحراف تھا۔ امریکا نے ہمیشہ جمہوریت کی حمایت کرنے میں اکثر عدم تسلسل سے کام لیا ہے اور اہم ایشوز پر آمروں کے ساتھ خوش دلی سے اتحاد کیا ہے کہ وہ اپنے ایجنڈے کی تکمیل اور حکمرانی کیلئے فردِ واحد سے ڈیل کرنا زیادہ آسان سمجھتے ہیں، لیکن اہم سیاسی معاملات اور دوسرے مفادات پر ڈیل کرنا ایک بات ہے اور اپنے نظریات کو چھوڑ کر غیر نمائندہ شخصیات کی تعریفوں کے پُل باندھنا الگ چیز ہے۔ ایسا کرنا بھی برا ہے کیونکہ یہ اس روایت کو، جو ماضی میں ایک قیمتی سفارتی اثاثہ ہوا کرتی تھی، توڑ دیتا ہے۔ یہ اس بات کا یقین تھا کہ امریکا محض انفرادی نوعیت کے مفادات کی بجائے کسی اور مقصد کیلئے اسٹینڈ لیا کرتا ہے۔

یہ تبدیلی وہ نہیں ہے جس کا لوگوں کو سرد جنگ کے فوراً بعد انتظار تھا، لیکن یہ حیران کن بھی نہیں۔ طاقتور ہونے کی بجائے دنیا کی بڑی اور اہم جمہوریتوں کو گزشتہ پچیس سال کے دوران بڑے نقصانات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ امریکا نے عراق اور افغانستان پر غلط وجوہ کی بنیاد پر حملہ کیا۔ معاملات کو الجھایا اور انتظامی صورت حال کی خرابی کے باعث بڑے پیمانے پر نقصان بھی اٹھایا۔ اس کے نتیجے میں امریکا کا سیاسی نظام بگڑتا چلا گیا۔ سیاست دانوں کے بارے میں عوام کی رائے دن بہ دن خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ اس سے بھی بدتر یہ کہ کسی ذمہ دار سے جواب طلبی نہ کی گئی اور عوام کے عروج پاتے غم وغصے کو ٹرمپ کے اقدامات نے مزید جلا بخشی۔ یورپ میں یورو کا قیام ایک مہلک غلطی ثابت ہوا، جس کے نتائج بہت دور تک جاتے ہیں۔ برطانیہ کے یورپی یونین سے الگ ہونے کے فیصلے نے برطانوی حکمرانوں کی نااہلی کا پردہ چاک کیا کہ ان کی بصیرت بروقت اس منصوبے کی کامیابی اور ناکامی کے ادراک میں بری طرح ناکام ہوئی۔

ٹرمپ جنہیں قابل رشک سمجھتے ہیں ایسے بہت سے آمر ذرا بھی شاندار ریکارڈ نہیں رکھتے۔ پیوٹن نے چند ایک معاملات میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ ضرور کیا ہے تاہم وہ روسی معیشت کی کمزوریاں دور کرنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ معاشرتی مسائل کا بہتر حل تلاش کرنے میں بھی ناکام رہے ہیں۔ امریکا اور کچھ دوسری جمہوریتوں نے دو دہائیوں سے بری کارکردگی دکھانے کے باوجود خود کو کامیابی سے قائم رکھا ہے لیکن افغانستان اور عراق کے معاملات پر مجرمانہ غفلت کے بھی مرتکب ہوئی ہیں اور بالخصوص اپنے مفادات کے حصول کیلئے اپنے پالتو اسرائیل کو غزہ میں اور مودی کو کشمیر میں کھلے عام انسانیت کے بہیمانہ قتل کا لائسنس مہیا کر رکھا ہے۔

یہ یاد رکھنے والی بات ہے کہ 2008ء کے بحران سے امریکا نے خود کو تیزی سے باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن چین کی بڑھتی ہوئی معاشی و اقتصادی ترقی کو روکنے کیلئے غیر دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے انڈیا کو علاقے کا تھانیدار بنانے کی حماقت کا سہرا ابھی پچھلی دونوں حکومتوں بالخصوص جونیئر بش کے سر پر ہے جس کو عروج پر پہنچانے کیلئے ٹرمپ کی ہٹ دھرمی خود امریکا کی تباہی کا سبب بن کر رہے گی اور رہی سہی کسر موجودہ امریکی صر کے ہاتھوں پوری ہو کر رہے گی۔ شمالی کوریا کے ہاتھوں امریکا کی درگت نے ٹرمپ کو ندامت کے گھڑوں پانی نے اس قدر شرابور کیا ہے کہ امریکا کی رہی سہی عزت بھی خاک میں مل گئی ہے۔ اگر یاد ہو تو نئے سال کے آغاز میں پاکستان کو خوفزدہ کرنے کیلئے ایک بیہودہ "ٹویٹ" جاری کرنے کے بعد خود امریکا میں سیاسی حلقوں اور تجزیہ نگاروں نے اس کی دماغی حیثیت پر شک کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔ ٹرمپ نے اپنی یکسر غلط پالیسیوں اور ہٹ دھرمی سے امریکا کو جو نقصان پہنچایا،

خود امریکا کے اندر سیاسی تجزیہ نگار ٹرمپ کی برطرفی کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ سابقہ صدر رونالڈ ریگن کے بیٹے نے ٹرمپ کو ایک بیوقوف، پاگل اور امریکی تاریخ میں سب سے زیادہ نالائق فرد قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف مواخذہ کا مطالبہ کیا تھا۔

ٹرمپ کے "یروشلم کو اسرائیل کا جائز دارالحکومت" قرار دینے پر دنیا بھر میں ایک بھونچال پیدا کر دیا تھا جس کے نتیجے میں اقوام متحدہ میں اس معاملے پر ٹرمپ کو منہ کی کھانی پڑی لیکن ٹرمپ اب ان ممالک کی تعریف و توصیف میں مگن رہے جنہوں نے اس قرارداد کی رائے شماری میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اسرائیل بہر حال اپنے صہیونی منصوبوں کو مرحلہ وار آگے بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔ مسلم دنیا، باہمی چپقلش اور استعماری قوتوں کی خوشامد میں لگی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی آسکے گی؟ یہ دیکھنا ابھی باقی ہے۔

اسرائیل کا ہمیشہ اصرار رہا ہے کہ بیت المقدس اس کے زیرِ انتظام رہے گا اور فلسطینیوں کا مطالبہ ہے کہ کم از کم اس کے مشرقی حصہ پر (جو 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں، اردن کے ہاتھوں سے نکل کر اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا تھا) فلسطینی کنٹرول ہونا چاہیے۔ اسی مشرقی بیت المقدس میں تقریباً 35 / ایکڑ رقبہ پر مشتمل وہ خطۂ زمین ہے جو حرم الشریف کے نام سے موسوم ہے اور جس کی حدود میں مسجد الاقصیٰ اور قبۃ الصخرۃ (پتھر والا گنبد) واقع ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے نبیٔ آخر الزماں ﷺ نے معراجِ سمٰوت کا عظیم سفر کیا تھا اور جس کی طرف رخ کر کے تقریباً 15 سال تک خود نبی اکرم ﷺ اور ان کے صحابہ نماز ادا کرتے رہے۔ اسی لیے اس کو قبلۂ اول کہا جاتا ہے۔ دنیا کی صرف تین مسجدوں کے بارے میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ وہاں نماز پڑھنے کیلئے خصوصی طور پر جانا اور اُنہیں دوسری تمام مساجد پر فوقیت دینا جائز ہے۔ یہ تین مسجدیں کعبۃ اللہ، مسجدِ نبوی اور مسجدِ اقصیٰ ہیں۔

28 ستمبر 2000ء کو اسرائیلی انتہا پسند جماعت لیکوڈ پارٹی کے سربراہ (بعد میں اسرائیلی وزیر اعظم بھی) ایریل شیرون نے حرم الشریف (مسجدِ اقصیٰ) کا دورہ کیا، جس پر فلسطینی مسلمانوں نے پُر امن احتجاجی مظاہرے کیے۔ اسرائیلی فوجیوں نے مظاہرین کو گولیوں سے بھون دیا۔ اس کے بعد سے پورا فلسطین ایک بھٹی کی مانند سلگ رہا ہے۔ اہلِ فلسطین، تین بار انتفاضہ کے نام سے غیر معمولی تحریکِ آزادی چلا چکے ہیں۔ اس طرح محاصرہ کا شکار غزّہ بھی بار بار اسرائیلی عسکری جارحیت کا شکار ہوتا رہا ہے اور اب پچھلے کئی ماہ سے غزہ کے شب و روز ساری دنیا کے سامنے ہیں۔ مجھے بڑے دکھ سے یہ تحریر کرنا پڑ رہا ہے کہ 57 اسلامی ممالک بزدلوں کی طرح اپنے اقتدار کو بچانے کی فکر میں اخروری فکر سے غافل ہو چکے ہیں۔

اسرائیلی اس بات پر بضد ہیں کہ مسجدِ اقصیٰ کی حدود میں ہیکل سلیمانی ضرور تعمیر کریں گے۔ متحدہ یروشلم (بیت المقدس) کو اپنا دارالحکومت بنائے رکھیں گے اور امریکا سمیت ساری دنیا کے سفارت خانوں کو، تل ابیب سے یروشلم منتقل کروائیں گے۔ دوسری طرف یہودیوں کو اس بلا جواز کارروائی سے روکنے کیلئے صرف فلسطینی مسلمان بالخصوص غزہ میں سات اکتوبر سے اب تک اسرائیلی بمباری سے مجموعی طور پر کم از کم 31553 فلسطینی شہید ہو چکے ہیں۔ ان ہلاک ہونے والوں میں دو تہائی تعداد فلسطینیوں بچوں اور عورتوں کی ہے۔ اب تک زخمیوں کی تعداد 73546 بتائی گئی ہے۔ تاہم یہ معلوم نہیں کہ ان میں سے کتنے زخمی علاج کی سہولت میسر ہو سکی ہے کیونکہ غزہ میں ہسپتال کی بڑی تعداد بمباری اور حملوں سے تباہ کی جا چکی ہے جبکہ باقی تھوڑے بہت بچ جانے والوں میں علاج کی سہولیات ناکہ بندی کے باعث ختم ہو چکی ہیں اور تقریباً سبھی ہسپتال ناکارہ ہو چکے ہیں۔ پوری دنیا کی نگاہیں بیت المقدس میں جاری کشمکش پر مرتکز ہیں۔

دوسری طرف عالمی میڈیا میں امریکی صدر جو بائیڈن کا ایک منافقانہ بیان گردش کر رہا ہے کہ "عرب ریاستیں اسرائیل کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہیں اور

میں سعودی عرب، مصر، اردن اور قطر سمیت دیگر تمام ممالک کے ساتھ کام کر رہا ہوں"۔ کون نہیں جانتا کہ ناجائز اسرائیلی ریاست کو امریکا کی کس قدر پشت پناہی حاصل ہے۔ جو بائیڈن آئندہ امریکی انتخابات میں اپنی فتح کو یقینی بنانے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ وہ ایک طرف مسلمان ممالک کو دوریاستی حل کا چکمہ دے رہے ہیں اور دوسری طرف اسرائیل کے جنگی اور خونی ہاتھوں کو چوم کر دوبارہ قصر سفید میں براجمان رہنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ واضح رہے کہ ان حالات میں جو بھی اسرائیل کو تسلیم کرنے کا ارادہ بھی کرے گا، خود وہاں کی عوام ہی ان کا ایسا احتساب کریں گے کہ جس اقتدار کی خاطر یہ جرم عظیم کرنے پر آمادہ ہوں گے، اسی اقتدار کی غلام گردشیں ان کو مزید پناہ دینے سے انکار کر دیں گی۔

ادھر ہمارے ہاں درپردہ امریکی اشارے پر طاقتور حلقوں کی آشیر واد سے یہ بحث چھیڑی جاتی رہی ہے کہ اسرائیل کو تسلیم کر لینے میں کیا حرج ہے۔ ہمارا اسرائیل سے کیا جھگڑا ہے؟ اب تو بہت سی عرب حکومتوں نے بھی اسرائیل کو تسلیم کر لیا ہے یا کرنے والی ہیں۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ عربوں نے کب ہمارا ساتھ دیا کہ اب بھی ہم ان کی وجہ سے اسرائیل سے دشمنی مول لیتے رہیں۔ اُس سے ہماری دشمنی کا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ اسرائیل اور بھارت دوست بنے ہوئے ہیں۔ اگر ہم اسرائیل کو تسلیم کر لیں تو ہم بھی اس کے دوست بن سکتے ہیں اور بھارت سے اس کی قربت کو کم کر سکتے ہیں لیکن ہم نجانے یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ اس وقت سینکڑوں بھارتی اسرائیل کی فوج میں بھرتی ہو کر غزہ کے مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلنے میں میدان جنگ میں موجود ہیں۔

یہ دلائل سادہ دل اور معاملے کے تاریخی، واقعاتی، ایمانی، اخلاقی اور نفسیاتی پہلوؤں سے ناواقف لوگوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں لیکن یاد رکھیں کہ اسرائیل کو تسلیم کرنے کا معاملہ محض ایک ملک کو ماننے یا نہ ماننے کا نہیں۔ اسرائیل یہودیوں کا جبری طور پر حاصل کردہ نسلی وطن اور عالمگیر صہیونی تسلط کا نقطۂ پرکار ہے۔ حق و باطل کی ازلی کشمکش میں سے پچھلے ہزاروں سال کے سینکڑوں خَم دار پہلو اس سے وابستہ ہیں، جنہیں ہوش و حواس میں رہنے والا کوئی باغیرت مسلمان نظر انداز نہیں کر سکتا۔ بیت المقدس کی اہمیت اور اس کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟ اس پر اسرائیلی اور عرب دعوؤں میں حقیقت کتنی ہے؟ اور اس حوالے سے صہیونی عزائم اور منصوبے کیا کیا ہیں؟ مسئلہ فلسطین کی نزاکت اور اس کے ایمانی پہلوؤں سے ہی نہیں، واقعاتی اور تاریخی حقائق سے بھی روشناس ہونا ضروری ہے۔

بروز جمعۃ المبارک 26 رمضان الکریم 1445ھ 5 / اپریل 2024ء

لیکن ایسا ہو گا نہیں!

پچھلی سات دہائیوں سے زائد امت مسلمہ کے دو دیرینہ زخموں مسئلہ کشمیر اور فلسطین کو جس بیدردی کے ساتھ کھرچا گیا ہے، ہماری تیسری نسل بھی انگشت بدنداں ہے کہ آخر مسلمان ہی ظلم و ستم کا شکار کیوں ہیں؟ آخر پوری مسلم امہ کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ تمام مسلم حکمرانوں میں مکمل خاموشی، سکوت، صبر اطمینان، ڈھٹائی، بے شرمی، کوئی عملی احتجاج، کوئی چیخ وپکار یا کسی یکجہتی کا کوئی اظہار دیکھنے میں نہیں آیا، معاملہ صرف بیانات تک ہی محدود امریکا کے بارے میں صرف احتجاج ریکارڈ کروانے کے بعد غزہ ہے۔ امت مسلمہ کی طرف مکمل خاموشی کے بعد او آئی سی کا اجلاس بلا کر اسرائیل اور یا کشمیر میں مسلمانوں کا قتل عام رکا ہے؟

دنیا بھر میں پہلی مرتبہ عام غیور شہریوں کا سڑکوں پر آکر اپنے دلی جذبات کا جس طرح اظہار جاری ہے لیکن کیا یہ احتجاج کارگر ثابت بھی ہو گا کہ نہیں؟ ابھی کل کی بات ہے کہ امریکی صدر جو بائیڈن کے منافقانہ بیان نے ساری حقیقت واضح کر دی ہے کہ "عرب ریاستیں اسرائیل کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہیں اور میں سعودی عرب، مصر، اردن اور قطر سمیت دیگر تمام ممالک کے ساتھ کام کر رہا ہوں"۔ غزہ میں قیامت صغری برپا ہے لیکن اس قیامت کی آڑ میں اسرائیلی مظالم کو روکنے کی بجائے اس کو تسلیم کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ غزہ اور کشمیر دونوں جگہ پر نہتے مسلمانوں میں مماثلت ان کا فقط یہ جرم ہے کہ وہ اپنے حق کیلئے مسلسل فریاد کرتے چلے آرہے ہیں۔ چھ لاکھ قابض بھارتی فورسز کیلئے بھی اب نوجوانوں کی تیسری نسل دردِ سر بنی ہوئی ہے جس نے مودی کی ظالم سپاہ کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں لیکن یہ الگ بات ہے کہ ایک سازش کے تحت کشمیر میں ہونے والے بھارتی درندوں کے جرائم کی اشاعت پر مکمل پابندی عائد ہے لیکن ہمارے زرخرید حکمرانوں کی مجرمانہ خاموشی تو بدتر یہود و ہنود درندوں سے بھی زیادہ بدترین ہے۔ غمزدہ فلسطین میں آج بھی چھوٹے چھوٹے بچے اپنے شہداء کی یاد میں مسلح ظالم اسرائیلی درندوں کے سامنے اپنے حقوق کیلئے صدا بلند کر رہے ہیں گویا اب اپنے شہداء کیلئے رونا اور احتجاج کرنا بھی جرم ٹھہر گیا ہے۔

اگر بیت المقدس کی تاریخ پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کو دو مرتبہ تو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا تھا، 52 مرتبہ بیت المقدس کو میدان جنگ بنایا گیا اور 44 مرتبہ اس پر قبضہ کیا گیا ہے لیکن ہر مرتبہ فلسطینی مسلمان ہی فاتح ٹھہرے ہیں جو اس سرزمین کے اصل مالک ہیں۔ حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ اسرائیلیوں کو یہ حقیقت کب سمجھ میں آئے گی اور وہ کب نوشتہ دیوار پڑھیں گے؟ کشمیر اور فلسطین میں تو باقاعدہ نظر آرہا ہے کہ امریکا اور اس کے اتحادی مغرب نے ہنود و یہود کو مسلمانوں کے قتل عام کی کھلی چھٹی دے رکھی ہے اور ان دونوں ممالک کے درندون کی آنکھ میں انسانیت کیلئے کوئی شرم وحیا باقی نہیں رہی۔ امریکا نے تو مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کیلئے تل ابیب سے یروشلم میں اپنا سفارتخانہ تبدیل کرنے کیلئے 14 مئی کا دن تجویز کیا تھا، یعنی اسی دن 14 مئی 1948ء کو ارضِ فلسطین پر اسرائیل کا ناسور خنجر گھونپا گیا تھا۔ عالمی سطح پر مسلمانوں کو مشتعل کرنے کیلئے ایک اور بڑا ظلم اسرائیل نے ارضِ فلسطین کے ساتھ یہ بھی کیا کہ اس نے بیت المقدس سے متصل مسلمانوں کی ایک متبرک قبرستان "الرحمہ" جہاں بہت سے جلیل القدر صحابہ کرام مدفون تھے، اس کو بلڈوزروں سے ملیامیٹ کر کے وہاں تفریحی پارک بنا دیا لیکن کسی مسلم حکمران کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ جبیں پر شکن تک نہیں آئی۔

1947ء کی مشرق وسطیٰ کی جنگ میں قبضہ اسرائیل نے فلسطینی مشرقی یروشلم پر بزور طاقت اور دھونس سے قبضہ کر لیا تھا اور اب یروشلم کو اپنا ازلی اور

غیر منقسم دارالحکومت کہتا ہے لیکن غزہ کے غیور مسلمانوں نے محاصرہ کے باوجود احتجاج میں سر پر کفن باندھ کر نکلے جس کے جواب میں اس وقت بھی اسرائیلی درندوں نے 48 فلسطینیوں کو شہید اور 3 ہزار سے زائد افراد کو زخمی کر دیا، گویا غزہ کے غیور مسلمان اس وقت بھی اپنی جانیں قربان کر کے اللہ کے حضور گواہی دیکر سرخرو ہو گئے اور اب تو غزہ نے ایک تاریخ رقم کر دی ہے کہ پچھلے چھ ماہ سے اسرائیل اپنے مغویوں کی رہائی کیلئے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے انہی عرب پڑوسیوں کے سامنے التجا کر رہا ہے۔

یاد رہے کہ یروشلم متعدد بار تاخت و تاراج ہوا ہے، یہاں کی آبادیوں کو کئی بار زبردستی جلاوطن کیا گیا ہے اور اس کی گلیوں میں ان گنت جنگیں لڑی جا چکی ہیں جن میں خون کے دریا بہہ چکے ہیں۔ یہ دنیا کا وہ واحد شہر ہے جسے یہودی، مسیحی اور مسلمان تینوں مقدس مانتے ہیں۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے کائنات کی تخلیق ہوئی اور یہیں پیغمبر حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے کی قربانی کی تیاری کی تھی۔ مسیحی سمجھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کو یہیں مصلوب کیا گیا تھا اور یہیں ان کا سب سے مقدس کلیسا واقع ہے۔ مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق پیغمبر اسلام نے معراج پر جانے سے قبل اسی شہر میں مسجدِ اقصیٰ میں تمام نبیوں کی امامت فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اور مسیحی ایک ہزار برس تک اس شہر پر قبضے کیلئے آپس میں برسرِ پیکار رہے ہیں۔

مسلمانوں نے سب سے پہلے 638ء میں دوسرے خلیفہ حضرت عمر کے دور میں بازنطینیوں کو شکست دے کر اس شہر پر قبضہ کیا تھا۔ مسیحی دنیا میں یہ واقعہ عظیم سانحے کی حیثیت رکھتا تھا۔ آخر 1095ء میں پوپ اربن دوم نے یورپ بھر میں مہم چلا کر مسیحیوں سے اپیل کی کہ وہ یروشلم کو مسلمانوں سے آزاد کروانے کیلئے فوجیں اکٹھی کریں۔ نتیجتاً 1099ء میں عوام، امراء اور بادشاہوں کی مشترکہ فوج یروشلم کو آزاد کروانے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ پہلی صلیبی جنگ تھی۔ تاہم اکثر فوجی جلد ہی واپس اپنے اپنے وطن سدھار گئے اور بالآخر سلطان صلاح الدین ایوبی 90 برس بعد شہر کو آزاد کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک بار پھر یورپ میں بے چینی پھیل گئی اور یکے بعد دیگر چار مزید صلیبی جنگیں لڑی گئیں، لیکن وہ یروشلم سے مسلمانوں کو بے دخل کرنے میں ناکام رہیں۔ البتہ 1229 میں مملوک حکمران الکامل نے بغیر لڑے یروشلم کو فریڈرک دوم کے حوالے کر دیا لیکن صرف 15 برس بعد خوارزمیہ نے ایک بار پھر شہر پر قبضہ کر لیا، جس کے بعد اگلے 673 برس تک یہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔

1517ء سے 1917ء تک یہ شہر عثمانی سلطنت کا حصہ رہا۔ عثمانی سلاطین نے شہر کے انتظام و انصرام کی مضبوطی کیلئے شہر کے گرد دیوار تعمیر کی، سڑکیں بنائیں اور ڈاک کا نظام قائم کیا جبکہ 1892ء میں یہاں ریلوے لائن بچھائی گئی۔ اسرائیلی شاعر یہودا عمیحائی نے لکھا تھا کہ "یروشلم ابدیت کے ساحل پر واقع ساحلی شہر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ سمندر اکثر و بیشتر متلاطم ہی رہا ہے"۔ اس کا اندازہ یروشلم کی اس مختصر ٹائم لائن سے لگایا جا سکتا ہے۔

پانچ ہزار قبل مسیح: ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے مطابق سات ہزار سال قبل بھی یروشلم میں انسانی آبادی موجود تھی۔ اس طرح یہ دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔

ہزار سال قبل مسیح: پیغمبر حضرت داؤد نے شہر فتح کر کے اسے اپنی سلطنت کا دارالحکومت بنا لیا۔

960 سال قبل مسیح: حضرت داؤد کے بیٹے پیغمبر حضرت سلیمان نے یروشلم میں معبد تعمیر کروایا جسے ہیکلِ سلیمانی کہا جاتا ہے۔

589 قبل مسیح: بخت نصر نے شہر کو تاراج کر کے یہودیوں کو ملک بدر کر دیا۔

539 قبل مسیح: ہخامنشی حکمران سائرس اعظم نے یروشلم پر قبضہ کر کے یہودیوں کو واپس آنے کی مشروط اجازت دی۔

30 عیسوی: رومی سپاہیوں نے یسوع مسیح کو مصلوب کیا۔

638 عیسوی: مسلمانوں نے دوسرے خلیفہ حضرت عمر کے دور میں بازنطینیوں کو شکست دے کر شہر کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

691 عیسوی: اموی حکمران عبدالملک نے قبۃ الصخرا (ڈوم آف داراک) تعمیر کروایا۔

1099 عیسوی: مسیحی صلیبیوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔

1187 عیسوی: صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں کو شکست دے کر شہر سے نکال دیا۔

1229 عیسوی: فریڈرک دوم نے بغیر لڑے یروشلم حاصل کر لیا۔

1244 عیسوی: دوبارہ مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

1517 عیسوی: سلطان سلیم اول نے یروشلم کو عثمانی سلطنت میں شامل کر لیا جو اگلے چار سو سال عثمانی سلطنت کا حصہ رہا۔

1917 عیسوی: انگریزی جنرل ایلن بی عثمانیوں کو شکست دے کر شہر میں داخل ہو گیا۔

1947 عیسوی: اقوامِ متحدہ نے شہر کو فلسطینی اور یہودی حصوں میں تقسیم کر دیا۔

1948 عیسوی: اسرائیل کا اعلانِ آزادی، شہر اسرائیل اور اردن میں تقسیم ہو گیا۔

1967 عیسوی: عرب جنگ کے نتیجے میں دونوں حصوں پر اسرائیل کا قبضہ ہو گیا۔

برطانوی مؤرخ کے مطابق برطانوی جنرل سر ایڈمند ایلن بی کو یروشلم کے تقدس کا اس قدر خیال تھا کہ جب وہ عثمانی فوجوں کو شکست دے کر یروشلم پر قبضے کی غرض سے باب الخلیل کے راستے شہر میں داخل ہوا تو اس نے گھوڑے یا گاڑی پر سوار ہونے کی بجائے پیدل چلنے کو ترجیح دی لیکن اس مقدس شہر کی حرمت اس وقت کہاں گئی جب اس کیلئے ہزاروں افراد کے سر تن سے جدا کر دئے گئے۔ برطانوی وزیرِ اعظم ڈیوڈ لوئڈ جارج نے اس موقع پر لکھا کہ دنیا کے مشہور ترین شہر پر قبضے کے بعد مسیحی دنیا نے مقدس مقامات کو دوبارہ حاصل کر لیا ہے۔ تمام مغربی دنیا کے اخباروں نے اس فتح کا جشن منایا۔ امریکی اخبار نیویارک ہیرالڈ نے سرخی جمائی: برطانیہ نے 673 برس کے اقتدار کے بعد یروشلم کو آزاد کروالیا ہے اور آج مسیحی دنیا میں زبردست خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔

جنرل ایلن بی کے قبضے کے بعد شہر تین دہائیوں تک برطانوی سلطنت میں شامل رہا اور اس دوران یہاں دنیا بھر سے یہودی آباد کئے گئے۔ آخر 1947ء گئے۔ آخر 1947ء میں اقوامِ متحدہ نے اس شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی منظوری دی، جس کے تحت نہ صرف فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، بلکہ یروشلم کے بھی دو حصے کر دیے گئے جن میں سے مشرقی حصہ فلسطینیوں جبکہ مغربی حصہ یہودیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کے اگلے برس اسرائیل نے آزادی کا اعلان کر دیا۔ عرب ملکوں کیلئے یہ بات ناقابلِ قبول تھی۔ انہوں نے مل کر حملہ کر دیا لیکن غلط جنگی حکمت عملی کی وجہ سے انہیں اس میں شکست ہوئی۔ اس کے بعد اگلے دو عشروں تک یروشلم کا مشرقی حصہ اردن کے اقتدار میں رہا لیکن 1967ء کی جنگ میں اسرائیل نے اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ بین الاقوامی برادری آج تک اس قبضے کو غیر قانونی سمجھتی ہے۔ اسرائیلی پارلیمان نے 1950ء ہی سے یروشلم کو اپنا دارالحکومت قرار دے

رکھا ہے لیکن دوسرے ملکوں نے اقوام متحدہ کی قرارداد کے احترام میں یروشلم کی بجائے تل ابیب میں اپنے سفارت خانے قائم کر رکھے لیکن امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے اس روایت کو توڑ کر یروشلم کو اسرائیل کا دارالحکومت تسلیم کرنے والا پہلا ملک بن گیا۔ ٹرمپ نے جنرل ایلن بی کے عثمانیوں کو شکست دینے کے ٹھیک سو سال بعد اعلان کیا کہ یروشلم اسرائیل کا دارالحکومت ہے حالانکہ دنیا بھر کے ملکوں نے انہیں خبر دار کیا تھا کہ اس اعلان سے خطے میں تشدد کی نئی لہر پھوٹ سکتی ہے۔ فرانسیسی صدر امانوئل میکخواں نے ٹرمپ سے کہا تھا کہ انہیں یروشلم کو یکطرفہ طور پر اسرائیلی دارالحکومت تسلیم کیے جانے کے منصوبے پر "تشویش" ہے۔ میکخواں نے کہا کہ شہر کی متنازع حیثیت پر کوئی بھی فیصلہ "اسرائیل اور فلسطین کے درمیان بات چیت کے دائرۂ کار" کے اندر ہونا چاہیے۔

اس وقت کے برطانوی سیکریٹری خارجہ بورس جانسن کا کہنا تھا کہ وہ غزہ میں انسانی جانوں کے ضیاع پر انتہائی غمزدہ ہیں اور برطانیہ یروشلم میں امریکی سفارتخانے کو منتقل کرنے کے فیصلے سے اتفاق نہیں کرتا اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ امریکا "غلط وقت پر غلط چال" چل رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ "ہم سمجھتے ہیں کہ کچھ لوگ تشدد کو اشتعال دے رہے ہیں لیکن دوسری جانب کو ہتھیاروں کے استعمال میں تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے"۔ اس سے قبل کئی عرب اور مسلم ممالک نے اسی طرح کے خدشات کا اظہار کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فلسطینی، صدر ٹرمپ کے فیصلوں کی شدید مخالفت کی مگر اندرونی تقسیم و سیاست کی وجہ سے فلسطینیوں کی مخالفت کے اثرات نہ ہونے کی برابر ہیں۔

2004ء میں یاسر عرفات کی موت کے بعد سے فلسطینی قوم تقسیم کا شکار ہے، اس تقسیم نے باہر کے لوگوں کو اپنے ایجنڈے کے تحت فلسطینیوں میں معاملات کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ یاسر عرفات کی قیادت میں فلسطینیوں کا کردار کمزور تھا مگر انہوں نے اسرائیل کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے، اس کو یاسر عرفات "فیصلہ سازی کی فلسطینی خود مختاری" کہا کرتے تھے۔ یاسر عرفات نے فلسطینیوں کے بنیادی مفادات پر سمجھوتہ کیے بغیر ریاست حاصل کرنے کا راستہ اختیار کیا۔ آزادانہ طرزِ عمل نے ہی ان کو رہنما کا درجہ دیا۔ آج عرفات کے وارث پی ایل او کے سربراہ محمود عباس، حماس کے نئے رہنما یحییٰ شنوار اور اسماعیل ہانیہ، اور سب سے اہم فتح کے سابق سکیورٹی چیف محمد دحلان، سب کے درمیان ایک فاصلہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ کہنا کہ حماس قیادت اور دحلان کے درمیان کوئی دشمنی نہیں، غلط ہو گا۔ دونوں کے درمیان کشیدگی 2007ء میں انتہا پر تھی جس کا نتیجہ مختصر جنگ کی صورت میں بھی نکلا تھا۔

اقوام متحدہ کے مطابق غزہ 141 / اسکوائر میل کے علاقے پر مشتمل ہے، جو کہ مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے 18 لاکھ پناہ گزینوں کا گھر ہے لیکن حالیہ تباہی کے بعد اب یہ برسوں تک رہنے کے قابل نہیں رہے گا۔ غزہ پر حکمرانی کرنے والے کو اس خطرے سے بھی نمٹنا ہو گا۔ حماس اور پی ایل او تین دہائیوں سے سمجھوتہ کرنے کی ناکام کوششوں میں مصروف ہیں، اس حوالے سے آخری کوشش مصر کی نگرانی میں اکتوبر 2017ء میں کی گئی، ان مذاکرات میں عملی اقدام نہ ہونے کے برابر رہے اور نیم دلی سے کوشش کی گئی مگر فریقین مشترکہ پروگرام پر اتفاق کرنے میں ناکام رہے، بہر حال کچھ لوگوں کے نزدیک حماس کی جانب سے اقوام متحدہ، یورپ، روس اور امریکا کے بنائے اصولوں کو تسلیم کر لینا بڑی کامیابی ہے۔ یہ اصول 2006ء میں حماس کی انتخابی فتح کے بعد بنائے گئے تھے۔ 2007ء میں غزہ سے نکالے جانے کے بعد محمد دحلان کو عباس اور الفتح کی اکثریت نے نظر انداز کر دیا، محمد دحلان غزہ کی سکیورٹی کے انچارج تھے، ان کو حماس نے غزہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ حماس نے غزہ میں ہر ایک کو اسلحہ رکھنے کا حق دیا، اس دوران محمد دحلان غزہ میں اپنے حمایتیوں کو منظم کرنے کی صلاحیت سے محروم رہے۔

رام اللہ میں دحلان کی موجودگی محمود عباس کو غزہ کے کھو جانے کی یاد دلاتی رہتی ہے، اس سے الفتح کے نوجوان جنگجوؤں میں تبدیلی کی شدید خواہش

کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ فلسطین میں اپنی سیاست کے خاتمے کے بعد محمد دحلان نے اپنے پرانے تعلقات استعمال کرتے ہوئے کاروبار کا آغاز کر دیا، محمد دحلان نے ابوظہبی کے ولی عہد شہزادہ محمد بن زید کے سلامتی کے مشیر کی حیثیت سے اور تاجر کے طور پر زبردست صلاحیت کا مظاہرہ کیا، خان یونس کے پناہ گزین کیمپ سے زندگی کا آغاز کرنے والے محمد دحلان نے جارج ڈبلیو بش کے ساتھ وائٹ ہاؤس میں مذاکرات بھی کیے، گزشتہ دہائی میں دحلان نے عربوں کی اعلیٰ ترین سیاسی اور تجارتی تنظیموں میں فعال کردار ادا کیا اور اپنی حیثیت کو دوبارہ بحال کر لیا، دوبارہ اہم حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے الفتح اور محمود عباس نے دحلان سے دوری اختیار کر لی۔

جب سے حماس نے غزہ کا انتظام سنبھالا، علاقے کی قسمت میں غربت لکھ دی گئی۔ الفتح غزہ میں غربت ختم کرنے اور مغربی کنارے ویروشلم میں اسرائیلی قبضہ اور یہودی آبادکاری روکنے میں ناکام رہی ہے، جس کی وجہ سے الفتح بہت تیزی کے ساتھ محدود اور بے اثر ہوتی جا رہی ہے۔ 2006ء کے انتخابات میں اکثریت حاصل ہونے کے بعد حماس نے خراب معاملات کو سنبھالنے اور بہتری لانے میں انتھک محنت کی لیکن انہیں ہر طرف سے ناکام بنانے کی شازشیں جاری رہیں۔ دحلان اپنی تمام تر ناکامیوں کے باوجود غزہ اور مستقبل کے فلسطین میں سیاسی جگہ بنانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں لیکن ان کو ابھی دوبارہ فعال ہونے کیلئے کئی مرتبہ سوچنا ہو گا کہ ابھی انہوں نے اپنا جو تجارتی مقام بنایا ہے، کہیں اس سے ہاتھ نہ دھونا پڑ جائیں۔

دحلان کی طرح یحییٰ شنوار نے بھی ایک مختلف تنظیم میں تربیت حاصل کی اور اعلیٰ عہدے پر پہنچے، دونوں نے خان یونس کے پناہ گزین کیمپ میں غربت میں پرورش پائی، پھر غزہ اسلامک یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی، یونیورسٹی میں دونوں کے درمیان طلبہ یونین کی قیادت کیلئے مقابلہ بھی ہوا، جس کے بعد ایک الفتح کا اور دوسرا حماس کا جنگجو، دونوں کو ہی غزہ نے بنایا اور دونوں ہی امریکی پالیسیوں کی پیداوار ہیں۔ فلسطینی قوم پرستی میں جان انتفادہ کی پہلی تحریک کے بعد پڑی اور اسرائیل کے خلاف فلسطینی جدوجہد کو جائز بھی تسلیم کیا گیا۔ یحییٰ نے 17 برس اسرائیلی جیل میں گزارے ہیں، وہاں انہوں نے عبرانی بولنا بھی سیکھی، جیل میں ان کو دحلان پسند تھے۔ دونوں نے اسرائیل سے جنگ لڑی اور مذاکرات بھی کیے، پھر دونوں کیوں ایک دوسرے کے ساتھ مذاکرات سے گریزاں ہیں، خاص کر ایسے حالات میں جب حماس اور محمود عباس کے درمیان قابل عمل معاہدے کا امکان نظر نہیں آتا۔

5 مارچ کو فتح کی انقلابی کونسل کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے محمود عباس نے مبینہ طور پر شکایت کی کہ ''ہمیں نہیں پتا کہ حماس مصالحت چاہتی ہے یا ایران مصالحت چاہتا ہے، نہیں معلوم حماس فلسطینی اتھارٹی کا حصہ بننا چاہتی ہے یا اس کی سربراہی چاہتی ہے، کہہ نہیں سکتا کہ حماس مصالحت چاہتی ہے یا ہمیں صرف اپنے اے ٹی ایم کی طرح استعمال کرنا چاہتی ہے''۔ محمود عباس کے بے لچک جواب نے حماس اور دحلان کے درمیان مصالحت کے مشکل کام کا امکان پیدا کر دیا ہے، محمود عباس سے معاہدہ ہو یا نہ ہو، حماس کا مقصد اپنی سلامتی، اجارہ داری پر سمجھوتہ کیے بغیر کسی طرح محاصرہ ختم کرانا ہے جبکہ دحلان کی خواہش ہے کہ قاہرہ اور خلیجی ممالک سے تعلقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے غزہ پر دوبارہ کنٹرول حاصل کیا جائے، جس کے ذریعے فلسطین کے مستقبل میں اہم کردار حاصل کیا جا سکے۔

اسماعیل ہانیہ کے سابق مشیر احمد یوسف کے مطابق ''دحلان اس قوم کا حصہ ہیں، اور وہ فلسطین کی سیاست میں موجود رہنے کیلئے کیلئے سخت جدوجہد کر رہے ہیں، شاید وہ ایک نئی جماعت تشکیل دینے کا فیصلہ کریں، مغربی کنارے میں موجود قیادت اور الفتح کے ساتھ معاملات خراب کیے بغیر دحلان کے ساتھ تعاون کرنا حماس کے مفاد میں ہو گا، اگرچہ دحلان حماس کے مخالف ہیں اور موجودہ حالات میں الفتح سے دور ہیں، غزہ کا انتظام چلانے کیلئے تمام اختلافات ایک طرف رکھ کر حماس دحلان کے ساتھ قومی شراکت داری قائم کرنے کی طرف بڑھ رہی ہے'۔ ان تنازعات کی وجہ سے فلسطینی مستقبل کو پہنچنے

والا نقصان سب سے اہم عنصر ہے، جس کا سب سے زیادہ فائدہ اسرائیل نے اٹھایا ہے اور فلسطینی رہنماؤں کی نااتفاقی نے آج اس حال پر پہنچا دیا ہے کہ سب کو ہی منزل سے دور کر دیا گیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ باہمی سر پھٹول یقیناً ان کو ایک میز پر بیٹھنے پر مجبور کر دیں گے جبکہ دشمن قوتیں اپنے ایجنٹوں کے توسط سے فلسطینی قوم کے امتحانات میں اضافہ کر کے انہیں امریکی ایجنڈے پر سر جھکانے پر مجبور کرنے کیلئے پوری قوت سے مصروف عمل ہے لیکن ایسا ہو گا نہیں کیونکہ غزہ کے باسیوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی، خون پھر خون ہے، بہتا ہے تو جم جاتا ہے۔

بروز اتوار 28 رمضان الکریم 1445ھ 7/ اپریل 2024

زمینی خداؤں کے زر خرید غلام

تحریر، ہاں کیا ہر واقعہ تحریر کیا جاسکتا ہے؟ شاید، ہو سکتا ہے خود پر تھوڑا سا جبر کریں، خود کو جمع کریں تو آپ لکھ لیں گے لیکن کیا ہر بات لکھی جاسکتی ہے؟ خوشی کو تو لکھا جاسکتا ہے اور غم کو۔ دکھ تو تحریر ہو سکتا ہے مگر درد اور انسوؤں اور کرب کو کیسے لکھیں! اضطراب کو، بے کلی کو، بے حسی کو، انا کو تحریر میں کیسے سموئیں۔ لفظ وہی ہوتے ہیں، قلم وہی ہوتا ہے، صفحات وہی ہے، سب کچھ تو وہی ہے لیکن آپ بے دست و پا ہیں۔ رحمت کو تو بیان کیا جاسکتا ہے، تحریر کیا جاسکتا ہے، نحوست کو کیسے پابند تحریر کیا جاسکتا ہے! اداسی کو تحریر کر سکتے ہیں آپ؟ کچھ نہیں کر سکتے ہم۔ فیض صاحب نے تو کہا ہے "جو دل پہ گزرتی ہے سو گزرتی ہے"، اسے بیان کیسے کریں! میرے لیے یہ ممکن نہیں۔ نہیں مجھے یہ ہنر نہیں آتا اور مجھے یہ سیکھنا بھی نہیں ہے۔ ضروری تو نہیں ہے مجھے سب کچھ آتا ہو۔ نہیں میں نہیں لکھ سکتا دل کو، اداسی کو، بے کلی کو، اضطراب کو... بالکل نہیں لکھ سکتا بھلا آنسوؤں کو کیسے تحریر کروں؟ بتایئے آپ؟ اگر آپ تحریر کر سکتے ہیں تو ضرور کیجئے۔

لیکن یہ ہوتا رہا ہے، ہوتا رہے گا، یہی ہے ریت۔ کوئی نئی بات نہیں، کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ خلق خدا کے حق میں نغمہ سرائی جرم تھی، جرم ہے، جرم رہے گی۔ خلقِ خدا کی گردنوں پر سوار اس وقت بھی یہی کرتے تھے، اب بھی یہی کرتے ہیں اور آئندہ بھی یہی کرتے رہیں گے۔ کوئی نئی بات نہیں، یہ ہوتا رہا ہے، ہوتا رہے گا۔ آپ زمینی خداؤں کو للکاریں گے تو وہ آپ کو ہار پھول پیش نہیں کریں گے۔ یہی ہو گا۔ آپ آئینہ دکھائیں گے اور وہ اپنی مکروہ صورتوں کو دیکھ کر آپ کو پتھر ماریں گے۔ گولیاں داغیں گے۔ لاٹھیاں برسائیں گے۔ آنسو گیس کے شیلوں کی برسات کریں گے لیکن اپنے قلم کو خلقِ خدا کی امانت سمجھنے والے کبھی باز آئے ہیں نہ آئندہ آئیں گے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں:

ہوں جب سے آدمِ خاکی کے حق میں نغمہ سرا
میں دیوتاؤں کے بپھرے ہوئے عتاب میں ہوں

زمینی خداؤں کے زر خرید غلام خلقِ خدا کی آواز کو خاموش کرنے کا سپنا دیکھتے ہیں اور وہ کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو پاتا، نہ ہو گا تو بس پھر یہی منظر ہو گا، آئندہ آنے والے چند دنوں میں۔ ہر طرف بپھرا ہوا عتاب اور اہل جنوں کا نعرۂ مستانہ۔ سر بلند رہے گا یہ نعرۂ، فرعون پہلے بھی غرقاب ہوا تھا، آئندہ بھی اس کا نصیبا یہی ہے۔ مبارک ہو انہیں جو خلق خدا کیلئے سر عام پٹتے رہے۔ جن کے خون سے سڑکیں رنگین ہوئیں۔ آج کچھ نہیں ہے کہنے کو، بس جو کچھ سن رہا ہوں، وہ لکھ رہا ہوں۔ ٹی وی چینلز پر لوگوں کے پیغام دیکھ رہے ہیں آپ! میں نے بھی دیکھے ہیں، سنے ہیں... وہی تحریر کر رہا ہوں، اس لئے کہ میں زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھتا ہوں۔ اندھے، بہرے نوشتۂ دیوار نہیں پڑھ سکتے تو ہم کیا کریں!

ہاں، فرعون مرتا ہے، فرعونیت نہیں مرتی۔ اس کے پیروکار آتے ہیں، آتے رہیں گے۔ پھر وہ پکارنے لگتے ہیں، ہمارا منصوبہ کامیاب رہا۔ ہم ہیں اعلیٰ و ارفع۔ ہمارے پاس ہیں وہ دانش و بینش جو بچالے جائیں گے سب کو۔ بس ہمارے پیچھے چلو۔ ہماری پیروکاری کرو کہ نجات اسی میں ہے۔ یہاں ہر فرعون یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ بس وہی ہے عقل و فکر کا علمبردار... بہت ضروری ہے وہ۔ اس کی ہدایت و رہنمائی ہی نجات کا سبب ہے۔ بس وہی "میں" کا چکر۔ نحوست کا چکر۔ اسی لیے وہ پکارتا رہتا ہے۔ وہی ہے اعلیٰ و ارفع، وہی ہے رب اور رب اعلیٰ بھی۔ خود فریبی کی چادر میں لپٹا ہوا۔ موت... موت تو اسے چھو بھی نہیں سکتی۔ سامان حرب سے لیس۔ خدام اس کی حفاظت پر مامور ہیں۔ چڑیا بھی پر نہیں مار سکی۔ دور دور تک کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اسے گزند پہنچا سکے۔

مصاحبین کے نعرہ ہائے تحسین اسے اس زعم میں مبتلا رکھتے ہیں کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ اس کی مرضی سے چلتا ہے کاروبار حیات... جیسے وہ موت کو بھول بیٹھتا ہے، خود فریب تو سمجھتا ہے کہ موت بھی اسے بھول جائے گی۔ سمجھ بیٹھے ہیں یہ محفل سدا سجائیں رہیں گے۔ واہ، واہ، آفرین آفرین کرنے والے درباری یونہی داد دیتے رہیں گے۔ نہیں جناب بالکل بھی نہیں۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

لیکن پھر ایک اور دریا ہوتا ہے اور انجام وہی۔ بالکل یہی سمجھتا ہے کہ جس طرح وہ موت کو بھولا ہوا ہے، موت بھی اسے بھول چکی ہو گی لیکن آتی ہے وہ۔ ہزار پہرے بیٹھا دیجئے، دیواریں چنوا لیجئے، کیمرے لگا لیجئے۔ وہ نہیں رکتی۔ آتی ہے اور سرعام آتی ہے۔ کوئی نہیں بچ سکا اس سے لیکن ہوتا کچھ اور ہے۔ سب کچھ ہوتا ہے... محافظ بھی، سامان حرب بھی، محلات بھی، ساز و سامان بھی، آفرین بھی، واہ واہ بھی ...سب کچھ ہوتا ہے اور پھر نیل ہوتا ہے، لہریں ہوتی ہیں، منہ زور لہریں...رب حقیقی کے حکم کی پابند۔ اور جب وہ گھِر جاتا ہے پھر دور دور تک کوئی نہیں ہوتا مددگار۔ تب وہ آنکھ کھولتا ہے اور پکارنے لگتا ہے "نہیں نہیں، میں ایمان لاتا ہوں، ہاں میں موسیٰ و ہارون کے رب پر ایمان لاتا ہوں۔" لیکن بند ہو جاتا ہے در۔ کسی آہ و بکا سے نہیں کھلتا۔ اور پھر وہ غرق ہو جاتا ہے۔ موت اس کی شہ رگ پر دانت گاڑ دیتی ہے۔ ختم شد۔ نشانِ عبرت۔ داستان در داستان

ہاں! اس وقت ہم کئی امتحانات سے گزر رہے ہیں، تاہم کئی نتائج ہماری رسوائیوں کا سامان لیکر آئے اور کچھ کا نتیجہ ابھی بعد میں نکلے والا ہے لیکن کیا؟ میں نہیں جانتا۔ بس میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ میں نے کیا کیا اور ان کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ ہاں! دعا کروں میں، لیکن کس منہ سے دعا کروں؟ کیسے اپنے رب کا سامنا کروں؟

اک نئی کربلا میرے سامنے بپا ہے۔ ہمارے بچے اور بچیاں تہہ تیغ کئے جا رہے ہیں اور جو کسی طرح جان بچانے کی کوششوں میں پناہ کی تلاش میں ہیں، ان کیلئے جاری غذائی صورتحال اور قحط جیسی موت سر پر منڈلا رہی ہے۔ عجیب صورتحال ہے کہ رمضان المبارک کے مہینے میں بھی آگ و خون کا کھیل بند کروانے کی بجائے امداد کے اعلان تو ہو رہے ہیں اور فضاء سے بھی ان بھوکوں کیلئے کھانے کی اشیاء پھینکی جا رہی ہیں لیکن زمین پر اسرائیلی درندے تاک کر ان کو گولیوں کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ پڑوسی عرب ممالک کے تعیشات میں بھی کوئی فرق نہیں آیا بلکہ لیکن دوسری طرف یہ خبر چل رہی ہے کہ ایک سعودی شہزادہ جوئے میں 300 ملین ڈالر کے ساتھ اپنی پانچ بیویاں جوئے میں ہار گیا۔

لیکن دوسری طرف موت کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کی ثابت قدمی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ خود اسرائیلی میڈیا نے اپنے خونخوار عسکری اداروں کی شکست کو تسلیم کرتے ہوئے اعتراف کر لیا ہے کہ اسرائیلی مغوی افراد کو بازیاب کروانا اب ان کے بس کی بات نہیں جس کیلئے ایک مرتبہ پھر پڑوسی ممالک میں مذاکرات کی بساط بچھائی جا رہی ہے جہاں پہلی مرتبہ "خون بہا" کا لالچ بھی سامنے آنے کا امکان ہے اور اس کی ادائیگی کیلئے ثالثوں کو ادائیگی کیلئے کہا جائے گا۔ عجلت میں طے پانے والے اس معاہدے میں بے یقینی کا یہ عالم ہو گا کہ مطلوبہ مغوی کی روانگی کے ساتھ ہی ادائیگی کو منسلک کر دیا جائے گا۔ کیا اس خوفناک خونی طوفان کا ایسے ہی مداوا ہو گا؟

آپ کہاں ہیں اور کیا کہتے ہیں؟ معصوموں کی چیخیں مجھے جینے نہیں دیں گی۔ میرا سینہ شق ہو جائے گا۔ میں کچھ نہیں کر سکا۔ ہاں مجھے زندگی پیاری ہے... ہاں میں سانس کی آمد و رفت کو زندگی سمجھتا ہوں...ہاں میں نے ذلت و رسوائی کی زندگی قبول کر لی ہے...ہاں میں موت سے بہت ڈرتا ہوں...ہاں میں نے

اپنا رب بدل لیا ہے...ہاں میں عزت و ذلت کا مالک انہیں سمجھتا ہوں جن کے ہاتھ میں ہمارے اقتدار کی ڈوری ہے، جن کے ایک ہاتھ میں خوفزدہ کرنے کیلئے کڑکتے کوڑے ہیں اور دوسرے ہاتھ میں ہمارے چیچک زدہ چہروں پر سجے طمع و حرص کے مارے منہ بھرنے کیلئے ڈالروں سے بھرے توڑے۔ان کے پاس بے حس بندوقیں ہیں۔شعلہ اگلتی ہوئی بندوقیں۔میں انہیں زندگی اور موت کا مالک سمجھتا ہوں جن کے میزائلوں کی گڑگڑاہٹ سے دل دہل جاتا ہے اور مجھے خدشہ ہے کہ کہیں وہ میرا تورابورا نہ بنادیں۔ہاں وہی ہیں میرے مالک... آپ کے متعلق کیسے کہہ سکتا ہوں! آپ جانیں اور آپ کا کام۔

بروز منگل 30 رمضان الکریم 1445ھ 9/ اپریل 2024

عید محکوماں ہجومِ مومنین

اس اجتماعی زندگی کے کچھ فطری تقاضے ایسے بھی ہیں جو کسی بھی معاشرے میں ایک خصوصیت بن کر سامنے آتے ہیں۔ اس لئے ہر جگہ سماجی طور پر کچھ متعین دن تہوار یا جشن کی حیثیت حاصل کرتے ہوئے مذہبی روایات میں شامل ہیں۔ کچھ سماجی عوامل کا ایک تاریخی تسلسل ہے جس کا رشتہ انسانی فطرت سے ایسا جڑا ہوا ہے کہ معاشرے میں مشاہدے سے اس کی تصدیق ہو رہی ہے چنانچہ آج موجودہ دور میں کوئی بھی گروہ اور سماج اس سے مستثنیٰ نہیں ملے گا۔

میرے آقا آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ کے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ برسوں سے جاری چند مخصوص ایام میں وہاں کے افراد لہو ولعب کے مظاہرے میں شریک ہوتے ہیں۔ حضور ﷺ نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے تمارے لئے دو دن عید الفطر اور عید الاضحیٰ مقرر کئے ہیں جو ان سے کہیں بہتر ہیں۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو ہر سال ان عیدوں کو اسلامی طریقے پر منا کر قیامت تک آنے والے امت مسلمہ کی مستقل رہنمائی فرمادی۔

بنیادی حیثیت اور عید الفطر میں نماز عید اور صدقہ فطر کو حاصل ہے مثلاً یہ کہ نماز عید کا اہتمام صبح ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ طہارت اور لباس کی عمدگی کے ساتھ عطریات کے استعمال اور سویرے جلد ہی عید گاہ کا رخ کرنا، راستے میں تکبیر کہتے ہوئے ایک راستے سے جانا اور واپسی پر دوسرا راستہ استعمال کرنا آپ ﷺ کی سنت مبارکہ ہے۔ نماز عید شہر سے باہر ایک ساتھ ادا کی جاتی اور تمام اصحابہ وہاں حاضر ہوتے۔ اس نماز سے قبل میں اذان، اقامت اور کوئی خطبہ بھی نہ ہوتا البتہ نماز عید سے فراغت کے بعد آپ ﷺ اور آپ کے بعد خلفائے راشدین خطبہ دیتے اور صدقہ فطر کے احکام وغیرہ سے لوگوں کو باخبر کرتے۔ بعض مرتبہ آپ نے عورتوں کو ان کی مجلس میں جاکر مستقل وعظ ونصیحت بھی فرمائی۔ صدقہ، فطر کے سلسلے میں صاحبِ حیثیت افراد کو نمازِ عید سے قبل اپنے اور اہل وعیال کی طرف سے صدقہ فطر مساکین کو ادا کرنے کا حکم بھی ارشاد فرمایا تاکہ وہ بھی عید کی خوشیوں میں شامل ہو سکیں۔

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ عید کے دو بنیادی عناصر ہیں۔ پہلا کریم رب کی بندگی کیلئے دوگانہ رکعت کو واجب قرار دیا گیا اور دوسرا غریبوں کی غم خواری اور خبر گیری کیلئے صدقہ فطر ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔ ان نکات پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ عید بے شک مسلم تہوار ہے لیکن اس کی نوعیت وہ ہرگز نہیں جو اغیار کے تہواروں کی ہے۔ ان کا اپنا نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ پورا معاشرہ اور ہر فرد اس دن آزاد ہے کہ جتنی بے اعتدالیاں اور خرافات میں بھی مبتلا ہو، سب جائز ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس نظریے کو ماننے والے حضرات کس طرح تہواروں میں بدمست اچھلتے کودتے اور عقل وخرد سے بیگانہ یا ایسے ہی اعمال و افعال میں مشغول رہنے کو اپنا یا ایسے ہی اعمال وافعال میں مشغول رہنے کو اپنا کمال سمجھتے ہیں جبکہ اسلام نے انسان کو اس طرح کی مطلق العنان آزادی کبھی نہیں دی بلکہ اسلامی نظریہ ہر ہر قدم پر اطاعت فرماں برداری کا ہے اور اس کیلئے اسلامی تعلیمات میں مکمل ہدایات موجود ہیں اور عید کا معاملہ بھی اس سے مبرا نہیں ہے۔ چنانچہ انسانی مزاج کی رعایت کرتے ہوئے اسلام نے خصوصی دن متعین تو کر دیئے ہیں جن میں زیادہ سے زیادہ اجتماعیت کو اور اجتماعیت کے اظہار کو اچھا سمجھا گیا ہے لیکن اس کو عبادت سے ہم آہنگ کر دیا گیا ہے جس میں عجز وبندگی کا بھرپور اظہار ہے اور قوم کے بے کس اور بے سہارا اشخاص کا تعاون بھی ہے۔

عید کے یہی وہ بنیادی عناصر ہیں جنہوں نے اسلامی عید کو دوسرے تہواروں سے ممتاز کر دیا ہے اور اس سے اسلام کا یہ مزاج بھی ظاہر ہو کر سامنے آجاتا ہے کہ بندگی کے تقاضوں کو پورا کرنا ہر حال میں مقدم ہے چاہے وہ خوشی کا موقع ہو یا رنج و غم کا، البتہ اسلام نے خدمت خلق اور قوم کے بے سہارا افراد کی رعایت کو بھی کار ثواب قرار دیا ہے۔ اسے بہت بڑے اجر و ثواب والا عمل بتایا گیا ہے حتیٰ کہ وہ مواقع جن میں عام لوگ صرف خرافات میں بدمستی کو اصل موضوع سمجھتے ہیں، اسلام نے ان مواقع میں بھی ان چیزوں کو اہمیت اور اولیت دی ہے۔ عید کی ایک حیثیت انعام اور تحفہ کی بھی ہے، حسب توفیق جی بھر کر عیادتیں کیں۔ دن بھر اللہ کی رضا کیلئے بھوکے پیاسے اور دوسری تمام نفسانی خواہشات سے دور رہے اور ایک دن یا ہفتہ نہیں، پورا ایک مہینہ اس حال میں گزارا۔ پھر راتوں کو سب سے پہلے تراویح میں مشغول رہ کر نماز اور قرآن سننے کی سعادت حاصل کی، پھر حسب توفیق نوافل تسبیحات اور تہجد وغیرہ میں ان کا وقت مصروف رہا۔ قرآن کی تلاوت سے گھر اور مسجدوں کے در و دیوار گونجتے رہے۔ مانگنے والوں نے رب کریم سے خیر و سلامتی کی دعائیں مانگیں اور اس کے فضل و کرم اور بخشش و مغفرت کے حقدار قرار پائے، جنہیں اللہ نے توفیق دی انہوں نے اعتکاف کی فضیلت بھی حاصل کی

۔

صدقہ خیرات میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا غرضیکہ خیر اور بھلائی کے جتنے ذرائع تھے، ان سب میں پیش پیش رہے۔ عید کا دن انہیں عبادت گزاروں کا دن اور رب کریم کی طرف سے آج ان کو انعام دیا جانے والا ہے گویا حقیقی معنوں میں اصل عید تو انہیں کی ہے جنہوں نے رمضان الکریم میں بندگی کے تقاضے پورے کئے اور ان کے توسط سے دوسرے بھی اس خوشی میں شریک قرار پائے اور عید کے منانے کا حق انہیں بھی عطا کر دیا گیا۔ اس موقع پر ایک بات بھی قابل توجہ ہے کہ عبادت اور نیکیاں جو رمضان میں کی جاتی ہیں اور جس طرح مسجد میں نمازیوں سے بھر جاتی ہیں۔ لوگ خیر اور بھلائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور جس طرح زیادہ سے زیادہ عبادت گزار بندے بن کر اپنا وقت گزارتے ہیں یہ صرف رمضان ہی کیلئے نہیں تھا بلکہ سال کے بقیہ دنوں کیلئے ایک تربیتی پروگرام ہوتا ہے۔

لیکن ان زمینی حقائق سے کس طرح انکار کیا جاسکتا ہے کہ چند برس قبل تک عید الفطر کے موقع پر مختلف احباب ایک دوسرے کو تہنیتی پیغامات بذریعہ عید کارڈ ارسال کیا کرتے تھے اور ان دنوں اکثریت جدید دور کی ٹیکنالوجی کو استعمال کرتے ہوئے موبائل فونز کی سہولت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف انداز میں پیغامات ارسال اور وصول کر رہے ہیں۔ یقیناً قارئین کی مختصر تعداد ان مغربی ممالک میں عید کارڈ کو اب بھی کرسمس کارڈ کے مقابلے میں اپنے گھروں میں نمایاں جگہ دیکر بچوں کو اپنے اس اسلامی تہوار سے متعارف کروانے کی کوشش ناتمام کرتی ہے حالانکہ مسلمان ان رسوم و قیود سے بالکل بے نیاز ہے۔ وہ تو بہت بے تکلف اور سادہ زندگی گزارنے کا عادی ہے۔ ہر تہوار کے پس منظر میں جو پیغام ہوتا ہے اس کو نظر انداز کر کے ہم نے جس طرح مغربی ماحول کی نسبت سے اپنے ہر تہوار کو ڈھال لیا ہے، چند مغربی رسوم کو کلمہ پڑھا کر تیزی سے ہم اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اپنے آپ کو اجتماعی ذمہ داریوں سے دور کر رہے ہیں، یقیناً مستقبل کا مؤرخ ہمیں اس سلسلے میں معاف نہیں کرے گا کہ ہم نے اپنی آنے والی نسلوں کو عید کے اصلی مفہوم سے بے خبر رکھا۔

عید الفطر کے موقع پر عید کارڈ کا اپنے احباب کے ساتھ تبادلہ پر اٹھنے والی رقم کئی مفلس گھروں میں یقیناً عید کی خوشیاں لا سکتی ہے جو اپنے عزیزوں کو کاغذی گلدستے پیش کرنے پر اٹھ رہی ہے حالانکہ خطوط میں لکھے ہوئے الفاظ میں بھی خلوص و محبت کی خوشبو محسوس کی جاسکتی ہے اور پھر ان کانٹوں بھری زندگی کو جو ایک غلط نظامِ حکومت کے تحت گزارنی پڑ رہی ہے۔ اس میں خلوص و محبت اور وفا کے پھول یقیناً بڑی چیز ہیں اور اس زندگی کی مسافت

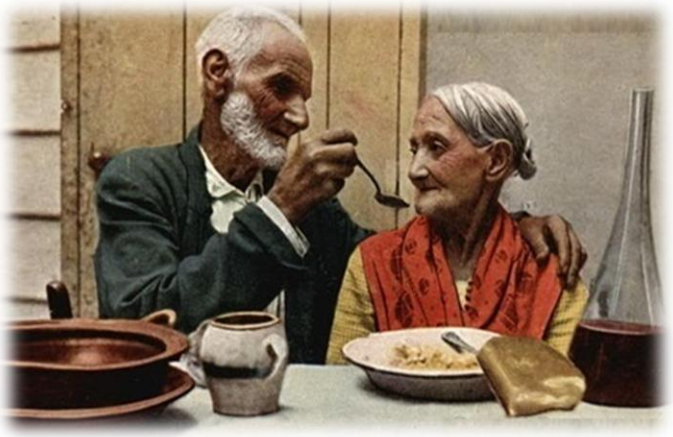

آدمی بتدریج طے کر کے جب کچھ شعور حاصل کرتا ہے تو اس کو آگہی ہوتی ہے کہ اس دنیا میں سکون دینے والی چیزوں میں مقید زندگی کا شعور اور بے غرض مہر و محبت بڑی چیز ہے۔ مقید زندگی کا شعور انسان کو غم و آلام سے نجات دلا کر اطمینان سے بھر دیتا ہے۔

آدمی خالی ڈھول کی مانند نہیں رہ جاتا کہ معمولی ٹھوکر سے واویلا کرنے لگے بلکہ ایک ٹھوس وجود بن جاتا ہے جسے حوادث کی آندھیاں بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتیں اور مہر و محبت وہ قوت ہوتی ہے کہ جو صرف اپنے ہم مقصد ساتھیوں کی رفاقت سے حاصل ہوتی ہے۔ ساتھیوں کی باتیں، ان کے مصافحے، ان کے معانقے، ان کی محبت بھری گفتگوئیں، ان کی بے غرض دوستیاں اور بے لوث ملاقاتیں ان سب چیزوں کے درمیان آدمی اپنے آپ کو ایک لشکر کے درمیان سمجھتا ہے۔ پر امن اور پر سکون عزیز دوست اس مختصر سی زندگی میں متاع بے بہا ہے جبکہ اس ملک میں مشینی انداز میں کام کرتے کرتے اعضاء اس قدر بے جان ہو گئے ہیں کہ ہمیں صرف ایک کارڈ میں اس قدر جان معلوم ہوتی ہے کہ اس کو خود سے توانا سمجھ کر اس کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے ہیں

ویسے تو عید کارڈ ماہِ رمضان کی جدائی کا پیغام لیکر آتا ہے، اس جملے میں کسی تقویٰ کا اظہار کرنا مقصود ہرگز نہیں، اس ماحول میں تو اب ایسے ایسے اصحاب دیکھنے کو مل رہے ہیں جن کے تقدس کی خود صاحب تقویٰ قسمیں کھاتے ہیں لیکن جب ان کو غور سے دیکھیں تو ان کی حیثیت کسی میلے میں بکنے والے رنگین غباروں سے زیادہ نہیں ہوتی جو اوپر سے بڑے رنگین اور خیر و خوبی کے مدعی ہوتے ہیں لیکن اندر سے حرص و ہوس کی متعفن ہوا نکل رہی ہوتی ہے اور جب زندگی میں تند ہوا کا جھونکا ان کی قلعی کھول کر رکھ دیتا ہے تو پھٹ کر ایک چیتھڑے کی طرح ایک کونے میں جا گرتا ہے اور بالآخر پاؤں میں مسل کر باہر کسی کوڑے کرکٹ یا گندگی کے ڈبے میں اس کو جگہ ملتی ہے۔ اللہ ہر مسلمان کو اس تقویٰ سے محفوظ رکھے آمین! اور ایسے تقوے کی توفیق عطا فرمائے جو ہوائے نفس سے خالی ہو، جو مظاہر نمود و نمائش اور ادعا سے پاک ہو، جس میں اتنی ہمت ہو کہ حق کی راستے میں مشکیں کسی جائیں اور الٹا اونٹ سے باندھ کر مدینے کی گلیوں میں گھسیٹا جائے تو بھی اٹھ کر صاف صاف یہی کہے کہ "لوگو! سن لو میں مالک بن انس ہوں، میں کہتا ہوں کہ جبریہ طلاق شریعت میں وارد نہیں ہوتی، جس میں اتنی ہمت ہو کہ جب اس پر کوڑوں کی بارش ہو تب بھی یہ بات کہے کہ اپنی بات منوانے کیلئے قرآن و حدیث سے کوئی دلیل لاؤ، جس میں اتنا حوصلہ ہو کہ جیل میں موت قبول کر لے اور زنداں سے اس کا جنازہ نکلے (امام ابو حنیفہ) جس میں اتنی جرأت ہو کہ پھانسی کے تختہ پر بھی مسکراتے ہوئے یہ کہہ کر چڑھ جائے کہ الٰہی تیرا احسان ہے کہ تو نے مجھے شہادت کی موت نصیب فرمائی، نہ کہ چند مظاہر لباس و تراش کا نام تقویٰ رکھ کر اس کا اعلان کر کے تقویٰ و پرہیز گاری کا اشتہار پیش کیا جائے۔ یہ طریقہ اب تک تو چلا ہے انشاء اللہ کل نہ چلے گا۔

ایک صاحبِ نظر نے سچ کہا تھا کہ پہلے ایمان کو اپنے اندر مستحکم کرو پھر اس پر عمل کر کے اور ساری زندگی اطاعتِ رب میں دیکر اپنے اسلام کا ثبوت پیش کرو، ساری زندگی کا لمحہ بہ لمحہ محاسبہ کرتے ہوئے چلو، کسی موڑ پر ٹھوکر نہ کھاتے اور ہمہ تن اپنے فرائضِ بندگی کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہوئے تقویٰ پیدا کرو اور پھر اپنا سب کچھ اپنے مالک کی راہ میں لگاؤ اور اس راہِ حق کے غبار بن کر احسان کا مقام حاصل کرو۔ لیکن یہاں تو ثابت ذرا بھی اسلام نہیں لیکن

لباس تقویٰ کا زیبِ تن کیا ہوا ہے۔ منبر رسول پر کھڑے ہو کر لوگوں کو سود (مارگیج) سے منع کیا جارہا ہے لیکن خود بینک میں سودی اکاؤنٹ رکھ کر بینک سے صد فیصد قرض لیکر مکان خرید اجارہا ہے، کاروبار میں وسعت کی جارہی ہے اور پوچھنے پر محاسبہ سے بچنے کیلئے مغرب یا امریکا کو "دار الحرب" کا نام دیکر جان بخشی کا بہانہ ڈھونڈا جارہا ہے۔ سود جسے قرآن میں بڑی صراحت کے ساتھ اللہ اور رسول کے خلاف کھلی جنگ قرار دیا گیا ہے، اسی کے سہارے اسلامی شعائر کا مذاق اڑا کر داعی حق کا گراں بار فریضہ بھی سرانجام ادا کیا جارہا ہے۔

جس کارڈ یا پیغام سے عید کی خوشی کا پیغام دینا مقصود ہوتا ہے اسی کو دیکھ کر بچے حیراں و پریشاں ہیں کہ آخر ہم مسلمانوں کی عید ایک دن کیوں نہیں منائی جاتی؟ کیا وجہ ہے کہ چاند کچھ مسلمانوں کو سعودی عرب میں نظر آتا ہے تو کچھ مراکش کے بادلوں میں اس کو ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں؟ ہم سارا سال اپنی نمازوں کا تعین یہاں برطانوی محکمہ موسمیات کے بتائے ہوئے اوقات سے ترتیب دیتے ہیں لیکن چاند کے بارے میں ان کی سائنسی گواہی ماننے کو تیار نہیں؟ عید جو اتفاق و محبت کا پیغام لیکر آتی ہے آخر اس کے نام پر کیوں دنگا فساد کیا جاتا ہے حالانکہ رمضان کا چاند طلوع ہوتے ہی اس گئی گزری مسلمان قوم کے اندر بھی زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ ایک اضطراب، ایک احتیاط، ایک خدا خوفی، ایک ذوقِ عبادت ابھر کر سامنے اس طرح آجاتا ہے جس طرح صبح کی شمع سنبھالا دیتی ہے اور محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ قوم واقعی دوسری اقوام سے مختلف ہے۔

بس یہی ایک مہینہ ہے جب اس قوم کے اندر ایک امتیازی نشان ابھرتا ہے، ان کے دل خوف خدا سے لبریز صدقہ و خیرات، غم گساری اور بھائی چارے کے علاوہ شب بیداری و عبادات میں مصروف نظر آتے ہیں لیکن اس مہینے کے آخری دن اور پھر سارا سال یہ شناخت کرنا مشکل ہے کہ یہ لوگ کس ملت سے تعلق رکھتے ہیں۔ روزوں کی احتیاط میں نماز تراویح کیلئے مساجد میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی، سحری کی رونق، افطاری کی چہل پہل، یہ امتیازات اس قوم کو دوسروں سے ممتاز کر دیتے ہیں، یہی وہ برکات ہیں جو اس مہنہ کو سال بھر میں عزیز تر مہینہ بنا دیتی ہیں، اب تو انہی کے دم قدم سے کچھ نشانِ امتیاز قائم ہے لیکن جونہی مغرب اور غیر مسلموں کی نقالی کر کے عید کارڈ اور پیغامات ارسال کرتے ہیں تو گویا خود فراموشی کے بقیہ گیارہ مہینوں کا پیغام دیتے ہیں جو اس متنازعہ دن کے بعد شروع ہونے والے ہیں۔ اس لئے رمضان المبارک کی مفارقت اور آئندہ گیارہ مہینوں کی منافقت آنکھوں میں نم آلود غبار پیدا کر دیتی ہے۔ اگر سچ پوچھیں تو عید کیا ہے جسکے ہم مسلمان منتظر ہیں:

عید آزاداں شکوہ ملک و دیں
عید محکوماں ہجومِ مومنین!!!

شکوہ مومنین تو بڑی چیز ہے، شکوہ ملک ہی سے محروم ہیں۔ شکوہ ملک جس چیز کا نام ہے وہ ہر قسم کے خارجی و داخلی اثرات سے آزاد اور پاک ملکی پالیسی ہے ۔ داخلی اطمینان اور سرحدوں کی قوت و شوکت ہے، دوسرے ممالک میں عزت و منزلت کا مقام ہے، قوموں کی برادری میں سربلندی ہے، افرادِ قوم کا اطمینان معاشی و معاشرتی خوشحالی ہے لیکن خوردبین لگا کر بھی آپ کو یہ اوصاف کسی مسلمان ممالک میں نہیں ملتے بلکہ مسلمان مملکتیں اپنے اندر کئی گروہوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے گلے کاٹنے میں مصروف ہیں اور اغیار اس بات پر خوش ہیں کہ ہزاروں میل دور بیٹھ کر وہ ان پر اس طرح حکومت کر رہے ہیں کہ 57 مسلم ریاستوں میں جرات نہیں کہ غزہ کے مسلمانوں کو اسرائیل کی بربریت سے بچا سکتے۔ اگر اگر دنیاوی دولت سے اللہ نے کچھ اسلامی ممالک کو مالامال فرمایا ہے تو ان کی دولت سے فائدہ بھی اغیار اٹھا رہے ہیں، ان مسلمانوں کے خزائن اغیار کے تصرف میں ہیں اور اسی سرمائے سے مسلمان ممالک کو اسلحہ تیار کر کے فروخت محض اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس کا تجربہ بھی تم دوسرے مسلمان ممالک کی آبادی پر کرو۔

پھر شکوۂ دیں یہ ہے کہ اللہ جس کے حاکم ہونے کا اقرار ہمارے ہاں کلمہ پڑھ کر ایک جاگیر دار و سرمایہ دار سے ہاری و مزدور تک کرتا ہے تاکہ اسی کا حکم اور قانون چلے اور جس کو آقا مانا ہے اس سے انحراف نہ ہو۔ یہ عجیب مذاق ہے کہ ایک نمبر دار ہے تو گاؤں کا ہر فرد اسے تسلیم بھی کرے اور اس کے حقوقِ نمبر داری ادا بھی کرے، ایک شخص ضلع افسر ہے تو ضلع بھر میں اس کی افسری کا ڈنکا بھی بجے اور کوئی شخص ملک کا سربراہ ہو تو اس کا ہر لفظ سر آنکھوں پر ہو اور جو خود کہتا ہے کہ (انا الحکم اللہ) اسی کے حکم کی ذرہ بھر پرواہ نہ ہو۔ ادھر ہر طرف دین کے نشانات مٹ رہے ہوں ادھر رقص و سرور کی مجالس سج رہی ہوں، گانا بجانا کلچر کے نام پر روا ہو، پینے پلانے کی کھلی اجازت ہو، چوری چکاری، بدعنوانی، رشوت خوری موجود ہو، رزقِ حلال کا حصول ناممکن کر دیا ہو، جو بچا کھچا دین قوم میں صدیوں کے انحطاط کے باوجود باقی چلا آرہا ہو اس کا بھی صفایا کیا جارہا ہو، قوم بار بار پکارے کہ ہمیں دین کی حکمرانی اور اسلام کا قانون چاہئے، اسی کے خلاف ساری قوت اور طاقت استعمال ہو رہی ہو اور دین سے ہر قدم دور جارہا ہو، برسوں کا سفر زندگی مکہ مدینہ کی سمت چھوڑ کر کسی اور ہی سمت کیا گیا ہو تو وہاں شکوۂ دین کہاں سے آئے گا، پھر جب نہ شکوہ ملک ہو نہ شکوۂ دین تو پھر آزاد بندۂ مومن کہاں ملے گا اور یہی وجہ ہے کہ عید کا دن ہجومِ مومنین کے سوا کچھ نہیں، اس لئے عید کی خوشی کا اظہار ایک کارڈ یا فون پر پیغامات کی ترسیل میں وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

ہاں البتہ اگر عید کی حقیقی خوشیوں کا حصول چاہتے ہیں تو یہ بہترین موقع ہے کہ غزہ اور کشمیری شہدا کے وہ ہزاروں خاندان جو اس وقت غربت اور فاقہ کشی کی حالت میں کسی سے بھی اپنا یہ دکھ بیان نہیں کر سکتے اور غیر انسانی حقوق کی پابندیوں کے وجہ سے دوسرے ملک کے افراد بھی ان تک امداد پہنچانے سے قاصر ہیں، آپ کی فوری توجہ کے مستحق ہیں۔ جلدی کیجئے کہیں دیر نہ ہو جائے۔

بروز بدھ یکم شوال المکرم 1445ھ 10 / اپریل 2024

آبِ حیات کی تلاش

مرید نے مرشد کو اچھے موڈ میں دیکھا تو باادب ہو کر گویا ہوا "میرے مرشد مجھے عرقِ حیات کے متعلق تو کچھ بتایئے، کیا اسی کو آبِ حیات کہتے ہیں؟ اور اس پانی کا چشمہ پھوٹتا کہاں سے ہے؟؟؟ مرشد نے گہری نظر سے مرید کی طرف دیکھا اور سوچ میں ڈوب گیا، جب کافی دیر گزر گئی تو مرید کو یوں لگا جیسے اس نے اپنے مرشد کو ناراض کر دیا ہے۔ وہ پھر ڈرتے ڈرتے بولا: حضرت جی اگر میرے سوال سے آپ کو کوفت ہوئی ہے تو میں معافی کا طلبگار ہوں۔ ایک لمبی ہو کے بعد مرشد نرمی سے بولا، نہیں میں ناراض تو نہیں ہوا مگر فکر مند ضرور ہوں۔ میں نے جب یہ سوال اپنے مرشد سے کیا تھا تو ہمارے درمیان 12 سال کی طویل جدائی پڑ گئی، میں سوچ یہ رہا تھا کہ پتہ نہیں میں تمہاری یہ طویل جدائی برداشت کر سکوں گا بھی یا نہیں، اس دوران اگر میری اجل آ گئی تو کہیں تمہاری محنت ضائع نہ ہو جائے بیٹا، یہ عرقِ حیات یا آبِ حیات "یہ الفاظ میں نہیں سمجھایا جا سکتا" سمجھاؤ تو سمجھ نہیں آتا! اس لئے میرا مرشد تو آبِ حیات کے چشمے کے کنارے کھڑا کر کے اس میں انگلی ڈبو کر دکھایا کرتا تھا کہ یہ ہے عرقِ حیات۔ میں نے یہ سوال اپنے مرشد سے ان کی جوانی میں پوچھ لیا تھا"۔

تم نے بہت دیر کر دی ہے خیر اللہ بہتر کرے گا۔ میں تمہیں ایک پودا دکھاتا ہوں، اس پودے کے پھول کا عرق تم نے ایک چھوٹی شیشی میں بھرنا ہے اور جب یہ شیشی بھر جائے تب میرے پاس واپس آنا، یہ عرق ہی ہماری آنکھوں میں عرقِ حیات کو دیکھنے کی صلاحیت پیدا کرے گا، یاد رکھنا ایک پھول سے صرف ایک قطرہ رس نکلتا ہے اور اگر شیشی فوراً بند نہ کرو تو فوراً اڑ بھی جاتا ہے اور یہ پودا جنگل میں کہیں کہیں ملتا ہے۔ اس کے بعد مرشد نے ایک درمیانے سائز کی شیشی اپنے مرید کو پکڑائی اور اسے ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیا! مرید بہت پرجوش تھا، آبِ حیات کا معمہ بس حل ہونے کو تھا اور اسے آبِ حیات کو دیکھنے اور چھونے کا موقع ملے گا۔

مگر ایک تو اس پودے کو ڈھونڈنا ایک جوکھم تھا، ایک پودے کے ساتھ ایک پھول اور ایک پھول میں ایک قطرہ، الغرض اسے بارہ سال لگ گئے بوتل بھرنے میں، جس دن اس کی بوتل بھری وہ دن اس کیلئے ایک نئی زندگی کی نوید تھا، ایک طرف وہ پھولے نہیں سما رہا تھا تو دوسری طرف اسے بار بار یہ خیال ستا رہا تھا کہ اگر اس دوران مرشد اللہ کو پیارے ہو گئے تو اس کی محنت ضائع چلی جائے گی کیونکہ آبِ حیات کا چشمہ تو صرف مرشد کو ہی پتہ تھا! وہ خیالات میں غلطاں و پیچاں کبھی چلتا تو کبھی دوڑتا اپنے مرشد کے ٹھکانے کی طرف رواں دواں تھا۔ مرشد کے ڈیرے پہ نظر پڑتے ہی بیتابی میں دور سے چلایا: مرشد، میرے مرشد، دیکھیں! میں اپنی تپسیا میں کامیاب رہا، میں بوتل بھر لایا ہوں۔ اس کی آواز پر مرشد اپنے کٹیا سے باہر نکلا، 12 سالوں نے اس کی کمر دھری کر دی تھی مگر وہ بھی مرید کی کامیابی پر خوش نظر آ رہا تھا۔

اپنے مرشد پر نظر پڑنا تھی کہ مرید بے اختیار دوڑ پڑا اور یہی بے احتیاطی اسے مہنگی پڑی، ٹیڑھے میڑھے رستے پر قدم کا سٹکنا تھا کہ مرید لڑکھڑایا اور عرق سے بھری شیشی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹھاہ سے پتھر پر لگی اور چورا چورا ہو گئی، عرق کے کچھ چھینٹے مرشد کے پاؤں پر پڑے باقی کو جھٹ زمین نگل گئی۔ بے اختیار مرید کی چیخ نکل گئی "میرے مرشد میں لٹ گیا، میں برباد ہو گیا، میری محنت ضائع ہو گئی، میرے بارہ سال کی مشقت مٹی بن گئی، میرے مرشد میں تباہ ہو گیا"۔ مرشد اپنے مرید کو چھوڑ کر اندر گیا، ایک اور چھوٹی سی شیشی لایا جس میں اس نے روتے سسکتے مرید کے آنسو بھرنا شروع کر دیئے اور وہ شیشی بھر لی!! اب مرید رو رہا تھا تو مرشد ہنس رہا تھا "میرے مرشد میری زندگی برباد ہو گئی اور آپ مسکرا رہے ہیں؟ مرید نے تعجب سے

پوچھا!! مرشد اسے اندر لے گیا اور بکری کے دودھ کا پیالہ پینے کو دیا۔ پھر اس نے اس چھوٹی شیشی کو کھولا جس میں مرید کے آنسو بھرے ہوئے تھے اور اپنی انگلی کو ان سے گیلا کر کے کہا کہ "یہ ہے عرقِ حیات یا آبِ حیات، یا مقصدِ حیات" اور پھر آنسوؤں میں ڈبڈباتی اس کی آنکھوں کو چھو کر کہا: یہ ہیں آبِ حیات کے چشمے!! یاد رکھو! اللہ نے انسان کو ان آنسوؤں کیلئے پیدا کیا ہے، ان میں ہی زندگی چھپی ہوئی ہے، کچھ اس کی محبت میں زار و قطار روتے ہیں جیسے انبیاء، اور کچھ اپنے عملوں کے بھرے مٹکے جب اپنی ذرا سی غلطی سے گرتے اور ٹوٹتے اور اپنی محنتیں ضائع ہوتے دیکھتے ہیں تو تیری طرح بلبلاتے ہیں، جس طرح پانی نکلنے اور نکالنے کے مختلف طریقے ہیں اسی طرح انسانوں میں بھی ان کی طبائع کے تحت ان آنسوؤں کا سامان کیا گیا ہے یاد رکھو آسمان پر بھرنے والے بہت سارے ہیں مگر شیشی کسی کی نہیں ٹوٹتی، آسمان والوں کے مٹکے ہر دم بھرے رہتے ہیں، وہاں مٹکے ٹوٹنے کے اسباب نہیں رکھے گئے، ان کے رونے میں تسبیح ہے، پچھتاوہ نہیں ہے۔

ہمیں اسی مقصد سے بنایا گیا ہے، پھر اس دنیا کے ٹیڑھے میڑھے رستوں پر ہاتھ میں تقوے کی بوتل دے کر دوڑایا جاتا ہے، اور جب ذرا سی بے احتیاطی سے تقوے کی وہ سالوں کی محنت کسی گناہ میں ڈوب جاتی ہے اور ہم پچھتاتے ہیں اور زار و قطار روتے ہیں تو اللہ فرشتوں کو اسی طرح ہمارے آنسو سمیٹنے پر لگا دیتا ہے جس طرح آج میں نے تیرے آنسو شیشی میں جمع کئے ہیں!! یہ وہ پانی ہے جس سے جہنم کی آگ بھی ڈرتی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے حشر کا نقشہ کھینچا ہے کہ جہنم کی آگ فرشتوں کے قابو میں نہیں آ رہی ہو گی اور میدانِ حشر میں باغیوں کی طرف پھنکاریں مارتی ہوئی لپکے گی، فرشتے اپنی بے بسی کا اظہار کریں گے تو اللہ جبرئیل سے فرمائیں گے کہ وہ پانی لاؤ، اور پھر جبرئیل اس پانی کے چھنٹے مارتے جائیں گے اور آگ پیچھے سمٹتی جائے گی یہاں تک کہ اپنی حد میں چلی جائے گی، صحابہ نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ وہ کونسا پانی ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے شوق میں اللہ کے خوف سے رونے والوں کے آنسو ہوں گے جو اللہ نے آگ پر حرام کر رکھے ہیں!! یہی وہ رونا ہے جو امیر خسرو روتے ہیں کہ:

بہت ہی کٹھن ڈگر پنگھٹ کی
کیسے بھر لاؤں میں جھٹ پٹ مٹکی؟

یہی وہ آبِ حیات ہے جس کی بشارت انسان کو دی گئی ہے کہ اس کے چشمے اس کی اپنی ذات کے اندر ہیں۔

اے تن تیرا رب سچے دا حجرہ، پا اندر ول جھاتی ہو
نہ کر منت خواج خضر دی، تیرے اندر آب حیاتی ہو

اسی کی طرف میاں محمد بخش صاحب رحمتہ اللہ علیہ اشارہ کرتے ہیں:

سب سیاں رل پانی چلیاں تے کوئی کوئی مڑسی بھر کے
جنہاں بھریا، بھر سر تے دھریا، قدم رکھن جر جر کے

یعنی تمام روحیں اصل میں ان سہیلیوں کی طرح ہیں جو کنوئیں سے آبِ حیات بھرنے جاتی ہیں مگر ان میں سے کوئی کوئی بھر کر واپس آئے گی بہت

ساریوں کے گھڑے رستے میں ٹوٹ جاتے ہیں لیکن جو بھر کر سر پر رکھ لیتی ہیں ان کے قدم رکھنے کا انداز بتاتا ہے کہ ان کا گھڑا بھرا ہوا ہے! وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر قدم رکھتی ہیں۔ اللہ نے اپنے بندوں کی تعریف میں فرمایا ہے

"وَعِبَادُالرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَاخَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا(فرقان:63):رحمان کے بعض بندے زمین پر بہت تھم تھم کر قدم رکھتے ہیں(یعنی پر وقار چال چلتے ہیں ان کی چال بتاتی ہے کہ گھڑا بھرا ہوا ہے) جاہل ان کے مُنہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام! میاں صاحب دوسری جگہ فرماتے ہیں!

لوئے لوئے بھر لے کُڑیئے جے تدھ بھانڈا بھرنا!

شام پئی بن شام محمد گھر جاندی نے ڈرنا

یہ بھرے گھڑے تڑوانے والوں کا ذکر اللہ نے قرآن حکیم سورہ التغابن میں بھی بار بار کہا ہے: يٰٓاَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ-وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں، ان سے ہوشیار رہو۔ اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کر دو تو اللہ غفور و رحیم ہے۔

میاں صاحب فرماتے ہیں:

اکھیوں انّاتے تِلکَن رستہ کیوں کر رہے سنبھالا؟

دھکے دیون والے بہتے تو ہتھ پکڑن والا

اے اللہ آنکھوں سے بھی میں اندھا ہوں، ان مادی آنکھوں سے تو نظر نہیں آتا، اور رستہ بھی پھسلن والا ہے، دوسری جانب ہر بندہ اس پھسلن رستے پر سہارا دینے کی بجائے دھکے دینے والا ہے، جبکہ صرف تیری ذات ہاتھ پکڑنے والی ہے۔

کچھ لوگ ان بہتی آنکھوں کو ولیوں کا ٹھکانہ کہتے ہیں۔۔۔۔ اگر کبھی موقع ملے یا پھر ایسے موقع کی تلاش میں رہیں، جہاں ان کی زیارت ہو جائے تو فوری اس آب حیات سے وضو کر لیں۔ قرآن کے تو ہر ورق سے آبِ حیات کے چشمے پھوٹتے ہیں اور ہماری یہ بدقسمتی ہے کہ ہم نے ان چشموں کو بھاری اور ریشمی غلافوں میں چھپا کر گھر کے ایسے اونچے کونوں میں سجا رکھا ہے جہاں آتے جاتے نظر تو پڑتی ہے لیکن اس قرآن کی فریاد ہمارے بہرے کانوں کو سنائی نہیں دیتی جس کی بناء پر ہم آج رسوا و ذلیل ہو رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو رمضان المبارک کا مہینہ عطا کیا جہاں ہمیں ہر نماز تراویح میں قرآن سننے کا موقع ملتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کی امامت میں ہمیں قرآن سننے کا موقع ملا۔ قرآن سننے کا بہترین حق یہ ہے کہ ہم امام کی تلاوت قرآن کو ترجمہ کے ساتھ جانتے ہوں اور کم از کم اس کا مفہوم ضرور سمجھیں، تب ہی ہم اللہ اور اپنے آقا نبی اکرم ﷺ کے اس معجزے سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ ماہِ رمضان میں جب بھی اللہ کے خوف سے آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوئیں تو یہی "آبِ حیات" ہے جو آپ کو جہنم کی آگ سے بچائے گا اور جنت میں ہمیشہ کی زندگی کی ضمانت دے گا۔ اللہ سے دعا ہے کہ یہ مبارک موقع آپ کی زندگی میں بار بار آئے، آمین۔ میں آپ سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ امت مسلمہ بالخصوص غزہ، فلسطین اور کشمیر کے مسلمانوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے کہ اگر یہ شہداء ہماری طرف اشارہ کر کے روزِ حشر رب سے شکایت کریں گے تو ہمارا نجات دہندہ کون ہو گا؟ اللھم اجرنی من النار۔آمین

بروز اتوار 5 شوال المکرم 1445ھ 14 / اپریل 2024ء

دعائے آخرِ شب

زندگی کی متاعِ عزیز کیا ہے؟ روپیہ پیسہ زر و جواہر، زمینیں اور جائداد، منصب جاہ و جلال، ناموری، واہ واہ، داد و تحسین، صلہ و ستائش، بیوی بچے عزیز و اقربا، یار دوست.....یہی ہے زندگی کی متاعِ عزیز! تو پھر نظریہ کیا ہے، اصول کیا ہے، حق و صداقت کیا ہے، دار و رسن کیا ہے، شہادت کیا ہے، عشق کیا ہے، محبت کیا ہے، بے غرضی کیا ہے، جاں نثاری کیا ہے، مر مٹنا کیا ہے؟؟؟ بتایئے پھر یہ سب کیا ہیں؟ کسے کہتے ہیں متاع عزیز؟ کیا انکار متاعِ عزیز نہیں ہے؟ جبر کے سامنے انکار، فرعونیت کا انکار، صلہ کا انکار، سودے بازی سے انکار، دولتِ بے بہا کا انکار، باطل کا انکار، سر جھکانے سے انکار، ظلم و جبر کا انکار، رب کی حاکمیت کے سوا سب کا انکار.....یہ انکار متاعِ عزیز نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ انکار؟ انکار اور یکسر انکار، پورے شعور کے ساتھ انکار۔ کوئی مصالحت نہیں بالکل بھی نہیں..... جسم انکار.....باطل کے سامنے، طاغوت کے سامنے، رب کے باغیوں کے سامنے، نفس پرستوں کے سامنے، دنیائے حرص و تحریص کے سامنے، دھوکے کے سامنے، بے وفائی کے سامنے، خدائی لہجے میں بات کرنے والوں کے سامنے.....انکار اور یکسر انکار.....پورے شعور اور پورے وجود کے ساتھ انکار۔ بس انکار۔

دلیل چاہے کتنی بھی مضبوط ہو، رب کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہے! بس انکار، لیکن انکار اپنے نفس کو خوش کرنے کیلئے نہیں، نفس کو خوش کرنے کیلئے انکار تو انکارِ ابلیس ہے۔ اپنے رب کیلئے انکار.....یہی ہے اصل اور کچھ نہیں۔ نہیں مانیں گے کسی کی بھی۔ کسی طاقت کی، کسی بھی نظام باطل کی..... ... نہیں مانیں گے چاہے لاکھ دلیلیں دو۔ بس مانیں گے تو صرف رب اعلیٰ کی، بس اسی کی اور کسی کی بھی نہیں۔ یہی توحید ہے اور ہے کیا توحید؟ میرا دین تو شروع ہی انکار سے ہوتا ہے یعنی "لا" سے۔ پہلے انکار کی منزل ہے پھر تسلیم کی۔ میں انکار کئے بغیر تسلیم کیسے کر سکتا ہوں! اگر میں انکار نہ کروں اور تسلیم بھی کروں تو یہ منافقت ہے جو قابلِ قبول نہیں ہے۔ ملاوٹ نہیں خالص درکار ہے، بالکل خالص.....چاہے ذرہ ہی ہو۔ ملاوٹ شدہ پہاڑ درکار نہیں ہے۔ یہی ہے اخلاص اور کیا ہے؟

انکار روحِ اسلام ہے۔ انکار روحِ حسینیت ہے۔ انکار.....جا، نہیں مانیں گے۔ تمہارے دھوکے تمہیں مبارک، ہمارا سچ ہمیں۔ انکار لکھنے میں بہت آسان ہے۔ پنج حرفی لفظ، بہت آسان ہے لکھنا، کرنا بہت مشکل ہے۔ جان لیوا ہے، بہت نقصان دہ، بہت قربانی چاہتا ہے۔ خود سے بھی لڑنا پڑتا ہے۔ اپنا انکار بھی، نہیں اپنی بھی نہیں مانوں گا۔ بہت مشکل ہے یہ بہت کٹھن منزل۔ معرکہ خیر و شر کیا ہے؟ معرکہ حق و باطل کیا ہے؟ یہی تو ہے حق کا ساتھ دینا خیر، باطل کا ساتھ دینا شر۔ رب کے سامنے تسلیم خیر اور ابلیس کا پیروکار بننا شر۔ معرکہ خیر و شر یہی ہے۔ بس یہی ہے۔ پورے عالم میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ ہوتا رہے گا۔ نہیں رکے گا یہ معرکہ۔ کربلا کا درس کیا ہے؟ جنگِ بدر کیا ہے؟ جہاد کیا ہے؟ یہی ہے بس۔ سب کا درس ایک ہے: بس انکار۔ انکار کرو تو جان سے گزرنا پڑتا ہے۔ خاندان نثار کرنا پڑتا ہے۔ سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ آگ و خون میں نہانا پڑتا ہے۔ خاک آلود ہونا پڑتا ہے۔ اپنی خواہشات کو ذبح کرنا پڑتا ہے۔ تیز دھار پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ لاشے اٹھانے پڑتے ہیں۔ جب شعور کے ساتھ انکار ہو تو ہر لاشہ اٹھاتے ہوئے یقین بڑھتا ہے۔ پختگی آتی ہے۔ رب اعلیٰ کیلئے سب کچھ قربان کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

سرشاری اسے ہی کہتے ہیں۔ ہنستے کھیلتے لاشے اٹھانا اور پھر آوازِ بلند سے رب کی کبریائی بیان کرنا۔ یہی ہے دین، اور ہے ہی کیا! اسے کہتے ہیں اپنی نذر پوری کرنا۔ اپنے دعوے کی صداقت کو مجسم کر دینا۔ لیکن یہ ہے بہت مشکل، توفیق پر ہے یہ۔ جانوں کا نذرانہ پیش کرنا اور رب سے التجا کرنا کہ قبول کر

لیجیے ہماری قربانی.....اور پھر یقین کی منزل پر پہنچ کر پکارنا:" کہہ دو بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کیلئے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے"۔ رب کیلئے خالص۔ باطل ہمیشہ سے گھمنڈی ہوتا ہے، دھوکے کا شکار۔

آنکھیں کھول کر دیکھو کہ آج بھی یقین کی منزل پانے والے ہی دراصل کامیاب ہیں۔ غزہ میں کیا ہو رہا ہے؟ ڈاکٹر خالد جو پچھلے 40 برسوں سے میرا غم خوار، ہمدرد اور سب سے بڑی بات کہ انکار کی دولت سے مالا مال تھا، اس کی غزہ میں شہادت کی اطلاع ملی کہ وہ اپنے خاندان کے 45 / فراد کو ظلم کے خلاف انکار پر خود بھی ان کے ساتھ جا ملا تھا اور آج اس کے غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھانے کیلئے دوست احباب مجھے مجبور کر رہے تھے۔ میں ایمانداری سے سمجھتا ہوں کہ میرے رب کے حکم کے مطابق تو شہید تو زندہ ہوتے ہیں اور انہیں مردہ کہنے سے بھی منع کیا گیا ہے تو پھر ہم اپنی بے حسی کے ہاتھوں مردہ افراد کیسے زندہ افراد کا جنازہ پڑھ سکتے ہیں؟

نصف صدی قبل ملنے والا میرا یہ غم خوار اور مونس مجھے بہت یاد آرہا ہے۔ اس سے پہلی ملاقات امریکا میں زمانہ طالب علمی میں ہوئی جہاں محمد مرسی شہید بھی ہمارے اس انکار کے قافلے میں شریک ہو گئے۔ برسوں مل کر منزل کی اس تلاش میں رہے کہ آخر رب کی دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے اور اس کے حصول کا راستہ کیا ہے؟ رب کے بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر دوبارہ رب کی بندگی میں لانے کا طریقہ کیا ہے؟ بالآخر یہی پنج حرفی انکار سامنے آن کھڑا ہو جاتا تھا کہ دنیا کے اس باطل نظام کا انکار ہی تو اس انکار کی منزل ہے۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ گھنٹوں اس بحث و مباحثہ میں گزارتے تھے کہ دیکھتے ہیں کہ "انکار" کی منزل پر پہلے کون پہنچتا ہے۔

چشمِ فلک نے دیکھا کہ میرے رب نے انہیں قاہرہ کے "تحریر اسکوائر" میں توحید کا یہ نعرہ بلند کرنے کی نہ صرف توفیق عطا فرمائی بلکہ مصر کی حکمرانی عطا فرمادی اور میرا وہی رب جو ہزاروں سال قبل ایک اندھے کنوئیں میں سے ایک بچے کو نکال کر نہ صرف مصر کی حکمرانی عطا کر دیتا ہے بلکہ پیغمبر کے بڑے منصب پر بھی فائز کر دیتا ہے اور پھر "قصص قرآن" کی زینت بنا کر قیامت تک کیلئے ایک خصوصی باب "سورہ یوسف" کے نام سے انہی انکار کرنے والوں کے حوصلے کو بڑھانے کیلئے گواہی کے طور پر رقم کر دیتا ہے۔

کسے معلوم تھا کہ یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں بیٹھے ہم چند دوست جو اس انکار کی منزل پر پہنچنے کے راستے ڈھونڈا کرتے تھے، برسوں بعد میرے سامنے پڑے حلفِ وفاداری میں شرکت کے دعوت نامے کی شکل میں ایک حقیقت بن کر میرے سامنے آجائیں گے۔ ہمارا یہ دوست مصر کے پہلے آزادانہ طور پر منتخب صدر کی تقریبِ حلف وفاداری اٹھانے کیلئے اس محبت سے بلا رہا ہے کہ برسوں انکار کی منزل کے خواب کی تعبیر کا سفر شروع ہونے جا رہا ہے اور مجھے اس کٹھن سفر کی کامیابی کیلئے آپ سب کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ حلفِ وفاداری کا وہ ایمان افروز خطاب ہم سب دوست کیسے بھول سکتے ہیں کہ برسوں پہلے دیکھے گئے خواب کو دریائے نیل کے قریب ایک قدیم عمارت میں اپنے پہلے خطاب میں ہی اس "انکار" کو انہی الفاظ میں دہراتے ہوئے ہم سب کو بھی وہ بھولا ہوا سبق یاد دلا رہا تھا۔

ہزاروں سال کی تاریخ آج خود کو دہرا رہی تھی کہ اسی نیل کے کنارے جہاں حضرت موسیٰ کا تعاقب کرتے ہوئے فرعون غرق ہو گیا تھا، اسی انکار کا ایک مرتبہ پھر اعادہ کیا جارہا ہے اور محمد مرسی اپنے اسی ایمانی جذبے کے ساتھ ان تمام استعماری قوتوں کو اپنے آئندہ کے عزائم سے آگاہ کر رہے تھے جو صدیوں سے حق و باطل کے خلاف روزِ اول سے برسرِ پیکار ہے۔ کبھی حضرت ابراہیم کو حق کے پیغام اور نمرودی حکومت کو تسلیم کرنے کے انکار پر دہکتی آگ کے الاؤ میں جھونک دیا گیا تو کبھی حضرت موسیٰ کو فرعونی خدائیت کے انکار پر ستایا گیا۔ کبھی نبی مہربان ﷺ کو دینِ حق کی خاطر شعب ابی طالب میں قید کیا گیا اور کبھی طائف کی وادیوں میں پتھروں کی بارش سے لہولہان کر دیا گیا، کبھی بدر کے جاں گسل مرحلہ سے گزارا گیا اور کبھی میدانِ احد میں دندانِ مبارک شہید کر دیئے گئے۔ ان تمام ستم سامانیوں اور مشرکوں کے نظام کے برملا انکار پر محسنِ انسانیت کو مکہ سے مدینے ہجرت پر مجبور کر دیا گیا لیکن راہِ حق کے راستے سے ان تمام مصائب کو "انکار" جیسی عزیمت کے ساتھ برداشت کرنے کی ایک ایسی عظیم مثال قائم کر گئے کہ محبت کرنے والوں کیلئے کامیابی کیلئے باطل کے "انکار" کا راستہ متعین فرما گئے جس پر عملدرآمد کیلئے ساری دنیا کے سامنے محمد مرسی اپنے حلف کے فوری بعد وعدہ کر رہے تھے۔

چونکہ میرے رب نے تمام ادیان و مذاہب پر اسلام کو غالب کرنا ہے، اس لئے وہ ہر دور میں اپنے منتخب پاک نفوس کا انتخاب عمل میں لاتا ہے جن کا مقصدِ حیات "اللہ کی دھرتی پر بندوں کو بندوں کی غلامی سے نجات دلا کر اللہ کی غلامی میں لانا مقصود ہوتا ہے"۔ محمد مرسی شہید نے انکار کا علم بلند کرتے ہوئے امریکا، اس کے اتحادی مغرب اور ان طاقتوں کے پالتو حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ اعلان کر دیا کہ "جو کوئی بھی محمد رسول اللہ ﷺ سے محبت کرے گا، میں اس سے محبت کروں گا اور جو کوئی نبی محترم ﷺ سے نفرت کرے گا، میں بھی اس سے نفرت کروں گا"۔

انہیں معلوم تھا کہ "انکار" کا پہلا مطالبہ یہی ہے کہ ظلم کو رحم نہ سمجھا جائے، جھوٹ کو سچ کے لباس میں نہ چھپایا جائے، مظلوم کی دادرسی کیلئے ہر وقت خود کو تیار رکھا جائے چاہے اس حق و باطل کی انتھک لڑائی میں امام حسین کی طرح شہادت کی خونی قبا ہی کیوں نہ پہننا پڑے جس کیلئے ان کے سالارِ کارواں حسن البنا شہید، سید قطب شہید ایک مثال چھوڑ گئے۔ امریکا، مغرب اور ان کے اتحادی اخوان کے ناقابلِ معافی جرم سے واقف تھے کہ انہوں نے ہی 1948 میں سب سے پہلے فلسطین کی آزادی کی جنگ لڑی تھی اور اب محمد مرسی نے اقتدار کی امانت سنبھالتے ہی فلسطینیوں کے ساتھ پکا سچا وعدہ دہرایا کہ ہم تمہاری مکمل سیاسی معاونت کریں گے جس کو اسرائیل نے اپنی موت قرار دیتے ہوئے اپنے تمام مربیوں کو اپنے وجود کو بچانے کیلئے دہائی دینا شروع کر دی جس کے جواب میں تمام استعماری قوتوں نے فوری طور پر اپنے پالتو "السیسی" کے ذریعے محمد مرسی کا تختہ الٹ کر اس مردِ مجاہد کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا جہاں 6 برس تک قید تنہائی میں انتہائی اذیت ناک ماحول سے گزارا گیا اور انہیں بنیادی ادویات سے بھی محروم رکھا گیا۔ اس تمام عرصے میں ان کے اہل خانہ کو چار مرتبہ انتہائی مختصر ملاقات کی اجازت ملی اور آخری ملاقات ان کی شہادت کے آٹھ ماہ قبل کروائی گئی۔

یقیناً جو انکار کی عظمت سے واقف ہیں، رب ذوالجلال انہی کو فرعونی طاقتوں کے سامنے سر اٹھا کر حق بات کہنے کی توفیق اور فرعونی تکبر کو نیست و نابود اور نمرودی طاقتوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کا حوصلہ عنائت کرتا ہے۔ یاد رکھیں! انکار جتنی شدت اختیار کرتا چلا جائے، انقلاب اسی شدت سے نمودار ہوتا ہے، ایسا انقلاب توحید اور حب رسول کی محبت اور خودداری کے نشے میں مبتلا کرتا ہے، اور پھر ہمارا مسئلہ نتائج نہیں کارزارِ خیر و شر میں اپنا کام سرانجام دینا ہے۔ ایسے ویسے چونکہ چنانچہ لیکن ویکن نہیں..... یکسر انکار۔ رب پر کامل یقین کے ساتھ باطل کا انکار..... طاغوت کا انکار، خون

رنگ لاتا ہے، انقلاب آتا ہے۔ کب رکا تھا معرکہ حق و باطل؟ نہیں رکے گا یہ معرکہ خیر و شر۔ بس غالب وہی رہیں گے جو اپنے رب کے ساتھ جڑے رہیں گے۔ پورے یقین کے ساتھ پوری سرشاری کے ساتھ، انکار روحِ دین ہے، انکار روحِ حسینیت ہے، عاشور کا درس یہی ہے اور کچھ نہیں۔ باطل کا انکار۔ طاغوت کی ہر شکل کا انکار..... یکسر انکار کوئی مصالحت نہیں، بالکل بھی نہیں۔ قربانی ہی قربانی، سرشاری ہی سرشاری۔ کوئی بھی تو نہیں رہے گا۔ رب کی قسم کوئی بھی نہیں۔ بس نام رہے گا اللہ کا۔

کدھر چلی ہے نگارِ فلک کسے معلوم
یہ طشتِ ماہ و ستارہ اٹھائے آخرِ شب
نصیب ہو صفِ آئندگاں کو تازہ سحر
مرے لبوں پہ یہی ہے دعائے آخرِ شب

بروز سوموار 6 شوال المکرم 1445ھ 15 / اپریل 2024ء

مسلمان کب بیدار ہوں گے ؟

امریکا میں چند دہائیاں پیشتر، گوروں کے ہوٹلز اور کلبز کے باہر بورڈ آویزاں ہوتا تھا جس پر لکھا ہوتا تھا "کتوں اور کالے لوگوں کا داخلہ ممنوع ہے" لیکن مکافاتِ عمل نے وہ دن بھی دکھایا جب ایک سیاہ فام وائٹ ہاؤس میں داخل ہوا، اور آٹھ سال تک قصر سفید میں ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ امریکا میں کالوں اور گوروں کا تعصب اتنا وسیع رہا ہے کہ سیاہ فام کولن پاؤل سابق وزیر خارجہ امریکا اور سیاہ فام وزیر خارجہ کنڈولیز ارائس گوروں کیلئے مخصوص گرجاؤں میں عبادت کیلئے داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

2008ء کے کالے اور گورے امریکی عوام نے اس الیکشن میں ثابت کیا کہ انہوں نے رنگ و نسل کے تعصب کو مٹا ڈالا، قصر سفید کے فرعون بش کی ظالمانہ و حشیانہ قتل و غارت گری سے بھرپور تعصب اور بڑے سرمایہ داروں کو تحفظ فراہم کرنے والی، عوام کو کچل دینے والی پالیسیوں کو امریکی عوام کی اکثریت نے مسترد کرتے ہوئے بش کے خاص ساتھی جان میک لین کے مقابلے میں بارک اوباما کے حق میں ووٹ دیئے۔ امریکا کے 89 فیصد مسلمانوں نے اوباما کو اور 2 فیصد نے جان میک لین کو ووٹ دیئے۔ اوباما کو ووٹ دینے والوں میں اکثریت ان عیسائی ووٹرز کی تھی جو انسان ہیں، انسانی شکل میں وحشی درندے نہیں جو ظلم کے خلاف تھے، جو دین اسلام اور مسلمانوں کے خلاف امریکی جارحانہ جنگ کے خلاف تھے۔ آج بھی اوباما کے ووٹرز کے بارے میں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں کوئی متعصب عیسائی نہیں ہو گا۔

چودہ صدیاں قبل قرآن مجید کی آیات میں رنگ و نسل کے امتیاز کا خاتمہ کیا جا چکا ہے:
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿حجرات:13﴾ اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنائے تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا عزت والا وہی ہے جو سب سے متقی ہو۔ اللہ خوب جاننے والا پورا خبر دار ہے"۔
رسول اللہ ﷺ کے خطبہ حجۃ الوداع میں بھی یہ یاد دہانی موجود ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم سب اولادِ آدم ہو، اس لئے کسی گورے کو کالے پر اور عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت نہیں ہے کیونکہ اللہ کے نزدیک وہی باعزت ہے جو زیادہ متقی ہو"۔ متقین وہ لوگ ہیں جو اللہ کی ناراضگی اور اس کے دنیاوی اور آخرت کے عذابوں سے ڈرتے ہیں، ایمان او عمل میں پکے مسلمان ہیں۔ اسی خطبہ میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "میں تمہارے پاس دو مرکز ثقل چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تم انہیں مضبوطی کے ساتھ تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے، ایک کتاب اللہ اور دوسری میری سنت"۔

اوباما کیلئے صدارت پاکستان کے حکمرانوں کی طرح آسان، عیاشیوں، فضول خرچیوں، اور قوم سے غداریوں کی مانند نہیں تھی۔ امریکی صدارتی کرسی اوباما کیلئے ایک امتحان ثابت ہوئی کیونکہ اوباما کو اپنے ووٹرز کی توقعات پر پورا اترنا تھا جنہوں نے پہلی بار ایک کالے فرد کو بطور امریکی صدر کیلئے منتخب کیا۔ ایسا نہیں ہوا کہ بش کی طرح اوباما نے خود کو امریکا اور دنیا بھر کا شہنشاہ سمجھنا شروع کر دیا اور کانگرس اور امریکی عوام کو اپنی انگلیوں پر نچانے لگ گیا۔ اوباما نے اپنی عوام اور دنیا بھر کے پر امن لوگوں سے یہ وعدہ کیا کہ زمین پر جگہ جگہ انسانوں کا قتل عام بند کر کے، جھوٹ سے گریز کرتے ہوئے زمین پر امن قائم کرے گا لیکن صد افسوس کہ اوباما بھی اپنے ہاں کی نمک کی کان میں داخل ہوتے ہی نمک بن گئے اور انہیں قصر سفید میں پہلی روایتی بریفنگ میں اداروں نے اپنی ترجیحات سے مطلع کر دیا کہ اوباما کو بھی بش کی پالیسیوں کی پیروی کرنا ہو گی جبکہ امریکی عوام نے "تبدیلی کے بینر" ہاتھوں

میں لئے امریکی الیکشن میں بھرپور حصہ لیا تھا، معیشت کو تباہ کر دینے والی وحشیانہ خونی جنگی پالیسیوں میں تبدیلی کیلئے اوباما کو کرسی صدارت پر بٹھایا تھا۔ 2008ء کا امریکی الیکشن دراصل عوامی ریفرنڈم کی حیثیت رکھتا تھا جس میں امریکی عوام نے بش کی تمام پالیسیوں کو ٹھوکر مار دی تھی لیکن اس کے باوجود درپردہ قصر سفید کے سرکش گھوڑے کا چابک انہی اداروں کے پاس رہا جو پچھلی کئی دہائیوں سے اپنا کام کر رہے ہیں۔

یہ درست ہے کہ دنیا کے اکثر لوگ، درندہ صفت شیطان بش اور اس کے ساتھیوں کی شکست اور امریکی عوام کی فتح پر خوش تھے لیکن سوال ہے کیا اوباما امریکا میں پھیلائے گئے متعصب یہودیوں کے مضبوط جال سے باہر نکل کر امریکی عوام کی توقعات پر پورا اتر سکے؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ پینٹاگون اور وائٹ ہاؤس کے اندر یہودی ایک مضبوط سازشی زمین پر فتنہ وفساد پھیلانے والی ایسی قوت ہیں جن کی مرضی کے بغیر امریکی حکومت کوئی ایسی پالیسی بھی وضع نہیں کر سکتی۔ خود امریکا کے مشہور زمانہ سینیٹر "پال فنڈلے" جنہوں نے اپنی ساری عمر امریکی اقتدار کی غلام گردشوں میں گزاری، امریکی حساس اداروں کے اعلیٰ عہدوں پر براجمان رہے لیکن بالآخر 1985ء میں اپنی کتاب "دے ڈیئر ٹو اسپیک آؤٹ" میں اس یہودی لابی کے بارے میں ساری حقیقت تحریر کر دی کہ یہودی لابی امریکی پالیسیوں کو اپنے حق میں تیار کروانے میں کس قدر طاقتور اور مؤثر ہے۔

اپنی کتاب میں ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ وائٹ ہاؤس میں امریکی صدر کے ساتھ انتہائی اہم میٹنگ میں انتہائی رازداری کے ساتھ کچھ فیصلے کئے گئے جس کے بعد صدر نے آدھ گھنٹے کے بعد دوبارہ اسی کمرے میں جمع ہونے کا کہا تاکہ یہ اہم فیصلوں کو تحریر میں لا کر اس کی کاپیاں میٹنگ میں شامل ممبران کے حوالے کی جائیں تاکہ وہ پڑھ کر اس پر اپنے دستخط کر کے اس کی منظوری دے دیں۔ سینیٹر پال فنڈلے کہتے ہیں کہ ہمیں ابھی کمرے سے باہر آئے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایمرجنسی بیل کے ذریعے ہمیں فوری واپس کمرے میں بلایا گیا جہاں صدر انتہائی غصے کی حالت میں چیخ رہے تھے کہ ہم میں سے کون اسرائیل کیلئے جاسوسی کر رہا ہے۔ میں ابھی مطلوبہ مسودہ ٹائپ کیلئے سٹاف کے حوالے کر رہا تھا کہ مجھے اسرائیلی سفیر برائے امریکا کا فون آیا جس میں اس نے کچھ طے شدہ فیصلوں پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا ہے"۔ ایسے درجنوں واقعات پر مبنی ان کے مشاہدات پڑھنے والے کو اپنے حصار میں لے لیتے ہیں۔ کئی برس تک ان کی کتاب کو شائع نہیں ہونے دیا گیا اور اس کتاب کی اشاعت کیلئے جو انہیں دھمکیاں اور دیگر مشکلات پیش آئیں، اس ساری صورتحال کا بھی انہوں نے اپنی اسی کتاب کے آغاز میں تفصیلاً ذکر کر دیا ہے۔

صدارتی فتح حاصل کرنے کے بعد اوباما کی طرف سے پہلا اعلان وائٹ ہاؤس کے نئے چیف آف اسٹاف کی تقرری کا سامنے آیا اور انہوں نے "ریم ایما نوئیل" اسرائیلی نژاد یہودی کو وائٹ ہاؤس کا نیا چیف آف اسٹاف بنا کر طاقتور حلقوں کے ہاتھوں شکستِ فاش اور اپنی اطاعت کا اعلان کر دیا۔ الیکشن رزلٹ کے بعد 9 نومبر 2008ء کو یہ اعلان بھی سامنے آگیا کہ اوباما نے شر پسند، فتنہ انگیز ہندو تنظیموں کی پشت پناہی کرنے والے متعصب بھارتی ہندو "سونل شا" کو اپنا اقتصادی مشیر مقرر کر دیا ہے۔ دنیا کے لوگوں بالخصوص مسلمانوں کو اس صورتحال کو دیکھ کر یہ اندازہ تو ہو گیا کہ اوباما الیکشن رزلٹ کے فوراً بعد یہود و ہنود، اسرائیل و بھارت کے جادو کا شکار ہو چکا ہے اور اب اوباما انتخابات میں کئے گئے وعدوں کی پاسداری کرنے کی بجائے اس کرہ ارض پر امن کا راستہ اختیار کرنے سے قاصر ہے اور وہ بھی بش کی شروع کی گئی کروسیڈ (صلیبی جنگ) کو جاری رکھے گا بلکہ اوباما کے ہاتھوں اس جنگ میں مزید شدت پیدا کی جائے گی۔ وہ جنگ جو 2001ء سے جاری ہے، وہ اب اک نئے انداز سے جاری رہے گی جہاں مسلم حکمرانوں کے سامنے امریکی امن کی خواہش اور مسلمانوں سے مزید قربت کا اظہار اور درپردہ اس خطے میں اپنی جارحیت پر پردہ ڈال کر اپنی کامیابی کا حصول ہو گا۔ پھر وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ اوباما نے تمام مسلم دنیا کو خطاب کرنے کیلئے اپنے پٹھو مصری حکمران حسنی مبارک کی میزبانی میں قاہرہ مصر کا انتخاب کیا اور اپنی چکنی چپڑی باتوں

سے مسلم امہ کو یقین دہانی کروانے کی کوششیں کیں لیکن تاریخ نے یہ ثابت کر دیا کہ اوباما کا کردار کسی طور پر بھی بش سے کم خوفناک نہیں رہا اور اوباما کی تقریر پر میرا تجزیہ صد فی صد درست رہا۔

ہمارے ہاں بیشتر اس غلط فہمی میں رہے کہ امریکا میں جنگی جنون میں مبتلا حملہ آور کروسیڈیوں کے خلاف مزاحمتی جنگ اس وقت تک جاری رکھنی ہو گی جب تک صلیبی افواج افغانستان اور عراق سے اپنے ممالک میں واپس نہیں چلی جاتیں لیکن میرا اس وقت بھی یہ کہنا تھا کہ امریکا یہودی نژاد "ہنری کسینجر" کے مرتب کردہ خوفناک پلان "ون ورلڈ آرڈر" پر اس وقت تک پیچھے نہیں ہٹے گا جب تک خود امریکا اپنی غلط پالیسیوں کی بناء پر ٹوٹ نہیں جاتا جس طرح سوویت یونین بالآخر چھ ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر روس بن گیا ہے۔۔یہ بات سب لوگوں کے علم میں ہے کہ 2001ء میں امریکی صدر بش نے اعلان جنگ کرتے ہوئے اس جنگ کا نام کروسیڈ (صلیبی جنگ) پکارا تھا۔ ماضی میں تمام صلیبی جنگیں صرف دین اسلام کو ختم کرنے، مسلمانوں کو ہلاک کرنے اور ان کے ممالک پر قبضہ کرنے کیلئے لڑی جاتی رہی ہیں۔ امریکا نے زیادہ چالبازی سے کام لیتے ہوئے کروسیڈ کے کئی دیگر نام بھی رکھے ہیں مثلاً "وار آن ٹیررازم کے خلاف جنگ، دہشتگردی کے خلاف جنگ، انتہا پسندی کے خلاف جنگ، شدت پسندوں کے خلاف جنگ، عسکریت پسندوں کے خلاف جنگ" وغیرہ۔ 2001ء سے آج تک بنائے گئے اہداف میں کسی عیسائی، یہودی، ہندو سکھ کو نشانہ نہیں بنایا گیا، کسی مندر، گرجا گھر، آتشکدہ کو زمین دوز نہیں کیا گیا۔ کسی کرسچن ملک یا لادین (سیکولر) ملک پر حملہ نہیں کیا گیا۔

کئی ناموں سے لڑی جانے والی صلیبی جنگ میں حملہ آوروں کا ہدف صرف اور صرف مسلمان، ان کے ممالک واحد معبود اللہ تعالیٰ رسول ﷺ قرآن مجید، ،مساجد اور قرآن پڑھانے والے، نماز سکھانے والے دینی مدارس رہے۔

پاکستان کے کروڑوں مسلمانوں کی بدقسمتی یا کمزوری یہ تھی کہ اس زمانے میں ہمارے ہاں اقتدار کے سیاہ وسفید کے مالک ڈکٹیٹر پرویز مشرف اور اس کے تمام مشیر اس صلیبی جنگ میں حملہ آور کفار کے خاص اتحادی اور مددگار بن گئے اور شاہ سے زیادہ شاہ کی وفاداری کا ثبوت دینے لگ گئے۔ ان صلیبی افواج نے ہمارے قبائلی علاقوں اور سوات میں فضائی بمباری کے ذریعے اور افغانستان کی سمت سے امریکی و نیٹو افواج اور جاسوس طیاروں کو سرزمین پاکستان پر حملہ آور ہونے کے مواقع فراہم کر کے تقریباً ہر روز مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ ستم ظریفی کی بات تو یہ ہے کہ اس پرائی جنگ میں جان ومال کی قربانی دینے والے ملک پر 430 ڈرون حملوں میں 1750 / افراد کے پرخچے اڑا دیئے گئے بلکہ جونہی 18 جون 2004ء کو وانا وزیرستان میں نیک محمد سمیت 5 افراد کو اپنا ہدف بناتے ہوئے پہلے "ایم کیو نائن ڈرون" حملہ میں شہید کر دیا تو مشرف نے اس کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے قوم کے سامنے جھوٹ بولا لیکن فوری طور پر پینٹاگون نے اپنے غلام کے جھوٹ کا پردہ چاک کرتے ہوئے اسے اپنا کارنامہ قرار دے دیا۔

اپریل 2011ء میں پاکستانی فوجی اور سیاسی حکام نے امریکا سے ڈرون حملے بند کرنے کے لیے کہا، زخمیوں کا علاج کرنے والے طبیبوں نے بتایا ہے کہ امریکی ڈروں کے ذریعہ کیمیائی ہتھیار استعمال کر رہے ہیں۔ حملہ کے بعد امدادی کارروائی کرنے والوں پر امریکی ڈرون دوبارہ حملہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مرنے والوں کے جنازہ پر بھی ڈرون پھر حملہ کرتے ہیں۔ ان ڈرون کو امریکی فوجی اور کارندے چلاتے ہیں۔ نیویارک ٹائمز کے مطابق ہر ہفتے قتل کیلئے افراد کا انتخاب خود امریکی صدر بارک اوباما کرتا تھا۔ اوباما نے 2012ء میں دوبارہ صدارت جیتنے کے بعد بھی پاکستان پر ڈرون حملے جاری رکھے اور

امریکی تاریخ میں سب سے زیادہ ڈرون حملے بارا اوباما کے حکم پر کئے گئے۔ پاکستان کے علاوہ دیگر مسلمان ممالک، یمن اور صومالیہ پر بھی ڈرون حملوں کے ذریعے مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا گیا۔

ٹاپ سیکرٹ دستاویزات اور سفارتی مراسلوں کے حوالے سے انکشاف کیا گیا ہے کہ سی آئی اے نے پاکستانی حکام سے ڈرون حملوں پر معلومات کا تبادلہ کرنے کیلیے خصوصی دستاویزات تیار کیں۔ پاکستانی حکام نے نہ صرف کئی برسوں سے امریکی ڈرون حملوں کی توثیق کی ہے بلکہ انھیں ان حملوں اور ہلاکتوں کے بارے میں بریفنگ بھی دی جاتی رہی ہے۔ امریکی اخبار نے سی آئی اے کی خفیہ دستاویزات جن میں پاکستان کے قبائلی علاقوں میں درجنوں ڈرون حملوں کا ذکر کیا گیا اور ان کے ساتھ نقشے اور حملے سے قبل اور بعد کی تصاویر بھی ہیں۔

امریکی اعداد و شمار کے مطابق 2006ء سے لیکر آخری ڈرون حملہ تک پاکستان میں 389 ڈرون حملے کئے گئے جن میں 2 ہزار 797 افراد کو ٹارگٹ کر کے قتل کیا گیا جبکہ اس کے علاوہ 200 کے لگ بھگ عام شہریوں کو بھی شہید کر دیا گیا جبکہ مقامی افراد کے مطابق حقیقت میں صحیح اعداد و شمار اس سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ قصر سفید کے فراعین نے صرف مسلم ممالک پاکستان کے علاوہ افغانستان، صومالیہ، یمن اور لیبیا میں بھی ڈرون حملوں کے ذریعے ہزاروں مسلمانوں کو شہید کیا۔ سب سے زیادہ ڈرون حملوں کا حکم اوباما نے دیا۔

اس پر ائی جنگ میں 73 ہزار افراد کی قربانی اور 100 بلین ڈالر کے نقصان کے باوجود ہمارے سیاسی جمہوری حکمرانوں کی تائید اور سپہ سالار کی کمان میں پاکستانی قوم کی تنخواہ دار افواج نے نمک حلالی اور جوانمردی کی بے شمار مثالیں قائم کیں۔ امریکا نے ہزاروں بستیوں کو رہائشیوں سمیت جلا ڈالا گیا، ہزاروں مساجد اور لاکھوں قرآن مجید کے نسخے شہید ہوئے۔ کئی لاکھ مسلمان ہلاک کر دیئے گئے، کئی لاکھ مفلوج اور کئی لاکھ بے گھر کر دیئے گئے اور آج بھی پاکستان میں مختلف افغان مہاجرین کے کیمپ اس ظلم و ستم کی گواہی کیلئے موجود ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک عالمی میڈیا کے ٹی وی پروگرام میں جہاں مجھے اور امریکی سینیٹر کو عراق اور افغانستان جنگ کے بارے میں دعوت دی گئی تھی۔ میں نے امریکی سینیٹر کو ان دونوں ملکوں میں جنگ پر خرچ ہونے والے ٹریلین ڈالرز اخراجات کے بارے میں یہ مشورہ دیا کہ اگر امریکا اس رقم کا چوتھائی حصہ بھی ان ملکوں میں تعلیم، صحت اور انفراسٹرکچر پر خرچ کرتا تو آج یہ سارے ممالک نہ صرف امریکا کے بہترین دوست ہوتے بلکہ امریکی مفاد کے نگران بھی ہوتے، جس پر امریکی سینیٹر نے لاجواب ہو کر کہا کہ امریکا کے اسلحہ سازی اور فارماسیٹیکل (ادویات بنانے والے) ایسی کسی پالیسی کو کیسے منظور ہونے دیں گے جن سے ان کے کاروبار کا دیوالیہ ہو جائے جہاں اس وقت ہزاروں افراد کام کر رہے ہیں۔ گویا ان دو اداروں کو چلانے کیلئے تیسری دنیا کے لاکھوں افراد کا قتل عام انتہائی ضروری ہے۔ میرے ان خدشات کا سینیٹر کوئی جواب نہ دے سکا۔

ابھی یہ ستم ختم نہیں ہوا تھا کہ غزہ میں گ وخون کا ہولناک کھیل جاری ہو گیا۔ درجنوں پڑوسی مسلم ممالک صرف زبانی احتجاج سے آگے نہ بڑھ سکے۔ پچھلے چھ مہینوں سے غزہ کے مسلمان اس جوانمردی سے مقابلہ کر رہے ہیں کہ خود اسرائیل جو فرعونی طاقتوں کی زبان میں فلسطین کا نام و نشان مٹانے کا دعویٰ کر رہا تھا، اب تک اپنے مغویوں کو بازیاب نہ کرا سکا اور بالآخر اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے مذاکرات کی میز پر بیٹھا التجا کر رہا ہے۔ یاد رہے کہ نیتن یاہو اپنی سیاسی مکاریوں اور داؤ پیچ کی بنا پر اسرائیل کا طویل ترین وزیر اعظم کا ریکارڈ قائم کر چکا ہے۔ 2017 میں کرپشن کے سنگین الزامات کے بعد اس کے مخالفین اس کی دائمی سیاسی موت کیلئے بڑے پر یقین تھے کہ یہ 2022ء میں انتہائی دائیں بازو کی جماعتوں کی مدد سے چھٹی بار وزارتِ عظمیٰ

حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اقتدار میں آتے ہی اپنی کرسی کو مضبوط کرنے کیلئے کچھ اہم عدالتی اختیارات پارلیمنٹ کو منتقل کرنے کی کوشش کی جس پر حزبِ اختلاف اور سول سوسائٹی نے ایسی سخت مزاحمت کی کہ لگتا تھا کہ اب یقیناً نیتن یاہو کا بستر گول ہو جائے گا لیکن اچانک 7 / اکتوبر کو حماس کے ساتھ جنگ شروع ہونے پر سیاسی دلدل میں غرق ہونے سے صاف بچ گیا۔

یہی وجہ ہے کہ عالمی سیاسی تجزیہ نگار بھی غزہ میں طویل جنگ جاری رکھنے پر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ جنگ بندی کی صورت میں نیتن یاہو پر دوبارہ استعفٰی کیلئے دباؤ بڑھ جائے گا اور استعفٰی کی صورت میں پرانے الزامات اور مقدمات ان کی راہ بے چینی سے تک رہے ہیں جن کے نتیجے میں نیتن یاہو کی بقیہ زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرے گی۔ نیتن یاہو کیمپ کا نظریہ ہے کہ جب ملک حالتِ جنگ میں ہو تو انتخابات چہ معنی دارد۔ ویسے بھی رائے عامہ کے مختلف جائزوں کے مطابق اس وقت اوسطاً ستر فیصد سے زائد اسرائیلی باشندے یرغمالیوں کے بے یقین مستقبل کے باوجود غزہ کی مہم کو منطقی انجام تک پہنچانے کے حق میں ہیں۔ ادھر نیتن یاہو بھی یہ سمجھتا ہے کہ اس کی سیاسی بقاء بھی خطے میں ایسی جنگ میں مضمر ہے جہاں اسرائیلی باشندوں کو یہ یقین دلا دیا جائے کہ اسرائیل کی بقاء کیلئے نیتن یاہو کس قدر ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نیتن یاہو نے انتہائی مکاری سے عالمی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دمشق شام میں ایران کے سفارت خانے پر حملہ کر کے وہاں القدس فورس کے دو اعلی عہدیداروں سمیت آٹھ افراد کو ہلاک کر دیا جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ اس علاقے میں جنگ کے شعلوں کو ہوا دیکر ایک بڑی جنگ کا آغاز کرنا چاہتا ہے جہاں ایک مرتبہ پھر نئی صلیبی جنگ کا ماحول پیدا کیا جا سکے۔ ایران نے اپنے فوری اور شدید احتجاج میں یہ واضح کر دیا کہ وہ اس جارحیت کا جواب ضرور دے گا اور اس نے اسرائیل کے مربی امریکا کو بھی آگاہ کر دیا جس پر امریکی صدر جو بائیڈن نے چند دن قبل عالمی میڈیا پر ایرانی حملے کے خدشات کا اظہار بھی کر دیا تھا۔

بالآخر ایران نے اپنے سفارت خانے پر حملے کے جواب میں ہفتہ کی رات محدود جنگ کا نام دیتے ہوئے اسرائیل پر 170 دہماکہ خیز ڈرون، 360 مختلف خطرناک ہتھیاروں، کروز میزائل، 120 بیلیسٹک میزائل داغ دیئے اور اس کے ساتھ ہی ایران نے تمام پڑوسی ممالک کو بھی اسرائیل کو فضائی راستہ مہیا کرنے پر کھلی جنگ کی دھمکی بھی دی ہے جبکہ اسرائیلی فوج کا دعویٰ ہے کہ 99 فیصد میزائلوں اور ڈرونز کو ہدف تک پہنچنے سے پہلے ہی "ایرو" نامی فضائی دفاعی نظام اور خطے میں موجود اپنے دفاع میں مدد کرنے والے ممالک میں امریکا اور اردن سمیت اتحادیوں کی مدد سے ناکام اور ناکارہ بنا دیا ہے۔ امریکی وزیر دفاع لائیڈ آسٹن کے مطابق امریکی فوج نے درجنوں میزائلوں اور ڈرونز کو ناکام بنایا ہے۔ برطانوی لڑاکا طیارے بھی اس حملے میں شامل تھے اور اسرائیلی فوج کے ترجمان کا کہنا تھا کہ فرانس نے فضائی حدود میں گشت کر کے اپنا حصہ ڈالا ہے۔ ادھر جو بائیڈن نے اسرائیل پر ایرانی حملے کے بعد اسرائیلی وزیر اعظم نیتن یاہو کے ساتھ فون پر بات چیت میں کہا کہ امریکا ایران پر ممکنہ اسرائیلی جوابی حملے میں حصہ نہیں لے گا۔ اس وقت عالمی سیاسی منظر پر عجیب کھچڑی پک رہی ہے۔ اگر نیتن یاہو اپنے اقتدار کی جنگ جیتنے کیلئے یہ اقدام کر رہا ہے تو کیا ایران واقعی غزہ میں قتل وغارت کے چھ ماہ بعد ہوش میں آیا ہے کہ مٹھی بھر یہودیوں کو ڈیڑھ ارب مسلمانوں کو یرغمال بنانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

ایسی صورتحال میں قرآن مجید مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے:

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۚ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ الطَّاغُوۡتِ فَقَاتِلُوۡۤا اَوۡلِیَآءَ الشَّیۡطٰنِ ۚ اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ کَانَ ضَعِیۡفًا﴿النساء:76﴾جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں، پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں۔
اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا سَوۡفَ نُصۡلِیۡہِمۡ نَارًا ؕ کُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُہُمۡ بَدَّلۡنٰہُمۡ جُلُوۡدًا غَیۡرَہَا لِیَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَزِیۡزًا حَکِیۡمًا(نساء:56) جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا اُنہیں یقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دُوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ خوب عذاب کا مزا چکھیں، اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے۔

سرے محل اور سوئس اکاؤنٹ والے زرداری اور شریف خاندان، وزراء اور مشیران وغیرہ اور دیگر تمام مقتدر حلقے جو 2001ء سے لیکر امریکی اور اتحادی افواج کے انخلاء تک امریکی پرچم کے زیر سایہ لڑی جانے والی صلیبی جنگ میں کروسیڈ کے اتحادی یا مددگار رہے، آیات مبارکہ سے ہر چیز واضح ہو جاتی ہے کہ وہ شیطان کے ساتھی رہے۔ یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کا ہے جس کی سلطنت آسمانوں اور زمین میں ہے۔ وقت کی یہ پکار ہے کہ دنیا کے مسلمان سورہ توبہ کو بغور پڑھیں۔

کچھ بھی نہیں، پہلے کون رہا ہے یہاں، جواب رہے گا۔ کچھ بھی تو نہیں رہے گا، بس نام رہے گا میرے رب کا۔
میں شیشہ گر نہیں، آئینہ سازی تو نہیں آتی
جو دل ٹوٹے تو ہمدردی سے اس کو جوڑ دیتا ہوں

بروز بدھ 8 شوال المکرم 1445ھ 17 / اپریل 2024ء

آستینوں کے بت

میں پچھلے کئی برس سے یہ بری طرح محسوس کر رہا ہوں کہ واقعی کوئی زوردار بد دعا ہمارے تعاقب میں ہے کہ نہ پوری امتِ مسلمہ اور بالخصوص قوم کی دعائیں رنگ لا رہی ہیں اور نہ ہی تہجد گزاروں کا گریہ نیم شب کام آرہا ہے۔ مایوسی ساون کی ہریالی کی طرح وطن عزیز میں اپنا زور بڑھاتی جا رہی ہے۔ بے دلی اور بیزاری جسم وخوں میں اس طرح گھل مل گئی ہے کہ زندہ رہنے کی امنگ اور آس ختم ہوتی جا رہی ہے۔ موجودہ سیاستدانوں اور مقتدر اشرافیہ کی پا ناامیدی کا زہریلا شیش ناگ دن میں کئی مرتبہ آپ کے لیسیوں کے ردِ عمل میں بے یقینی کی آکاش بیل ذہن وفکر کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے اور خوابوں کو ڈستا ہے۔ دن اور رات جیسے آگ کے الاؤ میں بھسم ہو کر رہ گئے ہیں لیکن اس کے باوجود کچھ دوست اب بھی امید کی قندیل جلائے کسی صلاح الدین ایوبی کا انتظار کر رہے ہیں۔

امید اندھی ہوتی ہے، یقین بھی دلیل نہیں مانگتا۔ ہم بھی کہہ دیتے ہیں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور انشااللہ حالات بھی ٹھیک ہو جائیں گے لیکن حالات کی حقیقت سے آنکھیں چرا کر ہم اپنے آپ کو دھوکا تو دے سکتے ہیں لیکن ان خطرات کو ٹال نہیں سکتے۔ صرف بارش کی امید سے دہکتی تمازت بھری دھوپ کی اذیت ناکی سے تو بچ نہیں سکتے۔ اس دور دیس میں بھی وطن کی مٹی نے اس قدر اپنے حصار میں جکڑ رکھا ہے کہ شب وروز اس کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں حالانکہ ہر روز خوابوں کی جواں مرگی کی اطلاع موصول ہوتی ہے۔ پاکستان جو وجود کا ایک قیمتی حصہ ہے، جہاں ہماری آبرو کو تحفظ اور سروں کی سلامتی کی ضمانت ملی تھی اب خاک میں ملانے کی تدبیریں ہو رہی ہیں (خاکم بدہن)۔

افغانستان کے معاملے میں پہلے فاسق کمانڈو نے کو جرم عظیم کا ارتکاب کیا، وہ بھی تاریخ کا ایک حصہ رہے گا لیکن بعد ازاں اس کا کفارہ بھی ہمیں ایسے ادا کرنا پڑا کہ اب تک اس کا خمیازہ بھی بھگت رہے ہیں جبکہ مصائب سے جان چھڑانے کیلئے خود قصرِ سفید طالبان کی شرائط کو مان کر گھٹنے بھی ٹیک چکا ہے لیکن ہمیں کسی طور بھی ان مصائب سے جان چھڑانے کیلئے مذاکرات کی اجازت نہیں اور قصر سفید کے فراعین افغانستان کی شکست کی رسوائی کا بدلہ لینے کیلئے درپردہ اب بھی سرگرم ہے۔۔ اس سے پہلے ہم نے جب بھی مزاحمت کاروں کو مذاکرات کی دعوت دیکر کسی امن معاہدے کی طرف قدم بڑھانے کی کوشش کی تو فوراً ایک ہرکارہ کان مروڑنے کیلئے بے دھڑک ہمارے سروں پر کھڑا ہو کر غرانا شروع کر دیتا ہے لیکن منافقت کا یہ عالم ہے کہ میڈیا میں بھرپور پاکستان کا ساتھ دینے کا برملا اعلان ہوتا ہے لیکن درپردہ ہم سب جانتے ہیں کہ مودی کی پشت پناہی پر کون کھڑا ہے۔

ادھر دوسری طرف ہمارا یہ عالم ہے کہ ان داتا کا حکم مانتے ہوئے ہم فوراً اس امن معاہدے سے منہ موڑ لیتے ہیں جس کے جواب میں ہندوؤں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بننے والوں نے اپنی توپوں کا رخ اپنی پوری طاقت کو مجتمع کر کے ہماری سیکورٹی فورسز کی طرف پھیر رکھا ہے اور گاہے بگاہے اپنا دائرہ کار خود کش حملہ آوروں کی شکل میں شہروں میں منتقل کرتے رہتے ہیں اور ان دنوں وہ پوری کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طور چین اور پاکستان میں استوار رشتے ختم کر دیئے جائیں جس کی حالیہ مثال چینی ماہرین کی ایک بس پر خود کش حملہ اس کی بدترین مثال ہمارے سامنے ہے۔

یہ صورت حال آخر کب تک چلے گی، یہ مزاحمت کار آپ سے سنبھالے جاتے ہیں نہ قصر سفید کا فرعون آپ کی بات سنتا ہے۔ امریکا اپنے اتحادیوں کے توسط سے اس جنگ کو ہماری سرحدوں سے ہمارے ملک کے اندر لانے کیلئے بے تاب بیٹھا ہے اور امریکا کے نمک خوار سرخ استقبالی قالین لئے بے چینی سے انتظار کی گھڑیاں گزار رہے ہیں۔ وہ اپنے ایجنٹوں کے ذریعے سلطنتِ نمرود کی گود میں بیٹھ کر آئے دن ان غداروں کے ذریعے ملک کو جلانے کا سامان

تیار کر کے جلتی پر تیل ڈال رہے ہیں۔ آپ کے پاس ان تمام خطرات سے بچانے کی عملی تدابیر نہیں، حکمت عملی یا سٹریٹجی موجود نہیں، صرف اپنی حاکمیت اعلیٰ کی دہائی دے رہے ہیں جو کب کی مضروب اور زخموں سے چور ہو کر قصر سفید کے فرعون اور نمرود کے قدموں میں دم توڑ چکی ہے۔

ان دنوں عوامی مینڈیٹ کے افق سے طلوع ہوتے سلطانی جمہور کے آفتاب و ماہتاب کی نمائندگی کرنے والی پاکستانی حکمرانوں کو وزارت داخلہ کا قلمدان بھی طشت میں رکھ کر ایسے فرد محسن نقوی کے حوالے کرنا پڑا جو اس انتخابی عمل سے کوسوں دور تھا لیکن بعد ازاں اپنے اس فیصلے کی توثیق کیلئے اسے سینیٹر بنوا دیا۔ اب ان کی گفتگو سنیں تو یہی پیغام ملتا ہے کہ اس بدنصیب پاکستانی قوم کی کم نصیبی کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ ابھی تو موسم گل کی آمد میں کافی دیر ہے۔

مجھے وہ دن بھی یاد ہے جس دن اس بدنصیب پاکستانی قوم کا وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی پہلی مرتبہ واشنگٹن میں شہزادی کونڈالیزا رائس کے دربار میں شرف باریابی حاصل کر کے باہر نکلا تھا تو پہلا خوشامدی بیان اپنی حاکمیت اعلیٰ کے دفاع کی بجائے مذاکرات کو بہت بے تکلفانہ، دیانتدارانہ اور حقیقت پسندانہ قرار دیکر اپنی غلامی کی سند حاصل کر رہا تھا حالانکہ وزیر خارجہ کو شہزادی کونڈالیزا رائس سے ملاقات سے قبل امریکی سرپرستی میں نیٹو افواج کے اس مکروہ حملے کی اطلاع دی جا چکی تھی جس کا اعلان پاکستانی سپاہ کے ترجمان میجر جنرل اطہر عباس دنیا کے ذرائع ابلاغ کے سامنے کر چکے تھے کہ امریکی حملہ میں پاکستانی علاقے انگوراڈہ کی فوجی چوکی پر پاکستانی سپاہ کے کم از کم چھ سیکورٹی اہلکار شدید زخمی کر دیئے ہیں جبکہ نیٹو کی افواج کے پاس غلطی اور لاعلمی کی گنجائش اس لئے نہیں تھی کہ نیٹو کی افواج کو اس علاقے میں قائم تمام پاکستانی چوکیوں کے قیام کی نقشوں کے ذریعے پیشگی اطلاع دی جا چکی تھی۔

اُس وقت بھی عام توقع تو یہ تھی کہ شاہ محمود قریشی عظیم الشان واضح عوامی مینڈیٹ کے افق سے طلوع ہونے والے نئے جمہوری پاکستان کی ترجمانی کرتے ہوئے اس توہین آمیز امریکی رویے پر بھرپور احتجاج کر کے مشترکہ اعلامیہ کے ذریعے اپنا بھرپور احتجاج سامنے لائیں گے اور پاکستانی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے نمائندے بڑی شدت سے منتظر تھے کہ وزیر خارجہ کا تعلق ایک عوامی جذبات اور احساسات کی علمبردار جماعت سے ہے، اس لئے وہ دبنگ لہجے میں صدائے احتجاج بلند کریں گے اور امریکی ایوانوں کو مطلع کریں گے کہ اب یہ مشرف کا نہیں بلکہ کروڑوں باغیرت پاکستانیوں کی سرزمین ہے جو اپنی خود مختاری کی حفاظت کا سلیقہ جانتی ہے۔ اگر ایسا حملہ ہوا تو وہ اس نام نہاد "وار آن ٹیرر" جو ہمارے 68 ہزار پاکستانیوں کی جانیں نگل چکی ہے اور 65 ارب ڈالر کا خطیر نقصان اپنے کندھوں پر برداشت کر چکی ہے، کو خیر باد کہتے ہوئے اس دھوکے سے نکل آئیں گے اور اپنا راستہ اپنی آزادانہ مرضی سے چنیں گے لیکن اس 55 منٹ کی ملاقات کے بعد پاکستانی وزیر خارجہ جب اس نمک کی کان سے باہر تشریف لائے تو نمک بن چکے تھے۔

شاہ محمود قریشی نے شہزادی کونڈالیزا رائس کے ساتھ اپنی ملاقات کو جب بہت بے تکلفانہ، دیانتدارانہ اور حقیقت پسندانہ قرار دیا تو پاکستانی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ کے نمائندوں نے پاکستانی علاقے انگوراڈہ کی فوجی چوکی پر 6 پاکستانی سیکورٹی اہلکاروں کے شدید زخمی ہونے کو "غیر دوستانہ" اقدام" سے تعبیر کیا تو قریشی نے فوری طور پر اپنے فدویانہ بیان میں شیرینی کی حلاوت گھولتے ہوئے اس کی تصحیح فرمائی کہ اس طرح کے (سخت) الفاظ استعمال نہ کریں۔ شا

ئدوہ پاکستانی سیکورٹی اہلکاروں کے شہدا اور شدید زخمی ہونے کے عمل کو دوستانہ چھیڑ چھاڑ، بے تکلفانہ ہنسی مذاق یا محبوبانہ نازوانداز سے تشبیہ دینا چاہتے تھے۔ پھر اس بزدلانہ رویے کی بناء پر یہ سلسلہ ایسا دراز ہوا کہ کہ سلالہ چوکی پر امریکی بے رحمانہ حملے نے ہمارے 24 سپوت کو ادھیڑ کر رکھ دیا اور ہمیں کچھ دیر کیلئے افغانستان کا امریکی روٹ بند کرنا پڑا لیکن نجانے درپردہ کیا معاملات طے ہوئے کہ اسی تنخواہ پر دوبارہ کام شروع کر دیا گیا۔

اس تاریخی ہزیمت کو دہرانے کا مقصد یہ ہے کہ کیا اب بھی ہم اسی تنخواہ پر کام کر رہے ہیں اور ملک میں ہونے والی دہشتگردی کے جواب میں سہمے ہوئے ہیں اور اب چین جیسے دوستکو ہم سے الگ کرنے کی جو سازش تیار ہو چکی ہے، اس کے جواب میں ایم آئی ایف کے نئے دباؤ اور مزید امریکی سرمایہ کاری کے لالچ کا طوق گلے میں ڈالنے کیلئے اپنی رضامندی کا اظہار کرنے جا رہے ہیں۔ اگر یاد ہو تو اس وقت بھی قصر سفید کے فرعون بش نے اپنی پالیسی ساز ادارے میں تقریر کرتے ہوئے صاف صاف کہا تھا "آئندہ اصل چیلنج عراق اور افغانستان کی بجائے پاکستان ہو گا" اور انہی دنوں مزید دباؤ بڑھانے کیلئے امریکی طیارہ بردار جہاز ابراہام لنکن" کو خلیج سے بحیرہ عرب کی طرف بڑھنے کا حکم بھی دے دیا گیا تھا۔

کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ قومی اسمبلی کا ہنگامی اجلاس بلا کر پاک چین دوستی کو سبوتاژ کرنے والوں کو واضح پیغام دیا جائے اور اگر ایسا کرنے کی ہمت نہیں تو پھر ہمارے تمام مقتدر حلقوں کو اس اعتراف کے ساتھ قوم کو بتا دینا چاہئے کہ وہ بھی انہی بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے ہیں جہاں اس سے پہلے کے تمام حکمران اپنا سب کچھ قربان کر چکے ہیں۔

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

بروز جمعۃ المبارک 10 شوال المکرم 1445ھ 19 / اپریل 2024ء

وقت کا عبرت کدہ

نہیں، نہیں یہ جو نظر آرہا ہے دھوکا ہے، فریبِ نظر ہے اور کچھ نہیں۔ یہ ایسا نہیں ہے جیسا نظر آرہا ہے۔ اندر کی آنکھ کھول، تب نظر آئے گا۔ وہ جو تیرے سامنے بیٹھا ہے، جو کہہ رہا ہے وہ ایسا نہیں ہے، ہاں! جو کہہ رہا ہے۔ وہ ایسا نہیں ہے۔ جو کہہ رہا ہے بس سن لے، ایسا ہے نہیں، اور اگر اندر کی آنکھ کھل جائے، نظر آنے لگے تو شکر کرنا کہ یہ توفیق ہے۔ رب کی عنایت ہے۔ مداری مت بن جانا کہ ہر ایک کو کہتا پھرے، جھوٹ بولتا ہے تُو۔ اندر سے تو تُو یہ ہے۔ پردہ پوشی کرنا، مرض سے لڑنا ہے مریض سے نہیں۔ پھر جب اندر کی آنکھ بینا ہو جائے تو اشکوں سے دھوتے رہنا کہ یہی ہے اسے مطہر کرنے کا پانی۔ آنکھ ناراض مت کرنا کہ اگر یہی ناراض ہو گئی تو سب کچھ برباد ہو جائے گا۔ آنکھ خفا ہو جائے تو برے مناظر دکھاتی ہے۔ برے مناظر تو ہوتے ہی پریشان کن ہیں، وہ تو اچھے منظر کو، اچھے چہرے کو بھی میلا کر دیتی ہے۔ تیرے اندر کی آنکھ کھلے تب تو تُو پہچان پائے گا ناں! کھلے گی کب؟ جب رب راضی ہو جائے۔ رب کرم کر دے تو اندر کی آنکھ کو بینا کر دیتا ہے۔ نہیں، نہیں..... جو نظر آرہا ہے دھوکا ہے، فریبِ نظر۔

بس رب سے جڑے رہنا ہر حال میں..... غربت میں بھی اور تونگری میں بھی۔ صحت مند ہو جب بھی اور بیمار ہو تب بھی۔ ہر حال میں سرپا تسلیم رہنا آئے ۔ راضی برضائے الٰہی رہنا کہ یہی ہے بندگی اور کچھ نہیں۔ اپنا دامن بچانا کمال نہیں، دوسروں کو بچانا اصل ہے۔ دوسروں کی مدد کر تو وہ تیری مدد کو گا، اوروں کا دکھ بانٹ تو سکھی رہے گا۔ اندر کا سکون چاہیے تو دوسروں کے آنسو پونچھ۔ احسان کر کے مت جتلانا، لیکن خبردار رہنا۔ بہت نازک ہے یہ کام ۔ اپنے ذاتی مقصد کیلئے یہ سب مت کرنا، اس لئے کرنا کہ رب کی مخلوق ہے اور مخلوق رب کو بہت پیاری ہے۔ تصویر کی تعریف مصور کی تعریف ہے۔ تخلیق کو سراہنا خالق کو سراہنا ہے۔ مخلوق میں رہ اور رب تک پہنچ۔ جنگل، بیاباں میں کچھ نہیں رکھا، مرنا تو بہت آسان ہے، زندہ رہنا کمال ہے۔ اپنے لئے بن، خلوص بن، نہیں پابرہنہ مخلوق کیلئے، خاک بسر بندگانِ خدا کیلئے، جی، ٹوٹے دلوں سے پیار کر، بے آسرا کیلئے سایہ بن شجرِ سایہ دار، پھول بن، خوشبو وفا بن، جب رب خوش ہو تو مخلوق کے دلوں میں اُتارتا ہے تیری محبت۔ تجھے کیا خبر کتنے ہاتھ رب کے حضور اٹھتے ہیں تیرے لئے۔

دیکھ رب خفا ہو جائے تو سب کچھ برباد ہو جاتا ہے۔ ہاں انسان کے اپنے اعضا بھی خفا ہو جاتے ہیں۔ کان خفا ہو جائیں تو بری باتیں سنتے ہیں، ٹوہ میں لگ جاتے ہیں، زبان خفا ہو جائے تو غیبت کرنے لگتی ہے، مخلوق کی برائیاں بیان کرتی ہے، چغلی کرتی ہے بہتان طرازی کرتی ہے، لوگوں کو آپس میں لڑاتی ہے، حق کو چھپاتی ہے، خوبیاں چھوڑ کر کوتاہیاں بیان کرتی ہے، دلوں کو اجاڑتی ہے، فساد برپا کرتی ہے۔ یہ زبان بہت کڑوی بھی ہے اور میٹھی بھی۔ یہ دلوں کو جوڑتی بھی ہے اور توڑتی بھی۔ خفا ہو جائے تو اس کے شر سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔ جھوٹے وعدے کرتی ہے، بس رب ہی اس کے فساد سے بچا سکتا ہے۔ پاؤں خفا ہو جائیں تو دوسروں کو آزار پہنچانے کیلئے اٹھتے ہیں، برائی کی جگہ جاتے ہیں، ہاتھ خفا ہو جائیں تو لوٹ مار کرتے ہیں، قتل وغارت گری کرتے ہیں، چھینا جھپٹی کرتے ہیں۔ مار پیٹ کرتے ہیں، خلق خدا کے حق میں تو نہیں اٹھتے، بس مخلوق کو تباہ کرنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں، ان کے ہاتھ اور بازو بن جاتے ہیں۔ ذہن خفا ہو جائے تو بری باتیں سوچتا ہے۔ بیہودہ خیالات کی آماجگاہ بن جاتا ہے، سازشیں کرتا ہے منصوبہ بندی کرتا ہے فساد کی۔ اور دیکھ اگر دل خفا ہو جائے تو مُردہ ہو جاتا ہے اور تجھے معلوم ہے مُردہ شے سڑنے لگتی ہے، اس کی بدبو سے رب بچائے، بے حس ہو جاتا ہے، نیکی قبول ہی نہیں کرتا، برائی کی طرف بڑھتا ہے، تفرقہ پھیلاتا ہے، جوڑتا نہیں، توڑنے لگتا ہے۔ بس رب بچائے ان امراض سے اور رب ہی تو بچا سکتا ہے۔ کچھ ہی لمحے تو جینا ہے۔ ابھی آتے ہوئے اذان ہوئی تھی اور پھر جاتے ہوئے نماز، وہ بھی اگر نصیب ہو جائے تب۔

دو پل کے جینے کیلئے اتنے منصوبے، اتنی جان ماری، اتنی ذلت در در کی بھیک، خوشامد اور چاپلوسی، کس خسارے میں پڑ گیا میں۔ رب توفیق دے، کرم کر دے، تب ہی تو میں پہچان پاؤں گا چیزوں کی اصل کو۔ انسان کے اندر دیکھنا عنایت ربی ہے۔ پھل پھول تو سب کو نظر آتے ہیں، جڑ کون دیکھے گا؟ وہ نظر کہاں سے لاؤں! بس یہ توفیق پر ہے، رب سے جڑنے میں ہے۔ جناب رسالت مآب ﷺ نے فرمایا ہے ناں: مومن کی بصیرت سے ڈر، وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔

کب پہچانوں گا خود کو، اپنے رب کو، اپنے پالن ہار کو..... کب انکار کروں گا جھوٹے خداؤں کا..... کب سہارا بنوں گا خاک بسر مخلوق کا..... کب دوست بنیں گے میرے اپنے اعضا۔ موت سے پہلے رب سے کیوں نہیں مانگتا میں یہ سب کچھ، کیوں آہ وزاری نہیں کرتا۔ کب ہوش آئے گا مجھے، میرا رب بچائے اُس وقت سے جب مجھے ہوش آئے اور وقت پورا ہو گیا ہو۔ کوئی چارہ نہ ہو، بے بسی ہو۔ دیکھئے وہ میرا ساتھ نہیں چھوڑتے، پھر آ گئے، کیا خوبصورت بات کی ہے، واہ میرے مالک کیسے نادر و نایاب بندے پیدا کئے۔ نہ کرتا تو ہم کتنے محروم رہ جاتے۔

حضرت سیّدنا ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ ایک دن بازار سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک آدمی کے کندھے پر ایک لاش پڑی ہے اور اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ میں نے کہا: اللہ کی قسم! میں ضرور اس کا ساتھی بنوں گا اور اس کا اجر حاصل کروں گا۔ جب وہ قبرستان پہنچا تو میں نے کہا: اے لوگو! اس شخص کا ولی کہاں ہے، تاکہ اس کی نماز جنازہ پڑھیں؟ تو اس نے جواب دیا: اے معزز مہمان! ہم میں سے کوئی اسے نہیں جانتا۔ پھر میں آگے بڑھا اور اس کی نماز جنازہ پڑھائی، ہم نے اسے لحد میں اتار کر اس پر مٹی ڈال دی۔ جب انہوں نے لوٹنے کا ارادہ کیا تو میں نے کہا: اس میت کا کیا معاملہ ہے؟ تو انہوں نے میرے اس سوال پر بھی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "ہم کچھ نہیں جانتے، ایک عوت نے اس میت کو یہاں لانے کیلئے ہمیں کرائے پر لیا اور وہ اب آنے والی ہے۔

اتنے میں وہ پریشان حال عورت روتے ہوئے قبر پر رکی تو اپنے چہرے سے پردہ ہٹایا، بال پھیلائے اور اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے گریہ وزاری کرتے ہوئے بے ہوش ہو گئی۔ کچھ دیر بعد ہوش آیا تو ہنسنے لگی تو میں نے اس قدر شدید تر رونے کے بعد ہنسنے کا سبب پوچھا تو اس عورت نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ کون ہیں؟ تو میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ میں "ذوالنون" ہوں۔ اس عورت نے کہا "اللہ کی قسم! اگر آپ صالحین میں سے نہ ہوتے تو میں آپ کو کبھی بھی نہ بتاتی۔ یہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک میرا بیٹا ہے جس نے اپنی ساری جوانی فخریہ لباس اور تکبر میں گزار دی، کوئی برائی ایسی نہیں جس کا اس نے ارتکاب نہ کیا ہو کوئی گناہ ایسا نہیں جسے کرنے کی کوشش نہ کی ہے۔ اس کی تمام بداعمالیوں کو جاننے والے رب نے اسے یہ سزا دی کہ اس کے سر میں شدید درد ہوا جو تین دن تک جاری رہا۔ جب اس کو اپنی موت کا پورا یقین ہو گیا تو کہنے لگا "اے میری ماں! میں تجھے اللہ کا واسطہ دیتا ہوں، میری وصیت قبول فرما: جب میں مر جاؤں تو میری موت کی خبر میرے دوستوں، میرے گھر والوں اور پڑوسیوں تک کو بھی نہ دینا کیونکہ وہ میری بداعمالیوں کی بناء پر مجھ پر رحم نہیں کریں گے، پھر اس نے روتے ہوئے یہ اشعار پڑھے!

میرے گناہوں نے مجھے نماز روزے سے غافل کر دیا۔
میں نے اپنے جسم کو اتنا علیل و کمزور کر دیا کہ وہ موت سے پہلے ہی مر چکا ہے۔
کاش! میں اپنے رب عزوجل کی بارگاہ میں تمام گناہوں سے توبہ کر لیتا۔
اے میرے معبود! اس وسیع بیابان میں تیرا یہ بندہ حیرت زدہ ہے۔

میرے عیوب سب پر ظاہر ہو گئے، گناہوں نے میری کمر توڑ ڈالی۔
میری برائیاں بہت زیادہ اور نیکیاں برباد ہو چکی ہیں۔

پھر روتے ہوئے اپنی ماں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: میری ماں! مجھے اس بات پر افسوس ہے کہ میں اللہ کی نافرمانیوں میں حد سے بڑھ گیا۔ میری پیاری ماں! تجھے اللہ کی قسم! جب میں مر جاؤں تو میرے رخسار کو زمین اور مٹی میں رکھ کر میرے دوسرے رخسار پر پورے زور کے ساتھ اپنا پاؤں رکھ کر کہنا کہ یہ جزا ہے اس بندے کی جس نے اپنے کریم ور حیم مولا کی نافرمانی و مخالفت کی، اس کے احکام کو ترک کیا اور اپنی خواہشات کا غلام بن کر رہا۔ پھر مجھے اس گڑھے میں دھکیل کر اپنے ہاتھوں کو اللہ کی جانب بلند کر کے پکارنا: اے اللہ اس سے راضی ہو جا!

جب میرے بیٹے کا دم نکل گیا تو میں نے اس کی تمام وصیتوں کو پورا کیا۔ جونہی میں نے آسمان کی طرف منہ اٹھایا تو مجھے اپنے بیٹے کی ندا سنائی دی: میری پیاری ماں! اب لوٹ جا کہ میں اپنے کریم ور حیم رب کے حضور اس حال میں حاضر کیا گیا ہوں کہ وہ مجھ پر ناراض نہیں تھا۔ جب میں نے یہ آواز سنی تو میرے دل کو کچھ ڈھارس ہو گئی اور بے اختیار اپنے رحیم رب کی مناجات میں مصروف ہو گئی۔

حضرت سیدنا منصور بن عمار فرماتے ہیں کہ جب بندہ مر جاتا ہے تو وہ 5 حالتوں سے گزرتا ہے:
اس کا مال وارثوں کا، اس کی روح ملک الموت کیلئے، اس کا گوشت کیڑوں کیلئے، اس کی ہڈیاں مٹی کیلئے، اور پانچویں حالت اس کی نیکیاں "حصوم" یعنی قیامت کے دن اپنے حق کا مطالبہ کرنے والوں کیلئے ہوتی ہیں۔ مزید فرمایا: وارث مال پر قبضہ کر لیں تو درست، ملک الموت روح قبض کر لیں تو بالکل درست لیکن ہم اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ موت کے وقت شیطان ایمان لے جائے اور اللہ سے جدائی ہو جائے۔ اللہ کا فراق تو برباد کر کے رکھ دیتا ہے جو ناقابل برداشت ہے۔

حضرت سیدنا محمد بن نعیمؒ سے رسول کریم ﷺ کا فرمان مبارک مروی ہے کہ: جبرئیل علیہ السلام جب بھی میرے پاس تشریف لاتے تو اللہ عزوجل کے خوف سے کانپ رہے ہوتے۔ جب شیطان کو قرب و بلند مرتبہ کے بعد اس کی نافرمانی کی بناء پر دھتکارا گیا تو جبرئی و میکائیل علیہ السلام دونوں رونے لگے تو دلوں کے حال تک جاننے والے رب ذوالجلال نے استفسار فرمایا: تمہیں کیا ہوا، کیوں روتے ہو، حالانکہ میں کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ تو دونوں مقرب ملائکہ نے عرض کی: اے ہمارے علیم و خبیر رب! ہم آپ کی خفیہ تدبیر یعنی قضا، تیرے قرب کی دوری اور سعادت مندی کے بعد شقاوت سے خوفزدہ ہیں۔ تو اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا "اسی طرح میری خفیہ تدبیر سے ڈرتے رہو"۔

چلئے ایک اور واقعہ "احیاء العلوم از امام الغزالی" سے آپ سے شئیر کر لیتا ہوں:
ایک روز شیخ شقیق بلخیؒ نے اپنے شاگرد حاتمؒ سے پوچھا "حاتم! تم کتنے دنوں سے میرے ساتھ ہو؟ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ گزشتہ 32 برس سے آپ کی شاگردی میں ہوں تو شیخ نے پوچھا: بتاؤ اتنے طویل عرصے میں تم نے مجھ سے کیا سیکھا؟ تو حاتم جیسے شاگرد نے جواب دیا "صرف آٹھ مسائل"۔ تو شیخ نے رڈ عمل میں "انا اللہ و انا الیہ راجعون" کا ورد کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے اوقات تیرے اوپر ضائع ہو گئے، تو نے صرف آٹھ مسائل سیکھے"

۔شاگرد نے سر جھکا کر کہا کہ استاد محترم!"زیادہ نہیں سیکھ سکا،اور جھوٹ بھی نہیں بول سکتا"۔ شیخ نے کہا"اچھا بتاؤ کیا سیکھا ہے؟حاتمؒ نے کہا:

1-میں نے مخلوق کو دیکھا تو معلوم ہوا،ہر ایک کا محبوب ہوتا ہے قبر میں جانے تک،جب بندہ قبر میں پہنچ جاتا ہے تو اپنے محبوب سے جدا ہو جاتا ہے،اس لئے میں نے اپنا محبوب "نیکیوں" کو بنالیا ہے کہ جب میں قبر میں جاؤں گا تو یہ میرا محبوب میرے ساتھ قبر میں رہے گا۔کسی عارف نے کیا خوب کہا ہے:

یاد داری کہ وقت زادن تو،ہمہ خندہ بوند و تو گریاں

اینچنیں زی کہ وقت مردن تو ہمہ گریاں بوند و تو خنداں

کہ تجھے کچھ یاد ہے کہ جس وقت تو نے اس دنیا میں پہلا قدم رکھا تھا تو تیرے سب گھر والے تو شاداں و خنداں تھے مگر تو رو رہا تھا،اب اس دنیا میں اس طرح اللہ والوں کی سی زندگی بسر کر کہ جس وقت تو اس دنیا سے کوچ کرنے لگے تو سب تو تیرے لیے روتے ہوں،مگر تو خوش و خرم وہشاش بشاش جاتا ہو، کہ گویا قید خانہ سے چھوٹ کے اپنے گھر جارہا ہے۔

2۔لوگوں کو دیکھا کہ کسی کے پاس قیمتی چیز ہے تو اسے سنبھال کر رکھتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے،پھر فرمانِ الٰہی پڑھا: مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ بَاقٍ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ:جو کچھ تمہارے پاس ہے،وہ خرچ ہو جانے والا ہے،جو کچھ خرچ ہو جانے والا ہے،جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے۔(النحل:96)۔تو جو چیز مجھے قیمتی ہاتھ آئی اسے اللہ کی طرف پھیر دیا تاکہ اس کے پاس محفوظ ہو جائے جو کبھی ضائع نہ ہو۔

3۔میں نے خدا کے فرمان پر غور کیا: وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ:اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو بُری خواہشات سے باز رکھا جنت اسی کا ٹھکانہ ہو گا(النازعات:40)تو اپنے نفس کو بُرائیوں سے لگام دی،خواہشاتِ نفسانی سے بچنے کی محنت کی،یہاں تک کہ میرا نفس اطاعتِ الٰہی پر جم گیا۔

4-لوگوں کو دیکھا،ہر ایک کا رجحان دنیاوی مال،حسب نسب،دنیاوی جاہ ومنصب میں پایا،ان امور میں غور کرنے سے یہ چیزیں ہیچ دکھائی دیں،اُدھر فرمان الٰہی دیکھا: إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ" درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے(الحجرات:13)۔تو میں نے تقویٰ اختیار کیا تاکہ اللہ کے ہاں عزت پاؤں۔

5-لوگوں میں یہ بھی دیکھا کہ آپس میں گمانِ بد رکھتے ہیں،ایک دوسرے کو بُرا کہتے ہیں دوسری طرف اللہ کا فرمان دیکھا:نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا:دنیا کی زندگی میں ان کی بسر اوقات کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں(الزخرف:32)اس لئے میں نے حسد کو چھوڑ کر خلق سے کنارہ کر لیا اور یقین ہوا کہ قسمت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے خلق کی عداوت سے باز آگیا۔

6-لوگوں کو دیکھا کہ ایک دوسرے سے سرکشی اور کشت وخون کرتے ہیں،اللہ کی طرف رجوع کیا تو اس کا فرمان نظر آیا:

إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا إِنَّمَا يَدْعُو حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَابِ السَّعِيرِ

بے شک شیطان تو تمہارا دشمن ہے سو تم بھی اسے دشمن سمجھو وہ تو اپنی جماعت کو بلاتا ہے تاکہ وہ دوزخیوں میں سے ہو جائیں(فاطر:6)۔اس بناء پر میں نے صرف اس اکیلے شیطان کو اپنا دشمن ٹھہرالیا اور اس بات کی کوشش کی کہ اس سے بچتا رہوں۔

7-لوگوں کو دیکھا پارہ نان(روٹی کے ٹکرے)پر اپنے نفس کو ذلیل کر رہے ہیں،ناجائز امور میں قدم رکھتے ہیں،تو ارشادِ باری تعالیٰ دیکھا: وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ۔زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے

جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو (ہود:6) پھر میں ان باتوں میں مشغول ہوا کہ جو اللہ کے حقوق میرے ذمے ہیں، اس رزق کی طلب ترک کی جو اللہ کے ذمے ہے۔

8- میں نے خلق کو دیکھا، ہر ایک کسی عارضی چیز پر بھروسہ کرتا ہے، کوئی زمین پر بھروسہ کرتا ہے، کوئی اپنی تجارت پر، کوئی اپنے پیشے پر، کوئی بدن پر، کوئی ذہنی اور علمی صلاحیتوں پر بھروسہ کیے ہوئے ہے، میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا تو یہ ارشاد دیکھا: وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا۔ اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے (وہم و) گمان بھی نہ ہو۔ اور جو خدا پر بھروسہ رکھے گا تو وہ اس کو کفایت کرے گا۔ خدا اپنے کام کو (جو وہ کرنا چاہتا ہے) پورا کر دیتا ہے۔ خدا نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے (طلاق:3)

شیخ بلخیؒ بے ساختہ پکار اٹھے: اے میرے پیارے شاگرد حاتم! اللہ تمہیں ان کی توفیق نصیب کرے، میں نے قرآن کے علوم پر مطالعہ کیا تو ان سب کی اصل جڑ انہی آٹھ مسائل کو پایا، ان پر عمل کرنے والا گویا چاروں آسمانی کتب کا عامل ہوا۔

"نصیحت کرنے والوں کا، ڈرانے والوں کا انجام ہمارے ہاں کیا یہی ہے؟ دنیا والے کبھی صلیب پر چڑھا دیتے ہیں، کبھی دار پر، کبھی اس پر کربلائیں نافذ کر دیتے ہیں، کبھی وادیٔ طائف سے گزار دیتے ہیں، کبھی کوئی صعوبت، کبھی کوئی.... لیکن سلام و درود ہو نصیحت کرنے والوں پر جن کے حوصلے بلند اور عزائم پختہ ہوتے ہیں۔ جو گالیاں سن کر دعائیں دیتے ہیں اور جو غافلوں سے غفلت کی چادریں اتار دیتے ہیں، اور انہیں بے حسی کی نیند سے جگاتے رہتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی نصیحتوں سے بھری ہوئی باتیں آپ تک پہنچائیں، اپنے ارد گرد کے ماحول کی صفائی میں خود کو تیار کریں۔ کیا کتابیں پڑھ لینا ہی کافی ہے؟ نہیں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے، بہت کچھ۔ دنیا وقت کا عبرت کدہ ہے، یہاں آنکھیں کھول کر چلنا چاہئے۔ اپنی من مانی نہیں کرنی چاہئے پہلے من مانیاں کرنے والے کہاں گئے؟ عشرت کدے، عبرت کدے کیوں بن گئے؟ محلات کھنڈرات کیوں ہو گئے؟ دنیا میں جھوٹ بولنے والے کیا کیا نشانیاں چھوڑ گئے۔ ویرانیاں ہی نشانیاں ہیں۔

پہلے کون رہا ہے یہاں، جو اب رہے گا۔ کچھ بھی تو نہیں رہے گا، بس نام رہے گا میرے رب کا!

جہاں میں ہم بھلا کب تک رہیں گے
تماشا ختم ہو گا، چل پڑیں گے
کسی کی آگ میں زندہ رہے تو
ہم اپنی آگ کب روشن کریں گے

بروز ہفتہ 11 شوال المکرم 1445ھ 20/ اپریل 2024ء

بھارت اور ایڈز

ہنود و یہود جہاں ایک ہی سامراج کے زیر طفیل دنیا بھر کے امن و امان کیلئے ایک خطرہ بنے ہوئے ہیں وہاں استعماری و طاغوتی خصائل میں بھی نہ صرف ایک دوسرے کے ہم آہنگ بلکہ ڈویلپمنٹ اور حقائق کی روشنی میں دیکھیں تو دونوں بے شرمی، اخلاق سوزی اور بے حیائی میں بھی ایک دوسرے کی راہ پر چل نکلے ہیں۔ بھارتی عدالت عظمیٰ کا ایک صادر فیصلہ جسے اباحیت کے حوالے سے نرم سے نرم الفاظ میں بھی بے حد شرمناک فیصلہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ بھارتی سپریم کورٹ کے اس فیصلے نے بیک جنبش قلم انسان کو جانور کے مقام تک پہنچا دیا گیا ہے کیونکہ جانور، درندوں اور مویشی کی جبلت بھی اس فعل سے مطابقت رکھتی ہے جو ایک بڑے جمہوری ملک کی اعلیٰ ترین عدالت نے کر ڈالا۔ بھارت کی سیاہ تاریخ میں یہ فیصلہ سیاہ ترین دن کے طور پر ریکارڈ ہو گیا ہے اور آئندہ زمانے میں مؤرخ یقیناً بھارتی النسل ہندوؤں کو ان کے آباؤاجداد عدالت عظمیٰ کے اس فعل پر شرمندہ کرتا رہے گا اور لعنت و نفرین بھیجتا رہے گا۔

فطرت سلیمہ کو مسخ کرنے کرنے والے چند اباحیت سیز اور ذہنی مریضوں کے اصرار و تقاف پر بھارتی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس دیپک مشرا کی قیادت میں پانچ رکنی بینچ نے 158 سالہ پرانے انڈین پینل کوڈ کی دفعہ 377 کو ختم کر کے ہم جنسی کی خباثت کو قانونی حیثیت دے دی جس کے بھارت بھر کی جیلوں میں ہزاروں افراد جو اس شرمناک فعل میں ملوث سزاؤں میں قید تھے، ان کو بھی خاموشی کے ساتھ رہا کر دیا گیا۔ بھارت جو ہر حوالے سے اسرائیل کے نقش قدم پر گامزن ہے، اب ہم جنس پرستی کے حوالے سے بھی اسرائیل کے قدم سے قدم ملا کر ایک بہت بڑی لعنت میں مبتلا ہو گیا ہے۔ بھارتی سپریم کورٹ نے جو فیصلہ سنایا ہے اس کی رو سے بھارت کے ایڈز زدہ اور تباہ حال معاشرے کے تابوت میں اس نے آخری کیل ٹھونک دی۔ آج ایڈز نے دنیا میں تباہی مچا رکھی ہے اور تین سال قبل بھارت کے محکمہ صحت کے وزیر نے اعداد و شمار بتا کر اس امر کا برملا اعتراف کیا کہ ایڈز کی وباء ہم جنسی کی بناء پر بھارت کو تیزی سے اپنی گرفت میں لے رہی ہے۔ ہم جنسیت اور کئی دیگر وجوہ کی نشاندہی کرتے ہوئے بھارتی وزیر نے بھارت میں ایڈز کی وباء پھیلنے کا اعتراف کیا۔ بھارتی سپریم کورٹ کے اس شرمناک اور اخلاق باختہ فیصلے کے بعد بھارت اور اسرائیل اخلاقی گراوٹ کے لحاظ سے یکساں ہو گئے ہیں۔ اس طرح "کند ہم جنس باہم جنس پرواز" کی مثال بھارت اور اسرائیل کے مشترکات پر پوری صادق آجاتی ہے۔

بھارتی سپریم کورٹ کے اس مذموم اور قبیح فیصلے سے قبل "ہم جنس پرستی" غیر قانونی اور قابل تعزیر جرم تھا اور بھارتی آئین کی دفعہ 377 کے تحت ایسا کوئی بھی فعل قانوناً سزا تھا اگرچہ بھارت نے اپنے آئین میں اس شق کو اگریز کے قانون سے مستعار لیا تھا جسے انگریزوں نے 852ء میں نافذ کیا تھا جس کے تحت غیر فطری جنسی فعل کو غیر قانونی قرار دیا تھا۔ واضح رہے کہ اباحیت، جنسی آوارگی اور ہم جنسی پرستی کے نتیجے میں مغربی اور امریکی معاشرہ کا خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ گزشتہ تین دہائیوں سے 4 کروڑ افراد ایڈز کے سبب عبرتناک موت کا شکار ہوئے ہیں، اس کا سب سے بڑا سبب ہم جنس پرستی بتایا جاتا ہے۔ مغرب میں ماہرین قوانین اور عدالتوں نے انسانی قدروں کو بے حد پامال کیا ہے وہ مابعد جدیدیت کے اس پہلو پر سختی سے کاربند ہے جس میں مذاہب اور اخلاقی اقدار کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہاں انسان کے بنائے ہوئے قوانین ہی حرفِ آخر ہیں۔ اخلاق، اقدار اور وحی الٰہی سے بے نیاز ہونے کے یہی نتائج سامنے آتے ہیں۔ اب بھارت بھی برہنہ کلب میں شامل ہو گیا ہے۔ آئندہ دنوں میں بھارتی معاشرہ کس حد تک کامل تباہی سے دوچار ہو گا اس کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔

جس بھارتی سپریم کورٹ نے "ہم جنسیت" کو قانونی قرار دیکر بھارتی معاشرے پر ایٹم بم گرا دیا، اسی بھارتی سپریم کورٹ نے 2013ء میں دہلی ہائی کورٹ کے 2009ء کے فیصلے کو کالعدم قرار دیتے ہوئے "ہم جنس پرستی" کو غلاظت میں لت پت دو ہم جنس کے درمیان "ہم جنس پرستی" کو جرم کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا لیکن اس کے بعد "ہم جنسیت" کی غلاظت میں لت پت پانچ فاعل و مفعول کی درخواست پر بھارتی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس دیپک مشرا کی سربراہی میں پانچ رکنی بینچ نے ہم جنس پرستی کو جرم کی ذیل سے ہٹانے کے متعلق درخواستوں کی سماعت کی، اس بینچ میں چیف جسٹس آر این نریمن، جسٹس اے ایم کھانوکر، جسٹس جی ڈی وی چندر چوڑ اور جسٹس اندو ملہوترا بھی شامل ہیں۔ بھارتی سپریم کورٹ نے اس سلسلے میں مودی حکومت کی نمائندگی کرنے والے ایڈیشنل سالیسٹر جنرل تشتار مہتا نے وسپریم کورٹ میں تین صفحات کا بیانِ حلفی داخل کرا کے کہا کہ مودی حکومت کا دفعہ 377 کے آئینی جواز کے متعلق کوئی مؤقف نہیں ہے۔ مودی حکومت کے نمائندے نے گیند سپریم کورٹ کے احاطے میں ڈالتے ہوئے کہا کہ اب یہ سپریم کورٹ پر منحصر ہے کہ ہم جنس پرستی کو جرائم کی ذیل میں شمار کرتی ہے یا نہیں۔

آسمانی کتابوں نے سختی سے پابند اور ہم جنسیت کی تمام شکلیں تمام آسمانی مذاہب میں حرام و ناجائز ہیں۔ رب العالمین کی طرف سے آسمانی مذاہب کی تنسیخ اور اسلام کے کامل و عامل اور آخری دین قرار پانے کا حکم نازل ہونے پر غور کیا جائے تو صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ اسلام مکارم اخلاق اعلیٰ صفات اور عمدہ کردار کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام کا بنیادی مقصد معاشرے کو صالحیت بخشتا ہے، اسلام میں شادی اور نکاح کا مقصد صرف جنسی آلودگی کے تمام غیر فطری راستوں کا راستہ روکنا ہی نہیں بلکہ نسل انسانی کا فروغ، بقا، تحفظ اور زوجین کے مابین مؤدت و محبت اور تعاون و تناظر، مشروعیت کا نکاح وغیرہ اہم ترین مقاصد کی تکمیل بھی ہے۔ اسی لئے جنس مخالف اور ان کے ولی کی رضامندی کے ساتھ علی الاعلان نکاح کا حکم دیا گیا ہے تا کہ معاشرے میں کسی قسم کی بدگمانی اور پرائی جنم نہ لے، اس کے برعکس آج کا مغربی، امریکی، یہودی اور اب ہندو معاشرہ جو خدائی احکام کا صریحاً باغی ہو چکا ہے، گندگی اور غلاظت کی گہرائی میں گر چکا ہے۔

اسلام نے اس فعل کو حرام قرار دیا ہے۔ قوم لوط اسی جنسی آوارگی کے سبب عذاب سے دوچار ہوئی تھی۔ اس عمل پر ان کا اتنا اصرار تھا کہ باوجود حضرت لوط کی تعلیمات کو مسترد کر کے وہ اس جرم عظیم کو انجام دیتے تھے، پھر جب پکڑ آئی تو ایسی آئی کہ وہ آج تک دوسروں کیلئے عبرت کے سبب بنے ہوئے ہیں۔ پتھروں کی بارش اور تباہ کن زلزلوں نے ان کی بستی کو زمین دوز کر دیا۔ تاریخ کے صفحات اس حقیقت کے ساتھ بھرے ہوئے ہیں کہ قوم لوط جہاں آباد تھی آج اس جگہ بحر مردار کی خطرناک موجوں کا قبضہ ہے۔ آج بھی اس کے اطراف واکناف میں نحوست کا سایہ اور عبرت کی فضا قائم ہے جو وہاں جانے والوں کے دلوں پر ہیبت طاری کر دیتی ہے۔ اس جرم کی پاداش میں اس قوم کی تباہی کے باوجود آج بھارت کی سپریم کورٹ نے بھارتی شہروں اور شہریوں کو اسی راہ پر ڈال دیا ہے جو ژولیدگی فکر اور بصیرت کی پستی کا مظہر ہے۔

بھارتی سپریم کورٹ کی طرف سے جنسی ہم پرستی کے حق میں فیصلہ دینے کے باوجود بھارتی مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ وہ یہ فیصلہ مسترد کر دیں کیونکہ یہ اسلام کے متصادم ہے۔ بھارتی مسلم علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہم جنس پرستی کی غلاظت و قباحت کو اہم الم نشرح کر دیں اور تمام ادیان و مذاہب اور افکار و نظریات کے موضوع کو اباحیت سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ فطرت کے خلاف عمل ہے۔ بھارت کے سب سے بڑے دو دینی اداروں، دیوبند اور ندوی علماء کی ذمہ داری بنتی ہے کہ مسلم معاشرے سمیت غیر مسلموں میں بھی اس وبائی اور ذہنی مرض سے متعلق دلائل کی روشنی میں گفتگو

کر کے بھارتی سپریم کورٹ کے اس جاہلانہ فیصلے کے خلاف ایک مشترکہ سوچ و فکر اختیار کرتے ہوئے ہندوؤں کو بھی سمجھائیں کہ اگر وہ ایڈز میں مبتلا ہوں گے تو یہ بھی انسانیت پر ایک عظیم ظلم ہو گا۔

بروز منگل 14 شوال المکرم 1445ھ 23/ اپریل 2024ء

کڑے فیصلوں کا موسم

1990ء میں افغانستان میں بری طرح شکست کھانے کے بعد جب سوویت یونین کا شیرازہ بکھر گیا جس سے امریکا دنیا کی واحد سپر طاقت بن گیا لیکن جن ملکوں (پاکستان و افغانستان) کے توسط سے اس کو یہ مرتبہ ملا، اس نے اپنی سرشت کے مطابق سب سے پہلے انہی کو اپنا ہدف بناتے ہوئے نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اس نے یہ ثابت کر دیا کہ امریکا کی دوستی اس کی دشمنی سے بھی بدتر ہے۔ جونہی واحد سپر طاقت کا نشہ دو آتشہ ہوا تو اس نے فوری طور پر دنیا کی سیاست اور جغرافیے میں تبدیلیوں کیلئے متعصب یہودی نژاد امریکی ہنرہ کسینجر کے مرتب کردہ "نیو ورلڈ آرڈر" جیسے منحوس پروگرام کو بالجبر نافذ کرنے کیلئے جارحیت کا آغاز کر دیا تاکہ کوئی بھی قوت اس کے مدمقابل نہ آسکے۔ سب سے پہلے ایک منظم پروگرام کے مطابق اکتوبر 2001 میں نائن الیون کو جواز بنا کر افغانستان پر وحشیانہ جارحیت کا آغاز کیا اور ان تمام عناصر کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی جن کو امریکا اپنے مدمقابل سمجھ رہا تھا۔

اس کے بعد امریکا نے اپنی خفیہ ایجنسیوں کی بے بنیاد معلومات کو بہانہ بنا کر کہ عراق کے پاس دنیا کو تباہ کرنے کیلئے مہلک ہتھیار کی موجودگی کا بے سروپا الزام لگا کر مشرقِ وسطیٰ کے ایک خوبصورت اور ترقی یافتہ تہذیب یافتہ اور تیل سے مالا مال ملک عراق پر حملہ کر دیا مگر آج تک امریکا نہ صرف اس الزام کو ثابت نہیں کر سکا بلکہ اس کے سیکرٹری خارجہ کولن پاؤل کو اقوام متحدہ میں اپنے اس جھوٹ کے پلندے اور سابقہ بیان پر شرمندگی اور معافی کا اعتراف بھی کرنا پڑا لیکن عراق اور افغانستان کو کھنڈرات میں تبدیل اور لاکھوں افراد کو ہلاک کرنے کے باوجود ابھی تک وہاں مداخلت کا سلسلہ بند نہیں ہو سکا اور آئے دن تشدد کے مختلف واقعات میں سینکڑوں افراد کا ہلاک ہونا ایک معمول بن گیا ہے اور دونوں ممالک کی معیشت آج مکمل طور پر انتہائی خستہ حال ہو چکی ہے جبکہ عراق کے تیل سے مالا مال ہونے کے باوجود اس کے اپنے شہری زندگی کی بنیادی سہولتوں سے بھی محروم ہیں۔

دوسری جانب امریکی صدارت کی انتخابات کی تاریخ قریب ہونے پر امریکی صدر اور طاقتور ادارے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ آج امریکا پہلے سے کہیں زیادہ محفوظ ہے یعنی امریکا نے اپنی سلامتی کو یقینی بنانے کیلئے دنیا کی سلامتی کو غیر یقینی صورتحال سے دوچار کر رکھا ہے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امریکی صدر جو گزشتہ ماہ امریکا کے دیوالیہ ہونے پر دہائی مچا رہا تھا، اس نے اسرائیل اور یوکرین کیلئے سینکڑوں ارب ڈالر کی امداد مختص کر دی ہے جس میں خطرناک قسم کے اسلحہ کی ترسیل کو تیز رفتاری کے ساتھ پہنچانے کا حکم بھی جاری ہو چکا ہے جبکہ دوسری طرف پاکستان کے بیلیسٹک میزائل کے پروگرام کیلئے سامان فراہم کرنے کے الزام میں چین کی 3 اور بیلاروس کی ایک کمپنی پر پابندی عائد کر دی ہے جبکہ پاکستان نے ہمیشہ بیجا پابندیوں کے باوجود اپنے ایٹمی پروگرام کی ریکارڈ حفاظت کا ذمہ دارانہ ثبوت دیتے ہوئے متعلقہ عالمی اداروں کو بھی قائل کیا ہے کہ پاکستان ہمیشہ "اینڈ یوز اور اینڈ یوزر ویریفکیشن میکانزم" کیلئے تیار ہے لیکن ایکسپورٹ کنٹرول کے من مانے سیاسی مقاصد اور اطلاق کو ہرگز قبول نہیں کیا جاسکتا جبکہ دوسری طرف جوہری عدم پھیلاؤ پر سخت کنٹرول کرنے کا دعوی کرنے والوں کو اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھنے کی ضرورت ہے جنہوں نے ان کی ناک کے نیچے بعض ممالک کیلئے جدید فوجی ٹیکنالوجیز کیلئے لائسنسنگ کی شرط کو بھی ختم کر رکھا ہے بلکہ بھارت کے ساتھ امریکا اور اس کے اتحادیوں کے معاہدے خود ان کی دوغلی پالیسیوں کے منہ بولتے ثبوت ہیں اور ماضی میں تو کھلم کھلا پاکستان اور ایران کو اس کی بھاری قیمت بھی چکانی پڑی ہے جبکہ نائن الیون کے فوری بعد پاکستان ہی کی سرزمین کو استعمال کرتے ہوئے وہ دنیا کی واحد سپر پاور کہلانے کا مستحق ٹھہرا تھا لیکن اپنی ہی بے وفائی کی تاریخ کو دہراتے ہوئے اس نے اپنے انہی آزمودہ دوستوں کو یہ کہہ کر غیر مستحکم کرنا شروع کر دیا کہ اب سوویت یونین کے کیمونزم کو شکست دینے کے بعد اسلام کی باری ہے جس کیلئے پاکستان کا نقشہ تبدیل کرنا بہت ضروری ہے۔

انہی دنوں جب یہ سازش چل رہی تھی تو معروف امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ کی شائع کردہ ایک رپورٹ سے اس بات کا انکشاف کیا گیا تھا کہ "امریکا نے پاکستان میں ڈرون حملوں، یمن، افغانستان اور افریقہ میں جاری سی آئی اے کے خفیہ آپریشنز اور ایرانی ایٹمی پروگرام کو ناکارہ بنانے کیلئے سوا چھ ارب ڈالر خرچ کئے ہیں جبکہ پاکستان میں مبینہ بائیولوجیکل و کیمیکل لیبارٹریز اور ایٹمی ہتھیاروں کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کیلئے بھی سی آئی اے بھاری رقوم خرچ کر رہا ہے اور دیگر ممالک کے مقابلے میں پاکستان کو امریکی خفیہ نگرانی کی فہرست میں ترجیحی سطح پر رکھا گیا ہے"۔ رپورٹ کے مطابق "امریکا کو پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کے متعلق انتہائی تشویش ہے اس لئے پاکستان سے متعلق خفیہ نگرانی کے نیٹ ورک کو پہلے سے کہیں زیادہ وسیع کیا گیا ہے" ۔اس کے جواب میں فوری طور پر پاکستانی دفتر خارجہ کے ترجمان نے واشنگٹن پوسٹ کی رپورٹ پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان ایٹمی ہتھیاروں کے عدم پھیلاؤ کے مقصد پر سختی سے عمل پیرا ہے اور اس سلسلے میں پاکستان کی پالیسی ضبط اور ذمہ داری کی ہے جس کیلئے عالمی اداروں سے ہونے والے مذاکرات کا بھی حوالہ دیا گیا کہ انہوں نے بھی پاکستان کے حفاظتی انتظامات کی تعریف کی ہے۔ مذکورہ رپورٹ امریکی اخبار نے امریکی ایجنسی سی آئی اے اور این ایس اے کے سابق اہلکار ایڈورڈ اسنوڈن سے حاصل کردہ سی آئی اے کے مفصل سیاہ بجٹ پر مشتمل 178 صفحات کی دستاویزات کی بنیاد پر شائع کی جس میں امریکی سلامتی سے متعلق پروگرام کی تفصیلات موجود ہیں۔ رپورٹ کے مطابق 16 / امریکی انٹیلی جنس ایجنسیوں کا سالانہ بجٹ 52-6 بلین ڈالر کے علاوہ 14-7 بلین ڈالر سالانہ سی آئی اے پر خرچ ہوتا ہے جس میں سے سی آئی اے کا نصف بجٹ ہیومن انٹیلی جنس پر خرچ ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ اس وقت 16 / امریکی انٹیلی ایجنسیوں میں ایک لاکھ 7 ہزار 25 ملازمین کام کر رہے تھے جبکہ ایک رپورٹ کے مطابق افغانستان، عراق اور لیبیا کی دلدل نکلنے کے باوجود ملازمین کی تعداد میں 8 فیصد اضافہ ہو چکا ہے۔

رپورٹ میں اس بات کا بھی انکشاف کیا گیا تھا کہ سی آئی اے اور این ایس اے دشمن ممالک کے کمپیوٹر نیٹ ورک کو ناکارہ بنانے کیلئے ہیک کرتی ہیں، ان میں چین، روس، ایران، اسرائیل اور کیوبا کے ممالک شامل ہیں۔ رپورٹ کے مطابق 2004 کے بعد سی آئی اے کیسالانہ بجٹ میں 3 بلین ڈالر کے لگ بھگ اضافہ کر دیا گیا ہے۔ واشنگٹن پوسٹ کی رپورٹ کے مطابق امریکی کمانڈوز نے خلا میں موجودہ سیٹلائٹ کی مدد سے پاکستان میں موجود اسامہ بن لادن کو مارنے کا دعوی بھی کیا تھا۔ واضح رہے واشنگٹن پوسٹ کی شائع کردہ یہ رپورٹ ایڈورڈ سنڈون کی فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر تیار کی گئی تھی۔ ایڈورڈ سنڈون امریکی خفیہ اداروں میں کمپیوٹر اسپیشلسٹ تھا جو سی آئی اے اور این ایس اے کیلئے کام کرتا تھا۔ ایڈورڈ سنڈون نے مئی 2013 میں امریکی خفیہ ایجنسیوں کے متعلق بہت سے راز افشا کئے تھے اور دنیا کے لوگوں کی خفیہ نگرانی کو غیر اخلاقی قرار دیا تھا جس کے بعد وہ امریکی ایجنسیوں کے خوف سے امریکا کو چھوڑ کر ہانگ کانگ سے کئی دوسرے ملکوں میں چھپتا رہا جس کے بعد اس نے کئی ممالک میں سیاسی پناہ کی درخواست دے دی جبکہ روس نے امریکی مخالفت مول لیتے ہوئے ایڈورڈ سنڈون کی سیاسی پناہ کی درخواست قبول کر لی۔

امریکی خفیہ برقی نگہداشت اور جاسوسی پروگرام میں ٹھیکے پر ملازم سنوڈن کی وجہ شہرت امریکی ادارے برائے قومی سلامتی کے طریقہ کار کا بھانڈہ پھوڑنے پر ہوا کہ کس طرح امریکا اپنے دشمنوں سمیت دوستوں کی بھی کڑی جاسوسی کرتا ہے۔ سنوڈن 2003 میں امریکی خفیہ ادارے برقی نگہداری اور جاسوسی پروگرامنگ میں بطور محافظ بھرتی ہوا لیکن بعد ازاں اپنی دونوں ٹانگیں تڑوا بیٹھا۔ 2013 میں سنوڈن نے گارجین کے اخبار نویس گلن گرینوالڈ کو پیغام بھیجا کہ اس کے پاس امریکی جاسوسی کے بارے میں اہم مصدقہ مواد موجود ہے لیکن وہ صرف پی جے پی طریقہ سے برقی رابطہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ گرینوالڈ اس ٹیکنالوجی سے نابلد تھا چنانچہ اس کی جہالت کی بنا پر رابطہ میں بہت تاخیر ہو گئی۔

سنوڈن نے بالآخر تنگ آ کر یہ مواد صحافی لارا پوئٹرس کو بھیجا جو اس ٹیکنالوجی سے واقف تھی۔ لارا پوئٹرس نے یہ سارا مواد گرینوالڈ کو بھیج دیا۔ اسی اثنا میں سنوڈن نے یہ 41 صفحات پر مبنی یہ مواد واشنگٹن پوسٹ کو بھی بھیج دیا۔ دونوں اخبارات نے فوری طور پر امریکی سرکار سے رابطہ کیا اور اس مواد کے صرف تین صفحات کو ہی شائع کرنے کی جرأت کر سکے۔ 14 جون 2013 کو وائرڈ نے "پی جی پی" کا استعمال کرتے ہوئے "انکرپٹڈ" پیغام سنوڈن کے نام شائع کر ہو گیا اور بھانڈہ پھوٹنے پر سنوڈن فوری طور پر اپنی جان بچانے کیلئے ہوائی سے ہانگ کانگ چلا گیا کہ اس وقت ہانگ کانگ چینی حکومت کی عمل داری میں آ چکا تھا۔

کرسمس 2013 پر سنوڈن نے برطانوی دور نما پر اپنے پیغام میں کہا کہ امریکی اور برطانوی جاسوسی ایک عالمی خطرہ ہے اور یہ ویلی دنیا کے نقشے سے بھی گھناؤنی ہے۔ سنوڈن نے یہ بھی کہا کہ وہ جیت چکا ہے۔ گویا یہ امریکا اور برطانوی جاسوسی نظام پر ایک زوردار طمانچہ تھا جس کو وہ کسی بھی صورت برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ سنوڈن پر ان اداروں کا عتاب اب ضروری ہو گیا اور دنیا بھر میں اس کی گرفتاری کیلئے کام شروع ہو گیا۔ اسی اثنا میں بولیویا کے صدر "ایو مورالس" روس کے سرکاری دورے کے بعد اپنے ملک جا رہے تھے کہ ان کے جہاز کو زبردستی "ویانا آسٹریا" میں اتار لیا گیا کہ انہیں یہ شک تھا کہ اس جہاز میں سنوڈن بھی سفر کر رہا ہے لیکن سخت ترین تلاشی کے بعد صدر کو اپنا سفر جاری رکھنے کی اجازت ملی۔ گویا اس عمل سے آپ دونوں ممالک کی پریشانی کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انہوں نے سنوڈن کو اغوا کرنے کیلئے تمام عالمی سفارتی ضابطوں کو بھی بالائے طاق رکھ دیا۔

سنوڈن کے زیر استعمال آن لائن برقی خدمت کے مالک نے سرکاری خفیہ حکمنامہ ملنے کے بعد فوری طور پر سنوڈن کے زیر استعمال یہ سہولت بند کر دی لیکن اس کے باوجود اس ادارے کو کئی طریقوں سے حراساں کیا گیا۔ اسی طرح برطانوی سرکار نے گلن گرین والڈ کے ہم جنس شریک کو روک کر برطانوی دہشتگردی کے قانون کی آڑ میں ہراساں کیا۔ امریکی غصے اور احتجاج کا یہ معاملہ اس وقت مزید عروج پر پہنچ گیا جب اس وقت کے صدر اوباما نے روسی دورے کے درمیان صدر پیوٹن سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ دنیا بھر میں آزادی رائے کا احترام کرنے والوں کا نعرہ لگانے والوں کے حساس ادارے کے ارکان نے گارجین اخبار کے دفتر میں زبردستی گھس کر وہ تمام کمپیوٹرز تباہ کر دیئے جس پر سنوڈن کا دیا ہوا مواد محفوظ تھا۔

امریکی حکام نے فوری طور پر ایکشن لیتے ہوئے سنوڈن پر جاسوسی کا الزام عائد کرتے ہوئے اس کا پاسپورٹ منسوخ کر دیا تاہم اس اثنا میں سنوڈن ہانگ کانگ سے ماسکو فرار ہو گیا جہاں اس نے کئی ممالک میں سیاسی پناہ کی درخواستیں داغ دیں۔ امریکا نے تمام ممالک کو ڈرا دھمکا کر سنوڈن کے تمام فضائی راستے بند کروا دیئے اور اس کی سختی سے نگرانی بھی شروع کر دی۔ سنوڈن نے روس میں عارضی سیاسی پناہ کی درخواست دائر کر دی جس پر امریکا نے روس کو بذریعہ خط یہ یقین دلایا کہ سنوڈن کو وطن واپسی پر نہ ہی کسی قسم کی کوئی اذیت دی جائے گی اور نہ ہی سزائے موت، اس لئے اسے روس اسے سیاسی پناہ نہ دے تاہم روسی صدر پیوٹن نے امریکا کی یہ استدعا ٹھکراتے ہوئے صاف انکار کر دیا کہ روس کبھی کسی ایسے فرد کو کسی اور ملک کے حوالے نہیں کرتا جس نے روس سے سیاسی پناہ کی درخواست کی ہو۔ بالآخر صدر پیوٹن کی منظوری کے بعد سنوڈن کو جولائی 2013 کو ایک سال کی عارضی سیاسی پناہ دے دی گئی جس کے بعد سنوڈن ماسکو ہوائی اڈے سے نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

ایڈورڈ سنڈون نے اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دنیا کو کو امریکی پالیسیوں سے آگاہ کیا کہ امریکا اپنی سلامتی کو ممکن بنانے کیلئے ہر قسم کی قانونی اور

اخلاقی خلاف ورزیاں کر رہا ہے۔ ایڈورڈ سنڈون کے امریکا خفیہ ایجنسیوں سے متعلق راز افشا کرنے کے بعد جرمنی میں امریکی خفیہ ایجنسیوں کی پالیسیوں کو بہت تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور جرمنی نے امریکا سے سرد جنگ میں کئے جانے والا جاسوسی کا معاہدہ ختم کر دیا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خود مغربی ممالک میں امریکی انٹیلی جنس کاروائیوں کو تنقید اور مخالفت کا شدید سامنا ہے۔ انہیں دنوں جرمن میگزین نے اس بات کا بھی انکشاف کیا تھا کہ امریکی خفیہ ایجنسی این ایس اے نے اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر اور 80 ممالک کے سفارت خانوں کی خفیہ جاسوسی کی ہے۔ میگزین کے مطابق امریکی ایجنسی این ایس اے اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر میں ویڈیو کانفرنسنگ سسٹم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

تجزیہ نگاروں نے اس انکشاف پر اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگر امریکا پر اقوام متحدہ کی جاسوسی کے الزامات ثابت ہو گئے تو یہ امریکا اور اقوام متحدہ کے درمیان اس معاہدے کی خلاف ورزی ہو گی جس کے مطابق امریکا اقوام متحدہ کی جاسوسی کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا اور جاسوسی ثابت ہونے پر امریکی خفیہ کاروائیاں غیر قانونی شمار کی جائیں گی۔ میگزین کے مطابق این ایس اے نے اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر کے ساتھ ساتھ امریکا میں قائم یورپی یونین کے سفارتخانے کی بھی جاسوسی کا کام بھی سرانجام دیتا رہا۔ رپورٹ کے مطابق امریکا پوری دنیا کے مواصلاتی نظام کی جاسوسی کرتا ہے جس میں لوگوں کے آن لائن ڈیٹا اور ٹیلی فون کالز کی نگرانی کی جاتی ہے۔ ابھی یہ رپورٹ بھی گردش کر رہی تھی کہ امریکا میں عام کی جانے والی ایک عدالتی دستاویز سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ امریکی قومی سلامتی کی ایجنسی این ایس اے نے غیر قانونی طور پر سالانہ امریکیوں کی 56 ہزار کے قریب ذاتی ای میلز جمع کی تھیں جو صارفین کی پرائیویسی کے حقوق کی سراسر خلاف ورزی تھی۔

10 / اگست 2013 میں جاری ہونے والی جرمن جریدے کی رپورٹ کے مطابق امریکی قومی سلامتی سے متعلق خفیہ ایجنسی این ایس اے نے بیرونِ ممالک اپنے جاسوسی پروگرام میں یورپی ممالک کو سرِ فہرست رکھا ہوا ہے جبکہ چین، روس، ایران پاکستان اور شمالی کوریا کی نگرانی سب سے اہم ہدف قرار دیا ہے۔ امریکی اہداف میں فرانس، جرمنی اور جاپان کی نگرانی کو درمیانے درجے میں رکھا گیا تھا۔ 2 ستمبر 2013 کو عالمی ذرائع ابلاغ کی رپورٹ کے مطابق امریکی خفیہ ایجنسی این ایس اے نے برازیل اور میکسیکو کے صدور کی بھی خفیہ نگرانی کی تھی اور ان کے آن لائن ڈیٹا تک رسائی حاصل کی تھی۔ مذکورہ معلومات عام ہونے کے بعد برازیل کی حکومت کی جانب سے امریکا کے اس عمل کی شدید مذمت کی گئی۔ اس تمام صورتحال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امریکی حکومت وانتظامیہ اپنے مفادات کو تحفظ دینے کیلئے نہ تو اپنے شہریوں کے حقوق کا خیال رکھتی ہے اور نہ ہی دنیا کے کسی قوانین کی پرواہ کی جاتی ہے۔ امریکا اپنی من گھڑت اطلاعات کی بنیاد پر افغانستان، عراق اور دنیا کے تین درجن سے زائد ممالک کو وحشیانہ ظلم وستم کی جنگی کاروائیوں کا نشانہ بنا چکا ہے اور اب دنیا کی دوسری اقوام کی ذاتی زندگی کو بھی اجیرن بنا رہا ہے جس کے نتیجے میں امریکی پالیسیاں دنیا کی سلامتی پر ایک سوالیہ نشان بن چکی ہیں۔ اس لئے امریکی حکومت کی طرف سے ایرانی صدر کے سرکاری دورے سے دو دن قبل پاکستانی وزارتِ خارجہ میں امریکی مقاصد کی تکمیل کیلئے ملاقاتیں اور سازشیں شروع ہو چکی ہیں اور عین ان دنوں میں جب اسرائیل کی وحشیانہ کاروائیوں کی پشت پناہی کرتے ہوئے ان تمام ممالک کو خوفزدہ کر کے اپنے مقاصد کی تکمیل کے ایجنڈے پر کام شروع ہو چکا ہے جس کیلئے نہ صرف پاکستان کو تنہا کرنے کیلئے ٹرائیکا (امریکا، اسرائیل اور انڈیا) سر توڑ کوششوں میں مصروف ہے بلکہ پابندیوں کا عمل بھی شروع کیا جا چکا ہے۔ ان کو علم ہے کہ پاکستان دنیا کی واحد ایٹمی قوت ہے جس کی نیوکلیئر صلاحیت کو معاشی پابندیوں کے ساتھ اس قدر بے بس کر دیا جائے کہ جس کے بعد منحوس "ون ورلڈ آرڈر" کے منصوبے کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

ویسے بھی امریکی حکومت کی طرف سے یہ پابندی کا عمل کوئی پہلا واقعہ یا ایسا کوئی نیا بھی نہیں، پاکستان نے 1970 میں جونہی اپنے ایٹمی پروگرام کو شروع کرنے کا اعلان کیا، تب سے ہی یہ مذموم سلسلہ جاری ہے بلکہ خود اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو ہنری کسینجر نے اپنے دورہ لاہور پاکستان میں عبرت کا نشان بنانے کی دھمکی بھی دی تھی۔ ایسی کڑی پابندیاں اکتوبر 2003 میں بھی ہم بھگت چکے ہیں جب امریکا نے پاکستان کو بیلیسٹک میزائل پروگرام کے پرزہ جات اور سامان فراہم کرنے والی 3 چینی کمپنیوں سمیت دنیا بھر کی بے شمار کمپنیوں پر اسی الزام میں پابندیاں عائد کی تھیں لیکن اس تمام غنڈہ گردی کے باوجود آج پاکستان ایک ایسی ایٹمی قوت ہے جس کے خوف میں ٹرائیکا اپنے تمام اتحادیوں سمیت ان سازشوں میں مصروف ہے۔

یاد رکھیں! رب ذوالجلال نے انسانی جسم میں ایک ایسا چھوٹا لوتھڑا "دل" کی شکل میں نصب کر رکھا ہے کہ جہاں صرف ایک خوف سما سکتا ہے۔ اللہ اور دنیاوی طاغوتی قوتوں کے خوف یکجا نہیں رہ سکتے، اگر دنیا کا خوف دل میں بیٹھ گیا تو اللہ کا خوف چپکے سے نکل جائے گا کیونکہ میرے رب کا خوف بڑا باغیرت ہے اور دنیا آپ کو خوب رسوا بھی کرے گی اور تذلیل میں کوئی کسر نہیں چھوڑے گی لیکن اگر دل میں اللہ کا خوف براجمان کر لیا جائے تو ساری دنیا آپ سے خوفزدہ رہے گی اور کوئی آپ کو خوفزدہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اپنے اکابرین کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ مٹھی بھر مسلمانوں نے اللہ کے خوف کو اپنے دلوں کی جب زینت بنایا تو پانی پر بھی گھوڑے دوڑانے میں بھی کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی اور آج خود مستشرقین یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی تاریخ میں حضرت عمر کو مزید موقع مل جاتا یا اس کے بعد ایک اور عمر حکمران ہوتا تو ساری دنیا پر اسلام کا غلبہ ہوتا۔ سونا بھی آگ میں تپ کر کندن بنتا ہے۔ ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کی ٹانگیں ابھی کانپ رہی ہیں تو سوچ لیں کہ کل کا مؤرخ آئندہ نسل کو آپ کے بارے میں سب حقیقت تو ضرور بتادے گا۔ دنیا و آخرت کی نفرین اور شرمندگی سے بچنے اور پناہ مانگتے ہوئے سوچ سمجھ کر فیصلوں کی ضرورت ہے۔

تجھے کیا ناصحا احباب خود سمجھائے جاتے ہیں
ادھر تو کھائے جاتا ہے، ادھر وہ کھائے جاتے ہیں
چمن والوں سے جا کر اے نسیم صبح کہہ دینا
اسیر ان قفس کے آج پر کٹوائے جاتے ہیں

بروز بدھ 15 شوال المکرم 1445ھ 24/ اپریل 2024ء

مودی کا جنگی جنون اور تعصب

بھارت جب سے چین سے بری طرح شکست کھا کر ذلیل ور سوا ہوا ہے تو اس دن سے ایسے جنگی جنون میں مبتلا ہو چکا ہے کہ ہر سال اپنے بجٹ میں اپنے غریب عوام کی بھوک و افلاس کو ختم کرنے اور فلاح کے بارے میں کوئی اقدامات کرنے کی بجائے ملک میں اسلحے کے انبار لگانے میں بری طرح غرق ہے اور اب ایک مرتبہ پھر خطے کے تمام پڑوسی ممالک کو اپنے زیر دست لانے کے مصنوعی اور جھوٹے خواب دیکھنے کی بیماری میں مبتلا ہو چکا ہے لیکن ہر بار منہ کی کھا کر اس کی اسلحہ جمع کرنے کی ہوس بڑھتی جا رہی ہے۔ متعصب ہندو مودی سرکار کی یہ ہوس کوئی نئی نہیں بلکہ برسوں سے یہ اپنی قوم کو خطے میں اکھنڈ بھارت کی توسیع کا خواب دکھا کر اپنے اقتدار میں رہنے کا جواز ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ صرف 6 برس قبل سابقہ بھارتی وزیر خزانہ ارون جیٹلی نے یکم فروری کو 19/2018ء کا جو بجٹ پیش کیا تھا اس میں دفاع کیلئے 29 کھرب 55/ارب 11 کروڑ روپے مختص کیے تھے۔ یوں ایک ہی نشست میں دفاعی بجٹ میں 81.7 فیصد کا اضافہ کر دیا گیا جبکہ گزشتہ بجٹ میں 27 کھرب 41/ارب 14 کروڑ روپے رکھے گئے تھے، یوں سالانہ اضافہ دو کھرب 13/ارب روپے کا بوجھ لاد دیا گیا۔ ارون جیٹلی نے 8 کروڑ غریب لوگوں کو مفت کنکشن دینے کا اعلان بھی کیا تھا، پہلے بھی اس سکیم کا اعلان کیا گیا تھا لیکن جن نمائشی خاندانوں کو مفت گیس سلنڈر دیئے گئے تھے، ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی جبکہ ان غریب خاندانوں کے پاس بھی سلنڈر دوبارہ گیس بھروانے کے پیسے نہیں تھے گویا یہ ڈرامہ ایک انتخابی دھوکہ ثابت ہوا۔

اسی طرح 2016ء میں بھی بی جے پی حکومت نے مفت انشورنس کا اعلان کیا تھا لیکن اس پر آج تک عملدرآمد نہیں ہو سکا۔ ملک کی موجودہ وزیر خزانہ نرملا سیتارمن نے بھی اپنے پیشروؤں کے طرزِ عمل کو جاری رکھا ہوا ہے اور سابق بجٹ کی طرح اب تک کسی بجٹ میں غریبوں، کسانوں اور دیہی معیشت پر آج تک کوئی توجہ نہیں دی گئی بلکہ دولت مند طبقوں اور بڑی کمپنیوں کو سہولتیں اور رعائتیں دی گئیں جو اب تک جاری ہیں جس کی وجہ انتخابات میں اس مالدار طبقے کی حمائت اور مالی اعانت کیلئے ہے جبکہ دوسری طرف اس غریب ملک جہاں کروڑوں افراد ایک وقت کی روٹی اور سر چھپانے کی چھت سے محروم ہیں، وہاں اپنے جنگی جنون کی تکمیل کیلئے اپنے دفاعی بجٹ میں 54028، 621 کروڑ مختص کر دیئے گئے جو گزشتہ برس سے 4/71 فیصد زیادہ ہے۔

تنخواہ دار، ملازمت پیشہ، متوسط طبقہ کو نہ صرف نظر کر دیا گیا بلکہ ان پر ٹیکس کا بوجھ بڑھا دیا گیا ہے، یہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کی دعویدار بی جے پی حکومت کا بجٹ ہے جہاں کروڑوں مفلس اور بے گھر لوگ بڑے شہروں کے فٹ پاتھوں پر سوتے ہیں جبکہ ان کے جنگی جنون کے نتیجے میں لاکھوں کی تعداد میں بھارتی فوج مقبوضہ کشمیر میں، آسام، ناگالینڈ وغیرہ میں مقامی حریت پسندوں کو کچلنے میں مصروف رہتی ہیں، اس سے دفاعی بجٹ میں ہر سال اضافہ کیا جاتا ہے۔

بھارت نے اپنے ہاں بڑے پیمانے پر ڈیفنس انڈسٹری قائم کر رکھی ہے تو دوسری طرف امریکا، اسرائیل، روس اور مغربی ممالک سے بھی جدید ترین اسلحہ اور دفاعی ٹیکنالوجی درآمد کر رہا ہے۔ جنوبی ایشیا کے ہمسایہ ممالک خصوصاً پاکستان پر اپنی فضائی حملے کرنے کی صلاحیت بڑھانے کیلئے روس سے سخوئی ایس 30، اور ایم کے 1 طیارے، فرانس سے میراج 200، برطانیہ سے جیگوار طیارے "ٹی یو 22/این سیک" فائٹر بمباروں کے علاوہ فرانسیسی رائل طیارے خرید رہا ہے۔ پچھلی دہائی میں بھی بھارت امریکا سے ایف سولہ بمبار، گائیڈڈ بمبار، برطانیہ سے جیگوار طیارے، فرانس سے 36 رافیل طیارے، چھ اسکارپین آبدوزیں، فضا سے فضا میں مار کرنے والے میزائل اور 126 کثیر المقاصد میڈیم لڑاکا طیارے خرید چکا ہے، 2006ء میں بھارتی دفاعی ادارے "ڈی آر ڈی

او"نے ایک روسی ادارے سے مل کر براہموس کروز میزائل تیار کیا تھا جو آواز سے تیز رفتار سپر سانک میزائل ہے جس میں روسی پروپلشن ٹیکنالوجی استعمال ہوئی ہے۔ اسرائیل نے بھی بھارت کو الیکٹرانک وار نیٹر ٹیکنالوجی اور پریسیشن گائیڈڈ اسلحہ فراہم کیا ہے اور اب بھی درپردہ یہ سلسلہ جاری ہے۔

دوماہ قبل رائٹر میں 23 فروری 2024ء میں ایک ہندو دفاعی تجزیہ نگار "کرشن کوشک "کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں اس نے اسرائیلی ذریعے سے یہ انکشاف کیا کہ اسرائیل کی بھارت کو فوجی برآمدات، جو اس کا سب کا سب سے بڑا دفاعی خریدار ہے، غزہ کی جنگ سے بھی متاثر نہیں ہوا۔ بھارت نے گزشتہ دہائی کے دوران اسرائیل سے 2.9 بلین ڈالر مالیت کا ملٹری ہارڈ ویئر درآمد کیا ہے، جس میں ریڈار، نگرانی اور جنگی ڈرون اور میزائل شامل ہیں۔ علاوہ ازیں جب سے غزہ میں خونی کھیل شروع ہوا ہے، ایک ہزار سے زائد انڈین ہندو اس خونخوار جنگ میں غزہ کے معصوم اور بے گناہ مسلمانوں کے قتل و غارت میں شریک ہیں۔ سٹاک ہوم انٹرنیشنل پیس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے مطابق، بھارت دنیا کا سب سے بڑا ہتھیار درآمد کرنے والا ملک ہے، جس نے 2012 سے 2022 کے درمیان 37 بلین ڈالر کی خریداری کی۔ امریکا، روس اور چین کے بعد بھارت دنیا کا چوتھا بڑا اسلحہ کا خریدار ہے جس کے دفاعی اخراجات 81.4 بلین ڈالر تک پہنچ گئے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ہندوستان نے اپنی مسلح فوج کی جنگی صلاحیتوں کو بڑھانے کیلئے 39,125 کروڑ روپے کے پانچ بڑے دفاعی حصول کیلئے آرڈر دے دیا ہے جس میں براہموس سپر سونک کروز میزائل، راڈار، ہتھیاروں کے نظام اور مگ 29 طیاروں کیلئے ایروانجن شامل ہیں۔

حالیہ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق 6 مارچ 2024ء کی رپورٹ کے مطابق مالیاتی سال 2024-25 میں ہندوستان کا دفاعی بجٹ 6,21,540.85 کروڑ روپے تک پہنچ گیا ہے۔ مالی سال 24-25 کیلئے دفاع کیلئے مختص کردہ بجٹ مالی سال 2022-23 کیلئے مختص کردہ رقم سے تقریباً ایک لاکھ کروڑ (18.35٪) زیادہ اور مالی سال 23-24 کیلئے مختص کیے گئے بجٹ سے 4.72٪ زیادہ ہے۔ بھارت اپنے دفاعی صنعتی اڈے کو مضبوط کرنے کی مسلسل کوششوں کے باوجود دنیا کے سب سے بڑے ہتھیار درآمد کرنے والے ملک کا اعزاز برقرار رکھے ہوئے ہے۔ 2019 اور 2023 کے درمیان، ملک نے اسلحے کی کل عالمی درآمدات کا نمایاں 9.8 فیصد حصہ لیا، جو اس کی دفاعی خریداری میں اسٹریٹجک کمزوری کی عکاسی کرتا ہے۔

روس بھارت کو ہتھیاروں کا سب سے بڑا فراہم کنندہ بنا ہوا ہے، جو اس کے ہتھیاروں کی 36 فیصد درآمدات کرتا ہے۔ تاہم اب پچھلے چند برسوں سے روس کا مجموعی حصہ مسلسل کم ہو رہا ہے جبکہ بھارت تیزی سے فوجی ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر کے ساتھ ساتھ مقامی سپلائرز کیلئے مغربی ممالک کی طرف اپنا رخ کر چکا ہے جبکہ یکم اپریل 2024ء کی ایک رپورٹ کے مطابق متحدہ عرب امارات (یو اے ای)، مصر، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ سمیت تقریباً دس ممالک نے ہندوستان سے ہلکا گولہ بارود خریدا ہے اور امریکا، برطانیہ اور فرانس بھارت سے دفاعی الیکٹرانکس کی خریداری کرتے ہیں۔ ماریشس، سیشلز اور مالدیپ نے تیز رفتار انٹرسیپٹر کشتیاں خریدی ہیں۔

بھارت اسرائیل اسلحے کی تجارت سالانہ 3 ارب ڈالر ہے۔ 2007ء میں بھارت نے امریکا کو ایمنی بیئس ٹرنس ڈاک شپ کیلئے پانچ کروڑ ڈالر ادا کیے جو گودی کا کام دیتا ہے۔ بھارت اپنی بحری جنگی صلاحیت میں بھی کئی گنا اضافہ کر چکا ہے۔ ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں پاکستان کی غازی آبدوز نے بھارتی طیارہ بردار جہاز وکرم کو بمبئی کی بندرگاہ سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ اس وقت بھارت کے پاس کوئی آبدوز نہیں تھی لیکن اب بھارتی بحریہ چار ایٹمی آبدوزوں، 16 ڈیزل الیکٹرانک آبدوزوں کے علاوہ چار مزید آبدوزوں کو اس بیڑے میں شامل کرنے کیلئے شب و روز کام کر رہی ہے۔ اس نے روسی ایٹمی آبدوز سے لیس ایک بحری اسٹرائیک فورس بھی تیار کر لی ہے۔ پاکستان نے بھی اس کے جواب میں اپنی بحریہ کو ایٹمی اسلحے سے لیس کر دیا ہے اور نہ صرف

جدید ترین حربہ میزائل بھی دے دیئے ہیں جو بھارت کے بعید ترین جزائر انڈیان تک مار کر سکتے ہیں بلکہ بھارتی سرزمین کے ہر ایک انچ کو نشانے پر لے رکھا ہے۔

امریکا اور اسرائیل کی جانب سے بھارت کو جدید ترین ڈرون ٹیکنالوجی بھی فراہم کی جارہی ہے اور نیول ڈرون طیارے فراہم کرنے کا معاہدہ بھی کیا جاچکا ہے۔ بھارتی جزائر سرحد پار سرجیکل اسٹرائیک کے دعوے یا کولڈ اسٹرائیک ڈاکٹرائن کا ذکر کرتے رہتے ہیں لیکن پاکستان کی دفاعی تیاریاں خصوصاً نصر اور ابدالی میزائلوں نے بھارتیوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ بھارتی روّیہ اور جنگوں کے باعث پاکستان نے بھی اپنی قومی سلامتی کے تحفظ کیلئے ایٹمی اثاثوں کی جدت میں بعض ناقابل یقین کامیابیاں حاصل کرلی ہیں۔ پاکستان کی ایٹمی ہتھیاروں کی نوعیت اور افادیت بھی اسی نوعیت کی ہے جس نوعیت کے جدید ایٹمی ہتھیار امریکا اور روس کے درمیان ایٹمی دوڑ کا موضوع ہیں۔ بھارت کو پاکستان کے ان جدید اور پاور فل ایٹمی ہتھیاروں کے ہاتھوں بڑی پریشانی کا سامنا ہے اور بھارت کے ایماء پر ہی واشنگٹن پاکستان کے ان چھوٹے ایٹمی ہتھیاروں کے حوالے سے پاکستان پر دباؤ ڈالتا رہتا ہے۔ موجودہ حالات میں پاکستان خطے میں روس اور چین کے ابھرتے ہوئے نئے پاور بلاک میں برابر کا تیسرا فریق ہے اور ایٹمی طاقت کے حوالے سے بھی پاکستان بھارت کو بہت پیچھے چھوڑ چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فاکس نیوز جو کہ بالعموم عالم اسلام اور بالخصوص پاکستان کے خلاف زہر اگلنے میں پیش پیش رہتا ہے اور اکثر عالمی دفاعی تجزیہ نگاروں کے بحث مباحثے کے ذریعے نفسیاتی برتری سے ڈرانے اور دہمکانے کا کام لیتا رہتا ہے۔

ہمارے ہاں جو دن رات پاکستان کے دفاعی بجٹ پر طعنہ زنی کرتے رہتے ہوئے بھارتی دشمن کی مثالیں دیکر خوفزدہ کرنے کی ناکام کوششوں میں مبتلا ہیں، وہ 18 جنوری 2024ء کی اس مصدقہ رپورٹ پر بھی غور کرلیں کہ 2023-24ء کے بجٹ میں بھارت نے اپنے بجٹ کا 13 فیصد دفاع کیلئے 6 ٹریلین روپے (تقریباً 74 بلین ڈالر) مختص کیا جبکہ پاکستان کا دفاعی بجٹ 6 بلین ڈالر ہے۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ پاکستان کی فوج کے مقابلے میں بھارت کے پاس 8 لاک فوجی بھی زیادہ ہیں لیکن اس کے باوجود اس کو ہر مرتبہ پاکستان سے چھیڑ خانی نہ صرف مہنگی پڑی بلکہ دنیا کے سامنے شرمندگی بھی اٹھانی پڑی۔

13 مارچ کی رپورٹ کے مطابق انڈیپنڈنٹ کمیشن فار ایڈ امپیکٹ کے 31 مارچ کو جاری ہونے والے جائزے میں کہا گیا ہے کہ حکومت نے 2016 اور 2021 کے درمیان ہندوستان کو برطانوی انٹرنیشنل انویسٹمنٹ کی طرف سے چھوٹی کمپنیوں کو عالمی قرض کے پورٹ فولیو سے £2.3 بلین اسٹرلنگ پاؤنڈ امداد کے نام پر دیئے جس میں 28 فیصد "بی 11" قرضون کی فراہمی بھی شامل ہے۔ یعنی ایک طرف قرضوں کی بھرمار کا بوجھ ملک پر لاد دیا گیا ہے اور دوسری طرف جنگی جنون کا یہ عالم ہے کہ اسلحے کے ڈھیر اکٹھے کرنے کے باوجود مودی گیدڑ شیر کی کھال پہن کر پڑوسیوں کو مرعوب کرنے کی کوششیں کر رہا ہے۔

ایک پروگرام میں اس کے انتہائی زیرک اور تجربہ کار دفاعی تجزیہ نگار یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس نے دنیا کے تمام ممالک کے دفاعی اور ملٹری ایکسپرٹس کو باقاعدہ بلا کر ان کے سامنے اپنے حساس ہتھیاروں کے نہ صرف کامیاب تجربات بلکہ ان کی سو فیصد ٹھیک نشانے کا مظاہرہ

کر کے ساری دنیا کو ورطہ حیرت میں مبتلا کر دیا ہے اور اس میدان میں پاکستان کی برتری کا دوسرا کمال یہ ہے کہ اس جدید ترین ٹیکنالوجی مہارت میں وہ مکمل خود کفیل بھی ہے اور ان تمام ایٹمی میزائل ٹیکنالوجی کے علاوہ ہر قسم کے ہتھیاروں میں اب کسی ملک کا محتاج نہیں رہا۔ پاکستان نہ صرف ہر قسم کے جدید ہتھیار خود بنانے کی مکمل صلاحیت میں خود کفیل ہو چکا ہے بلکہ اب کئی ممالک پاکستان کو جدید ترین اسلحے کا آرڈر بھی دے چکے ہیں لیکن ہمسایہ ملک بھارت ابھی تک امریکا، اسرائیل، فرانس، برطانیہ اور دیگر ممالک سے اسلحہ خریدنے پر سالانہ اربوں ڈالر خرچ کرنے کے باوجود خوف اور بزدلی کے عالم میں پہلے روس اور اب امریکا کی چھتری کے نیچے بیٹھا خطے کے تمام ممالک پر اپنی برتری کی دھاک بٹھانے کی ناکام کوشش کرتا رہتا ہے لیکن اب خود بھارت کے کئی دانشور بھارت کو اس جنون و خودکشی سے بچنے کیلئے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کی طرف توجہ دلانے میں مصروف ہیں جس میں سب سے توانا آوازارون دھتی کی ہے جبکہ مودی حکومت امریکا کی آشیر باد سے یہ سمجھتا ہے کہ اس نے کشمیر کی خصوصی حیثیت کو ختم اور بھارت کا حصہ ڈکلیئر کر کے یہ مسئلہ حل کر لیا ہے۔ اگر ایسی ہی ہے تو کیا اس نے اپنے کسی اور علاقے میں بھی 8 لاکھ سے زائد فورسز کو متعین کر رکھا ہے؟ اگر نہیں تو یہ یہ صرف اپنی قوم کو دھوکہ دینے کیلئے اس نے سیاسی اقدامات تو کئے ہیں لیکن زمینی حقائق اس سے کہیں زیادہ مختلف ہیں جس کی بناء پر وہ اب بھی جنگی جنون میں مبتلا ہے۔

ادھر دوسری طرف اب انڈیا میں عام انتخابات کا پہلا مرحلہ 19 / اپریل سے شروع ہو چکا ہے اور ابھی تک بھارتی عوام اور ماہرین مودی کی مکارانہ پالیسیوں اور مسلم دشمن متعصب بیانات پر حیران و پریشان ہیں کہ ہر مرتبہ انتخابات کے موقع پر اپنی روایتی مکاری کے ساتھ پاکستان اور اس مرتبہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کے خلاف اپنی انتخابی تقریروں میں واویلا کیا جا رہا ہے تاکہ ہندوؤں کے مسلمانوں کے خلاف جذبات بھڑکا کر دوبارہ انتخابات میں کامیابی حاصل کی جائے۔ اس کی واضح مثال حال ہی میں مودی نے راجستھان کے معرف علاقے پشکر میں ایک ریلی سے خطاب کرتے ہوئے کانگریس کے 2024 انتخابات کے اعلامیے کو مسلم لیگ سے متاثر منشور قرار دیتے ہوئے دہائی دینا شروع کر دی ہے کہ بھارت کو ایک مرتبہ پھر تقسیم کرنے کی سازشیں شروع ہو گئیں ہیں اور کانگرس کے منشور سے ایک مرتبہ پھر مسلم لیگ کے ان نظریات پر بھارت پر تھوپنا چاہتی ہے جس سے بھارت کے کئی ٹکڑے ہونے کی بو آ رہی ہے اور یہ ایک مرتبہ پھر زیادہ بچے پیدا کرنے والی بھارتی اقلیت مسلمانوں کو ہندوؤں پر غالب کرنے کی سازش میں مصروف ہے۔

مودی کے متعصبانہ بیان سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ گجرات میں مسلم کش فسادات میں ایک قصائی کے طور پر ابھرنے والا یہ ہندو مہاسبھائی ابھی تک اپنی اسی پالیسی پر گامزن ہے اور اسی لئے آج ایک مرتبہ اس کے چہرے سے اقلیتوں کے بارے میں اس کا چہرہ بے نقاب ہو گیا ہے۔ کہ وہ اب کانگریس کے منشور کو مسلم لیگ کی چھاپ والا منشور اس لئے کہہ رہا ہے کہ اس نے پاکستان کے وجود کو ابھی تک دل سے تسلیم نہیں کیا جبکہ اس کے برعکس تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ ان کی پارٹی کی ماں ہندو مہاسبھا نے 1940 کی دہائی میں سندھ، بنگال، این ڈبلیو ایف پی میں مسلم لیگ کے ساتھ حکومت سازی کی تھی اور اس سے قبل لکھنؤ میونسپل کارپوریشن کے انتخابات میں میئر شپ کیلئے مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا نے ہاتھ ملائے تھے۔

کیونکہ کانگریس نے پہلی مرتبہ اپنے مینیفیسٹو (منشور یا نیائے پتر) میں واضح انداز میں کھلے عام بہادری کے ساتھ دو تین باتوں کو رکھ دیا ہے جس پر عام طور پر گذشتہ انتخابات میں ہچکچاہٹ نظر آتی تھی۔ کانگرس کے مطابق وہ مساوات، سوشل جسٹس اور اقلیتی حقوق کی حفاظت کریں گے۔ کون نہیں جانتا کہ خود کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا جھوٹا نعرہ بلند کرنے والی مکار مودی سرکار نے مسلمانوں کو اچھوتوں سے بھی بدتر بنا کر رکھ دیا ہے اور یہ ایک حد تک سچ بھی تھا کہ بہار کی راشٹریہ جنتا دل اور اتر پردیش کی سماج وادی جیسی پارٹیاں جو صرف اپنی ذات اور مسلم ووٹ پر منحصر رہی ہیں وہ بھی مسلمانوں

کے مسائل پر مجرمانہ خاموشی اختیار کئے ہوئے تھیں اور ہندوتوا کے ایجنڈے کے سامنے پست ہوگئی تھیں اور کہیں نہ کہیں وہ اس میں شامل ہوگئی تھیں لیکن اب پہلی مرتبہ کانگریس نے اپنے منشور میں دلتوں، قبائلیوں اور اقلیتوں بلکہ سب کیلئے اہم سکیمیں اور ٹھوس پلان دیا ہے جس کو بھارتی وزیر خزانہ نرملاسیتارمن نے بھی کانگریس کے منشور کو بظاہر قابل عمل اور حقیقت پر مبنی قرار دیتے ہوئے اپنی جماعت کو بھی ایسے فلاحی پلان کی طرف متوجہ کرتے ہوئے بالخصوص مسلم اقلیت کے خلاف بیجا پروپیگنڈہ کو انتخابی کمزوری سے تشبیہ دیتے ہوئے اس سے گریز کا مشورہ دیا ہے۔

مودی اس طرح کے بیانات پہلے بھی دے چکا ہے، جب وہ ریاست گجرات کا وزیر اعلیٰ تھا۔ 2002 میں گجرات کے مسلم کش فسادات کے چند مہینوں بعد ہونے والے ریاستی اسمبلی کے انتخاباتی مہم کے دوران اس نے ایک جلسہ کے حاضرین سے پوچھا کہ کیا سرکار کو "ریلیف کیمپ چلانا چاہیے؟ کیا ہمیں بچے پیدا کرنے کے مراکز کھولنے چاہیں"؟ ہم یہاں سختی سے کاندانی منصوبہ بندی کو نافذ کریں گے تاکہ ہم پانچ کے مقابلے میں یہ پچیس تک نہ پہنچ سکیں۔ مسلم اقلیت کو انڈیا میں اکثر اس لئے دقیانوسی سمجھا جاتا ہے کہ وہ زیادہ بچے پیدا کرتے ہیں لیکن خود بھارتی تجزیہ کار اور ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ دعویٰ مسخ شدہ ہے اور مسلمانوں کے خلاف متعصبانہ سلوک کی وجہ بنا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومتی اعداد و شمار کے مطابق مسلمانوں کی آبادی کی شرح میں ہندوؤں سے زیادہ تیزی سے کمی ہو رہی ہے بلکہ 2011 کی مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق مسلمانوں کی شرح نمو انڈیا میں دیگر پسماندہ گروپوں سے ملتی جلتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مودی کے یہ بیہودہ بیانات نہ صرف جھوٹ پر مبنی ہیں بلکہ انتخابات جیتنے کیلئے وہ کسی بھی حد تک مکاری سے کام لیتے ہیں۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم جلد از جلد پاکستان میں سیاسی پختگی کا ثبوت دیتے ہوئے موجودہ سیاسی بحران سے نکلنے کی کوشش کریں۔ ہم اس فرسودہ نظام کو پچھلے 77 سالوں سے آزما کر ہر مرتبہ ناکام و نامراد ہو چکے ہیں۔ کبھی اس ملک کو جمہوریت کے نام پر لوٹا گیا ہے اور کبھی اس کرپشن سے نجات دلانے والوں نے اقتدار کے نشے میں ملکی دولت کو بے رحمی سے لوٹ کر غیر ممالک میں اپنے محلات اور کاروبار کی ایمپائر قائم کر کے ملک کو قرضوں کے بوجھ تلے ڈبو دیا ہے۔ کیا اب وقت نہیں آیا کہ ہم اپنے رب سے جس وعدے کی بنیاد پر یہ ملک حاصل کیا تھا، ایفائے عہد کرتے ہوئے سچے دل کے ساتھ اس کی طرف رجوع کرتے ہوئے وطن عزیز میں قرآن کے نفاذ کا اعلان کریں۔ یقین کریں جس دن ہم نے اپنے رب کے ساتھ کئے وعدوں کی پاسداری کیلئے پہلا قدم اٹھایا، اسی دن نہ صرف ملک سے منحوس سایوں سے نجات ملے گی بلکہ پڑوس میں بھی مسلم آبادی کو ایک مضبوط سہارا میسر آجائے گا۔ اس سلسلے میں میں آپ سے ایک واقعہ شئیر کرنا چاہتا ہوں کہ بھارت میں بسنے والی مسلم اقلیت ہم سے کیا چاہتی ہے۔

جنوری کے آخر میں اللہ کی دی ہوئی توفیق سے حرمین جانے کی سعادت حاصل ہوئی، مسجد نبوی میں نمازِ عصر کیلئے بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ساتھ میں بیٹھا راجستھان انڈیا کا ایک مسلمان بھائی نے مجھے اور میرے ساتھ برادرم جناب جنرل (ر) غلام مصطفیٰ کو پہچانتے ہوئے بڑی درد بھری فریاد سے مخاطب کرتے ہوئے کہا: خدارا! میری ایک التجا ہے جو میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے ملک کے تمام شہریوں کو ضرور پہنچائیں کہ پاکستان تو آپ نے بنا لیا لیکن تمام پاکستانی ہندوستان میں چھوڑ گئے ہیں۔ ہم آپ سے کچھ نہیں مانگتے بس آپ پاکستان کو اتفاق اور محبت سے جس قدر مضبوط کریں گے، اسی قدر بھارت میں ہمارے مصائب ختم ہوں گے کہ اب تو ہماری جان و مال کے ساتھ ساتھ ہماری عزتیں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ اس کا یہ پیغام اب تک میرے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دیتا ہے!

بروز جمعۃ المبارک 17 شوال المکرم 1445ھ 26/ اپریل 2024ء

امید ہی امنگ ہے

جانتا ہوں کہ امید پر قائم ہے یہ دنیا۔ امید ہی تو امنگ ہے جینے کی، امید ہی تو خوشخبری ہے اور امید ہی آمادہ کرتی ہے انسان کو..... شکست دیتی ہے مایوسی کو۔ میرے رب کا حکم ہے کہ مجھ سے امید کا دامن تھامے رکھو۔ میں کروں گا تمہاری مرادوں کو پورا، میں ہی تو کر سکتا ہوں تمہاری آرزوؤں کی تکمیل، میں ہی تو کر سکتا ہوں، تمہیں آسودہ اور مفلسی سے بھی میں ہی نکال سکتا ہوں، میں ہی تمہارے حالات بدل سکتا ہوں، میں ہی تو مخلوق کے دلوں کو تبدیل کر سکتا ہوں، میں ہی تو کارسازِ حقیقی ہوں، میں ہی ہوں دلوں کو پھیرنے والا چراغِ محبت روشن کرنے والا، تمہارے دوستوں کو بڑھاوا دینے والا اور تمہارے دشمنوں کے چہروں کو خاک آلود کرنے والا، انہیں نابود کر دینے والا۔ میں ہی ہوں ہر شے پر قادر، قادرِ مطلق..... سب ہیں میرے محتاج، میں تو کسی کا بھی محتاج نہیں ہوں۔ مجھ سے کون پوچھ سکتا ہے؟ میں جسے عزت دینا چاہوں کون اس کی تذلیل کر سکتا ہے؟ اور میں ہی کسی کو ذلیل کر دوں تو کون ہے جو اس کی تکریم کرے؟ ہاں جو میرے لیے ذلت برداشت کرے تب اُس کا مقام بلند ہے، جو میرے لیے ٹھکرا دیا جائے۔ اس کا کیا کہنا، جو میرے لیے محروم کر دیا جائے، اس کی شان مت پوچھو۔

رب امید ہے اور شیطان ناامیدی۔ تم جانتے ہو شیطان کا نام ابلیس ہے۔ ابلیس مایوس کر دینے والا، مایوسی کو پھیلانے والا، تنہا کر دینے والا، خوف دلانے والا، وسوسے پیدا کرنے والا، ہر طرح کا خوف..... رزق کا خوف، موت کا خوف، بھوک و پیاس کا خوف، جب نام ہی ابلیس ہے تو مایوسی پھیلائے گا ناں، مگر بندگانِ رب کبھی مایوس نہیں ہوتے، کسی بھی حزن میں خوف کا شکار نہیں ہوتے۔ تو بس بندہ رب بن اور شیطان ابلیس کو دھتکار دے، سچے دل اور مجھ پر کامل یقین کے ساتھ لعنت بھیج اس پر۔

مجھے اس غریب پر بڑا دکھ اور حیرت ہوتی ہے، بہت رحم آتا ہے جو غریب ہو کر بھی رب کی طرف نہ پلٹے، رب کا دامن نہ تھامے۔ امیر کا تو سمجھ میں آتا ہے کہ وہ دولت کے نشے میں مدہوش ہو کر بھول جائے رب کو، غریب کیوں نہیں رب سے مانگتا، کیوں نہیں اپنے رب کا در پکڑتا، کیوں آہ وزاری نہیں کرتا؟ مجھے حیرت ہے ایسے غریب پر، ہاں مجھے یاد ہیں ان کی باتیں، آبِ زر سے لکھی ہوئی باتیں، میرے اردگرد بھی حالات بہت بگڑ گئے ہیں۔ زمین نے اناج اگانا چھوڑ دیا ہے، آسمان نور برسانے سے انکاری ہو گیا، میرے دریا پانی کو ترس گئے، خاک بسر روٹی ڈھونڈ رہے ہیں..... رشتے ناتے ٹوٹ گئے، دلوں کی دنیا اجڑ گئی، موت کا ہرکارہ ہر طرف گھوم رہا ہے۔ بم دھماکے ہو رہے ہیں، نوجوان مایوس ہیں، میری بچیاں گھروں میں بیٹھی ہوئی بوڑھی ہو رہی ہیں، نام و نمود عام ہے، میری آنکھوں کا پانی مر گیا ہے، گھر میں رہتے ہوئے بھی اجنبی ہو گئے سب..... کسی سے مسئلہ پوچھو تو وہ "یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے" کہہ کر بیٹھ جاتا ہے اور وہ بتاتا اس لیے نہیں کہ اعتبار ہی نہیں رہا۔ بندہ اعتبار کرے بھی تو کس پر؟ اندر کچھ باہر کچھ۔ کتنے بڑے عذاب میں آ گئے ہم، کتنے دکھی ہو گئے، تنہا ہو گئے، بے یار و مددگار ہو گئے، بے دست و پا ہو گئے..... ہمارے شہر اجڑ گئے، بستیاں ویران ہو گئیں..... اداسی اور تنہائی اوڑھے ہوئے ہیں ہم، اتنے بڑے ہجوم میں ہر ایک تنہا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں دبکے ہوئے، لاکھ آوازیں دو، چیخ و پکار کر کے بلاؤ تو بھی جواب ندار.....
... لیکن جونہی وائی فائی کنکشن ختم کیا تو سب ہی پریشان حالت میں دوڑتے ہوئے اس کا سبب پوچھنے کیلئے موجود ہوتے ہیں اور ان کے بدلے ہوئے چہروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسی دنیا کے باسی بن گئے ہیں جہاں ماں باپ کے ساتھ گفتگو کرنا بھی ان کیلئے محال ہے۔

میرے بابا نے بتایا تھا: یہ سب کچھ رحمت ہے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ ہم اپنی اصل کی طرف لوٹ جائیں۔ اپنے مالکِ حقیقی کو پہچان لیں، اسے منائیں، آہ

وزاری کریں.....ہم سے بہت بڑا ظلم ہو گیا، ہم گمراہ ہو گئے تھے، ہم سے گناہ عظیم ہو گیا تو ہمیں معاف کر دے، ہمارے گناہوں کو نہ دیکھ اپنی رحمت کو دیکھ، اپنے پیارے حبیب ﷺ کے صدقے اپنی رحمت کے طفیل ہمیں معاف کر دے، ہم سے در گزر فرمادے، ہم بے سہارا ہیں، بس تو ہی تو ہے ہمارا سہارا، اور دیکھ تو ہمیں معاف نہیں کرے گا تو ہم ظالموں میں سے ہو جائیں گے ہم پر رحم کر دے۔ یاد رکھیں:

رحمت یہ چاہتی ہے کہ اپنی زباں سے
کہہ دے گناہ گار کہ تقصیر ہو گئی

ہاں ہمیں وعدہ کرنا چاہئے تھا کہ آئندہ نہیں ہو گا، اس طرح، ہم نہیں چھوڑیں گے تیرا دامن، ہم در در کے بھکاری بن گئے، اپنے غیبی خزانے ہم پر کھول دے، ہمیں رسوا نہ کر، ہاں ہم آئندہ تیرا در نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن کتنے دکھ کی بات ہے، کتنی محرومی ہے کہ ہم اس مصیبت میں بھی اسے بھول گئے ہیں۔ ہم کیا کر رہے ہیں، در در کی بھیک مانگ رہے ہیں..... ہماری مدد کر دو آئی ایم ایف والو، امریکا والو! ہمارا پانی چھوڑ دو مہربانی ہو گی، ہمارے مزدوروں کو روزگار دے دو، گندم دے دو، روٹی دے دو، ہم پر بمباری نہ کرو! دہشتگردوں کی اعانت بند کر دو۔ تمہیں یاد ہے کہ ہم نے تو اپنی عزت تمہارے ہاں گروہ رکھ کر اپنے ہوائی اڈے تمہارے حوالے کر دیئے تھے جہاں سے تم نے خود اپنی رپورٹ میں عالمی میڈیا کو بڑے تفاخر سے بتایا کہ ہم نے پاکستانی ہوائی اڈوں سے دو ہفتوں میں 57 ہزار فضائی حملے کر کے ایک عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے، اس رسوائی کے بعد ہم نے یہ پیغام بھی بھیجا کہ ہم خود اپنے لوگوں کو ماریں گے ان کو زندہ گرفتار کر کے تمہارے حوالے کریں گے، بس ہمیں ڈالر دے دو..... یہی کیا ناں تم نے بلکہ بے شرمی سے اپنی کتاب میں اس بے غیرتی کا ذکر کیا کہ کس کے بدلے میں کتنے ملین ڈالر موصول کئے۔ کیا اس سے انکار کی کوئی گنجائش بچی ہے؟ قوم کی بچی عافیہ صدیقی کی آہوں سے کیسے بچ پاؤ گے؟ آخر اس طرف تمہاری توجہ کیوں نہیں جاتی کہ ان تقصیروں کی گڑگڑا کر معافی مانگنے کی ضرورت ہے، قبولیت اگر ہو گئی تو تب ہماری عزت بحال ہو گی۔

الاعلیٰ مودودیؒ کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے کہا: مولانا! تاریخِ انسانی پاکستان کے ایک بہت بڑے صحافی اور شاعر آغا شورشؔ کشمیریؒ نے سید ابو میں ہمیشہ باطل کی فتح ہوئی ہے"۔ مولانا نے اس خط کے جواب میں جو لکھا وہ پڑھنے اور سننے کے لائق ہے:

"حق کے متعلق یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ وہ بجائے خود حق، ہے، وہ ایسی مستقل اقدار کا نام ہے جو سراسر صحیح اور صادق ہے۔ اگر تمام دنیا اس سے منحرف ہو جائے تب بھی وہ حق ہی ہے کیونکہ اس کا حق ہونا اس شرط سے مشروط نہیں ہے کہ دنیا اس کو مان لے، دنیا کا ماننا نہ ماننا سرے سے حق و باطل کے فیصلے کا معیار ہی نہیں ہے۔ دنیا حق کو نہیں مانتی تو حق ناکام نہیں ہے بلکہ ناکام وہ دنیا ہے جس نے اسے نہ مانا اور باطل کو قبول کر لیا. ناکام وہ قوم ہوئی جس نے انہیں رد کر دیا اور باطل پرستوں کو اپنا رہنما بنایا۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا میں بات وہی چلتی ہے جسے لوگ بالعموم قبول کر لیں اور وہ بات نہیں چلتی جسے لوگ بالعموم رد کر دیں، لیکن لوگوں کا رد و قبول ہر گز حق و باطل کا معیار نہیں ہے۔ لوگوں کی اکثریت اگر اندھیروں میں بھٹکنا اور ٹھوکریں کھانا چاہتی ہے تو خوشی سے بھٹکے اور ٹھوکریں کھاتی رہے۔ ہمارا کام بہر حال اندھیروں میں چراغ جلانا ہی ہے اور ہم مرتے دم تک یہی کام کرتے رہیں گے۔ ہم

اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں کہ ہم بھٹکنے یا بھٹکانے والوں میں شامل ہو جائیں۔ اللہ کا یہ احسان ہے کہ اس نے ہمیں اندھیروں میں چراغ جلانے کی توفیق بخشی۔ اس احسان کا شکر یہی ہے کہ ہم چراغ ہی جلاتے جلاتے مر جائیں۔

مجھے یاد آیا کہ ایک پروگرام میں مجھ سے سوال کیا گیا کہ آخر آزمائش اور عذاب میں فرق کیسے کریں؟ کیسے پتا چلے کہ یہ آزمائش ہے یا عذاب؟ بہت ہی آسان ہے یہ معلوم کرنا۔ میرے اس فقرے کی وضاحت مانگنا شروع کر دی گئی: جب کوئی مصیبت کوئی آفت کوئی بیماری تنگ دستی تجھے تیرے رب سے قریب کرتی چلی جائے تو خوش ہونا کہ یہ آزمائش ہے، دعا کرنا کہ اے بارالٰہا: ہمیں اس آزمائش میں پورا اتار۔ میرے مالک تیری رضا میں ہماری رضا ہے ۔بس تو خوش رہنا، اور جب کوئی دکھ، تکلیف، مصیبت، تنگ دستی تجھے اپنے رب سے بھی دور کرتی چلی جائے تو سمجھ لینا یہ عذاب ہے، دھتکار ہے، پھٹکار ہے۔

مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔ میرے مالک عذاب سے بچالے، میرا مولا! تنہا اور بے یار و مددگار نہ چھوڑ، پروردگار! ہم پر رحم کر واور مجھے یہ سمجھ دے کہ میں تیری عنائت کردہ نعمتوں کا شکر بجالاؤں۔ گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ میرے مالک، مجھے دنیا و آخرت کی رسوائی سے محفوظ فرمادے۔ میرے مالک تیری بادشاہی میں رہ کر تجھ سے بغاوت کے مرتکب رہے جس پر نادم ہیں۔ میرے مالک اس جاری عذاب سے نجات دے۔ میرے مالک ہمیں تنہا اور بے یار و مددگار نہ چھوڑ، مالک ہم پر رحم کر دے اور مجھے یہ سمجھ دے، یہ توفیق دے کہ مالکِ حقیقی کو پہچانوں، زمینی خداؤں کا انکار کر دوں اور حقیقی رب سے اپنا رشتہ جوڑ لوں جس کے احسانات کا میں شمار بھی نہیں کر سکتا۔

دو پل کا جینا ہے اور پھر اندھیری رات سجنو۔ کچھ بھی تو باقی نہیں رہے گا، بس نام رہے گا اللہ کا۔ مجھ کو اپنا دوست بنالے، ایسا ایک اشارے پر جو سب کچھ دھر دے کانوں کو مہمل کلمہ سننے کا، اور میرے دل کو خواہش سے مفر دے تجھ کو سوچ سکوں، وہ ذہن عطا کر تجھ کو دیکھ سکوں میں، ایسی نظر دے میں بھی عذاب گہہ دنیا سے دور ہو جاؤں میرے مولا! مجھ پر رحم کر دے، بس رحم کر دے، نہیں تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ مجھے توبتہ النصوح کی توفیق عنائت فرما.....اللھم آمین۔

فوج حق کو کچل نہیں سکتی
فوج چاہے کسی یزید کی ہو
لاش اٹھتی ہے پھر علم بن کر
لاش چاہے کسی شہید کی ہو

بروز سوموار 20 شوال المکرم 1445ھ 29/ اپریل 2024ء

مداواضروری ہے

جب سے متعصب مودی نے اقتدار سنبھالا ہے، بھارت میں آرایس ایس اور بی جے پی کے غنڈوں نے تمام اقلیتوں کا جینادوبھر اور انڈیا کو قبرستان بنا کر رکھ دیا ہے اور بالخصوص مسلمانوں پر بہیمانہ ظلم وستم کی انتہاء ہوگئی ہے۔ یہ متعصب غنڈے جب جی چاہے کسی مسلمان کو پکڑ کر کسی بھی جگہ لے جاتے ہیں، حکم عدولی پر بے پناہ تشدد کیا جاتا ہے اور اگر مضروب ہیں، ایک غنڈہ موبائل پر فلم بناتا ہے، دوسرا مسلمان کو حکم دیتا ہے، جے شری کا کا نعرہ لگاؤ مجبوری میں ان کے حکم کی تعمیل کرے تو اسے بار بار یہ نعرہ لگانے پر مجبور کیا جاتا ہے، اس پر جب دل نہیں بھرتا تو پاکستان اور اسلام کو غلیظ گالیاں دینے کرکے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور مجبورو پر مجبور کیا جاتا ہے جس کے بعد سرعام ہاتھ میں پکڑے ہوئے گنڈاسے یا تلوار سے خوفناک وار مقہور جان بخشی کیلئے گڑگڑاتا ہوا شہید ہو جاتا ہے جس کے بعد آرایس ایس کا دوسرا غنڈہ اس کی لاش پر تیل چھڑک کر آگ لگا دیتا ہے اور پاکستان کو دھمکی دیتا ہے کہ بھارت کے خلاف جہاد بند کرو، ورنہ یہاں مسلمانوں کا یہی حشر کریں گے۔ یہی سلسلہ مقبوضہ کشمیر میں قابض بھارتی فوج نے بھی شروع کر رکھا ہے۔ وہ کشمیری نوجوانوں کو پکڑ کر ان پر بہیمانہ ظلم وستم اور مارپیٹ کے دوران انہیں بھی پاکستان اور اسلام کو گالیاں دینے پر مجبور کرتے ہیں اور ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ بعد ازاں سوشل میڈیا پر یہ ویڈیو وائرل کی جاتی ہے تاکہ کشمیری مسلمانوں دلبرداشتہ ہو کر جدوجہد آزادی میں حصہ نہ لیں۔

مجھے ایک پاکستانی دوست نے بتایا: میں نے ایک ایسا ہی ویڈیو کلپ جو آرایس ایس نے وائرل کیا تھا، اپنی فیس بک پر چند روز کیلئے لگایا تو میری فیس بک اور پیج دو دن کیلئے بند کر دیئے گئے۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ وہی ویڈیو کلپ جس بھارتی پیج سے میں نے لیا تھا، وہ کئی ماہ سے ایسے ویڈیو کلپ چلا رہا ہے اور اب بھی کئی ایسے خوفناک ویڈیو کلپ اس کی فیس بک پر چل رہے ہیں لیکن اس پر کوئی پابندی نہیں۔ میں نے تو یہ کلپ ان پاکستانیوں بقراطیوں کیلئے وائرل کیا تھا جو دن رات اس متعصب بھارت کی تعریف کرتے نہیں تھکتے اور انہیں اس وقت نیند نہیں آتی جب تک وہ کسی بھارتی فلم کو دیکھ نہ لیں اور بے شرمی کی حد تو یہ ہے کہ پاکستانی وزیراعظم کراچی کے تاجروں سے ملکی ترقی کیلئے آگے بڑھنے کی جب دعوت دے رہے تھے تو پاکستانی تاجر جس نے اسی ملک کے باسیوں سے اربوں روپے کمائے، وہ میڈیا کے سامنے وزیراعظم کو بھارت سے تعلقات بہتر بنانے کی دعوت دے رہے ہیں جبکہ انہیں اچھی طرح علم ہے کہ مودی اور اس کے چیلے پاکستان کے بارے میں کیا کیا بیانات دے رہے ہیں اور بالخصوص ان دنوں انتخابی مہم میں پاکستان اور مسلمانوں کے بارے میں جو زبان استعمال ہو رہی ہے، کیا کوئی غیرت مند پاکستانی ان افراد کے ساتھ ہاتھ ملانے کا سوچ بھی سکتا ہے؟

بھارتی دہشتگردی اور بھارتی دہشتگردوں کے کرتوت ہمارے اپنے ایسے ہی مہربان قوم کے سامنے نہیں لانے دیتے، یہی وجہ ہے کہ ہم آج پوری دنیا میں انتہائی نچلے درجے کو پہنچ چکے ہیں۔ جہاں تک بھارت کی دہشتگرد حکومت کا تعلق ہے تو اس نے وندے ماترم، سوریہ نمسکار اور یوگا کے نام پر مسلمانوں کے مذہبی استحصال کے ساتھ ساتھ ہرزہ سرائی کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا ہے حتیٰ کہ یہاں تک کہا گیا کہ جو سوریہ نمسکار نہیں کرتا اسے ہندوستان چھوڑ کر چلا جانا چاہئے۔ بعض فرقہ پرست لیڈروں کے مطابق یوگا کرنے سے اسلام منع نہیں کرتا کیونکہ یوگا تو ایک قسم کی ورزش ہے جو صحت کیلئے سودمند ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ کئی مسلمانوں ملکوں میں یوگا کیا جاتا ہے تو پھر بھارتی مسلمانوں کو یوگا پر کیوں اعتراض ہے لیکن یوگا کی حمائت میں بات کرنے والے فرقہ پسند مسلم دشمنوں کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ کچھ مسلمان ملکوں میں یوگا کیا جاتا ہے لیکن وہاں یوگا کے دوران منتروں کا جاپ اور سوریہ نمسکار نہیں کیا جاتا مگر بھارت میں یوگا کے نام پر مسلمانوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ سوریہ نمسکار کریں۔ اوم کا جاپ کریں۔ اس مذموم پروگرام میں بلا تفریق سارے ہندوستانیوں بشمول مسلم اقلیت کی شرکت پر حکومتی اصرار غیر جمہوری، غیر اخلاقی اور اسلام مخالف طرزِ عمل ہے۔

چند سال قبل سب وکاس کا نعرہ لگاتے ہوئے مودی حکومت نے مسندِ اقتدار پر تسلط جمایا مگر اب تو مودی کے دورِ حکومت میں فرقہ پرستی انتہاء کو پہنچ چکی ہے جبکہ یوگا میں شامل سوریہ نمسکار اور اشلوکوں پر مبنی منتر پڑھنے کا عمل بھارتی سیکولر آئین کی روشنی میں ملنے والے بنیادی مذہبی حقوق کی خلاف ورزی کے مترادف ہے۔ مودی حکومت کے نمائندے غیر جمہوری بیانات دینے اور مسلمانوں کی مذہبی جذبات مجروح کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں اور گائے کا گوشت کھانے والوں کو پاکستان بھیجنے کی دھمکی دینا، گھر واپسی اور چار شادیوں کا تمسخر اڑانا ان کا معمول بن چکا ہے۔ یوگا اصل میں گیان اور دھیان کا ایک طریقہ ہے جس کا مقصد بھگوان کے آگے خود سپردگی ہے۔ سوریہ نمسکار یعنی سورج کی پوجا یوگا کا اہم عنصر ہے۔ یوگا بنیادی طور پر یوگ سے نکلا ایک لفظ ہے جس کے معنی جوڑ کے ہیں۔ یوگ کی تاریخ اور پس منظر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت ہندوؤں میں عبادت کا ایک طریقہ ہے۔ بنیادی طور پر ہندوازم کا بنیادی فلسفہ ہے جس میں آتما (روح) پرماتما (بھگوان) اور شریر (جسم) کو مراقبے کے ذریعے ایک ساتھ مربوط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یوگ کا پہلا طریقہ ہندوؤں کے مطابق ان کے بھگوان شنکر نے ایجاد کیا تھا اور دوسرا طریقہ پنا نچلی نام کے یوگ گرو نے شروع کیا تھا۔ لوگ ہندوؤں کے علاوہ بدھ مت کے ماننے والوں میں بھی رائج ہے۔ یہ محض ایک ورزش نہیں کیونکہ اس کی ایک مذہبی حیثیت رہی ہے۔ یوگ کے دوران مذہبی اشلوک کی ادائیگی بھی اس کا حصہ ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہزاروں آشرم قائم ہیں اور حکومت کی طرف سے انہیں سرکاری امداد بھی دی جاتی ہے رام دیو "یوگا کے سب سے بڑے پیروکار ہیں اور انہی کی کوششوں سے اقوام متحدہ جبکہ مودی کی حکومت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرنے والے "بابا میں یوگا کا عالمی دن منانے کا اعلان کیا گیا تھا جس میں بھارتی فرقہ پرست وزیر اعظم اور آر ایس ایس کے پرچارک مودی نے اہم کردار ادا کیا۔ مودی حکومت بھارت کو ہندو راشٹر بنانے کے ایجنڈے پر عمل پیرا ہے اور یوگا کا عالمی دن منانے کے پیچھے بھی حکومت کا مقصد کارفرما تھا۔

مودی نے اپنے اقتدار کے پہلے سال میں 27 ستمبر 2014ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے 69ویں سیشن میں خطاب میں بین الاقوامی برادری سے یوگا کے انعقاد کی اپیل کی تھی۔ 11 دسمبر کو جنرل اسمبلی نے اس تجویز کو 21 جون کو عالمی یوگا ڈے منانے کی تجویز کو اتفاق رائے سے منظور کر لیا۔ مودی سرکار چانکیہ کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ اس کی دو واضح پالیسیاں ہیں، اوّل ان تمام جھوٹے وعدوں کو بھارتی عوام کے دماغ سے صاف کر دیا جائے جو مودی نے الیکشن کے دوران کیے تھے تاکہ ہندوستانی عوام سمجھنے کے اہل ہی نہ رہیں کہ ان کے ساتھ کوئی دھوکہ یا ٹھگی ہوئی ہے اور ناراض ہونے کی بجائے مودی کی مالا جپتے رہیں۔ دوم، ہندو اکثریتی طبقے کے دماغوں میں ہندتوا کے مفروضے کا اس طرح پرچار کیا جائے کہ انہیں یوں لگے کہ اب وہ ایک ہندو دیش کے شہری ہیں اور ہندو سنسکرتی دنیا میں سب سے اعلیٰ ہے اور ہندو عوام کو یہ فضیلت سنگھ پریوار اور مودی کے طفیل ہی مل سکی ہے۔ ان دونوں پالیسیوں کو ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں متواتر پختہ کیا جا رہا ہے۔ ویدک کال میں جنگی جہازوں کا استعمال اس قدیم دور میں جدید میڈیکل سائنس کی کرشماتی سرجری سے بھی زیادہ پیچیدہ آپریشن اور اب یوگا کی اچانک اس قدر تبلیغ الیکشن کے دوران مودی باقاعدہ اعلان کرتے تھے کہ انہیں خود بھگوان نے بھیجا ہے تاکہ اس دیش کا کلیان کر سکیں۔

آج سے پچاس سال قبل امریکا اور یورپ سے سیاح کثیر تعداد میں بھارت آنا شروع ہوئے، اس زمانے میں ہندو عوام سادھوؤں اور سنتوں کو کسی اور دنیا کی مخلوق سمجھتے تھے اور ان کو سمجھنے کیلئے ان کے آشرموں میں قیام کرتے تھے۔ ان سادھوؤں، سنتوں کی سیوا کرتے اور بدلے میں تین چیزیں (بھنگ، گانجا اور یوگا) ساتھ لے جاتے۔ ان سیاحوں کیلئے رشی کیش، ہری دوار کے آشرم ہی ٹھکانے تھے جہاں ہندو یوگی اور سادھو چلم کے کش کے

ساتھ دیگر بیہودہ اعمال کی تعلیم دیتے تھے۔ ان لوگوں نے امریکا اور یورپ میں بھی آشرم قائم کیے اور لوگوں کو یوگا کی تعلیم دینے لگے جس سے کروڑوں ڈالر کماتے۔ ہندو دھرم میں تمام علوم کا سرچشمہ وید ہیں اور ویدوں کے عالم اور تخلیق کاروں نے یہ سسٹم ایجاد کیا، اس لئے مختلف آسنوں کے دوران مختلف دیوتاؤں سے شکتی اور صحت پرارتھنا کی جاتی ہے، ان کی تعریف کی جاتی ہے۔ سوریہ (سورج) آسن میں سورج کے سامنے ڈنڈوت کیا جاتا ہے ۔ منتر اور اشلوک پڑھ کر ان سے مدد کی درخواست کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلمان یوگا تو کر سکتے ہیں لیکن اشلوکوں کے ورد سمیت یہ تمام اعمال انجام نہیں دے سکتے جو غیر اللہ کی پرستش پر محمول ہیں مگر سب کے سب مسلمان ہر مذہبی رسم کی تہ تک پہنچنے کی حاجت محسوس نہیں کرتے اور ان کی آزاد اور غیر جانبدار طبیعت بے حد مضر رساں بھی ثابت ہو رہی ہے، دوسری طرف مسلمانوں اور دیگر غیر ہندوؤں کو مرتد کرنے کی مہم سونے پر سہاگے کا کام دے رہی ہے۔

جس مذہب میں ہر طاقتور کو خدا مان کر اس کو سجدے کرنا شروع کر دیئے جائیں، سوا ارب کی آبادی کے کروڑوں بھگوانوں کی پرستش کی جاتی ہو، جس مذہب کی اساس گائے کی تقدیس ہو اور جو بے شمار اوہام اور لایعنی رسوم کا مجموعہ ہو، اسے کوئی غیر ہندو کس طرح قبول کرے۔ یہ وہ لاینحل مسئلہ ہے جو آج کل مودی سرکار میں ہندوستان کے ان تمام باشندوں کیلئے سوہانِ روح بن گیا ہے جو ہندو دھرم پر ایمان نہیں رکھتے، اس صورتحال سے بھارت کے عیسائی، پارسی، بدھ مت کے ماننے والے، کیمونسٹ حتیٰ کہ دہریے بھی پریشان ہیں۔ اس صورتحال کا محرک ہندوؤں کا روحانی گرو مدھو یوسدا شیو گولوا کر ہے۔ اس نے مودی سرکار کی شہہ پا کر اپنا نعرہ ہندو راشٹر ابڑی تیزی سے بلند کیا ہے۔ وہ ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کر رہا ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام غیر ہندو اپنی جان کی امان چاہتے ہیں تو ہندو دھرم اور ہندو بود و باش اختیار کر لیں بصورت دیگر ان کی زندگی ہلاکت کی زد میں رہے گی۔ مدھو یوسرا شیو مدت سے ہندو دھرم کا پرچار کر رہا ہے۔ وہ تمام مسلمانوں، عیسائیوں، بدھوؤں، پارسیوں حتیٰ دہریوں کو بھی تاکید کر رہا ہے کہ ہندو راشٹر کا فلسفہ قبول کر لو کیونکہ ہندو فلسفہ قومیت کی بنیاد ہے۔

بھارت کے کیمونسٹ ہندوتر اشٹر اکے فلسفے پر تعجب کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ اگر مذہب ہی قومیت کی بنیاد مان لیا جائے تو پھر بھارت اور نیپال دونوں ملک ایک ہی دھرم کو ماننے والے ہیں، یہ دونوں آپس میں ضم ہو کر ایک قوم کیوں نہیں بن جاتے۔ برما اور سری لنکا یکساں نوعیت کا ایک ہی دستور اختیار کیوں نہیں کرتے؟ اکثر پڑھے لکھے تعصب سے ماوراء لوگ ہندو دھرم کے تضادات پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پروفیسر ڈی این جھا، پروفیسر آر ایس شرما، رومیلا تھاپر اور ڈی سی کوسمبی نے مستند تاریخی حوالوں سے لکھا ہے کہ ہندوستان کے قدیم برہمن گائے کا گوشت کھایا کرتے تھے جبکہ نیپال کے ہندو تو آج بھی ہر قسم کی خوشی کی تقاریب میں بیل کے گوشت کا پکوان پکاتے ہیں۔ اس صورتحال میں گاؤکشی کے نام پر مسلمانوں کو کیوں قتل کر دیا جاتا ہے؟

ہندو دھرم کا ایک اہم اثاثہ وید ہیں لیکن اس کے متن میں یکسانیت نہیں ہے۔ گاندھی اپنی روزانہ کی دعائیہ مجلس میں قرآن کریم، انجیل اور گیتا کے اسباق پڑھا کرتے تھے۔ ہر چند ان کا یہ عمل مذہبی سے زیادہ سیاسی تھا کیونکہ وہ ہندوستان کے تمام مذاہب کے لوگوں کو ایک قوم بنانا چاہتے تھے۔ جسٹس دیپک

دوااور مودی بھی گیتا پڑھتے ہیں۔ احمد آباد کا شاعر احسان جعفری عالمگیر انسانیت پر یقین رکھتا تھا، جواہر لال نہرو کا پیروکار تھا۔ اس نے زندگی بھر پیرا، گوتم بدھ اور گورونانک جیسے شخصیات کے محاسن پر نظمیں لکھیں لیکن گجرات میں مسلم کش فسادات کے ذمہ دار مودی کے چیلوں نے انہیں بھی نہیں بخشا۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور اس کے گھر کے سارے اثاثہ کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ اسی طرح احمد آباد ہی کی ایک مغنیہ رسولاں بائی کا گھر بھی جلادیا حالانکہ وہ ہر نغمے کی دھن سے پہلے رام اور کرشن کے نام کا پاٹھ پڑھا کرتی تھی۔

یہ آج کے بھارت کی وہ سرگرمیاں ہیں جنہوں نے مسلمانوں سمیت تمام اقلیتوں کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ شدھی یعنی مسلمانوں کو ہندو بنانے، مسلمانوں کی بستیاں جلانے اور ان کا خون بہانے کی تحریک ہندوستان میں بہت پہلے سے موجود تھی لیکن اب مودی حکومت میں یہ تحریک ایک وبا اور بلائے بے اماں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ آج خود بھارت میں ہر صاحبِ ضمیر شخص یہ سوال کر رہا ہے کہ کیا اب بھارت کا سیکولر آئین اندھا اور انسانی حقوق کا کا عالمی منشور اپاہج ہو گیا ہے؟ کیا اب بھارت میں کسی مہذب انسان کو اپنے افکار کے مطابق زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں؟

مودی سرکار کی منافقت کا یہ عالم ہے کہ سادھو کے بھیس میں جب بھی کبھی امن کے اشلوک دہراتا ہے تو کوئی بھی یقین کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ جنگی جنون میں مبتلا مودی کئی مرتبہ یہ ایسے اکھنڈ بھارت کا نعرہ لگا چکا ہے کہ بحر ہند کے ساحل پر بسنے والا ہر ملک اکھنڈ بھارت کا حصہ ہے اور دوسری طرف ان کے سرپرست یہودی گریٹر اسرائیل کے مبینہ نقشے کی سرحدیں بحر ہند سے منسلک دکھائی گئی ہیں۔ یہود و ہنود کی درپردہ دوستی اب کھل کر سامنے آچکی ہے اور ابھی حال ہی میں بھارتی ائیر فورس نے اسرائیل سے ہارڈ ویئر حاصل کرنے کے بعد "راکس" نامی نیم بیلسٹک میزائل کا تجربہ کیا ہے۔ اسرائیل کی طرف سے تیار کردہ راکس سسٹم کی رینج 250 کلومیٹر ہے اور اسے "ایس یو 30 ایم کے جیٹ" کے ذریعے لانچ کیا گیا ہے تاکہ پاکستان کے جوہری مقامات کو نشانہ بنایا جاسکے۔

بھارتی خبر رساں ادارے "پرنٹ" کے ذریعے اس کی کامیابی کا اعلان کیا ہے، جس کے بعد یقیناً خطے میں ایٹمی ہتھیاروں کی نئی دوڑ کا آغاز ہو گیا ہے۔ اطلاعات کے مطابق یہ فضا سے زمین تک مار کرنے والا ایٹمی میزائل ہے جس کو اسرائیلی دفاعی ٹیک کمپنی رافیل ایڈوانسڈ ڈیفنس سسٹم نے ڈیزائن اور بنایا ہے اور اس میزائل کی ٹیکنالوجی بھی ہندوستان کو منتقل کرنے کا معاہدہ ہوا ہے تاکہ ہندوستان اب اپنے ملک میں مزید میزائل بنا سکے۔ نئے میزائل نے بھارت کے پاکستان کے اہم انفراسٹرکچر بشمول اس کی جوہری تنصیبات پر حملہ کرنے کے قابل ہونے کا خدشہ بڑھا دیا ہے۔

یونیورسٹی آف البانی، یو ایس اے سے ماہر تعلیم کرسٹوفر کلیری اور ایم آئی ٹی سے وپن نارنگ نے 2018 میں خبردار کیا تھا کہ پاکستان کے پاس ٹیکٹیکل نیوکلیئر ہتھیار ہیں لیکن اس مفروضہ کا کوئی ثبوت آج تک مہیا نہیں کیا جاسکا- یہ چھوٹے جوہری ہتھیار جو عین اہداف پر استعمال کیے جاسکتے ہیں، انڈیا کو "سٹریٹجک فالج" میں ڈال سکتے ہیں۔ پاکستان اور بھارت کے مابین پہلے "استعمال نہ کرنے" کی جوہری پالیسی تو موجود ہے لیکن بصورت جنگ میں پاکستان کے پاس ان ٹیکٹیکل ہتھیاروں کی بناء پر یہ صلاحیت موجود ہے جو بڑے جوہری ہتھیاروں کی نسبت کہیں زیادہ تباہ کن ہیں جبکہ اب بھارت کو اسرائیلی میزائل "راکس" کے حصول کے بعد یہ صلاحیت ہو گئی ہے۔

کرسٹوفر کلیری اور وپن نارنگ کے اس بے بنیاد مفروضے پر کیسے یقین کیا جائے جس کا آج تک کوئی ثبوت سامنے نہیں آسکا۔ ایسے ہی مفروضے پر عمل کرتے ہوئے عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور وہاں ڈیڑھ ملین افراد کو اب تک موت کے گھاٹ اتار دیا گیا جبکہ اقوام متحدہ میں خود امریکی وزیر

خارجہ کولن پاؤل نے شرمندگی کے ساتھ عراق پر ناجائز حملے کی اپنی غلطی کا اعتراف بھی کیا لیکن ہزاروں سال پر محیط تہذیب سے مالا مال ملک کو تباہ کر کے اس کو صدیوں پیچھے دھکیل دیا گیا، اس عظیم نقصان کو کون پورا کرے گا۔

مارچ 2013 میں، براؤن یونیورسٹی میں واٹسن انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل اسٹڈیز کے ذریعہ آج تک کی عراق جنگ کی کل لاگت کا تخمینہ 1.77 ٹریلین ڈالر لگایا گیا تھا۔ دفاعی اور معاشی ماہرین کا کہنا ہے کہ امریکی معیشت پر جنگ کی کل لاگت 2053 تک سود کی شرح سمیت 3 ٹریلین ڈالر سے 6 ٹریلین ڈالر تک ہو گی، جیسا کہ واٹسن انسٹی ٹیوٹ کی رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے کہ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ امریکی اور اتحادی افواج کی تسلیم شدہ غلطی کا تاوان نجانے کب تک عراقی تیل کی صورت میں وصول کیا جاتا رہے گا۔

غزہ فلسطین میں حالیہ اسرائیلی ظلم و ستم ابھی ختم نہیں ہوئے کہ اسرائیل نے عالمی قوانین کی دھجیاں اڑاتے ہوئے دمشق میں ایرانی سفارت خانے پر حملہ کر کے درجن سے زائد افراد کو شہید کر دیا جس کا مقصد غزہ پر ہونے والے جرائم پر پردہ ڈالنے اور اپنے مغویوں کی بازیابی پر ناکامی اور شکست سے توجہ ہٹاتے ہوئے ایران کے جواب پر امریکا اور اس کے اتحادیوں کو ایک بڑی جنگ میں ملوث کرنا مقصود تھا۔ اس واقعے کے فوری بعد ایرانی صدر کا پہلی اسلامی ایٹمی قوت کا تین دن دورے کو ناکام بنانے کیلئے امریکا کا کھلی دھمکیاں دینا بھی اس سازش کا پتہ دیتا ہے کہ ایسے موقع پر مودی کا اسرائیل کے اشتراک سے میزائل کا تجربہ کرنا یقیناً شکوک شبہات بڑھا دیتا ہے کہ کہیں عراقی جنگ شروع کرنے کے بے بنیاد بہانے کو اس خطے میں دہرانے کی سازش تو نہیں بنائی گئی جس کے بعد یہ خدشات بڑھ گئے ہیں کہ "پہلے استعمال نہ کرنے" کی پالیسی کو ہوا میں اڑاتے ہوئے یہ خوفناک کھیل شروع کر دیا جائے جس کیلئے اس خطے میں مودی جیسے مکار کو استعمال کرتے ہوئے کہیں عالمی جنگ کا طبل نہ بجا دیا جائے۔ ان خدشات کی بناء پر یقیناً مودی جیسا جنونی اب دنیا کیلئے ایک ایسا خطرہ بن گیا ہے کہ دنیا کے امن کیلئے اس کا مداوا از حد ضروری ہو گیا ہے۔

بروز منگل 21 شوال المکرم 1445ھ 30/ اپریل 2024ء

میں ٹوٹتی سانسوں کی فصیلوں پہ کھڑا ہوں

دنیا بھر میں مسلم ریاستوں کا یہ المیہ ہے کہ یہاں کے حکمران اپنی عوام کو غلام اور خود اپنے اقتدار کیلئے استعمار کے غلام ہوتے ہیں۔ اپنے چہروں پر ایسے مضبوط نقاب پہنے ہوتے ہیں کہ جو بھی اس کو ہٹانے کی کوشش کرتا ہے، اسے ہٹا دیا جاتا ہے۔ تاریخ میں اس کی درجنوں مثالیں موجود ہیں۔ عالم عرب میں مرد آہن کہلانے والے جمال عبد الناصر کے بارے میں منظر عام آنے والی برطانوی مصنف جیمز بار کی کتاب ''دی لارڈز آف ڈیزرٹ'' میں انکشاف کیا گیا ہے کہ مصر میں 1952ء کا فوجی انقلاب امریکا کی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کے اُکسانے اور اس کے عملی تعاون سے برپا ہوا تھا۔ فوجی انقلاب کے ترجمان ریڈیو اسٹیشن وائس آف عرب کا قیام بھی سی آئی اے کی مدد سے ممکن ہوا اور لیفٹیننٹ کرنل جمال عبد الناصر نے اپنے ساتھیوں کی ملی بھگت سے شاہ فاروق کا تختہ الٹ دیا۔ کتاب کے مصنف جیمز بار نے اپنی کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مصر میں اس فوجی انقلاب کی وجہ امریکا اور برطانیہ کے درمیان مشرق وسطیٰ میں اپنا اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کی کشمکش تھا۔ برطانیہ مصری بادشاہ شاہ فاروق کی حمایت کر رہا تھا جبکہ سی آئی اے اپنے مجوزہ پروگرام کی تکمیل میں اسے رکاوٹ سمجھتے تھے۔

اس انقلاب کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ مصری فوج کے اندر 1948ء میں اسرائیل کے ہاتھوں غیر متوقع شکست کی وجہ سے بہت بے چینی تھی اور مصری عوام بھی اپنی اس شکست پر اس قدر جذباتی تھے کہ انہوں نے اس فوجی انقلاب کو نہ صرف قبول کر لیا بلکہ ناصر کو اپنا ہیرو مانتے ہوئے دیوانگی کی حد تک اس کے ہر عمل کی نہ صرف تائید کی بلکہ اس کے تمام ناجائز اقدامات کو بسر و چشم قبول بھی کر لیا۔ سی آئی اے کو اپنے دوررس پروگرام کے مطابق آئندہ اس خطے میں اسرائیل جیسے ناسور کے ذریعے اپنا اثر ورسوخ قائم رکھنا مقصود تھا جس میں امریکا آج تک تمام عرب ممالک پر اپنی اجارہ داری رکھنے میں کامیاب نظر آتا ہے، اس لئے کرنل ناصر اور اس کے ساتھیوں کی مدد کر کے شاہ فاروق کا تختہ الٹنے میں تاخیر نہیں کی۔

برطانوی مصنف جیمز بار نے برطانوی دفتر خارجہ کی دستاویزات اور دیگر تاریخی دستاویزات کی مدد سے اپنی کتاب میں مشرق وسطیٰ کے بارے میں برطانیہ اور امریکا کے درمیان مسابقت اور تعاون پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ فوجی کاروائی سے دو دن قبل کرنل ناصر نے برطانیہ اور امریکا کو فوج کی طرف سے ٹیک اوور کرنے کے منصوبے کے بارے میں باقاعدہ اعتماد میں لیا تھا۔ اگرچہ انقلاب کی تمام تر منصوبہ بندی جمال عبد الناصر نے سی آئی اے کی مدد سے مکمل کی تھی جس میں طے کیا گیا کہ جنرل نجیب عہدے کے لحاظ سے سب سے سنئیر، فوج میں اچھی شہرت، اپنے تجربے اور پروفیشنل کی بناء پر بہت مقبول ہیں، ان کو عارضی طور پر انقلاب کا سربراہ بنا دیا گیا کیونکہ عبد الناصر کے فوج میں جونیئر رینک افسر ہونے کی وجہ سے فوج میں بغاوت ہونے کا بھی خدشہ تھا۔ پہلے سے طے شدہ سازش کے تحت کچھ ہی عرصے بعد جنرل نجیب کو ہٹا کر کرنل ناصر نے 1956ء میں باقاعدہ مصر کے صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔

اپنے مجوزہ منصوبہ بندی کے تحت سی آئی اے نے اس خطے میں جمال عبد الناصر کو ہیرو بنانے کیلئے ایک اور چال چلی اور اسی سال (1956ء) جب جمال عبد الناصر نے نہر سوئز کو قومی ملکیت میں لینے کا اعلان کیا تو برطانیہ اور فرانس نے اسرائیل کے ساتھ مل کر نہر پر قبضہ کرنے کیلئے مصر سے جنگ شروع کر دی لیکن اس وقت کے امریکی صدر آئزن ہاور نے فرانس، برطانیہ اور اسرائیل کو بزور طاقت کی دھمکی دیتے ہوئے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس پسپائی پر برطانیہ کو فوجی، سیاسی اور سفارتی محاذ پر انتہائی خفت کا سامنا کرنا پڑا اور اس واقعہ کے بعد مشرق وسطیٰ میں اس کا اثر ورسوخ کم ہوتا چلا گیا اور پورا خطہ

امریکی حلقہ اثر میں آ گیا۔ اس سارے ڈرامے میں امریکا کی آشیر باد پر اسرائیل نے بڑی مکاری کے ساتھ برطانیہ اور فرانس کا ساتھ دینے کا محض کردار ادا کیا جبکہ امریکا کے پیش نظر تو مشرق وسطیٰ پر اپنا تسلط قائم کرنے کی بنیادی وجہ اس علاقے میں اسرائیل کی حفاظت اور مشرق وسطیٰ کے تیل کے ذخائر تک رسائی اور اجارہ داری تھی جس میں وہ آج تک کامیاب نظر آتا ہے۔

امریکی مدد سے اسرائیل کو فوجی لحاظ سے تمام عربوں کے مقابلے میں اتنا طاقتور بنا دیا گیا کہ 1967ء کی جنگ میں مصر، شام اور اردن تین ممالک کی مشترکہ افواج کو چھ دنوں کے اندر اسرائیلی فوج نے شکست دے کر بیت المقدس، غزہ اور باقی ماندہ فلسطین، اردن کے مغربی کنارے، گولان کی پہاڑیوں اور مصر کے جزیرہ نما سینائی پر قبضہ کر لیا۔ نصف صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد بھی اسرائیل کا ان علاقوں پر (سوائے مصر کے جزیرہ نما سینائی) قبضہ برقرار ہے۔

فوج کے ذریعے حکومتوں کو گرانے اور تبدیل کرنے کی سی آئی اے کی یہ سرگرمیاں صرف مصر تک محدود نہیں رہیں۔ مصر میں فوج کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹنے کا جو سلسلہ 1952ء میں شروع ہوا تھا، وہ 1953ء میں ایران میں ڈاکٹر محمد مصدق کی حکومت کو ختم کر کے آگے بڑھایا گیا اور اس کے دس سال بعد صدام حسین نے عراقی بادشاہت کو بعث پارٹی کے ذریعے فوجی انقلاب برپا کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ 2003ء میں صدام کو اقتدار سے ہٹانے کیلئے امریکا اور برطانیہ نے عراق پر براہ راست حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ ان واقعات کے بعد میری نظر پاک وہند کے مابین ہونے والی محدود جنگ کارگل پر جا کر رک جاتی ہے کہ کیا کارگل کی جیتی ہوئی جنگ کو شکست میں تبدیل کر کے مشرف کو اقتدار میں لانے اور بعد ازاں نائن الیون واقعے میں مشرف کی امریکا کی غیر مشروط حمائت کی بناء پر اس خطے میں امریکا کے تسلط کو دوام دینے کی کوئی سازش تو نہیں تھی؟

اسی تناظر میں مجھے جنرل (ر) باجوہ کی پاکستانی صحافیوں سے وہ ملاقات بھی یاد آ رہی ہے جس نے پاکستانی پریس کے ذریعے قوم کے سامنے باجوہ کا ایک نیا چہرہ متعارف کروایا جس میں انہوں نے صحافیوں کو اپنے احساسِ شکست کے ساتھ بھارت کے ساتھ جنگ نہ کرنے پر محض اس لئے قائل کرنے کی کوشش کی کہ ہمارے پاس اب لڑنے کے وہ وسائل میسر نہیں اور ہمارے ٹینک اور دیگر جنگی اسلحہ بھی ان کے مقابلے میں کافی پرانا ہو چکا ہے۔ ٹی وی پر اس پروگرام کے نشر ہوتے ہی مودی کے حمائت یافتہ پریس نے پورے ملک میں مودی کی تعریف میں زمین و آسمان کے جہاں قلابے ملانا شروع کر دیئے اور بھارت میں گھی کے چراغ جلانے شروع کر دیئے وہاں پاکستانی پریس اور قوم نے بیک آواز باجوہ کے محاسبہ کی بات شروع کر دی اور اس معاملے پر باجوہ کے کورٹ مارشل کا بھی مطالبہ شروع کر دیا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ پاکستانی وزیر اعظم اور فوج کے سپہ سالار نے پہلی مرتبہ ایک ساتھ امریکا کا دورہ کیا تو اس موقع پر پینٹاگون میں قمر باجوہ کو 21 توپوں کی سلامی دی گئی جو ایک غیر معمولی واقعہ ہے کیونکہ پینٹاگون نے اس سے قبل یہ اعزاز اپنے سب سے زیادہ وفادار جنرل مشرف کو نہیں بخشا تو قمر باجوہ کی امریکا بہادر کیلئے ایسی کیا خدمات تھیں جس کیلئے ان کو اس اعزاز سے نوازا گیا۔ اس موقع پر دونوں ملکوں کے قومی ترانے بھی بجائے گئے۔ امریکی چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف جنرل جوزف ڈنفورڈ نے جنرل قمر جاوید باجوہ کا استقبال کیا اور بعد ازاں آرمی چیف قمر باجوہ نے پینٹاگون میں امریکی فوجی قیادت سے ملاقات کی۔

آرمی چیف سے امریکی فوج کے چیف آف اسٹاف مارک ملی نے بھی ملاقات کی۔ جنرل قمر جاوید باجوہ نے امریکی فوجی ہیروز کو خراج عقیدت پیش کیا۔

یقیناً عراق، لیبیا اور افغانستان میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے والے امریکی فوجی ہی ان کے نزدیک ان کے ہیرو تھے۔ اسی دورہ امریکا میں وائٹ ہاؤس میں جب عمران اور ٹرمپ ایک دوسرے کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے تو اچانک ٹرمپ نے مسئلہ کشمیر پر اپنی ثالثی کا عندیہ دیا تھا جس کے جواب میں عمران نے یہ بھی کہا ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کے خلاف آپریشن آئی ایس آئی کی فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر ہوا تھا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شکیل آفریدی کس جرم کی سزا کاٹ رہا ہے۔

دراصل ماجرا یہ ہے کہ کشمیر میں سیز فائر یعنی جنگ بندی کے اعلان کے بعد مودی نے پاکستان کا دورہ کرنا تھا۔ جب اس وقت کے وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی کو اس بات کا علم ہوا تو انہوں نے فوری طور پر عمران خان سے ملاقات کر کے ان کو آگاہ کیا کہ جنرل باجوہ اور آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل فیض حمید اس بارے میں بھارتی قومی سلامتی کے مشیر اجیت دوول سے بات چیت کر رہے ہیں تو عمران خان نے بجائے جنرل قمر باجوہ کو انہوں نے جنرل فیض حمید کو وزارتِ خارجہ کو "آن بورڈ" لینے کا مشورہ دیا جس کے بعد باجوہ نے وزارت جارجہ میں ایک بریفنگ کا اہتمام کیا جس میں انہوں نے کہا کہ ہمارا جنگی ساز و سامان بہت پرانا ہو چکا ہے اور ہم بھارت کے ساتھ جنگ نہیں لڑ سکتے جبکہ ملکی صحافیوں کے مطابق جنرل باجوہ اس سے پہلے ایسی بریفنگ 25 ملکی صحافیوں کو دے چکے تھے کہ پاکستان کی جنگی صلاحیت بھارت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ انہی دنوں ایک سینئر صحافی نے اپنے انٹرویو میں یہ انکشاف بھی کیا جنرل قمر جاوید باجوہ اور عمران خان کو کشمیر میں مودی کے 5 اگست 2019 کے اقدامات کا مبینہ طور پر پہلے سے علم تھا اور وہ پارلیمان کو اعتماد میں لیے بغیر بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر بنانا چاہ رہے تھے۔

یوں تو پاکستانی عوام جس قدر کشمیری بھائیوں سے اپنی یگانگت، محبت اور قربانی میں اپنی ایک مثال ہیں لیکن بدقسمتی سے پاکستان کی مقتدر اشرافیہ نے اسی قدر کشمیر کے ساتھ دھوکہ اور بے وفائی کا عملی ثبوت دیا بالخصوص اس بے وفائی کا دور تو مشرف کے زمانے سے ہی شروع ہو گیا تھا جب کشمیر کی سودے بازی شروع ہو گئی اور کشمیر کے اصل وارث جناب سید علی گیلانی کو نظر انداز کر کے ان کے خلاف توہین آمیز پروپیگنڈہ شروع کر کے کشمیر کے ایک دوسرے گروپ کو آشیر باد دیکر ان سے پینگیں بڑھانا شروع کر دی گئیں لیکن وقت نے بالآخر اس تمام سازشی ٹولے کو قعرِ مذلت میں دھکیل دیا اور کشمیر کے ہیرو سید علی گیمالی آج بھی لوگوں کے دلوں پر راج کر رہے ہیں۔ لیکن یہ معاملہ ختم نہیں ہوا بلکہ اس کہانی کے دو ایسے کردار بھی ہیں جنہوں نے اپنے پیشروؤں سے سبق حاصل کرنے کی بجائے اپنے اپنے اقتدار کو طویل اور مضبوط کرنے کیلئے ایک دوسرے کو استعمال کرتے ہوئے اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتے رہے اور بالآخر خود ہی لڑ پڑے اور اس کے نتیجے میں آج ارضِ وطن مصائب اور مشکلات سے کراہ رہا ہے اور یہ دو کردار عمران خان اور قمر باجوہ ہیں۔

باجوہ کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے اپنے آئینی حدود اور حلف کی خلاف ورزی کرتے ہوئے 2017ء میں ملکی سیاست میں براہِ راست مداخلت شروع کر دی تھی۔ ایک طرف انہوں نے نواز شریف کے جانشین وزیر اعظم خاقان عباسی کو قابو کر کے فاٹا کو خیبر پختونخوا میں ضم کرایا دوسری طرف

حکومت کے علم میں لائے بغیر بھارت کے ساتھ بیک چینل کھول لیا۔ شاہد خاقان عباسی کی کمزوری سے جنرل باجوہ کے حوصلے بلند ہو گئے۔ باجوہ اوران کے ساتھیوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب ملک میں ایسا حکومتی سیٹ اپ لایا جائے جو ان کی مرضی کے تابع ہو تو ان کی نظر اپنے ساتھیوں کے مشورے کے بعد عمران خان پر جا ٹھہری کہ اس نئے چہرے کی آمد سے سابقہ دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کو بھی قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جنرل باجوہ نے 2018ء میں عمران کو کیسے وزیر اعظم بنوایا؟ 2018ء کے الیکشن میں دھاندلی اور میڈیا کی زباں بندی کی ساری قوم عینی شاہد ہے۔

عمران خان کو وزیر اعظم بنانے کے بعد اب اگلے قدم کے طور پر وہ پنجاب اور خیبر پختونخوا میں اپنی مرضی کے وزرائے اعلیٰ لانا چاہتے تھے لیکن عمران نے باجوہ کو پنجاب اور خیبر پختونخوا کے معاملات سے دور رکھنے کیلئے انہیں بھارت کے ساتھ بیک چینل مذاکرات جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ اس بیک ڈور چینل کے تحت نومبر 2018ء میں کرتار پور راہداری کا سنگِ بنیاد رکھ دیا گیا اور ریکارڈ برق رفتاری کے ساتھ اس کو مکمل کر کے پاکستان کا خواب دیکھنے والے علامہ اقبال کے یوم پیدائش 9 نومبر 2019ء کو عمران کے ہاتھوں کرتار پور راہداری کا افتتاح کر دیا گیا جس کا عمران حکومت نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور پاکستانی اور کشمیری عوام کی پریشانیوں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے اس نئی سازش کا حصہ بنتے چلے گئے۔

فروری 2019ء میں مقبوضہ کشمیر کے علاقے پلوامہ میں ایک خودکش حملے کے بعد بھارت نے پاکستان کے علاقے بالاکوٹ پر فضائی حملہ کر دیا۔ پاکستان ایئر فورس نے بھارت کے فضائی حملے ناکام بناتے ہوئے جہاں بھارتی پائلٹ ونگ کمانڈر ابھینندن کو گرفتار کر لیا وہاں اگلے دو دنوں میں اس کا بھرپور جواب دیتے ہوئے بھارت کو اس کی اوقات بھی یاد دلا دی لیکن اچانک ڈرامائی طور پر امریکی صدر ٹرمپ کی مداخلت پر عمران خان نے پارلیمنٹ میں بھارتی پائلٹ کو رہا کرنے کے اعلان پر سب کو ششدر کر کے رکھ دیا۔ سوال یہ تھا کہ اگر پاکستانی پائلٹ ہندوستان کے قبضے میں ہوتا تو کیا مودی سرکار بھی اس قدر عجلت میں یہ قدم اٹھاتی؟

اس دوران جون 2019ء میں آئی ایس آئی کے سربراہ سید عاصم منیر کو اچانک تبدیل کر دیا گیا کیونکہ انہوں نے خاتون اول بشریٰ بی بی کی زیر قیادت درجنوں کرپشن کی مصدقہ فائل عمران خان کو پیش کر دی جس پر عمران خان نے بجائے اس کرپشن کی تحقیقات کرنے کے عاصم منیر کو فوری تبدیل کرنے کیلئے باجوہ کی مدد مانگ لی جبکہ باجوہ اس وقت ایک غیر ملکی دورے سے واپس اپنے جہاز میں تھے اور انہوں نے ملک پہنچتے ہی اس کا فوری نوٹس لینے کا وعدہ کیا لیکن اس کے باوجود عمران خان اپنے اس کام کی تکمیل کیلئے ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ جنرل عاصم منیر کی جگہ فیض حمید کو لایا گیا کیونکہ عاصم منیر اپنے سپہ سالار باجوہ کے بیک ڈور چینل کیلئے بھی نامناسب تھے لیکن باجوہ نے یہ قدم اٹھا کر عمران کا مزید اعتماد حاصل کر لیا۔

انہی دنوں ایک بریفنگ میں انکشاف ہوا کہ بھارت کے ساتھ کوئی بڑا بریک تھرو ہونے والا ہے جس پر مجھ سمیت کئی کالم نگاروں نے مودی کی جاری مکاریوں سے خبردار کرتے ہوئے کشمیر پر "سیاسی سرنڈر" سے نہ صرف خبردار کیا بلکہ اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق کی طرف سے مقبوضہ کشمیر میں بھارتی مظالم کے خلاف ایک تفصیلی رپورٹ کو اقوام عالم کے بھرپور نوٹس میں لانے کا بہترین موقع استعمال کرنے کا مشورہ بھی دیا لیکن مودی سرکار نے 5/اگست 2019ء کو نہ صرف اقوام متحدہ کی قراردادوں کو پسِ پشت ڈال دیا بلکہ خود بھارتی آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مقبوضہ جموں وکشمیر میں مارشل لاء نافذ کر کے مقبوضہ کشمیر کو بھارت کا حصہ ڈکلئیر کر دیا بلکہ ان دنوں یہ خبر بھی بڑی گرم رہی کہ امریکا نے کشمیر کے سودے میں باقاعدہ طور پر ملک کی دو بڑی جماعتوں مسلم لیگ ن اور پیپلز پارٹی کو بھی اعتماد میں لیا اور یہی وجہ ہے کہ ملک میں جماعت اسلامی کے سراج الحق کے سوا سب سیاسی جماعتوں کے قائدین نے مجرمانہ خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ کشمیر پر اس فیصلے بعد مسلم لیگ ن اور پیپلز پارٹی نے عمران کے ساتھ مل کر باجوہ

کے عہدے میں تین سال کی توسیع بھی کر دی، جس کے بعد باجوہ کا نشانہ حریت کانفرنس کے رہنما سید علی شاہ گیلانی تھے۔ پاکستان میں ان کے نمائندے عبداللہ گیلانی کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ ایک لمبی کہانی ہے لیکن قصہ مختصر یہ کہ علی گیلانی صاحب حریت کانفرنس سے علیحدہ ہو گئے۔

دراصل 1954 سے سقوطِ ڈھاکہ تک پاکستان کے امریکا کی طرف جھکاؤ نے جو خطیر نقصانات پہنچائے ہیں وہ بھی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے لیکن بد قسمتی سے ان سارے سوراخوں میں ایسے سانپ موجود تھے جو ملکی خزانے کے دودھ پل کر جوان ہوئے تھے اور انہی کی مدد سے ملکی حرمت کو بار بار ڈس کر قوم کو ادھ مویا کر دیا۔ جب 5 / اگست 2019 کو بھارت نے مقبوضہ کشمیر کو غیر قانونی طور پر دہلی میں ضم کیا تو یہ وہ وقت تھا جب ہمیں مقبوضہ کشمیر کو فاشسٹ اور نسل پرست بھارت کے ظالمانہ چنگل سے آزاد کرانے کیلئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے تھی۔ رگ کٹ جانے کے بعد کسی اور چیز سے فرق نہیں پڑتا۔ کم از کم ہمیں مقبوضہ کشمیر اور بھارت کے کچھ دوسرے شورش زدہ علاقوں میں خفیہ کارروائیاں تیز کر دینی چاہیے تھیں لیکن سابق رہنماؤں کی طرح عمران خان اور جنرل باجوہ نے کشمیر کے تنازع سے متعلق اپنے پیشروؤں کی معذرت خواہانہ اور دفاعی پالیسی کو جاری رکھا، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مقبوضہ کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کرنے سے متعلق مودی کے پلان کا جنرل باجوہ اور عمران خان کو علم تھا۔ دونوں کو دورہ امریکا کے موقع پر اس سے آگاہ کر دیا گیا تھا اور ان سے کہا گیا تھا کہ وہ لوگوں کو کنٹرول کریں۔ جنرل باجوہ کو جو اسی سال نومبر میں ریٹائر ہو رہے تھے۔ پینٹاگون کی طرف سے اکیس توپوں کی سلامی، اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ انہوں نے رضامندی دی تھی جس پر فیصلہ کیا گیا کہ انہیں تین سال کی توسیع دی جائے گی۔

دراصل جولائی 2019ء عمران خان اور جنرل باجوہ کے دورہ واشنگٹن کے دوران ٹرمپ اور پینٹاگون کو ایک خاموش انڈراسٹینڈنگ دی گئی تھی جبکہ ٹرمپ کی ثالثی کی پیشکش کا مقصد آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کی حفاظت کی ضمانت دینا تھا۔ یہ سب سے زیادہ افسوسناک ہے کہ ہمارے نام نہاد رہنماؤں نے سسکی بھرے بغیر بھارت کو مقبوضہ کشمیر پر قبضہ کرنے کی اجازت دی۔ سفاک بھارت کو سب سے بڑی فوجی چھاؤنی اور کھلی جیل میں بند کشمیریوں کی نسل کشی اور عصمت دری کرنے کی اجازت مل گئی۔ مودی کو کشمیر کی آبادی کا تناسب تبدیل کرنے کا کھلا لائسنس دے دیا گیا۔ غیر مسلموں کو زمینیں خریدنے اور مسلمان کشمیری لڑکیوں سے شادی کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ اب غیر ملکی کاروباری ٹائیکونز کے ساتھ جی ٹوئنٹی کو بھی وادی کشمیر میں سرمایہ کاری، کاروباری سلطنتیں اور ریزورٹس بنانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔

پاک بھارت لائن آف کنٹرول پر سیز فائر کا اعلان کر دیا گیا۔ جب یومِ پاکستان 23 مارچ 2021ء کو مودی نے عمران خان کے نام خط لکھا تو دفتر خارجہ اسلام آباد کے کان کھڑے ہو گئے۔ امریکا میں متحدہ عرب امارات کے سفیر یوسف العتیبہ کے ذریعہ یہ خبر نکلی کے دبئی میں فیض حمید اور اجیت ڈوول کے درمیان خفیہ بات چیت بہت آگے جا چکی ہے جس کے نتیجے میں یہ خط موصول ہوا ہے۔ اس خط کے موصول ہونے کے کے ایک دن بعد جنرل باجوہ نے عمران کو بتایا کہ مودی 9 / اپریل 2021ء کو پاکستان آئیں گے۔ مودی پہلے تو بلوچستان کے پہاڑی علاقے لسبیلہ میں دریائے ہنگول کے کنارے ہنگلاج ماتا کے مندر جائیں گے اور وہاں ہندوؤں کے سالانہ میلے میں شرکت کریں گے پھر اسلام آباد آئیں گے اور عمران کے ساتھ ملاقات میں پاک بھارت تجارت اور کرکٹ میچوں کی بحالی کا اعلان کریں گے۔ عمران کو بتایا گیا کہ ہنگلاج ماتا کے مندر کو بلوچستان میں بی بی نانی کی زیارت بھی کہا جاتا ہے اور کرتار پور راہداری کی طرز پر راجھستان اور بلوچستان کے درمیان ہنگلاج راہداری بھی کھولی جا سکتی ہے۔ عمران نے جب مسئلہ کشمیر کے مستقبل کے بارے میں پوچھا تو فیض حمید نے کہا کہ 20 سال تک مسئلہ کشمیر جوں کا توں رہے گا اور 20 سال کے بعد کوئی حل تلاش کریں گے۔

اس موقع پر شاہ محمود قریشی نے خان کو خبر دار کیا کہ ہم پاکستان پارلیمینٹ میں اس کا کیا جواب دیں گے ؟ ہم نے الیکشن بھی لڑنے ہیں ہم پر کشمیر فروشی کا الزام لگ جائے گا۔ جولائی 2021ء میں آزاد کشمیر میں عام انتخابات ہونے والے تھے۔ خدشہ تھا کہ اگر اپریل میں مودی نے پاکستان کا دورہ کیا تو جولائی میں تحریک انصاف کا آزاد کشمیر سے صفایا ہو جائے گا۔ اس دوران اقتصادی رابطہ کمیٹی بھارت کے ساتھ تجارت کھولنے کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن شاہ محمود قریشی نے نہ صرف بھارت کے ساتھ بیک ڈور چینل مذاکرات سے لاعلمی ظاہر کر دی بلکہ وفاقی کابینہ نے بھارت کے ساتھ تجارت کی بھی مخالفت کر دی۔ جس کے ردِ عمل میں باجوہ نے شدید غصے میں عمران سے شکائت کرتے ہوئے کہا کہ "ہم نے اب تک جو کچھ بھی کیا، آپ سے پوچھ کر پلان کے مطابق کیا "جواب میں خان نے کہا" فکر مت کریں، ذرا آہستہ چلیں اور اپوزیشن کو فوری طور پر گرفتار کر کے جیل میں ڈالیں تا کہ ہمارے اس پلان کے خلاف کوئی رد عمل سامنے نہ آ سکے "۔ گویا عقدہ یہ کھلا کہ اس سازش میں اکیلا جنرل باجوہ شامل نہیں بلکہ عمران خان ڈبل گیم کر رہا تھا۔

ادھر قریشی نے باجوہ کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کیلئے دفتر خارجہ آنے کی دعوت دی اور اس ملاقات میں ان پر واضح کیا گیا کہ جب تک بھارت 5 اگست 2019ء کے اقدامات واپس نہیں لیتا تو بھارت کے ساتھ تعلقات کی بحالی کو پاکستان کی شکست سمجھا جائے گا لیکن دوسری طرف ستمبر 2021ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سیشن میں کشمیر پر اپنا روایتی مؤقف دہرا کر قوم کے سامنے سیاسی مقبولیت کو بحال کرنے کا داؤ کھیلا۔ یقیناً عمران خان کی مرضی کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ شاہ محمود قریشی اپنے طور پر ایسی تقریر کرتا لیکن دوسری طرف اس تقریر نے نہ صرف باجوہ کو مایوس کر دیا بلکہ جب امریکی آقا نے وعدہ شکنی کا نوٹس لیا گیا تو انہیں یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ یہ "نورا کشتی " آزاد کشمیر میں انتخابات جیتنے کیلئے ہے اور پاکستان میں اپنی سیاسی ساکھ کو بچانے کیلئے ضروری تھا۔ جس کے بعد باجوہ بیک ڈور چینل کے ذریعے بھارت کو یقین دلاتے رہے کہ اپریل میں بریک تھرو ہو جائے گا۔

مارچ 2022ء میں عمران خان کے خلاف تحریک عدم اعتماد آئی تو عمران باجوہ کو ایک اور ایکسٹینشن کے ساتھ ساتھ ان کی تمام باتیں ماننے کیلئے تیار ہو گیا۔ باجوہ اپنے ہی لائے ہوئے وزیر اعظم کو ہٹانا نہیں چاہتا تھا، صرف جھٹکا دینا چاہتا تھا لیکن جھٹکا ذرا شدید ہو گیا۔ خان نے بھی جوابی جھٹکے دینے شروع کر دیئے اور لڑائی دونوں کے قابو سے باہر ہو گئی اور ان دونوں کی اقتدار کی مجرمانہ ہوس نے ملک کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کر دیا۔ اس لڑائی میں سب سے بڑا اور بدترین سبق تو یہ ہے کہ کس طرح سی آئی اے نے اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے یہ جال پھیلایا اور ان دونوں افراد سمیت دیگر سیاسی جماعتوں کو اپنے دامِ فریب میں پھانس کر اپنے مقاصد حاصل کئے۔

یہ بھی افسوسناک حقیقت ہے کہ عمران خان نے اپنے پونے چار سالہ دور میں سابق حکومت پر الزام تراشی اور سیاسی مخالفین کو نشانہ بنانے پر توجہ مرکوز رکھی۔ معیشت کو بہتر بنانے یا اہم اصلاحات کرنے یا منقسم قوم کو اکٹھا کرنے یا کشمیریوں کے دکھ کو کم کرنے پر بہت کم دھیان دیا گیا۔ تب ملٹری اسٹیبلشمنٹ بھی ایک پیج پر تھی۔ امریکا کو خوش کرنے کیلئے سی پیک کو منجمد کرنا ایک مجرمانہ فعل تھا اور پاکستان کے سب سے قابل اعتماد دوست چین کو پریشان کرنے کی قیمت چکانی پڑی۔

2018ء کے الیکشن میں دھاندلی نے ایک ایسا گند اکھیل شروع کیا جس کے نتیجے میں ابھی تک سیاست میں گندگی پھیلی ہوئی ہے۔ فوج کو ہمیشہ سیاست سے دور رہنا چاہئے اور سیاستدانوں کو تمام اہم فیصلے پارلیمینٹ میں کرنے چاہئیں۔ اب بھی وقت ہے کہ سیاسی جماعتیں سیاسی بلوغت سے کام لیتے ہوئے اپنے درمیان کے اختلافات کو ذاتیات سے بلند ہو کر ملکی مفاد کیلئے بہتر فیصلے کرنے میں ایک دوسرے کے معاون بنیں وگرنہ بیرونی ملکوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا

کر ملکی مسائل سے نجات حاصل نہیں کی جاسکتی۔

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی، بالآخر آج کے مضبوط کردار جب آئندہ کا ماضی ٹھہریں گے تو انہیں یہ بات یاد رکھنا ہو گی کہ کہیں کل کلاں ان کو کسی تہوار میں صفائی پیش نہ کرنی پڑ جائے جس طرح اپنے وقت کے انتہائی طاقتور باجوہ کو ایک ہاتھ بزرگ صحافی مجیب الرحمان شامی کے کندھے پر اور دوسرے ہاتھ میں قرآن تھامے اپنی ماں کی قبر کی قسم اٹھانی پڑ گئی کہ اس نے نہ تو نواز شریف کو ملک سے باہر بھیجا اور نہ ہی عمران کو اقتدار سے محروم کرنے میں کوئی کردار ادا کیا۔

تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو اس طرح حکومتوں کو گرانے اور تختہ الٹنے کا جو سلسلہ 1952ء میں مصر سے شروع ہوا تھا، وہ آج بھی مسلمان ممالک میں کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے لیکن میرے رب کا اپنا پروگرام ہے کہ اس صدی میں سب سے بڑی جارحیت کے باوجود افغانستان میں ایک بڑی رسوائی کا داغ اس کا مقدر بن گیا لیکن سب سے زیادہ تلخ حقیقت یہ کہ جن طالع آزماؤں نے اقتدار میں آنے کیلئے سی آئی اے کے منصوبے پر عمل کیا، اسی نے ان کو شکست سے دوچار اور ان کے ممالک کو تباہ کر کے اقتدار سے الگ کیا۔ ناصر، صدام اور مشرف، اب عمران کے ساتھ باجوہ کو بھی شامل کر لیں، ممکن ہے کل کلاں موجودہ حکمران بھی اسی قطار کا حصہ ہوں جن کو تاریخ ایک عبرتناک مثال کے طور یاد رکھے گی کہ انہوں نے بھی عمران اور باجوہ سمیت کشمیر فروخت کرنے میں انتہائی خاموشی سے درپردہ حصہ لیا۔

اے خاک وطن اب تو وفاؤں کا صلہ دے
میں ٹوٹتی سانسوں کی فصیلوں پہ کھڑا ہوں

بروز ہفتہ 25 شوال المکرم 1445ھ 4 مئی 2024ء

امت مسلمہ اور عالمی بارودی سرنگیں

دنیا کے بیشتر ممالک کے موجودہ نقشے اور حدودِ اربعہ، بیسویں صدی کی عالمگیر جنگوں کی زیرِ اثر بنے ہیں۔ یقیناً مشرقِ وسطیٰ بھی اس میں شامل ہے۔ اس خطے کے ممالک مگر، تاریخی، جغرافیائی، نسلی، لسانی، تہذیبی، کسی بھی عامل سے زیادہ سابق استعماری قوتوں کی خواہشات کے تحت میز پر کھینچی گئی لکیروں سے بنے ہیں۔ مثلاً لبنان، شام، اردن، اسرائیل، عراق، سعودی عرب، کویت، اومان وغیرہ کے نقشے دیکھئے، صاف پتہ چلتا ہے کہ سیدھی سیدھی لکیریں کھینچ کر، یہ نئے ممالک، عالمی نقشے میں "کاڑھے" گئے ہیں۔ یہ تمام ممالک، ماضی میں بڑی سلطنتوں کے صوبے یا ضلعے ہوا کرتے تھے۔ یورپ کی استعماری اقوام خصوصاً برطانیہ اور فرانس نیا پنی استعماری سوچ کے مطابق، یہ نئے ممالک تخلیق کر دیے گئے، ان کی تشکیل میں امریکا عملاً شریک نہیں تھا۔

اب تاریخ کا پہیہ ایسے مقام پر آ گیا ہے کہ آج کی سب سے بڑی استعماری قوت امریکا اور اس کے اتحادی یورپی ممالک اور اسرائیل کو نیا مشرقِ وسطیٰ درکار ۔ تمام ہے۔ چنانچہ گزشتہ صدی کے اختتام کے ساتھ ہی نئے عہد اور نئی سرحدوں کا بگل بجا دیا گیا ہے۔ علاقائی عناصر و عوامل کو مارچ کا حکم مل چکا ہے۔ ہرکارے، کارندے، پیادے، فیل و فرزیں روبوٹس کی طرح حرکت میں آ چکے ہیں۔ پرانے زمانے کے راجاؤں اور نوابوں کے شکار کیلئے، جس طرح ہانکا لگا کرتا تھا، مشرقِ وسطیٰ میں شکار اور شکاری اور ان کے ہانکا لگانے والے سبھی اس کھیل کا حصہ بن کر، اپنا اپنا کردار بخوبی نبھا رہے ہیں۔ شاید اگلے ایک عشرے کے اندر رہی، مطلوب نیا مشرقِ وسطیٰ تشکیل پا جانے کی خواہش و کوشش ہے۔ ہم اہلِ حرم حسبِ سابق اِس رومن اکھاڑے کی سیڑھیوں پر بیٹھے، محض تماشائی ہیں جو اپنی بھوک اور اِفلاس، اپنا دکھ اور غم غلط کرنے کیلئے، یہ کھیل دیکھ رہے ہیں، تبصرے کر رہے ہیں یا زیادہ سے زیادہ اس میں معاون و مددگار بننے کی خواہش رکھتے ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ کے حالیہ اکھاڑے میں جاری کھیل کا جائزہ لیا جائے تو چیدہ چیدہ 19 / نکات اس طرح سامنے آتے ہیں:۔

☆1۔ دنیا کے موجودہ تناظر میں، چار مسلم ممالک ایسے ہیں، جن کے حالات و واقعات، جن کا عمل اور بے عملی (یا بد عملی)، جن کا استحکام یا انہدام اور جن کی قوت و یکجہتی یا کمزوری و انتشار سارے عالمِ اسلام کو سب سے زیادہ متاثر کر سکتے ہیں اور یہ ممالک سعودی عرب، مصر، ترکی اور پاکستان ہیں۔

☆2۔ یہ چاروں ممالک ہم آہنگ ہو کر، ایک دوسرے کے ہاتھ تھام کر اور باہمی اعتماد و مشاورت کے ساتھ عالمی بساطِ سیاست پر، دھیرے دھیرے ہی سہی، لیکن مظبوط قدم رکھتے چلیں، تو مسلم امہ کی بے چارگی و بے بسی میں تیزی سے، قابلِ لحاظ کمی آتی جائے گی۔

☆3۔ اِس اتحادِ اربعہ کے جھرمٹ میں کئی اور مسلم اور غیر مسلم ممالک، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، شامل ہوتے جائیں گے۔ یوں یہ نیا عالمی بلاک آج کی بے توازن اور بے کل دنیا میں، قدرے توازن و قرار کا ذریعہ بن سکے گا۔

☆4۔ چند برس قبل اللہ نے یہ سنہری گھڑی قریب کر دی تھی، جب مصر میں ڈاکٹر محمد مرسی کی جسٹس پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی تھی، اور ترکی میں رجب طیب ایردوان کی "اے کے پی" کی حکومت سے اس کا بڑا اچھا تعلق پروان چڑھ رہا تھا۔ گویا اتحادِ اربعہ کیلئے حالات سازگار ہونے جا رہے تھے۔

☆5۔ بدقسمتی سے آلِ سعود کے پچھلے بادشاہ اور کچھ شہزادے، امارات کے حکمراں، خصوصاً اُن کے موجودہ ولی عہد، اسرائیلی لابی اور مغربی استعمار نے مصر پر، اور امت پر نہایت اوچھا وار اور تاریخی ظلم کیا۔ یہ گویا سنبھلتی اور قسمت بدلتی مسلم دنیا کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دینے کے مترادف تھا۔

☆6۔اِسی دوران، شام کے معاملہ میں جو ہوا، وہ حکمتِ عملی اور اسٹریٹجی کے لحاظ سے ایک تاریخی بلنڈر تھا۔ اسرائیل کی پشت پناہ مغربی قوتوں نے سازش کا جو جال بنا، بدقسمتی سے اس میں ترکی، سعودی عرب، قطر اور بعض دیگر عرب حکومتیں، یہاں تک کہ شام کے اِخوان بھی، حیرت انگیز طور پر بڑی آسانی سے پھنس گئے۔ اب ان کے گلے میں گویا چھچھوندر پڑا ہے۔ 1981 میں بھی شام کی اِخوان، اپنے نوجون عنصر کے دباؤ میں آکر خروج کی خودکش غلطی کر چکی تھی، جس کا خمیازہ ربع صدی تک اسے بھگتنا پڑا۔ خدا جانے ہمارے یہ دوست ممالک اس استعماری و صہیونی جال سے بسلامت کیونکر نکل پائیں گے کیونکہ اب غزہ میں اسرائیل کی جانب سے کھیلا جانے والا خونی کھیل خود استعمار کے گلے کی ہڈی بن چکا ہے؟

☆7۔ایک مضبوط رائے رہی ہے کہ شام کو اس کے حال پر ہی چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ بشارالاسد کی علوی یا نصیری حکومت سے امتِ مسلمہ کو، یا اتحادِ امت کو، کوئی فوری خطرہ لاحق نہیں تھا بلکہ دمشق میں حماس کو ایک مناسب اور مضبوط ٹھکانا میسر تھا، جو اب اس سے چھن چکا ہے۔ شامی فوج کی صورت میں، اسرائیل کے سامنے ایک مظبوط عسکری قوت بھی موجود تھی، جو کلیتاً تباہ ہوگئی ہے۔ اربوں ڈالرز میں خریدے ہوئے لڑاکا جہاز، ٹینک، توپیں، میزائل، گولا بارود، یا تو استعماری قوتوں کی بمباری سے تباہ ہوگئے یا اپنے ہی لوگوں سے لڑنے میں ضائع ہوگئے۔ شام، اِس علاقہ میں نسبتاً بہتر فوج رکھتا تھا۔ وہ فوج اسرائیلی نفسیات کو کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ خانہ جنگی میں وہ بھی تتر بتر ہوگئی جو خطے میں استعماری قوتوں کی پیش قدمی اور فتح کی نوید ثابت ہوئی۔

ابتدا ہی سے مجھے شام کا یہ سارا جہاد سمجھ نہیں آتا تھا۔ اب تو یہ امر اظہر مِن الشمس ہو چکا ہے کہ یہ بہت بڑا اسٹریٹیجک بلنڈر تھا۔ شام میں، کئی سال سے ملی خودکشی کی گلوٹین مشین اب بھی مسلسل چل رہی ہے جبکہ غزہ میں جاری اسرائیلی جارحیت کے بعد اس سے سبق حاصل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔
مسلم دنیا میں صدیوں سے موجود سب سے بڑی فرقہ وارانہ (شیعہ، سنی) تقسیم زیادہ شدت سے نمایاں ہو کر، عالمگیر پیمانے پر سامنے آکھڑی ہوئی ہے۔ عصرِ رواں کی استعماری قوتوں نیاس تقسیم کو مؤثر طور پر بروئے کار لا کر اپنے بہت سے منصوبے آگے بڑھائے ہیں، اور وہ اس کا دائرہ مزید بڑھائیں گی۔ فی الحال اس میں کمی کا بظاہر کم ہی امکان ہے لیکن اس کے باوجود امریکی وزیر خارجہ انٹونی بلنکن مشرقِ وسطیٰ کے دورے کیلئے سعودی عرب پہنچ چکے ہیں اور بظاہر اپنے مذاکرات کی کامیابی کیلئے انہوں نے ایک مرتبہ پھر آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کا جھانسہ بھی دیا ہے۔ اسرائیل میں نیتن یاہو کے خلاف مظاہرے شروع ہو چکے ہیں اور یاد رہے کہ نیتن یاہو کے خلاف سنگین کرپشن اور بدعنوانی کے مقدمات ان کو تاعمر جیل بھیجنے کیلئے منتظر ہیں جس کیلئے نیتن یاہو اب مکمل طور پر امریکا کی مدد کا محتاج بن کر اپنی خلاصی چاہتا ہے۔

☆8۔اتفاق سے میں دینی اور علمِ سیاسیات کا طالب علم بھی ہوں۔ میں پوری ایمانداری سے سمجھتا ہوں کہ مسلم ممالک میں، عہدِ ماضی والے تصورِ خروج پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ بالخصوص ایسی دنیا میں جہاں دشمنانِ دین وملت، ہر قابلِ لحاظ مسلم ملک کا تیاپانچا اور قیمہ کرنے کی مہم پر صاف دِکھائی دے رہے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ خروج ایک سیاسی اجتہاد اور فقہ سیاسیات کی ایک اصطلاح ہے۔ یہ نہ ایمانی مسئلہ ہے، اور نہ فرائض وواجبات سے اِس کا کوئی تعلق ہے۔ البتہ انسانی تمدن کے ایک خاص دور سے متعلق ضرور رہا ہے۔

☆9۔مصر کو جس طرح عملاً اسرائیلی تولیت میں دے دیا گیا ہے، اس عاقبت نااندیش اور ملی بربادی میں آلِ سعود اور سلفی مکتبِ فکر کے کلیدی کردار پر غور کرتا ہوں تو دل تھام کر رہ جاتا ہوں۔ کئی بار میرا بڑا دل چاہا کہ کچھ صہیونی آلہ کاروں کیلئے "قنوت" والی بددعائیں کروں، عمرہ پر گیا تو وہاں بھی یہی دل چاہا مگر میرے دماغ نے میری زبان پکڑے رکھی۔ اِس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ سعودی عرب کا داخلی انتشار، چاہے وہ شاہی خاندان کے اندر ہو یا

پوری مملکت میں، فی زمانہ ہر گز باعثِ خیر نہ ہو گا۔ اِس سے ہمارے دین وملت کو کچھ نہیں ملے گا بلکہ امت میں اِس کا نفسیاتی فال آوٹ ہمارے اندازوں سے کہیں زیادہ ہو گا اس لئے حرمین کی حرمت کی وجہ سے ان کے سدھرنے کی دعائیں کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

☆10۔ عربستان کے جنوب مغربی کونے پر، یمن میں جو ہو رہا ہے، اس کے دو فعال ترین فریقین میں ایک طرف ایران ہے، تو دوسری طرف سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات۔ دونوں فریقوں نے جس عاقبت نااندیشی کا مظاہرہ کیا ہے، اس سے یمن تو برباد ہو ہی گیا مگر تیل کا جو پیسہ دھواں بنا کر اڑا دیا گیا اور ملی وجود میں نفرتوں کا جو زہر سرایت کر چکا، اس کے کامل اثرات آہستہ آہستہ ہی ختم ہوں گے لیکن اس کے باوجود وہاں مٹھی بھر حوثیوں نے اپنا وجود ظاہر کر دیا ہے کہ اس حالت میں بھی وہ دنیا کی استعماری قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہیں اور ابھی حال ہی میں جدید ترین ٹیکنالوجی سے آراستہ ڈرون جہاز کو گرا کر دشمنوں کو ورطہ حیرت میں مبتلا کر دیا ہے۔

☆11۔ اگر یاد ہو تو اسی خطے میں استعماری قوتوں نے "آنسو کے قطرے" جیسے ننھے سے ملک قطر کے خلاف "چار کا ٹولہ" سامنے لائے تھے حالانکہ اسی قطر نے اربوں ڈالر سے تعمیر کردہ اپنا بحری اڈہ مکمل طور پر امریکی دسترس میں دے رکھا ہے لیکن اس کے باوجود یہاں بھی اپنی منافقانہ پالیسیوں کی بنا پر خطے میں اپنی موجودگی کی ضرورت کو ثابت کرنے کیلئے فریقین کو اپنی اوقات میں رکھنے کیلئے یہ سارا کھیل کھیلا گیا حالانکہ سب جانتے تھے کہ "چار کے ٹولہ" کی حیثیت شکاری شِکرہ سے زیادہ نہیں۔ اصل فیصلہ ساز تو وہ ہاتھ اور ذہن ہے جس نے اِن شِکروں کو قطر کا کبوتر شکار کرنے پر مامور کیا تھا۔ قطر کے خلاف اقدام کرنے کے بعد، چند ماہ کے اندر ہمارے عرب بھائیوں نے تقریباً 180 / ارب ڈالر کے سودے صرف امریکا سے اسلحہ خریدنے کیلئے کر لیے تھے جو بعد ازاں اس اسلحے کی دیکھ بھال اور مرمت کیلئے مزید اربوں ڈالر کے معاہدے کئے گئے جس سے 18 ہزار امریکیوں کو ملازمت کے نئے مواقع ملے۔ آنے والے برسوں میں اس سے چھ گنا زیادہ خریداری کی نوید بھی دے دی گئی ہے۔

یاد رہے! کہ عرب بھائیوں کا یہ معاہدہ تین درجن اسلامی ممالک کے مجموعی بجٹ سے بھی زیادہ ہے۔ یہ اسلحہ کس کے خلاف خریدا جا رہا ہے؟ ایک دوسرے کے خلاف! یہی وجہ ہے کہ امریکی اسلحہ کی عربوں کو فروخت کے خلاف اسرائیل کی طرف سے ایک بھی لفظ نہیں کہا گیا بلکہ ایک ایک امریکی صہیونی سینیٹر نے ایک فقرے میں اس کی جامع تشریح کرتے ہوئے کہا کہ "ہم اس کی مخالفت کیوں کریں جہاں اسرائیل کی حفاظت کیلئے عربوں کا سرمایہ استعمال ہوا ہے"۔ صہیونی ریاست، اسرائیل سے مستقبل قریب میں کوئی جنگ ہونی ہے اور نہ اس سے کوئی خطرہ باقی رہا ہے۔ جنگ اس لیے نہیں ہونی کہ اسرائیلی مقاصد بغیر کوئی گولی چلائے حاصل ہو رہے ہیں، پھر اسے عربوں سے لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ خطرہ اس لیے نہیں کہ اب اسرائیل سے دوستی کی مسابقت شروع ہو گئی ہے۔ شنید ہے کہ دونوں حکومتوں میں مسلسل رابطہ ہے اور مفاہمت کے مختلف منصوبوں پر کام جاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی مرتبہ امریکی صدر جو بائیڈن نے یروشلم سے براہِ راست ریاض کا سفر کر کے اپنے خاموش کردار کا اعلان کر دیا تھا۔ توقع کی جا رہی تھی کہ اگلے تین تا چھ ماہ میں کسی باقاعدہ مفاہمت کا اعلان ہونے والا تھا کہ غزہ میں ہونے والی کاروائی حماس کے شہدا نے اپنے خون کی گہری لکیر سے اسے فی الحال روک دیا ہے۔

☆12۔ یہ خبریں بھی سامنے آئی ہیں کہ حماس کے حملے سے قبل لبنان پر "حزب اللہ" پر حملے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اور اس یلغار میں اسرائیل کو امریکی شہہ پر مصر اور سعودی عرب سمیت دیگر عرب ممالک کی تائید حاصل کرنے کیلئے مذاکرات آخری مراحل میں تھے۔ حزب اللہ کو ختم کرنے کے بعد حماس کو ختم کرنے کا پلان ترتیب دیا گیا تھا جس میں پہلا دور "حماس" کو گلا گھونٹ کر مارنا طے پایا تھا اور دوسرے مرحلے میں جنگی طاقت سے بے دخل کرنے کا پلان ترتیب دیا گیا تھا۔

☆13۔ چین کی مدد سے ایران اور یمن میں جاری جنگ بندی کے بعد امریکا، اس کے اتحادی اور اسرائیل کو اپنے مستقبل کے منصوبے میں ناکامی اور تاخیر برداشت نہ ہوئی جس کیلئے فوری طور پر خطے میں پلان "بی" پر عملدرآمد شروع کر دیا گیا لیکن تاہم وہ اپنے منصوبے کی کامیابی سے واقف ہیں کہ سعودی عرب اور ایران میں تصادم ہو یا زبانی جنگ جاری رہے، دونوں صورتوں میں خطہ، عدم استحکام اور نفرتوں کی آماجگاہ بنا رہے گا۔ اس صورتحال کا بڑا گہرا اثر پوری مسلم دنیا پر پڑھ رہا ہے جس کی بنا پر پوری امت مسلمہ عدم استحکام اور نفرتوں کی زہرناک فضا کا شکار ہو چکی ہے۔

☆14۔ ایران بھی ساسانی سلطنت کے خاتمے کے بعد پہلی بار عروج کے ایسے زینے کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہے جو اس کیلئے حالات نیا اور خود اس کی حکمت کاری نے ممکن بنا دیا ہے۔ مشرق میں زاہدان سے لیکر، مغرب میں بیروت تک، دمشق سے لیکر یمن کے ساحلوں تک اس کو وسیع و کشادہ عمل داری مل رہی ہے۔ مسلم تاریخ میں ایسا پہلی بار ہو رہا ہے۔ خود بغداد پر کسی شیعہ حکومت کا قیام اب سے پہلے کبھی ممکن نہیں ہوا تھا۔ یہ صورتحال مسلمانوں کے سوادِ اعظم (سنی دنیا) کیلئے ہضم کرنا سہل نہیں۔ اسی لئے اہلِ مغرب اس ذہنی و نفسیاتی و جذباتی تقسیم کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کر رہے ہیں۔ امریکا اور ایران میں غالباً کوئی باقاعدہ مفاہمت نہیں ہے مگر سوئے اتفاق سے دونوں قوتیں، تاریخ کے ایک ہی صفحے پر آ کھڑی ہوئی ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈپلومیسی میں بہرحال اہلِ فارس بہت آگے ہیں۔ اس کی شہادت آئے دن کے حالات و واقعات دے رہے ہیں جہاں پہلی مرتبہ ایران کی سب سے بڑی مذہبی طاقت کے سرخیل نے سنیوں کے ساتھ مکمل اتحاد کا فتوی جاری کر کے تمام شیعہ قوتوں کو احترام کا درس دیا ہے۔

☆15۔ خطے میں مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے والی قوتوں نے خطے میں بادشاہتوں کو خوفزدہ کرنے کیلئے سوشل میڈیا کے محاذ پر بڑی تیزی کے ساتھ یہ پروپیگنڈہ کو پھیلانا شروع کر دیا ہے کہ سعودی عرب کے حکمراں خاندان میں اِن دنوں جو ٹوٹ پھوٹ اور محلاتی کشمکش جاری ہے، اس سے ملک اور حکمراں طبقے کا داخلی استحکام بری طرح متاثر ہو رہا ہے اور آلِ سعود کی حکومت جو اب تک باہمی اتفاق و اتحاد کے پائے پر کھڑی تھی، اب ڈانواں ڈول ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ یاد رکھیں! اگر یہ پایہ کمزور ہو گا تو خطے میں اتحاد و اتفاق کا پورا محل ضعف و انہدام کے خطروں سے دوچار ہو جائے گا۔ ایسے میں استعماری قوتوں کیلئے اپنے من مانے فیصلے کروانا مزید آسان ہو جائے گا جس کیلئے ضروری ہے کہ تاریخ سے سبق حاصل کرتے ہوئے آلِ سعود کو ان حالات سے بچایا جائے جو مغلوں کی حکومت کے آخری سو سالوں میں فرنگیوں نے کیا تھا کہ وہ جب چاہتے تو ولی عہد اور بادشاہ تبدیل کر دیتے تھے۔

☆16۔ دو عشروں سے، مغرب کی دانش گاہوں اور پالیسی سازی کے مراکز میں دو مسلم اقوام سے ہمدردی کا مروڑ اٹھ رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دو قومیں ایسی ہیں، جنہیں ممالک دستیاب نہیں حالانکہ وہ اپنے لیے، الگ الگ ریاستیں بنانے کا پورا استحقاق رکھتی ہیں۔ یہ دو مسلم قومیں کرد اور بلوچ ہیں۔ ایک طرف کردستان کی پیدائش کیلئے زمین ہموار کی جا رہی ہے تو دوسری طرف بلوچستان کیلئے جو ڑ توڑ زوروں پر ہے۔ پہلے مشن کیلئے، اسرائیل کو اسائنمنٹ دیا گیا ہے، اور دوسرے کی ذمہ داری بھارت کے سپرد کی گئی ہے۔ بیک وقت دونوں پر کام جاری ہے لیکن زیادہ تیزی کردستان کے معاملے میں دکھائی جا رہی ہے۔ جس کے نتیجہ میں ترکی، شام، عراق، ایران بری طرح متاثر ہوں گے جبکہ گریٹر بلوچستان کے مشن کا ہدف پاکستان، ایران اور افغانستان

کو "کٹ ٹو سائز" کرنا ہے جس کیلئے امریکا کا تھنک ٹینک خطے کا نیا نقشہ بھی جاری کر چکا ہے اور اب تک خطے کی ٹوٹ پھوٹ کے جاری کردہ سارے پلان اور تاریخیں بری طرح ان کے مکارانہ عمل کے چہرے پر ایک بھرپور طمانچہ بھی رسید کر چکی ہیں جس کے بعد انہی اداروں سے آوازیں اٹھنا شروع ہو گئی ہیں کہ ہمارے اس پلان میں فی الحال سب سے بڑی رکاوٹ پاکستان کی فوج ہے۔

☆17۔ سعودی عرب، اپنے اثاثے بیچنے کا اعلان کر چکا ہے۔ اپنے بجٹ کے خسارے پورے کرنے کیلئے اپنا زرِ محفوظ پہلے ہی استعمال کرنا شروع کر چکا ہے ۔ نیز ایک بہت بڑا پراجیکٹ "نیوم" کے نام سے اردن، مصر اور اسرائیلی سرحد کے قریب شروع کر چکا ہے۔ تبوک میں 26500 / اسکوائر کلومیٹر پر مشتمل یہ ایسا سعودی عرب ہو گا، جہاں سعودی عرب کی اقدار و روایات اور شرعی قوانین کا داخلہ ممنوع ہو گا۔ یہ پراجیکٹ مکمل ہو سکے گا یا نہیں، یہ بتانا دشوار ہے البتہ اس کے نام پر پٹرول کی دولت، پانی کی طرح بہہ رہی ہے اور اپنی تکمیل پر یہ مغربی استعماری معیشت کا حصہ بن جائے گا۔

☆18۔ بہت اہم بات جاننے اور سمجھنے کی یہ بھی ہے کہ اِستعماری قوتوں نے اپنے میڈیا کے ذریعے یہ واویلا شرع کرنا شروع کر دیا ہے کہ اس وقت دنیا میں 8 مسلم ممالک جو "اٹلس" پر نظر آتے ہیں لیکن وہ اپنا وجود عملاً کھو چکے ہیں اور حقیقت میں "نان ایگزسٹنٹ" اور "ناکام ریاستیں اور وہ ہیں: افغانستان ، عراق، شام، لبنان، یمن، لیبیا، صومالیہ اور مالی۔ اگر اِس فہرست میں کل کلاں سعودی عرب، ترکی، تیونس، نائیجیریا، الجزائر، پاکستان یا کسی کا بھی اضافہ کر دیا گیا، تو دین و ملت کو جو نا قابلِ تلافی نقصان ہو گا، اس کا تو اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا لیکن "ون ورلڈ آرڈر" کی تکمیل کیلئے اس کو بروئے کار لانے کی پس پردہ کوششیں جاری ہیں۔

☆19۔ صورتحال پر ہم اپنے غصے یا فرسٹیشن کا اظہار ضرور کریں مگر احوالِ جہاں اپنے اِرد گرد کے زمینی حقائق اور چاروں طرف پھیلی بارودی سرنگوں کو بھی پیشِ نظر رکھیں، اِنہیں ہر گز نظر انداز نہ کریں۔ ہم سب کی کوشش ہونی چاہیے کہ سب سے پہلے تو اپنی شریانوں سے بہتے لہو کو روکیں، اپنے کمروں اور باورچی خانے سے اٹھتے شعلوں کو سرد کریں اور اپنے ملکوں کو بطور "پنچنگ بیگ" استعمال نہ ہونے دیں۔ آخر اس دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں الٰہی! ہم پر، اپنے کمزور بندوں پر اپنے نام لیوا بے عمل اور بد عمل مسلمانوں پر، اب رحم فرما، کرم فرما، راہِ نجات دِکھا، اس پر چلنے ہی کی نہیں، چلانے کی بھی صلاحیت و فراست، عزم و ہمت اور سلیقہ و توفیق عطا فرما۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۘ وَاغْفِرْ لَنَا ۘ وَارْحَمْنَا ۘ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿286﴾

﴿ایمان لانے والو! تم یوں دُعا کرو﴾ اے ہمارے ربّ! ہم سے بھول چُوک میں جو قصور ہو جائیں، ان پر گرفت نہ کرنا۔ مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال ، جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔ پروردگار! جس بار کو اُٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں ہے، وہ ہم پر نہ رکھ۔ ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر، تُو ہمارا مولیٰ ہے، کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔ آمین، یا ارحم الرحمین۔

بروز منگل 28 شوال المکرم 1445ھ 7 مئی 2024ء

واحد سپر پاور کا گھمنڈ

میں اس خوفناک لمحات سے بھی واقف ہوں جب ایٹمی بریف کیس کا بٹن دبانے کی مکمل طاقت رکھنے والے امریکی صدر ٹرمپ کے بارے میں ایک مشہور زمانہ امریکی ماہر نفسیات بھرپور دلائل کے ساتھ عالمی میڈیا پر ببانگ دہل ٹرمپ کی دماغی صحت پر اپنے شک وشبہ کا اظہار کرتے ہوئے اپنے خدشات کا اظہار کر رہی تھی جس سے تمام دفاعی اور سیاسی تجزیہ نگاروں میں ایک خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ماہر نفسیات ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ ٹرمپ نے جب سے امریکی صدر کا منصب سنبھالا ہے تب سے وہ ایسا بہت کچھ کر رہے ہیں جو امریکا کو ایک عظیم طاقت بنانے والے عوامل کے خلاف اور دنیا کو مکمل تباہی ۔ان کی طرف دھکیل سکتا ہے۔انہوں نے قدم قدم پر ایسی باتیں اور حرکتیں کی ہیں جو ان کے منصب کے تقاضوں سے کسی بھی طور میل نہیں کھاتیں کی کوشش رہی ہے کہ جو کھلنڈراپن ان کے مزاج میں پایا جاتا ہے وہ امریکی صدر کے منصب میں بھی دکھائی دے۔امریکا کو ایک عظیم طاقت میں تبدیل کرنے والے اصولوں، طریقوں اور خواص کو انہوں نے نشانے پر لینے کی بارہا کوشش کی ہے اور یہ بات اب بیشتر امریکی زیادہ شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

ٹرمپ عالمی سیاست کے حوالے سے کوئی بھی پیش گوئی انتہائی دشوار کام ہے۔حالات اتنی تیزی سے بدلتے ہیں کہ ہر پیش گوئی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ کا معاملہ تو اب اور بھی پیچیدہ ہو گیا ہے۔اس نے اپنے دورِ صدارت کے پہلے ایک سال کے دوران ایسا بہت کچھ کیا جس کی بنیاد پر ان کے بارے میں پورے یقین سے کچھ کہنا انتہائی دشوار تھا۔پیش گوئی کرنے والوں کو بھی اندازہ تھا کہ وہ اگر کچھ کہیں گے تو ٹرمپ اس کے خلاف کچھ نہ کچھ کر کے انہیں ناکامی وذلت سے دوچار کرنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کرے گا۔تاہم یہ بات البتہ پورے یقین سے کہتے رہے کہ مورخین جب ٹرمپ کے ادوار کے بارے میں لکھیں گے تو اس نکتے پر ضرور زور دیں گے کہ اس نے اپنے کھلنڈرے مزاج سے وہ نظم وضبط تباہ کر دیا جو امریکی صدر کیلئے لازم قرار دیا جاتا تھا۔یقیناً اپنے دورِ صدارت میں اس نے بہت کچھ اپنی خواہش کے اصول کی بنیاد پر کیا، افغانستان میں روائتی بموں کی "ماں" جیسا خطرناک بم گرانے میں شرم محسوس نہ کی اور پھر برملا عالمی میڈیا کے سامنے افغانستان پر ایٹم بم گرنے کی دھمکیاں بھی دیں، کبھی نئے سال کی آمد پر خطے میں اپنے سب سے اہم اتحادی پاکستان کے خلاف ٹوئیٹر میں نازیبا الفاظ پر مشتمل ہرزہ سرائی سے بھی باز نہ آیا جس کے نتیجے میں امریکا کو کئی معاملات میں بہت سبکی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔تاہم دنیا بھر کے سنجیدہ افراد کو یہ تشویش ضرور لاحق ہو گئی ہے کہ ٹرمپ امریکا کا پہلا صدر ہے جس کے پاس اپنا کوئی وژن نہیں۔اسی لئے وہ اپنے پورے دورِ اقتدار میں کوئی ایسی "گرینڈ اسٹریٹجی" تیار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا جس کی بنیاد پر کہا جا سکے کہ وہ امریکی معاشرے اور قیادت کے ڈھانچے کو کوئی باضابطہ نئی شکل دیکر اسے عالمی بحرانوں سے نکالنا چاہتا تھا۔اس حوالے سے ٹرمپ کی سنجیدگی کا گراف خاصا نیچا رہا۔

کسی بھی ملک کیلئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کی کوئی واضح اور بڑی حکمت عملی نہ ہو۔اس مرحلے سے گزرے بغیر کوئی بھی ریاست ترقی تو کیا کرے گی ،اپنا وجود بھی برقرار نہ رکھ پائے گی۔امریکا کوئی عام ملک نہیں، اسے واحد عالمی طاقت ہونے کا گھمنڈ ہے۔اس کیلئے تو قیادت کے ڈھانچے کا مضبوط ہونا اور بیشتر بین الاقوامی معاملات میں واضح حکمت عملی کا ہونا لازم ہے۔امریکا میں ایک زمانے سے عظیم، ہمہ گیر حکمت عملی اپنانے کا رجحان رہا ہے اور یہ رجحان محض اپنی پسند کا نہیں بلکہ مجبوری اور لازم ہے۔امریکا سپر پاور ہے۔اسے کئی ممالک سے خصوصی تعلقات استوار رکھنا پڑتے ہیں۔ہر خطے پر نظر رکھنا پڑتی ہے۔کسی بھی صدر کیلئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ملک کی "گرینڈ اسٹریٹجی" سے ہٹ کر کچھ کرے۔وہ اگر نمایاں حد تک بصیرت سے محروم ہو اور مستقبلِ بعید کے بارے میں سوچنے اور اس حوالے سے کوئی واضح منصوبہ تیار کرنے کا اہل نہ ہو تب بھی اسے حکمت عملی کے حوالے سے بہت سے

معاملات میں غیر معمولی دلچسپی لیناہی پڑتی ہے۔ٹرمپ بظاہر بصیرت کا حامل نہیں تھا مگر اس کیلئے بھی گرینڈ اسٹریٹجی کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا یا اس سے مطابقت رکھنے والے اقدامات سے گریز کرتا۔لیون ٹراٹسکی نے خوب کہا ہے کہ اگر کوئی صدر گرینڈ اسٹریٹجی میں زیادہ دلچسپی نہ بھی لے، تب بھی گرینڈ اسٹریٹجی تو اس میں دلچسپی لیتی ہی ہے یعنی پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں، صرف بڑھنے کا آپشن ہے۔

اگر امریکی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ نکتہ کسی بھی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ٹرمپ نے ایک ایسے اہم موقع پر امریکا کی صدارت سنبھالی جب اس کے انتخاب سے پہلے کے 70 برسوں میں امریکا نے دوسری عالمی جنگ عظیم کے بعد سے ایک ایسی طاقت کا کردار ادا کیا تھا جو پوری دنیا کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا بھرپور عزم اور توانائی رکھتی تھی۔امریکی جبر نے کئی خطوں کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کیا۔متعدد ممالک کو تعمیر و ترقی کی نئی جہتوں سے آشنا کیا اور دوسری طرف کئی ممالک امریکا کے ہاتھوں بربادی کا شکار ہوئے۔1990ء میں سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکا چونکہ واحد سپر پاور تھا، اس لیے اس کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئیں۔تقریباً تین عشروں پر محیط اس مدت کے دوران امریکا نے اچھا کم اور بُرا بہت زیادہ کیا ہے۔بعض مواقع پر صاف محسوس کیا گیا کہ امریکا کیلئے معاملات الجھے ہوئے ہیں اور وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے، اس کی پشت پر یا تو بدحواسی ہے یا پھر کچھ اداروں کا دباؤ اور خوف۔

امریکی دفاعی تجزیہ نگاروں کے مطابق یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ ٹرمپ ایک ایسے وقت امریکا کا صدر منتخب ہوا جب چین اپنی پوری قوت کے ساتھ ابھر کر سامنے آچکا تھا۔چین ایک ایسا بڑا چیلنج بن گیا جس سے نمٹنے کیلئے امریکا کو اپنی ''گرینڈ اسٹریٹجی'' تبدیل کرنا پڑ گئی۔ایک طرف جہاں چین نے امریکا کی عسکری و معاشی بالادستی کیلئے بہت بڑے چیلنج کی حیثیت اختیار کرلی وہاں خطے میں پاکستان جیسا اہم اتحادی جس نے امریکا کو دنیا کی واحد سپر پاور بننے میں اہم کردار ادا کیا تھا، اب چین کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑا نظر آیا جس کے جواب میں امریکی آشیر باد پر آئے دن پاکستانی سرحدوں پر بھارتی جارحیت جیسا ماحول، سرحد پار سے پاکستان میں دہشتگردی جیسے واقعات، کشمیر میں جاری ظلم و ستم کی بناء پر بھارت کے ساتھ انتہائی کشیدہ تعلقات اس پر مستزاد ٹرائیکا کا مختلف انداز میں بلاوجہ دباؤ ڈالنے کی غلط پالیسی اختیار کرنے کی بناء پر امریکا کو اس خطے میں سخت دھچکا لگا ہے اور ردِّ عمل میں خطے میں چین، پاکستان، روس اور ایران کا ایک مضبوط بلاک بھی تشکیل پا رہا ہے۔

ایک طرف چین نے امریکا کی عسکری و معاشی بالادستی کیلئے بہت بڑے چیلنج کی حیثیت اختیار کی ہے اور دوسری طرف مشرق وسطیٰ میں بھی صورتِ حال بہت تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے جو امریکا کیلئے مشکلات پیدا کر رہی ہے۔یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ دنیا بھر میں جمہوریت کو بہتر طرزِ حکمرانی کی حیثیت سے قبول نہ کرنے کا رجحان پروان چڑھ رہا ہے۔عام آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ اگر آمریت اس کے مسائل حل کر دے تو جمہوریت کی کیا ضرورت ہے؟

کئی عشروں سے امریکا عالمی سیاست و معیشت پر بلاشرکتِ غیرے متصرّف رہا ہے۔اس نے یورپ کو ساتھ ملا کر اپنی مرضی کے فیصلے کیے ہیں اور ان فیصلوں کا پھل بھی کھایا ہے مگر اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔کئی ممالک تیزی سے مضبوط ہو کر ابھرے ہیں۔یورپ نے اپنی راہ بہت حد تک الگ کرلی ہے۔چین، روس، برازیل، جنوبی افریقا اور دوسرے بہت سے ممالک تیزی سے مستحکم ہوئے ہیں۔ان کا استحکام امریکی بالادستی کیلئے واضح خطرے کی شکل میں ابھرا ہے۔یہ سوال امریکا میں بھی جڑ پکڑ چکا ہے کہ عالمی سیاست و معیشت میں اب امریکا کیلئے کیا رہ گیا ہے۔گزشتہ صدارتی انتخاب میں جہاں دیدہ سیاست دان جو بائیڈن منتخب ہو کر جب وائٹ ہاؤس میں براجمان ہوئے تو ان کیلئے بھی سب سے اہم سوال یہی تھا کہ کہ عالمی سطح پر امریکا کو برتر حیثیت

بر قرار رکھنے کے قابل کس طور بنایا جائے۔ وہ ان چیلنجز کا مقابلہ کرتے ہوئے اب اگلی انتخابی مہم میں داخل ہو چکے ہیں جہاں انہیں یقیناً اپنے سیاسی فیصلوں کے نتائج کا سامنا کرنا ہے۔ حقیقتاً ان کیلئے چیلنجز بڑھ چکے ہیں۔ حکمت عملی میں غیر معمولی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔

جو بائیڈن نے اب تک ایسا کچھ نہیں کیا جس سے اندازہ لگایا جاسکے کہ وہ امریکا کو نئی بلندیوں پر لے جانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ بھی ٹرمپ کی طرح بظاہر اس سیاسی بصیرت سے محروم دکھائی دیئے جو کسی امریکی صدر کیلئے لازم سمجھی جاتی تھی مگر اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ وہ اپنی شخصیت کا کوئی تاثر چھوڑنے میں مکمل ناکام رہے ہیں۔ چند ایک معاملات میں انہوں نے "ٹرمپ بڑھک" سے ہٹ کر عمل کے میدان میں اعتدال پسندی کا ثبوت دیا ہے مگر مجموعی طور پر وہ اپنے اقوال و اعمال سے امریکی فکر کو متاثر کرنے میں تھوڑے بہت کامیاب ضرور ہوئے ہیں۔ یہ بات محسوس کی جارہی ہے کہ امریکا نے جن اصولوں اور طریق کار کو اپنا کر اب تک عالمی سیاست و معیشت میں اپنی بالادستی کسی نہ کسی طور برقرار رکھی ہے اُنہیں جو بائیڈن نے متاثر کرنے کی کوشش کی ہے اور کسی حد تک کامیاب رہے ہیں جبکہ ٹرمپ کا دعویٰ تھا کہ جو کچھ وہ سوچتا اور کرتا تھا، اس سے امریکا کی طاقت اور دولت میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور عالمی سیاست و معیشت میں امریکی بالادستی برقرار رہی مگر درحقیقت ٹرمپ کی پالیسیوں سے امریکا کو مجموعی طور پر خاصا نقصان پہنچا۔ پالیسی ساز اب یہ بات شدت سے محسوس کر رہے ہیں کہ دراصل ٹرمپ کے آنے کے بعد سے امریکا کی سب سے بڑی طاقت والی حیثیت متاثر ہوئی ہے اور جو کچھ وہ کہتا رہا، اُس کے وہ اثرات رونما نہیں ہوئے جو ہونے چاہیے تھے۔ امریکیوں کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ ٹرمپ کی پالیسیوں سے عالمی سطح پر امریکا کی پوزیشن قابل ذکر حد تک متاثر ہوئی اور اب ایسے شخص کو دوبارہ ایسی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

امریکی پالیسی ساز یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں جس سے بڑی حد تک واضح اختلاف کیا جاسکتا ہے کہ امریکا نے چار نسلوں تک دنیا کو ایک ایسا نظام دیا ہے جس نے امن، خوش حالی، استحکام اور جمہوریت کی راہ ہموار کی ہے۔ یہ بات دیگر نظام ہائے سیاست سے موازنے کی صورت میں کہی جارہی ہے۔ امریکا نے عالمی سیاست و معیشت پر جو بالادستی پائی وہ اس کی ''سخت قوت'' کا نتیجہ تھی۔ امریکا کے پاس بے مثال قوت تھی اور اس قوت کو بھرپور انداز سے بروئے لانے پر بھی خاطر خواہ توجہ تو دی گئی لیکن اپنی ظالمانہ پالیسیوں کے سبب اپنے اردگرد نفرتوں کے پہاڑ بھی کھڑے کر لئے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکا نے باضابطہ عالمی طاقت کی حیثیت اختیار کی۔ ایسا نہیں کہ سرد جنگ کے زمانے میں سابق سوویت یونین کے ہوتے ہوئے امریکا کی عالمی حیثیت اتنی مضبوط تھی جسے چیلنج نہ کیا جاسکتا تھا تاہم دنیا دو واضح عالمی قوتوں کے درمیان تقسیم تھی۔ بظاہر امریکا نے غیر معمولی عسکری قوت کے ذریعے پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکا کی عسکری قوت مزید بڑھ گئی۔ عالمی معیشت میں بھی اس کا حصہ اس قدر بڑھ گیا کہ ایک مرحلے پر امریکی خام قومی پیداوار عالمی خام قومی پیداوار کا پچیس فیصد تھی۔ دنیا نے کسی ایک ملک کو باقی دنیا کے مقابلے میں اس قدر طاقتور کبھی نہیں دیکھا لیکن امریکا کو یہ مقام کبھی نہ ملتا اگر سوویت یونین افغانستان میں جارحیت کی غلطی نہ کرتا اور پاکستان جیسا اتحادی امریکا کی بھرپور مدد نہ کرتا لیکن امریکا نے اپنی سابقہ تاریخ دہراتے ہوئے پاکستان کے ساتھ وہی سلوک کیا کہ جونہی سابقہ روس شکست و ریخت سے دوچار ہوا، امریکا وعدہ خلافی کرتے ہوئے پاکستان اور افغانستان کو بیچ منجدھار میں چھوڑ کر فوری طور پر پاکستان کے مخالف کیمپ کو گلے لگا لیا کیونکہ بھارت نے بھی پانچ دہائیوں سے ایک وفادار ساتھی روس سے آنکھیں پھیر کر امریکا کے قدموں میں پناہ لیکر اپنی برہمنی روایت کو قائم رکھا جس کا حال روسی وزارتِ خارجہ نے بھرپور گلہ کا اظہار بھی کیا ہے۔

لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ مکافاتِ عمل نے چند برسوں کے دوران امریکی بالادستی کیلئے بہت سے خطرات پیدا کر دیئے ہیں۔ اب چین، روس

اور دیگر ممالک ابھر کر سامنے آئے ہیں مگر اس کے باوجود امریکا سمجھتا ہے کہ اس کی عسکری اور معاشی قوت اب بھی اس قدر ہے کہ وہ عالمی سیاست و معیشت پر نمایاں حد تک متصرف ہے اور امریکی قیادت اب بھی دنیا بھر میں معاملات کو الٹنے اور پلٹنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر امریکا چاہتا تو ایسی حکمت عملی ترتیب دے سکتا تھا جو صرف اس کیلئے کارگر ہوتی اور اسے زیادہ سے زیادہ عسکری و معاشی قوت سے ہمکنار کرتی مگر پالیسی سازوں نے ایک ایسا بین الاقوامی نظام ترتیب دینے پر توجہ دی جس کے ذریعے صرف امریکا بھرپور استحکام سے ہمکنار نہ ہو بلکہ مجموعی طور پر تمام خطے ترقی کریں، خوشحالی پائیں اور خاص طور پر ہم خیال ممالک زیادہ مستفید ہوں۔ اس بین الاقوامی نظام کو چلانے کیلئے ادارے معرض وجود میں لائے گئے، پروگرامز ترتیب دیے گئے۔ یوں اب تک بین الاقوامی نظام کے معاملے میں امریکا عالمی راہنما کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے۔ امریکا نے عسکری اتحاد تشکیل دیے۔ کوشش کی گئی کہ بین الاقوامی تجارتی راستوں کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنایا جائے۔ یہ سب کچھ عالمی سطح پر امن برقرار رکھنے کی خاطر کیا گیا، مگر درحقیقت امریکا یہ چاہتا تھا کہ ایک ایسی دنیا تشکیل دی جائے جس میں وہ خود زیادہ آسانی سے ترقی و استحکام سے ہمکنار رہ سکے۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر امریکا چاہتا تو ایسی حکمت عملی ترتیب دے سکتا تھا جو صرف اس کیلئے نہیں بلکہ اس کے قریبی اتحادیوں کیلئے بھی کارگر ہوتی اور امریکا زیادہ سے زیادہ عسکری و معاشی قوت سے ہمکنار ہوتا مگر پالیسی سازوں نے ایک ایسا بین الاقوامی نظام ترتیب دینے پر توجہ دی جس کے ذریعے صرف امریکا نہ صرف بھرپور استحکام سے ہمکنار ہو اور اس کے اتحادی مجموعی طور پر خطے میں ترقی اور خوشحالی کیلئے اس کی بالادستی قبول کریں اور پر ہم خیال ممالک اس کی ہر پالیسی میں اس کے ہمنوا ہوں جس طرح مشرقِ وسطیٰ میں مسلم ممالک اور افغانستان کی تباہی میں اس کے تمام خاص طور اتحادیوں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس بین الاقوامی نظام "ورلڈ آرڈر" کو چلانے کیلئے ادارے معرض وجود میں لائے گئے، پروگرامز ترتیب دیے گئے، یوں اب تک بین الاقوامی نظام کے معاملے میں امریکا عالمی رہنما کی حیثیت اختیار کرنے کے راستے پر گامزن ہے۔ امریکا نے عسکری اتحاد تشکیل دیے اور کوشش کی گئی کہ بین الاقوامی تجارتی راستوں کو اپنے مفادات کیلئے زیادہ سے زیادہ محفوظ بنایا جائے۔ یہ سب کچھ عالمی سطح پر امن برقرار رکھنے کے نام تشکیل دی جائے جس میں وہ خود زیادہ آسانی سے ترقی و استحکام پر کیا گیا لیکن اب اقوام عالم یہ سمجھ چکے ہیں کہ درحقیقت امریکا یہ چاہتا تھا کہ ایک ایسی دنیا سے ہمکنار رہ سکے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنے کی امریکی مساعی درحقیقت صرف اس مقصد کے تحت تھیں کہ عالمی سیاست و معیشت میں اس کی بالادستی قائم ہو اور مستقل بغیر کسی چیلنج کے برقرار رہے۔ اسی لئے کویت عراق جنگ کے بعد جارج بش اوّل نے یہودی نژاد ہنری کسینجر کے تشکیل کردہ "نیو ورلڈ آرڈر" پروگرام کو متعارف کرانے کے بعد امریکا نے جو عالمی نظام پر اس قدر زور دیا تو اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ معیشت، عسکری قوت اور سفارت کاری کے میدان میں اپنی پوزیشن زیادہ سے زیادہ مستحکم رکھنا چاہتا ہے۔ اس کیلئے وہ جو دنیا تشکیل دینے میں مصروف ہے، اس کا واحد مقصد اکیلے ہی اس سے بھرپور استفادہ مقصود ہے تاکہ عالمی معیشت کو اپنی مرضی کے مطابق چلا کر امریکا اپنی طاقت میں بے پناہ اضافہ کر کے عالمی بالادستی کو یقینی بنائے۔

یہ نکتہ نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ امریکا نے عالمی سیاست و معیشت میں اب تک جو بھی مرضی کے فیصلے کیے ہیں ان کے حوالے سے اپنے اتحادیوں کیلئے زیادہ طاقت استعمال نہیں کی۔ وہ اگر چاہتا تو اپنی طاقت کے ذریعے غیر معمولی حد تک اپنی مرضی کے فیصلے کر سکتا تھا مگر اس کے بجائے کم استحصالی انداز اختیار کر کے امریکا نے ان تمام ممالک کو مجوزہ مفادات میں کچھ حصہ ضرور دیا جو عالمی نظام کے حوالے سے اس کے تصورات کو قبول کرنے کیلئے تیار تھے۔ دیگر سپر پاورز کے مقابلے میں امریکا نے طاقت کے ذریعے بات منوانے پر کم توجہ دی۔ امریکا کے بہت سے شراکت دار اس امر کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ کسی بھی معاملے میں امریکا کی بالادستی سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں امریکا معاملات سے الگ تھلگ نہ ہو جائے اور پھر ان ممالک کو دیگر قوتوں کے ساتھ بھی سرد جنگ کا سامنا کرنا پڑے!

ہر حال میں سب سے پہلے امریکا کا نعرہ امریکی سیاست و معیشت کیلئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ امریکا نے کبھی اپنے مفادات کو کسی بھی صورتِ حال کے تابع نہیں کیا۔ وہ صورتِ حال کو اپنے مفادات کے تابع کرنے پر یقین رکھتا آیا ہے۔ ایک یورپی سفارت کار کا کہنا ہے کہ یورپ نے ستر سال تک امریکا کی ڈفلی پر رقص کیا ہے۔ ویتنام سے نکارا گوا تک لوگ اس بات کے گواہ ہیں کہ اپنے ملک کے مفادات کو ہر حال میں تقویت بہم پہنچانے کیلئے امریکی حکام نے غیر معمولی تشدد اور ظلم و جبر کی راہ پر چلنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ معیشت اور سیاست سے ہٹ کر بھی کئی معاملات میں امریکی اندازِ قیادت بہت اہم رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے امریکا نے عالمی سطح پر امن اور استحکام کے حوالے سے غیر معمولی کردار ادا کرنے کی یہ وجہ بھی تھی کہ اس وقت دنیا سرمایہ داری اور کیمونزم نظام میں واضح طور پر تقسیم تھی اور امریکا کے اتحادی یہ سمجھتے تھے کہ امریکا عسکری امور میں کمٹ منٹ کے مطابق کام کرنے اور ڈلیور کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے اور یہ کہ ایک انتہائی خطرناک دنیا میں حقیقی استحکام پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کی صلاحیت اگر کسی میں پائی جاتی ہے تو وہ امریکا ہے۔

امریکی صدور اس امر کیلئے کوشاں رہے ہیں کہ دنیا بھر میں ایسی جمہوریت اور بنیادی حقوق کی پاسداری کو یقینی بنایا جائے جو امریکی قیادت کے تابع رہے اور اس کی واضح مثال ہمیں پہلے الجزائر اور بعد ازاں مصر کی مرسی حکومت کا تختہ الٹنے سے ملتی ہے۔ امریکی قیادت یہ سمجھتی ہے کہ عالمی سطح پر بالادستی برقرار رکھنے میں یہ بات بھی کلیدی حیثیت رکھتی ہے کہ اخلاقی سطح پر امریکا کیسی دنیا دیکھنا چاہتا ہے۔ امریکا نے اپنی اخلاقی بالادستی بھی یقینی بنانے کیلئے دنیا بھر میں کھلے معاشرے معرضِ وجود میں لانے اور لبرل ازم کو بھرپور تقویت بہم پہنچانے کی کوششیں جاری رکھی ہیں۔

سابق امریکی وزیر خارجہ جارج شلز نے ایک بار کہا تھا کہ امریکا نے زیادہ مستحکم تعلقات ان ممالک سے استوار رکھے ہیں جہاں ایسی جمہوریت کی جڑیں گہری اور مضبوط ہیں جو امریکی اور اس کے اتحادیوں کی پالیسیوں سے مکمل آہنگی اور یکجہتی کا اظہار کریں۔ یہ محض اتفاق نہیں۔ امریکا جن ممالک میں حقیقی جمہوریت اور سیکولر لبرل روایات دیکھنا چاہتا ہے ان کی طرف زیادہ جھکتا ہے۔ امریکی قیادت انہی ممالک سے بہتر سیاسی اور معاشی روابط کو فروغ دینے پر آمادگی ظاہر کرتی ہے جہاں کی سیاسی روایات امریکی اور اس کے اتحادیوں کی سیاسی روایات سے ہم آہنگ ہوں۔ معاملات محض لین دین کی سطح سے کہیں بلند ہو کر ورلڈ آرڈر کے حقیقی نظریہ اور ثقافتی ہم آہنگی مفادات تک تابع ہوں۔

ایسا نہیں ہے کہ امریکا نے صرف "سخت قوت" (معاشی و عسکری) پر مدار رکھا ہے۔ وہ اپنی بات منوانے کیلئے اور اپنی نمبر ون پوزیشن برقرار رکھنے کیلئے دنیا بھر میں سوفٹ امیج بھی پھیلاتا ہے۔ امریکیوں نے ہر دور میں چاہا ہے کہ دنیا ان کے ملک کو دیکھ کر صرف خوفزدہ نہ ہو بلکہ متاثر ہو کر متوجہ بھی ہو۔

آج دنیا بھر میں امریکا کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے مگر اس کے باوجود دنیا کے ہر ملک کے باشندے چاہتے ہیں کہ انہیں کسی نہ کسی طور امریکا میں داخل ہونے کا موقع مل جائے۔ جن ممالک سے امریکا کے تعلقات اچھے نہیں اور جہاں کے لوگ امریکا سے شدید نفرت کرتے ہیں وہاں بھی لوگ اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ امریکی ویزا لگ جائے یعنی مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ امریکا کی ''سخت قوت'' کو تقویت بہم پہنچانے میں ''نرم قوت'' نے بھی کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ناپسندیدہ ہوتے ہوئے بھی امریکا میں دنیا بھر کے لوگوں کیلئے غیر معمولی کشش پائی جاتی ہے لیکن صد افسوس کہ پہلی مرتبہ ٹرمپ کی نئی امیگریشن پالیسی نے امریکا کے برسوں سے قائم اس تاثر کو بری طرح نہ صرف مجروح کیا بلکہ خود امریکی اعلیٰ عدالت نے مداخلت کرکے ٹرمپ کی اس پالیسی کو مسترد کردیا تھا۔

ٹرمپ نے اپنے دورِ اقتدار میں جو کچھ کہا وہ اس امر کا غماز تھا کہ وہ بنانے پر کم اور بگاڑنے پر زیادہ توجہ دیتا رہا۔ (ڈین ایچیسن کیلئے یہ بات بہت اہم تھی کہ وہ امریکا کی تخلیق کے وقت تھے)۔ خود امریکی اور مغربی سیاسی تجزیہ نگاروں کے مطابق ٹرمپ کی بڑھکیں دیکھتے ہوئے یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکے گی کہ انہیں شاید کل کو یہ بات قابل فخر محسوس ہو کہ وہ امریکا کی تباہی کے وقت موجود تھے۔ ٹرمپ نے اپنی انتخابی مہم کے دوران ایسا بہت کچھ کہا جس سے پتہ چلا کہ اسے بنیادی امریکی اقدار کی پاسداری کا ذرا بھی خیال نہیں تھا۔ اس نے آزاد تجارت کے بجائے اپنے مفادات کو ہر حال میں مقدم رکھنے کی تجارت پر زور دیا۔ ٹرمپ نے جمہوریت کیلئے اب تک ویسی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا جیسی ان کے پیش رَو بیان کرتے آئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے جمہوریت کے مقابل پیوٹن کیلئے پسندیدگی کا اظہار کیا جو مطلق العنانیت کو بنیادی سیاسی قدر قرار دے کر تمام اختیارات اپنی ذات میں سمیٹنا چاہتا ہے۔ امریکا نے پانچ چھ عشروں میں جو کچھ بھی پایا، اُسے ٹرمپ نے ٹھکانے لگانے میں تاخیر نہیں کی۔ اس کا خیال تھا کہ امریکا نے جنگ کے بعد کے زمانے میں جو خارجہ پالیسی اپنائی وہ بہت سے معاملات میں مخالفین کو اس قدر رعایتیں دیتی رہی ہیں کہ اب وہ منہ دینے کا سوچ رہے ہیں۔ امریکا نے دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا میں عالمی معیشت کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی کوشش ضرور کی ہے مگر اس کوشش میں اس نے اپنی مصنوعات ٹرمپ جیسے لوگ پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ امریکا کو اپنی ٹیکنالوجیز اور جدید ترین مصنوعات اور ٹیکنالوجی دنیا بھر کو دی ہے۔ اس بات کو ساری دنیا میں پھیلانے سے گریز کرنا چاہیے۔

ٹرمپ نے امریکی فوج کو قیدیوں پر تشدد بڑھانے کی اجازت دیتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ دہشتگردی ختم کرنے کی خاطر اگر جنگی جرائم کا ارتکاب بھی کرنا پڑے تو ایسا کرنے میں کچھ ہرج نہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امریکا نے کسی نہ کسی طور اپنی بالادستی کو برقرار رکھا ہے مگر ٹرمپ اسے ٹھکانے لگانے کے لئے بے تاب رہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جو کچھ ٹرمپ نے صدر کی حیثیت سے کہا تھا وہ جذباتیت کی طرح پر ہے۔ وہ ایک زمانے سے کئی امریکی شراکت داروں پر شدید نکتہ چینی کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے 1980ء کے عشرے میں جاپان اور کویت کو شدید نکتہ چینی کا نشانہ بناتے ہوئے کہا تھا کہ ان دونوں ممالک سے امریکا کو ملا کم ہے اور امریکا نے دیا زیادہ ہے۔ اسی طور انہوں نے 2015ء اور 2016ء میں جرمنی اور میکسیکو پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ ان دونوں ممالک نے امریکا کیلئے طفیلی کا کردار ادا کیا ہے۔ اپنی انتخابی مہم کے دوران انہوں نے امریکا کے بعض شراکت داروں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ ان کے دو ڈھائی عشروں کے خیالات ہی کا عکاس تھے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ٹرمپ نے صدر کی حیثیت سے امریکا کے بعض اتحادیوں اور اتحادیوں کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، وہ محض بڑھک نہیں، جذباتیت کی سطح پر نہیں بلکہ وہ واقعی کچھ کرنا چاہتا تھا یعنی وہ امریکا کے بعض اتحادیوں کو ایک طرف ہٹانے اور نئے تعلقات استوار کرنے کی راہ پر گامزن

ہونے کیلئے بے تاب رہتا تھا چاہے اس کیلئے امریکا کو کتنی ہی بھاری قیمت کیوں نہ چکانی پڑے۔ لیکن خود امریکا کے خیر خواہ اور ان کے اتحادی ٹرمپ کی ان پالیسیوں کے اجراء کی کبھی بھی کھل کر حمائت نہ کر سکے کیونکہ اس سے امریکا تیزی کے ساتھ تنہائی کا شکار ہو جاتا لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ ٹرمپ ایک مرتبہ پھر اسے سے کہیں زیادہ شدت پسند نعروں کی گونج میں وائٹ ہاؤس پہنچنے کی تیاریوں میں بڑا پر امید ہے اور ایسا ہی حال ہمارے ملک کی سیاست کا بھی ہو چکا ہے کہ ہر روز کسی نہ کسی کا بیان آجاتا ہے کہ عمران کے ساتھ بیک ڈور چینل پر بات چیت جاری ہے اور ناکامی کا منہ دیکھتے ہی اس کی تردید کر دی جاتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ دونوں کردار ایسے ہم مزاج ہیں کہ ایک دوسرے کی تعریفوں کے پل باندھنے میں کبھی بخیلی سے کام نہیں لیتے۔

؎ اپنا بھی کچھ خیال کر، اے دل بجز لحاظ
موقع ملے تو جھاڑ کبھی آستین کے سانپ

بروز جمعرات 30 شوال المکرم 1445ھ 9 مئی 2024ء

کتنا مشکل ہے جینا.....مدر ڈے

اللہ تعالی کے محبوب مرسل حضرت محمد مصطفی ﷺ کی والدہ ماجدہ کو ماں ہونے کا بلند مرتبہ عطا ہوا تو سچ مچ ماں کی عظمت اور وقار بلندیوں کو چھونے لگیں کہ مامتا کا پاکیزہ رشتہ ایسا عروج و کمالات سے مالا مال ہوا کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے قرار دی گئی، والدہ ماجدہ کی شان کو بھلا کون پہنچ سکتا ہے ۔ سرکار دو عالم ﷺ نے حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے بطن اقدس سے جنم لیا اور ان کی آغوش میں پروان چڑھے۔ اس لحاظ سے بی بی آمنہ رضی اللہ عنہا تمام عالم کی خواتین میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں کہ خاتم الانبیا ﷺ کو جنم دینے اور پالنے کا شرف آپ کے حصے میں آیا۔

بی بی آمنہ رضی اللہ عنہا کا تعلق عرب کے معزز ترین قبیلہ بنو قریش سے تھا۔ آپ کے والد وہب بن عبد مناف بن کلاب تھے اور والدہ برہ بنت عبد العزیٰ بن کلاب تھیں۔ آپ نہایت پرہیز گار اور پاکباز خاتون تھیں۔ آپ کا نکاح حضرت عبد المطلب کے پیارے بیٹے حضرت عبد اللہ سے ہوا۔ نکاح کے کچھ عرصہ بعد حضرت عبد اللہ تجارت کیلئے شام کو روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر آپ بیمار ہو گئے اور بیماری کی حالت میں واپس آرہے تھے کہ یثرب سے گزرتے ہوئے والد کے ننھیال میں ٹھہر گئے اور وہیں وفات پائی۔ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا سے شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد اس عالم میں بیوگی کا صدمہ اٹھایا کہ امام الانبیا ﷺ ان کے بطن مطہر میں پرورش پا رہے تھے۔

20/اپریل 571ء بروز پیر صبح کے وقت اللہ تعالی نے حضرت آمنہ کو وہ بیٹا عطا کیا جسے آگے چل کر تمام عالم کی فلاح کی ذمہ داری اٹھانا تھی۔ حضرت عبد المطلب نے پوتے کی خوشی میں قربانی کیلئے اونٹ ذبح کئے اور سارے عرب میں غریبوں کو کھانا کھلایا۔ اس موقع پر تمام قبائل کے بڑے بڑے سرداروں نے بچے کو دیکھا اور حضرت عبد المطلب کو مبارکباد دی۔ اس موقع پر آپ کے دادا حضرت عبد المطلب نے بچے کا نام محمد ﷺ یعنی بہت تعریف کیا گیا رکھا۔

حضور ﷺ کی ولادت کے وقت عرب میں یہ رواج تھا کہ پیدائش کے بعد شرفا اپنے دودھ پیتے بچے کو اچھی تربیت اور پرورش کیلئے صحرا یا دیہات میں دایہ کے حوالے کر دیتے تھے تاکہ بچے باہر کی کھلی اور صحت بخش ہوا میں پرورش پا سکیں۔ جب حضور ﷺ کی عمر مبارکہ چھ ماہ ہوئی تو آپ کو قبیلہ بنی سعد کی حضرت حلیمہ سعدیہ کے سپرد کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد حضرت حلیمہ آپ ﷺ کو واپس مکہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے پاس لائیں مگر شہر میں وبا پھیلی ہوئی تھی اس لئے حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا نے اپنے نورِ نظر کو دوبارہ حضرت حلیمہ کے سپرد کر کے واپس بھیج دیا۔ جب حلیمہ دوبارہ حضور اکرم ﷺ کو واپس لائیں تو ان کی عمر مبارک تقریباً چھ سال تھی۔ آپ بڑے توانا و تندرست تھے گویا جس مقصد کیلئے حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا نے اکلوتے فرزند کی جدائی کا صدمہ سہا تھا وہ پورا ہو چکا تھا۔ اب آپ ﷺ اپنی والدہ کے ہمراہ رہنے لگے۔ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کو اپنے پیارے بیٹے کا بڑا خیال تھا۔ وہ آپ ﷺ کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتیں، آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھیں۔ حضرت عبد اللہ کے انتقال کے بعد حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا ہر سال ان کی قبر کی زیارت کو مدینہ تشریف لے جاتیں۔

ساٹھ ستر ہزار کا مجمع..... آخری حج کے سفر پر رواں دواں..... اونٹنی کا رخ ماں کی قبر کی طرف پھیر دیا یعنی ابوا کی طرف (جو کہ مدینہ سے 249 کلومیٹر دور مکہ کی جانب واقع ہے)۔ یہ ایک پتھریلا علاقہ ہے جو ایک پہاڑی کا ہموار حصہ ہے۔ چشم تصور میں اپنے آقا کا وہ منظر یاد آگیا جب میرے آقا بچپن میں اپنی والدہ محترمہ کا ہاتھ تھامے اپنے والد کی قبر کی زیارت کیلئے تشریف لے گئے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جناب آمنہ بنت وہب حضرت عبد اللہ کی قبر کی

زیارت کیلئے مدینہ گئی تھیں وہاں انھوں نے ایک ماہ قیام کیا، جب واپس آنے لگیں تو بمقام ابواء پر 25 سال کی عمر میں اپنے خالقِ حقیقی سے جاملیں اور وہیں دفن ہوئیں آپ کی خادمہ ام ایمن، آپ ﷺ کو لے کر مکہ آئیں (گویا والد محترم اور والدہ محترمہ دونوں 25 سال کی عمر میں خالق حقیقی سے جاملے)۔
(روضۃ الاحباب 1 ص 67)

میرے آقا ﷺ (جن کے روضہ اقدس پر جہاں ملائکہ، جن وانس کا ایک ہجوم رہتا ہے) وہ آج اپنی ماں کی قبر پر یوں حاضری دے رہے ہیں کہ باپ عین عالم شباب میں سال کی عمر خالق حقیقی سے جاملے اور ماں بھی عین جوانی میں دریتیم کو سات سال کی عمر میں چھوڑ کر اپنے شوہر نامدار کو ملنے کیلئے اپنے رب کے ہاں حاضر ہو گئیں۔ میرے آقا ﷺ کو وہ تمام مناظر ازبر تھے کہ صرف تین افراد کا یہ قافلہ تھا۔ والدہ محترمہ نے اپنے لال کا ہاتھ تھاما ہوا تھا اور خادمہ ام ایمن بھی ہمراہ تھیں۔ اچانک طبیعت ایسی خراب ہوئی کہ اسی پتھریلی زمین پر لیٹ گئیں، جسم پسینے میں شرابور اور بولا نہیں جارہا تھا، بار بار کروٹ بدل رہی تھیں۔ شائد اپنے معصوم بچے کے سامنے اپنی تکلیف کو چھپانے کا عمل ہو کہ بیٹا پریشان نہ ہو جائے۔ آپ سہمے ہوئے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ نجانے اب کیا ہو گا۔

جوانی کسی نے پھر اس عظیم ماں کی زبان سے آخری کلمات ادا ہوئے....."کل حیی میت وکل جدید بعد.....لبیک" ہر زندہ نے مرنا ہے اور ہر ڈھلنا ہے، لبیک میرا آخری وقت آگیا ہے۔ "ولقدولدالطحرا" میں نے ایک پاکیزہ ہستی کو جنم دیا ہے۔ اس کے بعد وہ پاکیزہ شمع بجھ گئی۔ میرے آقا ﷺ نے جب ماں کو رخصت ہوتے دیکھا تو بے ساختہ رقت اور ہچکیوں کے ساتھ رونا شروع کر دیا۔ اپنے ہی سینے سے منہ لگائے اس قدر روئے کہ سینہ مبارک تر ہو گیا۔ ہائے ہائے..... اس وقت آنسو پونچھنے والا کوئی بھی نہ تھا، بڑی دیر تک درِّ یتیم ماں کی قبر کے سرہانے بیٹھے اپنے آنسوؤں کا خراج پیش کرتے رہے۔ قبر کے ارد گرد پتھر جوڑ کر نیچے اترے ہی تھے کہ فوراً بے ساختگی سے دوڑ کر دوبارہ قبر پر پہنچ گئے۔ ام ایمن یہ منظر دیکھ کر پیچھے دوڑیں۔ جب قریب آئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ میرے آقا ﷺ اپنی ماں کی قبر کے ساتھ چمٹ کر اس کے اوپر لیٹے ہوئے یہ فرمارہے تھے "بے تحاشہ محبت کرنے والی ماں! تجھے تو خبر تھی کہ اس دنیا میں تیرے سوا میرا کوئی نہ تھا۔ مجھے چھوڑ کر تم کہاں چلی گئی ہو؟

یوں لگ رہا تھا کہ میرے رب نے چودہ صدیوں کے تمام پردے الٹ دیئے ہیں، میری اپنی حالت اس قدر غیر ہو گئی کہ کھڑے ہونے کی سکت نہیں رہی اور میں بھی بے اختیار آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا اور چشم تصور میں اپنے آقا ﷺ کے بچپن کے تمام مناظر میری آنکھوں کے سامنے آنے شروع ہو گئے ۔ میں بے اختیار سوچنے لگا، اے ارض وسما کے مالک! جسے تو نے اپنا حبیب اور تمام جہانوں کیلئے رحمت العالمین بنایا، اسے اتنے بڑے دکھ اور صدمے میں مبتلا کر دیا..... باپ دیکھا نہیں، کوئی بھائی اور بہن نہیں جو اس صدمے میں سینے سے لگا کر تسلی اور حوصلہ دے اور میرے آقا ﷺ کے ان آنسوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ لے..... اگر یہ واقعہ مکہ میں رونما ہوتا تو چلو وہاں محبت کرنے والا دادا، خاندان کے دوسرے عزیز واقارب اس گھڑی میں غم بانٹنے کیلئے ارد گرد موجود ہوتے۔ بیاباں جنگل، پتھریلے پہاڑوں اور صحرا میں یہ غم دیکھنے کو ملا..... دل سے ایک ہوک اٹھی، یا میرے رب! تو واقعی بے نیاز ہے۔ ام ایمن نے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے التجا کی، اٹھو بیٹا، میرے آقا ﷺ نے اپنے آنسوؤں سے تر چہرہ سے جواب دیا کہ "نہیں، میں نہیں جاؤں گا، مجھے اپنی ماں کے پاس ہی رہنے دو

"ام ایمن فرماتی ہیں کہ میں زبردستی اس ننھے شہزادے کو قبر سے اٹھا کر لائی۔

میرے آقا ﷺ آخری حج کے سفر میں اپنے رب کے حضور مناجات کیلئے تشریف لے جارہے ہیں، شدید گرمی کا مہینہ، آپ نے اپنی اونٹنی کا منہ ابواء کی طرف موڑ دیا اور 70 ہزار کا قافلہ اپنے آقا کے پیچھے رب کی تسبیح بیان کرتے ہوئے گامزن ہے۔ 57 برس گزر گئے، اتنا بڑا زخم اور صدمہ نجانے کیسے بھرا ہو گا۔ کہاں وہ بچپن کا چھٹا سال اور آج میرے آقا ﷺ 63 سال کی عمر میں، میرے آقا اپنی ماں کی قبر کے سرہانے تشریف لائے، اونٹنی کو بھی فاصلے پر بٹھا دیا، اس عظیم ہستی کی آخری آرام گاہ کی پتھریلی زمین پر دوزانو ہو کر، سر گھٹنوں میں جھکا کر بیٹھ گئے جس طرح بچپن میں اپنی ماں کے پاس بیٹھے تھے جب وہ انتہائی تکلیف میں بے چین ہو کر کروٹیں بدل رہی تھیں۔ یقیناً وہ سارے مناظر یاد آگئے تو بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر اسی طرح رونا شروع کر دیا جس طرح وہ بچپن میں اپنی والدہ مرحومہ کو اپنے ہاتھوں لحد میں اتارتے ہوئے بیتاب ہوئے تھے، جس طرح بے تابی میں ام ایمن کا ہاتھ چھڑا کر دوڑ کر قبر سے چمٹ گئے تھے۔ آج ایک مرتبہ پھر ان مبارک آنسوؤں کی برسات ریش مبارک کو تر کرتی ہوئی سینہ مبارک پر طوفان برپا کر رہی تھیں اور آج بھی کوئی چپ کرانے والا نہ تھا کہ صحابہ کرام کی پوری جماعت حزن و ملال کے اس مناظر میں ماں بیٹے کی ملاقات میں حائل نہیں تھے اور ادب کی بنا پر ایک فاصلے پر بیٹھے اپنے آقا ﷺ کی اس جذباتی اور رومانوی کیفیت کو دیکھ کر بے چین ہو رہے تھے۔ کافی دیر تک نجانے اپنی والدہ محترمہ سے کیا باتیں کرتے رہے کہ بچپن میں ماں کو ابھی جی بھر کر دیکھا بھی نہیں ہو گا، لاڈ و پیار کا وہ سارا زمانہ اب آنکھوں کے سامنے آرہا ہو گا جس کی بنا پر حزن و ملال کی کیفیت بے چین کر رہی تھی، دائمی جدائی کے تمام مناظر آج یکجا ہو کر میرے آقا ﷺ کو مضطرب کر رہے تھے۔ طبیعت اس قدر بے چین ہوئی کہ آپ نے اپنے تمام ساتھیوں کو ارشاد فرمایا: میں آج رات یہاں ہی قیام کروں گا اور وہاں نہیں گئے جہاں قیام کیلئے بندوبست کیا گیا تھا، اپنی ماں کے سرہانے ساری رات قیام فرمایا۔

حضور نبی کریم ﷺ بڑے مضبوط دل اور حوصلہ مند انسان تھے۔ مشکل سے مشکل وقت اور کڑے سے کڑے حالات میں بھی آپ صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ اپنے ساتھیوں کو صبر و تحمل، شجاعت اور مردانگی کا سبق دیا لیکن ان کی زندگی میں بھی چند مواقع ایسے آئے جب ان کی مبارک آنکھیں بے اختیار اشک بار ہو گئیں۔

ان میں سے ایک موقع وہ تھا جب غزوہ احد میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ ان کے گھر تشریف لے گئے ان کے بچوں کو پیار کیا اور ان کی شہادت کی خبر ان کی رفیقہ حیات کو دی۔ اس موقع پر آپ ﷺ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ایک موقع وہ تھا جب آپ ﷺ کے ڈیڑھ سالہ فرزند حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ انتقال کر گئے۔ اس وقت بھی ہزار ضبط کے باوجود آپ کی آنکھیں پرنم ہو گئیں اور ایک موقع وہ تھا جب غزوہ بدر سے آپ ﷺ فارغ ہونے کے بعد اپنی والدہ محترمہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کی قبر مبارک پر حاضر ہوئے جو اسی نواح میں تھی۔ وہاں آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تعجب سے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ کی آنکھوں میں آنسو؟ مطلب یہ تھا کہ آپ تو فرمایا کرتے ہیں کہ مرنے والوں پر رونا نہیں چاہیے لیکن اب آپ جیسے جری اور مضبوط انسان کی آنکھیں بھی نم ناک ہیں۔

اس موقع پر آپ ﷺ نے جو کچھ فرمایا اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک بیٹے کی طرف سے اپنی والدہ محترمہ کی جناب میں نذرانہ عقیدت و احترام ہے۔ ان آنسوؤں کو کم حوصلگی یا تھڑدلی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو بے اختیار آنسو ہیں جو اس حرم محترم میں حاضری کا خراجِ عقیدت ہے۔ یہ ماں کے ان قدموں میں، جن کے نیچے جنت ہوتی ہے، گلہائے عقیدت کے طور پر آنسوؤں کا گلدستہ ہے۔ جن کے ہاتھ میں جنت کی کلید ہے اور جن سے پہلے کوئی جنت میں

داخل نہیں ہو سکتا۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے کہ سب نبیوں پر جنت حرام ہے جب تک میں جنت میں داخل نہ ہو جاؤں، وہ اپنی ماں کیلئے ایسے بے قرار ہیں ۔ سبحان اللہ!

ان دنوں ہم بھی مغرب کی تقلید میں پچھلے کئی برسوں سے "مدر ڈے" کا تہوار منانے میں بڑا تفاخر محسوس کرتے ہیں۔ چلے آج ایک چھوٹی سی کہانی پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں جو مجھے ایک پڑھی لکھی ماں نے سنائی جس کے بچے ان سے دور بیرونِ ملک میں مقیم تھے۔ وہ ایک کالج کی پرنسپل رہ چکی ہیں۔ ساری عمر درس و تدریس میں گزار دی۔ اب بھی کئی غریب بچیوں کی کفالت انتہائی پردہ داری اور خاموشی کے ساتھ سرانجام دیتی ہیں۔ مجھے اس بات کا کبھی پتہ نہ چلتا اگر بوڑھاڈا کیا مجھے اس کی اطلاع نہ دیتا۔ ایک دفعہ میں ان کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا تو مجھے روک کر میرے کل شام کے ٹی وی پروگرام پر تبصرہ فرمانے لگیں۔ مجھے جہاں ان کی علمی گفتگو نے حیران کر دیا وہاں ان کی لاجواب یادداشت نے میرے دل و دماغ کے کئی چراغ روشن کر دیئے۔ میں جتنی دیر پاکستان میں رہتا ہوں ان سے سیکھنے کیلئے جی بھر کر باتیں کرتا ہوں، ان کی ڈھیر ساری باتیں سنتا ہوں جو وہ سارا سال میرے لئے جمع کر کے رکھی ہوتی ہیں۔ یہاں سے میں جب ٹیلیفون پر ان کو سلام کرتا ہوں تو ان کی خوش کلامی سے میرا دل معطر ہو کے رہ جاتا ہے لیکن مختصر سی بات کر کے یہ کہہ کر ختم کر دیتی ہیں کہ تمہیں خواہ مخواہ اس کا زیادہ بل آئے گا۔ آؤ گے تو خوب باتیں کریں گے۔

دوران قیام پاکستان ایک دن خود بخود میرے پاؤں ان کے گھر کی سمت چل پڑے۔ وہ مجھے باہر ہی مل گئیں۔ کیسی ہیں آپ ماں جی.....بہت شرمیلی ہیں وہ، مسکرائیں اور کہنے لگیں تم کیسے ہو؟ آج صبح سویرے ہی.....جی ماں جی آپ کو سلام کرنے آ گیا۔ انہوں نے پھولوں کا ایک گلدستہ تھام رکھا تھا۔ میں نے ان پھولوں کی بابت پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ میرے تینوں بیٹے امریکا میں مقیم ہیں، سب سے چھوٹے بیٹے نے یہ پھول بھیجے ہیں کیونکہ آج "مدر ڈے" ہے ناں! میں نے بھی انہیں مدر ڈے کیلئے جب "وش" کیا تو دعائیں دینے لگیں "جیتے رہو میرے بچے، سدا خوش رہو، خوشیاں دیکھو۔ ان کی آواز کے زیر و بم، میں کیسے تحریر کروں اور ان کے چھلکتے آنسوؤں پر ضبط کی ناکام کوشش کو کیسے صفحہ پر بکھیروں۔

تھوڑی دیر آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہیں، بالکل گم سم۔ آپ ٹھیک تو ہیں ماں جی! میری آواز سن کر چونک سی گئیں اور واپس اسی دنیا میں لوٹ آئیں۔ اب تو تمہارے سر کے بالوں اور داڑھی میں کافی سپیدی آ گئی ہے، کیا تمہارے پوتے پوتیاں تم سے کہانی سننے کی فرمائش کرتے ہیں؟ جی ہاں، کبھی کبھار، وگرنہ آج کل تو اسکول کا ہوم ورک اور بعد میں کمپیوٹر پر بچوں کی مصروفیت کے بعد دوستوں سے موبائل فون کی گپ شپ اور ٹیکسٹ پیغامات نے تو گھر میں عجیب اجنبیت پیدا کر رکھی ہے کہ بچوں کے پاس اب بڑوں کے پاس بیٹھنے کی فرصت کہاں؟

تم نے مجھے "مدر ڈے" پر "وش" کر کے ماں جی تو مان لیا اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ میں تم سے عمر میں کافی بڑی ہوں۔ چلو آج ہم دونوں ایک بھولی بسری روائت کو قائم کرتے ہیں۔ کہانی سنو گے؟ انہوں نے اچانک مجھ سے یہ فرمائش کر دی۔ "ضرور، کیوں نہیں، مدت ہوئی مجھے کوئی کہانی سنے ہوئے" ۔ انہوں نے موقع کی نسبت سے ایسی دلخراش کہانی سنائی کہ جس کو سن کر میں بھی دل تھام کر رہ گیا، آپ بھی سنیں:

ایک شخص اپنی ماں کو پھول بھجوانے کا آرڈر دینے کیلئے ایک گل فروش کے پاس پہنچا۔ اس کی ماں دو سو میل کے فاصلے پر رہتی تھی۔ جب وہ اپنی کار سے نیچے اترا تو اس نے دیکھا کہ دکان کے باہر فٹ پاتھ پر ایک نو عمر لڑکی بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ وہ شخص اس لڑکی کے پاس آیا اور اس کے رونے کا سبب پوچھا۔ لڑکی بولی: میں اپنی ماں کیلئے سرخ گلاب خریدنا چاہتی ہوں لیکن میرے پاس صرف ایک پاؤنڈ ہے جبکہ گلاب کی قیمت دو پاؤنڈ ہے۔ یہ سن کر وہ

شخص مسکرایا اور اسے دلاسا دیتے ہوئے بولا، میرے ساتھ اندر چلو، میں تمہیں گلاب دلا دیتا ہوں۔ اس نے بچی کو گلاب کے کئی پھول خرید کر اپنی ماں کیلئے پھولوں کا آرڈر بک کروایا۔

دکان سے باہر آنے کے بعد اس نے لڑکی کو گھر تک پہنچانے کی پیشکش کی۔ یس پلیز! لڑکی نے جواب دیا، آپ مجھے میری والدہ کے پاس لے چلیں۔ لڑکی کی رہنمائی میں وہ ایک قبرستان تک پہنچے۔ لڑکی نے وہ سرخ گلاب کے پھول ایک تازہ بنی ہوئی قبر پر رکھ کر دعا مانگنے لگی۔ وہ شخص پلٹ کر گل فروش کے پاس پہنچا اس نے اپنا آرڈر منسوخ کرا دیا اور ایک گلدستہ لے کر فوری اپنی ماں سے ملنے کیلئے روانہ ہو گیا اور سارے راستے میں اپنی نم آلود آنکھوں سے اس معصوم لڑکی کا شکریہ ادا کرتا رہا کہ اس نے بروقت اس کی بہترین رہنمائی کی۔ جونہی وہ اپنی ماں کے پاس پہنچا تو اس کی ماں کی آنکھوں میں جھلکتی خوشی کے آنسو اپنی زندگی سے بھی کہیں قیمتی نظر آئے گویا وہ اپنے رب کے عطا کردہ اس بیش بہا خزانے کو برسوں سے پہچان نہ پایا تھا جس کا پتہ آج اس معصوم لڑکی نے بتا دیا۔

آخری فقرہ کہتے ہوئے ان کی آواز کپکپانے لگی تو میں نے اپنی جھکی گردن اٹھا کر ان کے چہرے پر نظر ڈالی تو انہوں نے منہ پھیر لیا کہ میں ان کی آنکھوں کی چغلی نہ پکڑ لوں۔ "سنا ہے تم اخبارات میں لکھتے ہو۔ لگتا ہے جو بچے اپنی ماؤں سے ہزاروں میل دور رہتے ہیں، اب کیا وہ اپنی ماں کی قبر پر سرخ گلاب رکھ کر ہی محبت کا اظہار کریں گے؟ کتنا مشکل ہے اس طرح جینا.....!" اس سوال کا ہے کوئی جواب آپ کے پاس! اگر نہیں تو پھر جلدی کیجئے کہ ہمارے لئے تو ہر دن ہر لمحہ "مدر ڈے" ہے اور یہی تعلیم میرے آقا خاتم النبیّن ﷺ کی ہے۔

بروز سوموار 5 ذوالقعد 1445ھ 13 مئی 2024ء

فیصلہ کن گھڑی

مزاحمتی قوت گرتے ہوؤں کو پیروں پر کھڑا کرتی ہے، ڈوبتے ہوؤں کو تیرنے کا حوصلہ دیتی ہے اور ساحل پر لا پٹختی ہے۔ بیمار کو بیماری سے جنگ میں فتح یاب کرتی ہے (اللہ کے حکم سے) بجھتے دیئے کی لو بجھنے سے پہلے تیز ہو جاتی ہے، کیوں؟ شائد یا دیر تک جلنا چاہتا ہے۔ یہ اس کی مزاحمت ہے۔ اندھیروں کے خلاف کبھی کوئی مسافر کسی جنگل میں درندوں کے درمیان گھر جائے تو تنہا ہی مقابلہ کرتا ہے کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ ایک ناتواں مریض جو بستر سے اٹھ کر پانی نہیں پی سکتا، ناگہانی آفت کی صورت میں چھلانگ لگا کر بستر سے نیچے کود سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مریض میں وہ مزاحمتی قوت موجود تھی جس کا اس کو خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ خطرے کے احساس نے اس قوت کو بیدار کر دیا۔

یہی وہ قوت ہے جو کمزوروں کو طاقتور سے ٹکرا دیتی ہے، کبوتر کے تنِ نازک میں شاہین کا جگرہ پیدا ہو جاتا ہے، چیونٹی ہاتھی کے مقابلے میں اتر آتی ہے، مظلوم کی آنکھیں قہر برساتی اور سلگتے انگارے شعلہ جوالہ بن جاتے ہیں لیکن تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ دنیاوی کامیابی کے حصول کیلئے مزاحمت کمزور پڑ کر سرد ہو جاتی ہے لیکن اگر مزاحمت کے ساتھ "ایمان باللہ" شامل ہو جائے تو مزاحمت کبھی سرد نہیں پڑتی، راکھ میں کوئی نہ کوئی چنگاری سلگتی رہتی ہے جہاں مزاحمتی قوت بیدار ہو تو یہ چنگاری بھڑک اٹھتی ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ یہ مزاحمتی قوت اس وقت بیدار ہو جب خطرہ حقیقت بن کر سامنے سامنے آجائے، جب سر پر لٹکتی تلوار کی نوک شہ رگ کو چھونے لگے، جب سرحدوں پر کھڑے مہیب اور دیو ہیکل ٹینکوں اور طیاروں کی گڑگڑاہٹ سڑکوں اور چھتوں پر سنائی دینے لگے۔ جب ڈیزی کٹر، کروز اور ٹام ہاک بم بارش کے قطروں کی طرح برسنے لگیں۔ جب بہت کچھ "گنوا کر" کچھ بچانے کیلئے ہم مزاحمت پر اتر آئیں گے؟

پاکستانی قوم سے خطرہ در حقیقت "دو چار لب بام" ہی رہ گیا ہے اور ہم ہیں کہ ذہنی پسپائی کی راہ پر سرپٹ بھاگے جا رہے ہیں۔ جب کوئی قوم لڑے بغیر ہی شکست تسلیم کر لیتی ہے تو یہ جسمانی نہیں ذہنی پسپائی ہوتی ہے۔ ایسی قوم کو جسمانی طور پر زیر کرنے کیلئے دشمن کو زیادہ مشکل نہیں اٹھانی پڑتی۔ ہلاکو خان کی فوجیں کھوپڑیوں کے میناریوں ہی نہیں تعمیر کر لیا کرتی تھیں۔ صلاح الدین ایوبی نے جب "ملت اسلامیہ" کا نام لیا تو ایک غدار فوجی افسر طنزیہ مسکرا اٹھا، کون سی ملت اسلامیہ؟ یہ ذہنی پسپائی کی سب سے گری ہوئی شکل تھی کہ ایک دیو ہیکل انسان اپنے ہی وجود سے انکاری تھا لیکن صلاح الدین ایوبی نے مزاحمت کی قوت کے ساتھ ایمان کو جمع کر کے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے بعد بیت المقدس ناپاک ہاتھوں سے چھین لیا۔

اگر آج ہم مصیبت میں گرفتار ہیں تو ہمارا دشمن ہم سے بڑھ کر مصیبت مول لے چکا ہے۔ کئی مرتبہ اس نے ایک سازش کے تحت آبی جارحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سیلابی ریلے کو ارضِ پاکستان کی طرف دھکیل دیا مگر اپنے جرائم کی سنگینی سے توجہ ہٹانے کیلئے مکاری کا اظہار کرتے ہوئے اپنے بغل میں چھپائے خنجر کو دنیا کی نظروں سے اوجھل رکھنے کیلئے پاکستان کو مدد فراہم کرنے کی منافقانہ خواہش کا اظہار بھی کر دیا لیکن وہ شائد یہ بھول رہا ہے کہ ایک یقینی شکست کے امکان کے باوجود محض دنیا پر ظاہری غلبے کی خواہش نے اسے ایک ایسی دلدل میں اتار دیا ہے جہاں اگلا قدم اس کی ظاہری شان و شوکت اور مصنوعی ہیبت کا جنازہ نکال کر رکھ دے گا۔

کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ ہم جو گھروں میں بیٹھے ہیبت زدہ ہیں، وہ اپنے آقاؤں سمیت سارے لاؤ لشکر کے باوجود ہم سے زیادہ خوفزدہ ہے۔ اس کی چڑھائی میں شیر جیسی بے جگری نہیں بلکہ لومڑی جیسی عیاری ہے۔ ہمیں دیوار سے لگ کر کانپنے کی ضرورت نہیں، پس آج ہمیں اپنی مزاحمتی قوت کو

سمجھنے کی ضرورت ہے جس کی بنیاد "ایمان" ہے اور اس قوت کو مضبوط کرنے والی قوت "اللہ کی نصرت" ہے۔ جب مومن اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے تو مزاحمت میں اللہ کی نصرت نازل ہو کر اس کو کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔ تاریخ اسلام کے صفحات پر ایسی روشن مثالیں ان گنت تعداد میں جگمگا رہی ہیں جب نہتے مسلمانوں کی مزاحمت نے وقت کے فرعونوں کو زخم چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ آج بھی دنیا بھر میں مزاحمتی تحریکیں پوری شان سے جاری جاری ہیں۔ پتھر نے ٹینک سے شکست نہیں کھائی، معمولی ہتھیاروں سے جدید ٹیکنالوجی کا مقابلہ جاری ہے۔ جتنا ظلم بڑھتا جا رہا ہے، اتنی ہی شدت سے مزاحمت بڑھتی جا رہی ہے۔

لیکن کیا مزاحمت کی صرف ایک ہی صورت ہے؟ جب کوئی جابر وقت اپنے لشکروں کے زعم میں کسی قوم پر چڑھ دوڑتا ہے تو ہر ہاتھ ہتھیار اٹھا لیتا ہے۔ یہ یقینی امر ہے کہ ایسے وقت میں اس کے بغیر مزاحمت کی کوئی اور صورت نہیں ہوتی لیکن اس سے بھی پہلا مرحلہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے اور ہمیں یاد رکھنا ہو گا کہ مزاحمت "ایمان" اور "کڑے احتساب" کے بغیر کچھ نہیں۔ لہذا ایسا کڑا وقت آنے سے پہلے "ایمان" کو بچانا اور قائم رکھنا اشد ضروری ہے۔ ایمان کی کمزوری ہی ذہنی غلامی اور پسپائی کی طرف لے جاتی ہے لہذا ہر اس وار کی مزاحمت ضروری ہے جس کا نشانہ آج ایمان بن رہا ہے۔ ہمارے نظریات و افکار، ہمارا طرزِ زندگی، ہماری تعلیم، ہماری معیشت، ہمارا میڈیا یہ سب وہ میدان ہائے کارزار ہیں جو ہماری مزاحمتی قوت کے شدت سے منتظر ہیں۔ یہ ڈوب رہے ہیں، ان کو ساحل پر کھینچ لانے کیلئے بھرپور توانائیوں کی ضرورت ہے۔

ہمارا دشمن اس بات سے پوری طرح باخبر ہے کہ دنیا میں صرف دو ریاستیں نظریات کی بناء پر قائم ہیں، ایک پاکستان اور دوسری ریاست اسرائیل ہے جس کو عین مسلمان ملکوں کے درمیان ایک سازش کے تحت بطور ایک خنجر کے گاڑھ دیا گیا ہے اور پچھلی سات دہائیوں سے زائد فلسطینیوں، کشمیریوں کا خون مسلسل بہہ رہا ہے۔ ٹرائیکا (اسرائیل، امریکا، انڈیا) کے ناپاک گٹھ جوڑ اور ہمارے مسلم حکمرانوں کی اقتدار کی بدبودار ہوس نے مسلم امہ کو نزع کی حالت میں پہنچا دیا ہے اور اس کیلئے جب سے ایک متعصب یہودی نژاد امریکی ہنری کسینجر نے "ورلڈ آرڈر" تشکیل دیا ہے، جس میں بڑی وضاحت کے ساتھ اعلان کیا گیا ہے کہ سوویت یونین کے کیمونزم کو شکست دینے کے بعد اب اسلام کی باری ہے اور جب تک اسلامی نظریات کی مکمل طور پر بیخ کنی نہیں ہو جاتی، "ورلڈ آرڈر" کی تکمیل نہیں ہو سکتی اور اس منصوبے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ پاکستان کا وہ ایٹمی پروگرام ہے جس کو ختم کرنا از حد ضروری ہے۔

اس سلسلے میں ٹرائیکا کی مدد کے ساتھ امریکا نے اپنے تمام مغربی اتحادیوں کو "صدام کے دنیا کو تباہ کرنے والے ہتھیاروں" جیسا خوف پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں پھیلا رکھا ہے جس کیلئے پہلی مرتبہ مغرب سے ویسی حمائت نہ ملنے کی صورت میں ٹرائیکا نے اپنے پلان "بی" پر عملدرآمد شروع کر رکھا ہے۔ "عرب بہار" کے نام پر لیبیا، تیونس، عراق، شام اور یمن کو تاراج کرنے کے بعد باقی ماندہ مسلم ممالک کیلئے نظریاتی پروپیگنڈہ کیلئے سب وروز "سوشل میڈیا" کو میدان میں اتارا گیا۔ سابقہ امریکی صدر ٹرمپ کے یہودی داماد "جیر الڈ کشنز" نے سعودی ولی عہد کی دوستی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اک نئے "لارنس آف عریبیا" کا کردار ادا کرتے ہوئے خطے کے اہم عرب ممالک سے اسرائیل کے جہاں سفارتی تعلقات بحال کرنے میں اپنا کردار ادا کیا بلکہ حالیہ غزہ فلسطین پر اسرائیل کی جانب سے جو قیامت خیز مناظر ساری دنیا کو دیکھنے کو ملے، اس انسانیت سوز مظالم پر سارے مغرب اور خود امریکا میں جہاں بے پناہ ردعمل نظر آیا، اس کے مقابلے میں خطے کے عرب ممالک نے ریت میں سر دیکر جو مجرمانہ خاموشی اختیار کی، وہ بھی اقوامِ عالم کے

ایک سوالیہ نشان بن کر تاریخ میں رقم ہو چکی ہے لیکن پاکستان جو واحد ایٹمی قوت ہے، اس کو بھی خاموش رکھنے کیلئے دس سال قبل ہی پاکستان کی ایٹمی قوت کو سلب کرنے کیلئے سازشیں شروع ہو گئی تھیں لیکن ساری دنیا کے دفاعی ماہرین کے سامنے پاکستان کے ایٹمی میزائل کی تیز رفتار ترقی اور اس کے آزمائشی ٹیسٹ کے ٹھیک ٹھیک نشانوں نے ان کی شب و روز کی نیندوں کو حرام کر رکھا ہے جس کی بنیاد پر انہوں نے پاکستان کے سیاسی نظام کو یرغمال بناتے ہوئے تین منصوبوں پر عملدرآمد شروع کر دیا۔

سب سے پہلا منصوبہ یہ بنایا گیا کہ پاکستان کی معاشی حالت کو اس قدر لاغر کر دیا جائے کہ یہ اپنے حالات سے مجبور ہو کر دیوالیہ کی حد تک پہنچ جائے اور فوری طور پر عالمی میڈیا کے ذریعے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خطرے کا اعلان کر کے پاکستان کو اس طاقت سے محروم کر دیا جائے جس کیلئے یہاں ایسے حکمران لائے جائیں، جن سے یہ سودہ آسانی سے طے پا جائے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ پاکستان میں ایسے حکمران لائے جائیں تو بظاہر تو امریکا کے خلاف نظر آتے ہوں لیکن ان کی ڈور مکمل طور پر ان کے پاس ہو۔ اس سلسلے میں اپنے ایک کالم "میں ٹوٹتی سانسوں کی فصیلوں پر کھڑا ہوں" میں لکھ چکا ہوں کہ "عالم عرب میں مرد آہن کہلانے والے جمال عبد الناصر کے بارے میں منظر عام آنے والی برطانوی مصنف جیمز بار کی کتاب "دی لارڈز آف ڈیزرٹ" میں انکشاف کیا گیا ہے کہ مصر میں 1952ء کا فوجی انقلاب امریکا کی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کے اکسانے اور اس کے عملی تعاون سے برپا ہوا تھا ۔ فوجی انقلاب کے ترجمان ریڈیو اسٹیشن وائس آف عرب کا قیام بھی سی آئی اے کی مدد سے ممکن ہوا اور لیفٹیننٹ کرنل جمال عبد الناصر نے اپنے ساتھیوں کی ملی بھگت سے شاہ فاروق کا تختہ الٹ دیا۔ کتاب کے مصنف جیمز بار نے اپنی کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مصر میں اس فوجی انقلاب کی وجہ امریکا اور برطانیہ کے درمیان مشرق وسطیٰ میں اپنا اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کی کشمکش تھا۔ برطانیہ مصری بادشاہ شاہ فاروق کی حمایت کر رہا تھا جبکہ سی آئی اے اپنے مجوزہ پروگرام کی تکمیل میں اسے رکاوٹ سمجھتے تھے۔" اور اپنے اسی مضمون میں دلائل کے ساتھ جنرل باجوہ اور عمران کے ہاتھوں "کشمیر فروشی" کا انکشاف بھی کر چکا ہوں۔

اس سے اگلا قدم یہ ہو گا کہ جیل یاترا کے بعد عمران کو ایک بھرپور حمائت کے ساتھ قوم کا لیڈر بنا کر ایک مرتبہ پھر قوم کے سامنے لایا جائے۔ اس کے بعد اپنے باقی ماندہ پروگرام کو اس طرح عملی جامہ پہنایا جائے کہ پاکستانی قوم کو معلوم ہی نہ ہو سکے کہ ان کے ساتھ "اتنا بڑا ہاتھ" ہو گیا کہ نہ صرف پاکستان کو ایٹمی قوت سے محروم کر دیا گیا بلکہ خطے میں تنہا کرتے ہوئے چین جیسے دوست سے بھی محروم کر دیا گیا۔ اس کی ماضی سے ایک مثال سامنے رکھ دیتا ہوں جس سے ہم نے اب تک کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔

2014ء میں "را" کے ایک سابق افسر "آر کے یادیو" نے اپنی کتاب "مشن آر اینڈ اے ڈبلیو" میں انکشاف کیا ہے کہ اندرا گاندھی نے 1967ء میں آئی بی کے سینیئر افسر آر این کاؤ کے ساتھ مل کر ایک خفیہ منصوبہ تیار کیا جس کا مقصد مشرقی پاکستان، بلوچستان اور صوبہ سرحد (اب خیبر پختونخوا) میں بغاوت کے جذبات کو تقویت دے کر ان کو علیحدہ ریاستوں میں تبدیل کرنا تھا۔ اس منصوبے کو "کاؤ پلان" کا نام دیا گیا۔ باوثوق شہادتوں کے مطابق شیخ مجیب الرحمن بھارتی خفیہ ایجنسی سے 25 ہزار روپے ماہانہ وصول کرتا تھا۔ حسینہ واجد نے مجیب کی یادداشتوں پر مبنی کتاب میں تسلیم کیا ہے کہ مجیب الرحمن نے بنگلہ دیش کی آزادی کیلئے ایک خفیہ تنظیم قائم کر رکھی تھی۔ اگر تلہ سازش کیس بے بنیاد نہ تھا جو سیاسی مصلحتوں کی نذر ہو گیا۔ خفیہ ایجنسی را نے گہری سوچ بچار کے بعد چھ نکات تیار کئے جن کا بنیادی مقصد پاکستان کو پانچ ٹکڑوں میں تقسیم کرنا تھا۔ ادھر ہمارے ہاں مغربی پاکستان میں تخمینے لگانے والوں

نے ہوش سے کام نہیں لیا۔ اندرا گاندھی نے امریکا اور چین کو پاکستان کی مدد سے باز رکھنے کیلئے روس سے دفاعی معاہدہ کر لیا۔ رانے مکتی باہنی تیار کی تا کہ مشرقی پاکستان کے اندر فوج کے خلاف گوریلا جنگ کا آغاز کیا جاسکے۔ یوں گھر کو گھر کے چراغ سے ہی آگ لگادی گئی۔

کون نہیں جانتا کہ عمران خان کی سیاسی پرورش کیسے ہوئی اور کن ہاتھوں نے اسے تیار کر کے اپنے مقاصد کیلئے میدان میں اتارا۔ 2014 کے طویل دھرنے کے وقت ہی تمام حقائق سامنے آنا شروع ہو گئے تھے اور اس سلسلے میں باقاعدہ طور پر کئی ہزار افراد کو باقاعدہ تنخواہ پر سوشل میڈیا کیلئے استعمال کی تربیت دی گئی اور یہ کام صرف اندرونِ ملک ہی نہیں بلکہ بیرون ممالک میں بھی بڑی رازداری کے ساتھ سرانجام دیا گیا۔ پاکستان کے سیاسی تاریخ میں عمران خان بلامبالغہ اسٹبلشمنٹ کا سب سے چہیتا قریبی باخبر اور بااعتماد وزیر اعظم بن گیا۔ جتنی بریفنگ میٹنگز اور معلومات عمران کو ملٹری اسٹبلشمنٹ اور ملکی خطرات کے بارے میں ہیں، ممکن نہیں کہ موجودہ سیاستدانوں میں کسی اور کے پاس ہوں کیونکہ عمران کو ایک سویلین اور سیاسی لیڈر کی بجائے ایک ملٹری لیڈر کی طرح سسٹم کا حصہ بنا کر رکھا گیا تھا۔ جس کیلئے پہلی بار ایک سیاسی لیڈر کیلئے ہر ادارے کو مجبور کیا گیا تھا کہ وہ ہر وہ کام کرے جس سے عمران کی شخصیت پارٹی اور مقاصد کا حصول سہل تر ہو جائے۔

کل کی بات ہے کہ پہلی دفعہ اس کی خاطر خود جنرل باجوہ اور اس کے فوجی رفقا کھلم کھلا مہینے میں چھ چھ پارمیڈیا کو مثبت رپورٹنگ کی ہدایات دیا کرتے تھے اس لئے مجھ جیسے کئی افراد کیلئے عمران خان کے اس انٹرویو کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا جس میں عمران خان نے سمیع ابراہیم کے ساتھ (فکسڈ انٹرویو میں) ملک کے دیوالیہ ہونے، اس سے ہمارے سب سے مضبوط فوج کے ادارے کا متاثر ہونے، اس کے بدلے میں یوکرین کی طرح ایٹمی ہتھیاروں سے دستبردار ہونے اور اس کے نتیجے میں خدانخواستہ ملک کے تین ٹکڑے ہونے کا خدشہ ظاہر کیا تھا۔ یقیناً عمران اس انٹرویو سے جہاں اپنے بیرونی آقاؤں کی نظر میں وفاداری کا پیغام دے رہا تھا وہاں مضبوط فوجی ادارے پر بھی اپنا خوف قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بظاہر جنرل باجوہ اور دیگر اہم عسکری عہدیداروں کو یہ یقین دلا تا رہا کہ وہ دراصل قوم کو اپنی فوج کی اہمیت واحترام بڑھانے کیلئے بیان دے رہا ہے۔

آیئے! اب اس تناظر میں 9 مئی کے واقعات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب آئی ایس آئی کے سربراہ کی تعیناتی کے معاملے میں عمران نے اپنی من مانی اور مداخلت کرتے ہوئے ادارے کی سلامتی کو کئی خطرات سے دوچار کر دیا اور وہاں سے جنرل باجوہ اور دیگر ان عسکری رفقاء کو ایک شدید جھٹکا لگا اور اس وقت اس خطرے سے جان چھڑانے کیلئے طے پا گیا کہ اپنے ہاتھ کی لگائی ہوئی گرہ کو دانت سے کھولنے کا وقت گیا ہے۔ ادھر عمران نے بھی جنرل باجوہ اور اس کے ساتھیوں کو برسرعام جلسوں میں میر جعفر اور میر صادق کے القاب سے پکارنا شروع کر دیا۔

عمران کو سوشل میڈیا کی جانب سے شہرت کی جن بلندیوں پر دکھایا گیا، اس سے خود عمران کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ جس طرح ترکی میں عوام نے فوجی بغاوت کو کچل دیا، اب ایسا ہی عمل وہ پاکستان میں لانے میں کامیاب ہو جائیں گے جس کے بعد اگلے پندرہ سال تک جنرل فیض حمید کے ساتھ طے کردہ پلان پر عمل کرنا بہت ہی آسان ہو جائے گا اور اس کیلئے یقیناً بیرونی آقا بھی درپردہ ان کا اسی طرح ساتھ دیں گے جس طرح الجزائر اور مصر میں دیا گیا لیکن عمران خان یہ بھول گئے کہ ترکی میں تو فوج نے منتخب حکومت کو گرانے کیلئے راست اقدام کیا جس کو عوام نے ناکام بنایا لیکن یہاں تو عمران نے اپنی پوری ٹیم کے ساتھ منصوبہ بندی کرتے ہوئے 9 مئی کا پلان تیار کیا کہ اس پر کوئی حرف نہ آئے جس کیلئے وہ جیل چلا گیا لیکن اگلے ہی دن جب عدالت میں پیشی ہوئی تو میڈیا کے سامنے سینہ پھلا کر بیان داغ دیا کہ مجھے اگر پھر گرفتار کیا جائے گا تو اس سے کہیں زیادہ شدید ردِّ عمل آئے گا۔

اگر آپ کو یاد ہو تو پاکستان کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کا نظریہ ریٹائرڈ لیفٹیننٹ کرنل پیٹر رالف نے امریکی فوج کے میگزین میں 2006 میں اپنے ایک مضمون "بلڈ بارڈرز، ہاؤ اے بیٹر مڈل ایسٹ ووڈ لک" مجوزہ نقشے کی صورت میں چھاپا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مشرق وسطیٰ کے سرحدات مغربی طاقتوں نے اپنے مفادات کیلئے مقامی لوگوں کے ساتھ ناانصافی کر کے بنائے ہیں، اب انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کئی ایک ممالک کے سرحدات نئے سرے سے خونی رشتوں کے بنیاد متعین کیے جانے چاہیے۔ تاکہ ممالک کے درمیان موجود ٹینشن اور مخاصمت ختم ہو جائے، جس کے نتیجے میں امریکی فوج مشرق وسطی سے باآسانی نکل سکے گی۔

پیٹر رالف کے آرٹیکل اور مجوزہ نقشے (جس کو ٹرائیکا کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی) کے مطابق مسلم دنیا کے تین اہم امریکی اتحادی ممالک یعنی ترکی سعودی عرب اور پاکستان نئے نقشے کے مطابق بڑی تبدیلیوں سے گزار کر کئی ٹکڑوں میں تقسیم دکھائے گئے ہیں۔ ترکی سے بڑا علاقہ کاٹ کر کردستان کا نیا ملک تخلیق کیا گیا، سعودی عرب کے تین ٹکڑے کر کے شیعہ ملک، مقدس سرزمین اور سعودی عرب بنائے گئے ہیں، جبکہ پاکستان کو دریائے سندھ کے کنارے کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹے ملک کے طور پر دکھایا گیا جس کے جنوبی علاقہ آزاد بلوچستان اور شمالی علاقے افغانستان کو دیے گئے ہیں۔

یاد رکھیں! جب جسم کا ایک حصہ کمزور پڑ جائے تو اس پر بیماریاں حملہ آور ہو جاتی ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی غلطیوں کو سامنے رکھتے ہوئے اور اغیار کی سازشوں اور ریاکاریوں کو سمجھنے کیلئے جہاں اپنی سیاست کے معیار قائم کریں، وہاں اپنوں میں موجود ایسے عناصر کو سختی سے دبائیں جو وطن پرستی کو ختم کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ آج وہ خطرناک مرحلہ آچکا ہے جب نحیف ونزار مریض زندگی کی ڈور سلامت رکھنے کیلئے اس پوشیدہ قوت پر انحصار کرتا ہے جو اس کے جسم میں بجلی کی سی طاقت بھر دیتی ہے۔ گونگے، بہرے اور اندھے بھی اس نازک دور کی شدت سے کچھ کر گزرنے کو تیار ہو جائیں تو جن کو اللہ نے تمام تر توانائیوں سے نوازر کھا ہے ان کو اپنی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے سے کس نے روک رکھا ہے؟

مسلمانان پاکستان نے اگر آج اپنی اس طاقت کے راز کو پالیا جس کا نام ایمان ہے اور اس کو پختہ کر لیا تو یہ وہ مورچہ ہے جس میں پناہ لینے والوں کیلئے دائمی فتح کی خوشخبریاں ہیں۔ ایمان کی آبیاری وقت کی اولین ضرورت ہے اور وقت سر پر کھڑا ہے۔ مزاحمت، ایمانی قوت سے مشروط ہے، اس کو کھو دیا تو سب کچھ چھن جائے گا۔ ارضِ وطن کی سلامتی کیلئے ہر اس مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانا ضروری ہے جنہوں نے اس ملک کے ساتھ ایسا بھیانک کھلواڑ کیا کہ شہداتک کو نہیں بخشا گیا۔

پیڑ اسی احساس سے مرتے جاتے ہیں
سارے پرندے ہجرت کرتے جاتے ہیں

بروز جمعرات 8 ذوالقعد 1445ھ 16 مئی 2024ء

لُکن میٹی، چھپن چھپائی

کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جن پر لکھنے کو دل تو بہت مچلتا ہے لیکن جب لکھنے کی کوشش کرنے لگیں تو دماغ خالی ہو جاتا ہے کہ کہاں سے شروع کروں اور اس کا انجام کیا ہو گا؟ اب بھلا "ماں" پر کیا لکھا جائے۔ وہ موزوں الفاظ کہاں سے لاؤں جو ممتا کی صحیح عکاسی کر سکیں، جو ماں کی مخلص دعاؤں کی درست ترجمانی کر سکیں، میرے لئے تو یہ ممکن نہیں۔ ہر قلمکار ماں کے رشتے کو بہت عظیم لکھ کر مطمئن ہو جاتا ہے لیکن میں اس کو ایک اضافی لفظ سے زیادہ نہیں سمجھتا کیونکہ عظمتوں کے کوہ ہمالیہ کو خالی عظیم لکھ دینا کہاں کا انصاف ہے؟ بالخصوص وہ مائیں جو جوانی میں بیوگی کا بوجھ اپنے دل پر اور زمانے بھر کی مجبوریوں ومشکلات کا تاج اپنے سر پر سجا کر اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی پرورش میں اپنی جوانی کے شب وروز قربان کر دیتی ہے جبکہ یہ ضروری نہیں کہ اس ظالم اور بے حس معاشرے میں انہیں ان قربانیوں کا صلہ بھی ملے۔

قارئین کی طرف سے "کتنا مشکل ہے جینا۔۔۔۔ مدر ڈے" مضمون کے بعد پیغامات کا ایک لامتناہی سلسلہ اور مختلف اور خوبصورت الفاظ سے مرصع احساسات کے کئی گلدستے میرے دامن میں بھر دیئے گئے ہیں جن میں ایک یہ پرزور مطالبہ بھی کیا گیا ہے کہ جن کی مائیں اس دنیا سے رخصت ہو گئیں ،ان کے بارے میں کچھ نہیں لکھا گیا جبکہ نصف صدی سے زندگی کا کوئی ایسا لمحہ نہیں گزرا، جب مرحومہ والدہ محترمہ ایک پل کیلئے بھی جدا ہوئی ہوں۔ آج بھی کسی ماں کی جدائی کا سنتا ہوں تو بے اختیار اپنی ماں کا چہرہ سامنے آجاتا ہے کہ جو ہر مشکل میں اپنے سینے سے لگا کر ایسی تسلی دیتی تھی کہ سارا غم کافور ہو جاتا تھا۔ میں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ ماں کے بغیر بھی جی سکتے ہیں۔

ماں چلی گئی، کہیں بادلوں کے پار، اس کا کمرہ خالی کیا ہوا، ہر چیز سونی ہو گئی، گویا زندگی کے سارے رنگ ہی روٹھ گئے۔ ماں کے رخصت ہونے کے بعد ایک دن مولوی صاحب کو بلایا تو وہ مسجد سے کئی درجن بچوں کو بھی قرآن پڑھنے کیلئے ساتھ لے آئے۔ سینکڑوں کی تعداد میں احباب بھی قرآن خوانی میں مشغول تھے گویا ہم سب ماں کی جدائی کا ادھار لوٹانے کیلئے اپنے تئیں یہ سب کچھ کر رہے تھے۔ ماں کو جتنے کھانے پسند تھے، سارے تیار کروائے، ہم سب کو علم ہے کہ ماں تو ساری عمر ہمارے پسند کے کھانے بناتی رہتی تھی، سخت گرمی میں پسینہ سے شرابور ہماری سیوا کیلئے، اپنے شوہر اور خاندان کے ہر فرد کیلئے سارا دن مختلف انواع واقسام کے کھانے بناتے ہوئے کبھی شکائت زبان پر نہیں آئی، درجنوں مہمانوں کی خاطر مدارت کیلئے کیا کچھ نہیں بنتا تھا لیکن سب کچھ ختم ہو جانے پر خود بڑی سادگی سے پیاز، نمک مرچ کی چٹنی کوٹ کر روٹی یہ کہہ کر کھالیتی کہ ڈھیر سارا کھانا پکا کر میرا جی بھر گیا، اس لئے چٹنی سے روٹی کھانے کو دل چاہ رہا تھا۔

لیکن آج ان کی رخصتی پر سارے کھانے بڑے اہتمام کے ساتھ تیار کروائے گئے، پہننے کیلئے اس نے اپنے لئے دو یا تین سوٹ ہی رکھے تھے لیکن آج جیسے کپڑے پسند تھے، سب وہ بھی لا کر رکھے کہ یہ تمام اشیاء بعد میں غریبوں میں تقسیم کریں گے۔ جو جو ماں کرتی تھی، اپنی زندگی میں ماں جو کچھ اپنے پیاروں کیلئے کرتی رہی، آج وہ سب کچھ اسی طرح دہرایا گیا۔ امام صاحب نے قرآن خوانی کے اختتام پر دعا کیلئے جب ہاتھ اٹھائے ہوئے اللہ سے مانگنے کا عمل شروع کیا تو اونچی آواز میں ہم سب کو کہا کہ جو کچھ اللہ سے مانگنا ہے، خوب مانگو۔ مجلس میں سب نے بند آنکھوں اور گردن جھکائے، چہرے پر بڑی عاجزی لاتے ہوئے امام صاحب کی ہر دعا پر اونچی آواز میں آمین کہنا شروع کر دیا لیکن مجھے تو مانگنے کا سلیقہ ہی نہیں آتا تھا کہ ماں کے ہوتے ہوئے کبھی مانگنا ہی نہیں پڑا اور کبھی ایسا سوچا ہی نہیں تھا کہ ماں چلی جائے گی اور ماں کا یہ کام مجھے خود کرنا پڑے گا۔ میری آواز کو تو آسمان کی طرف جانے کا راستہ ہی معلوم

نہیں! کبھی اپنے لئے مانگنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی کہ یہ سارا حساب کتاب اور یہ سارا سلسلہ ماں نے سنبھال رکھا تھا۔ یہ زندگی تب تک ہلکی اور آسان رہی جب تک سارے بوجھ ماں نے اٹھائے ہوئے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں پڑھنے کیلئے ملک سے باہر تھا۔ امتحانات سر پر تھے، تیاریوں میں مصروف تھا، اس لئے ہفتہ وار جو ماں کو فون کرتا تھا، وہ کر نہیں سکا۔ ان دنوں فون کی ایسی سہولت نہ تھی جو آج میسر ہے، ہفتے کے بعد باقاعدہ پوسٹ آفس جا کر ٹرنک کال بک کروانی پڑتی تھی جو تھوڑے انتظار کے بعد باری آتی تھی۔ سوچا کہ اگلے ہفتے کرلوں گا۔ ہر وقت یہ پلان کرتا رہتا تھا کہ ڈگری مل جانے کے بعد اچھی جاب تو مل ہی جائے گی تو ماں کو اپنے پاس ہی بلالوں گا۔ یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دیتا رہا۔ اندر سے آواز آئی کہ "ٹھیک ہے تم کوئی غلط نہیں سوچ رہے، کیریئر بنانے کی گھڑی ہے، میل ملاقاتوں کیلئے تو ساری زندگی پڑی ہے۔ لیکن یہ جو سوچ ہے، اس کا احساس اس وقت تو نہیں ہوا لیکن اب جب اس جرمِ عظیم کا احساس ہوتا ہے تو ضمیر خود سے جواب دیتا ہے کہ ارے نادان! لمحے کی خطا، صدیوں کی سزا۔۔۔ کو اب بھگتو!

ان سوچوں کے الفاظ کا کھوکھلا پن آج چیخ چیخ کر حساب مانگ رہا ہے کہ جس ماں نے میری ضروریات اور میرے حق سے بھی بڑھ کر دیا، میں نے اس ماں کی حق تلافی کیونکر کر دی؟ یہ کیوں نہ سوچا کہ اس نے میری آواز سننے کیلئے سارا ہفتہ کس کرب سے گزارا، میری جدائی کا ہر ہر لمحہ کس قدر تڑپ کر میری سلامتی کیلئے دعاؤں میں گزارا ہوگا اور میں نے اپنے امتحانات کی تیاری کا بہانہ بنا کر خود کو تسلیاں دینا شروع کر دیں جبکہ میرا اصل امتحان اور اس کی دائمی خوشی تو یہ ہونی چاہئے تھی کہ میں اس کے ایک ایک سانس میں اسی طرح خوشیاں بکھیرتا، جس طرح اس نے مجھے اپنے ہر سانس میں بسا رکھا تھا۔ یہ نہ سوچا کہ تمہارے کیلنڈر پر دن، مہینے اور سال باقی ہوں گے، تم نے یہ کیونکر سوچ لیا کہ اگلے ہفتے یا پھر کبھی بات کرلوں گا لیکن تیرے ذہن میں یہ کیوں نہ آیا کہ اس ماں کا تو ہر سانس مغرب میں ڈوبتے سورج کے ساتھ غروب ہو رہا ہے۔

کیا کبھی تم نے اپنی ماں کو غور سے دیکھا کہ تمہیں "سوہنا سوہنا" کہتے ہوئے اس کے سر کے سارے بال چاندی ہو گئے ہیں۔ کاش تم نے اس وقت یہ سوچا ہوتا یا اپنے اندر کے خود غرض بیٹے کو یہ کہہ کر ڈانٹ دیا ہوتا کہ اگلا ہفتہ کس نے دیکھا ہے؟ تم یہ سوچتے ہوئے فوری اٹھتے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا خوشحالی ہو گی کہ آج ایک دفعہ پھر ماں کی رس بھری آواز سے کانوں میں سچی اور پر خلوص لعل و جواہرات کی برسات ہو گی۔

سنا ہے بلکہ یقین ہے کہ ایک جنت ہے جہاں شہد اور دودھ کی نہریں بہتی ہیں، خوش نما باغات میں پریوں کی شکل میں حوریں رہتی ہیں، وہاں کوئی دکھ نہیں ہے، کوئی درد نہیں ہے، خوشی پر کوئی پہرہ نہیں ہے، ہنسی پر کوئی شرط نہیں ہے، بن مانگے خوبصورت بادل ہیں، اور بن مانگے ہی حسین اجالا دل کو لبھانے کیلئے ہے، وہاں راتوں سے میٹھے دن ہیں اور دن سے روشن راتیں ہیں اور بھی کئی خوبصورت باتیں ہیں لیکن یہ سب ابھی کسی آنکھ نے دیکھا نہیں ہے، سنی سنائی باتیں ہیں لیکن یہ سب تو آنے والے کل کی باتیں ہیں، لیکن بغل کے کمرے میں جہاں ماں رہتی تھی، اس کے قدموں میں تو یہ جنت رہتی تھی، اس سے بے اختیار لپٹنے اور چمٹنے سے محرومی آج کیوں ستاتی ہے۔

آنکھیں تو ہم سب کے پاس ہیں لیکن کبھی ہم نے یہ سوچا کہ ماں کے پاس تو دوربین بلکہ خوردبین ہوتی تھی۔ گھر میں کچھ کھو جائے تو وہ صرف ماں کو ملتا تھا۔

میرا بٹوہ، بہن کے سر کا کلپ یا دوپٹہ ،والد صاحب کی گھڑی، دادا جان کی چھڑی، کچھ بھی ماں کی نظروں سے اوجھل نہیں رہتا تھا لیکن ماں جو چیز چھپا دے ،اسے کوئی ڈھونڈ نہیں سکتا تھا۔ میں نے بارہا کوشش کی، گھر کا ایک ایک کونہ چھان مارا لیکن مجھے وہ دکھ نہیں ملے جو ماں نے کہیں ہم سب سے چھپا کر رکھ دیئے تھے، وہ درد نہیں ملے جو کسی اندھیرے تہہ خانے میں دبا کر رکھ دیئے تھے۔ ایک ایک الماری اور گھر کے ہر کمرے کا ایک ایک انچ چھان مارا لیکن مجھے وہ سپنے نہیں ملے جو ہمیں جوڑنے کیلئے ٹوٹ گئے تھے، بستر کی ایک ایک تہہ کھول دی، وہ آنسو نہیں ملے جو کسی تکیئے کے غلاف میں جذب ہو کر سوکھ گئے تھے۔ ہاں، یقیناً اس لکن میٹی میں ماں تو جیت گئی لیکن ہم سب ہار گئے، ہمیں اس ہارنے پر کوئی شکائت نہیں، جو چھپا دیا، اس کی کوئی پرواہ نہیں لیکن تم اتنے برسوں سے ہماری بہترین تربیت کر کے اپنے قدموں کی جنت ہمارے حوالے کر کے خود جنت کے کسی عالی شان محل میں جا چھپی ہو، وہاں آپ کو کیسے ڈھونڈ کر لاؤں۔ ہم سب تو اب بھی چشم تصور میں تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں، گھر کے ہر کونے میں تلاش کرتے ہیں، یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اگر تم چھپ گئی تو میں تجھے کیسے ڈھونڈ پاؤں گا کیونکہ میری آنکھیں تو تمہاری طرح کی دوربین یا خوردبین نہیں ہیں کہ پھر سے تیرا ہنستا مسکراتا ہوا چہرہ ڈھونڈ لاؤں۔

ماں! لکن میٹی بہت ہو گئی، چھپن چھپائی بھی کافی ہو گئی، اب تھک گیا ہوں، اب کیا صرف خوابوں میں آ کر ہی اپنا حال احوال بتایا کرو گی؟

بروز ہفتہ 10 ذوالقعد 1445ھ 18 مئی 2024ء

عصر حاضر کا سب سے بڑا دہشتگرد

دہشتگردی عصر حاضر کی سب سے ہولناک لعنت جس پر ہر مہذب و متمدن دنیا اور معاشرہ پریشان ہے اور اس عفریت سے محفوظ رہنے کیلئے کوشاں بھی ہے مگر بھارت واحد ملک ہے جس کی موجودہ قیادت متعصب اور اقلیتوں پر زندگی حرام کرنے والا مودی جیسا سازشی کر رہا ہے جو دہشتگردی کے ہر معاملے پر بڑھاوا دینے میں پیش پیش رہتا ہے اور اپنی روش پر دیدہ دلیری سے ابھی تک قائم ہے۔ مودی کے تمام بازوئے شمشیر زن بشمول راشٹریہ سیوک سنگھ (آر ایس ایس)، بجرنگ دل، وشواہندو پریشد، سنیکت ہندو سنگھرش سمیتی، کرنی سینا، سناتن سنستھا، سریرام سینے، ہندو ویواہنی، اب جو بھی دہشتگردانہ کام کرتے ہیں یا تعصب سے مامور جو کرتوت بھی کرتے ہیں انہیں باعث ندامت نہیں سمجھتے بلکہ اعلانیہ اظہار کرنے لگے ہیں۔ مودی سرکار کا روّیہ اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ اس حد تک ظالمانہ ہو چکا ہے جس کی مثال خود بھارت ہی کی ماضی میں نہیں ملتی۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب لو جہاد، گئو رکھشا اور اب بچہ چوری کے نام پر کسی مسلمان کو جان سے نہ مارا جاتا ہو، کسی کی سر راہ پٹائی نہ ہوئی ہو، اور یہ تمام دہشتگردانہ ظالمانہ کاروائیاں ڈھکے چھپے نہیں ہو رہیں، باضابطہ کسی نہ کسی تنظیم کے بینر تلے ہو رہی ہیں۔

جو لوگ انفرادی طور پر ان دہشتگردیوں میں ملوث ہیں، وہ بھی عام طور پر کسی بھگوا تنظیم سے وابستہ ہیں اور اس کا اظہار کھلے عام کر رہے ہیں پھر بھی نجانے ان کے خلاف ان کی تنظیم کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی جاتی۔ اگر دنیا کو دکھانے کیلئے اکا دکا واقعہ میں کوئی کاروائی ہو بھی رہی ہے تو محض دکھاوے کے طور پر کیونکہ ان پر معمولی قسم کی دفعات لگائی جاتی ہیں تاکہ وہ آسانی سے ضمانت پر رہائی پا سکیں۔ دہشتگردی کی زیادہ تر کاروائیاں راشٹریہ سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کی ذیلی تنظیمیں جیسے وشواہندو پریشد اور بجرنگ دل انجام دے رہی ہیں جبکہ بعض کاروائیاں مخصوص ریاستوں میں سرگرم عمل تنظیمیں کر رہی ہیں جیسے گوا، مہاراشٹر، کرناٹک کی حد تک سناتن سنستھا، جنوبی کرناٹک میں سری رام سینے اور اتر پردیش میں ہندو ویواہنی بعض جگہوں پر نئے نام بھی سامنے آ رہے ہیں جیسے ہریانہ میں مسلمانوں کو جمعہ کی نماز نہ پڑھنے دینے کیلئے بھگوا تنظیموں کا ایک متحدہ محاذ "سنکیت ہندو سنگھرش سمیتی" سامنے آ گیا ہے۔ پدماوت علم کی مخالفت کے نام پر کھڑی کی گئی تحریک کے وقت "کرنی سینا" کا بینر استعمال کیا گیا جس نے راجستھان اور ہریانہ وغیرہ میں طوفانِ بدتمیزی مچایا۔

تنظیمیں چاہے کوئی بھی ہوں ان سب کی فکر ایک ہی ہے اور صاف پتہ چلتا ہے کہ ان سب تنظیموں کے پیچھے وہی متعصب ذہنیت ہے جس کو مودی سرکار نے بڑھاوا دیکر خوف کی علامت بنا دیا ہے۔ ہندو رکھشا کے نام پر مسلمانون، عیسائیوں اور دلتوں سے بے انتہاء نفرت کا اظہار اور اپنے مذموم مقاصد کے حصول کیلئے جھوٹ اور فریب کے ساتھ تشدد اور دہشتگردی کر رہے ہیں۔ عالمی قوانین کے مطابق ان تمام متعصب اور بیمار ذہنیت کی تنظیموں پر فوری پابندی لگنی چاہئے خاص طور پر بجرنگ دل پر، کیونکہ سب سے فعال تنظیم یہی ہے جس نے ایک طرح سے پورے بھارت میں دہشتگردی کی کمان سنبھال رکھی ہے۔ کہیں یہ براہِ راست میدان میں اترتی ہے اور کہیں اس کے زیر اثر افراد یا گروپس سامنے آتے ہیں۔ ماضی میں بجرنگ دل پر پابندی لگائے جانے کا مطالبہ بھارت کی تمام اہم سیاسی جماعتوں کے قائدین کرتے رہے ہیں جن میں دیوے گوڑا، شرد پوار، لالو پرشاد، رام دلاس پاسوان، مایاوتی اور منیش کمار تیواری کے نام قابل ذکر ہیں۔

جب من موہن سنگھ وزیر اعظم تھے تو سابق وزیر اعظم دیوے گوڑا نے ایک خط لکھ کر شکائت کی تھی کہ بجرنگ دل، کرناٹک اور اڑیسہ میں اقلیتوں کے

خلاف جنونی انداز میں تشدد کر رہا ہے۔ ایک اور ممتاز بھارتی رہنما دیر پا مائل نے کہا تھا کہ راشٹریہ سیوک سنگھ کی اس ذیلی تنظیم پر اس لئے پابندی لگنی چاہئے کہ عام دہشتگرد تو چھپ کر حملہ کرتے ہیں جبکہ بجرنگ دل کھلے عام دہشتگردی پھیلا رہے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ جن ریاستوں میں بی جے پی کی حکومت ہے وہاں پارٹی بجرنگ دل کو اپنی بقا کیلئے آکسیجن سمجھتی ہے۔ نیشنل کمیشن فار منارٹیز بھی ایک زمانے میں بجرنگ دل سے عاجز رہا ہے اور پابندی لگانے کا مطالبہ کرتا رہا۔ کمیشن کے وائس چیئر مین مائیکل نپٹونے کرناٹک حکومت پر جب وہ بی جے پی کے تحت تھی، الزام عائد کیا تھا کہ بار بار کی یاددہانی کے باوجود بجرنگ دل کو چرچ اور عیسائیوں پر حملوں سے باز نہیں رکھا جاسکا۔ وشواہندو پریشد نے جو خود آر ایس ایس کی ایک ذیلی تنظیم ہے۔

1984ء میں بجرنگ دل قائم ہوا تھا، اپنے یوتھ ونگ کے طور پر ہندو پریشد کو اس کی ضرورت یوپی میں ہندوؤں نوجوانوں کو بابری مسجد پر قبضے کیلئے شروع کی گئی اور نوجوان متعصب ہندو

نوجوانوں کو اس تحریک میں شامل کرنے کیلئے باقاعدہ ایک سیل بنایا گیا۔ ان کی یہ پیشکش اور تحریک اتنی کامیاب رہی کہ جلد ہی اسے وسعت دیکر سارے ملک میں پھیلا دیا گیا۔ رام جنم بھومی کے حوالے سے جتنی بھی ریلیاں سنگھ پریوار نے نکالیں ان سب میں بجرنگ دل کے کارکن پیش پیش رہے۔ 1962ء میں بابری مسجد کی شہادت سے لیکر 2002ء کے گجرات فسادات تک ہر خونخواری میں بجرنگی کارکن براہِ راست ملوث رہے۔ نرسمہاراؤ کی حکومت نے بابری مسجد میں عبادت پر پابندی لگادی تھی لیکن بعد ازاں ان پر اس قدر دباؤ پڑا کہ صرف ایک سال بعد یہ پابندی اٹھانی پڑی۔ اس سے پھر سے رہ رہ کر مختلف قومی اور عالمی اداروں کی طرف سے اس کو نکیل ڈالنے کا مطالبہ ہوتا رہا۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل ہیومن رائٹس واچ، پیپلز یونین فار سول لبرٹیز اور پیپلز یونین فار ڈیموکریٹک رائٹس جیسی انسانی حقوق کی تنظیمیں گاہے بگاہے، بجرنگ دل کے کالے کرتوتوں پر روشنی ڈال کر بھارتی حکمرانوں سے اس پر پابندی لگانے کا مطالبہ کرتی چلی آرہی ہیں مگر اب تک بی جے پی اور اس سے پہلے کانگرس کی حکومت نے ان مطالبات کو تسلیم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، گویا دہشتگردی کی کھلی چھٹی دیئے جانے پر بھارت کی کسی بھی حکومت کو کوئی ملال ہے اور نہ ندامت! مودی سرکار کی سرپرستی نے تو دہشتگرد بجرنگ دل کے حوصلے اتنے بلند کر دیئے ہیں کہ اس کے منہ کو انسانی خون کا چسکا لگ چکا ہے۔

اب ایک مرتبہ پھر مودی سرکار اور اس متعصب جماعت کے دیگر رہنماء اور وزراء انتخابات جیتنے اس انتہاء پسند تنظیم کے ساتھ کھڑے نظر آرہے ہیں ، کون نہیں جانتا کہ نوادہ میں گری راج سنگھ فساد بھڑکانے کے الزام میں گرفتار بجرنگ دل کے ذمہ داروں سے ملنے جیل جاکر اس بات پر باضابطہ آنسو بہا رہا ہے اور یقین دہانی کروا رہا ہے کہ وہ ان سب کو جلد جیل سے رہائی دلا کر دم لے اسی طرح ہزاری باغ میں جیت ہنسانے ماب لنچنگ کے ملزموں کی کھلے عام میزبانی کر رہا ہے جو حال ہی میں ضمانت پر رہا ہوئے تھے، یہ کام اس نے خاموشی سے نہیں کیا بلکہ مٹھائی کھاتے ہوئے ان کے ساتھ تصویریں بنوائیں۔ بجرنگ دل کے کارکن پہلے صرف لاٹھی کا استعمال کرتے تھے، اب ہر طرح کے آتشیں ہتھیاروں کا استعمال بے دھڑک استعمال کر رہے ہیں۔ اس سال رام نومی کے موقع پر سنگھ پریوار کی طرف سے انہیں کھلے عام ترشول اور تلوار ایسے ہتھیار بانٹے گئے۔ اس سے پہلے یہ خبر بھی آئی کہ انہیں

ہر قسم کے ہتھیار چلانے کی تربیت وٹریننگ دی جارہی ہے۔ آرایس ایس کے ذریعے چلنے والے ایک اسکول میں بجرنگ دل کے سینکڑوں کارکنوں کو مارشل آرٹس کی ٹریننگ دی جارہی ہے جس میں انہیں تلوار، ترشول کے علاوہ دیگر ہتھیار چلانے کی تربیت بھی دی جارہی ہے۔ ملک کے مختلف مقامات پر بجرنگ دل اور ہندو پریشد اسکول کے بچوں کو ہر قسم کے اسلحے استعمال کے استعمال کی کھلے عام ٹریننگ دی جارہی ہے۔

28 فروری 2015ء کو پندرہ روزہ ملی گزٹ نے اطلاع دی تھی کہ بجرنگ دل ملی ٹینٹ ہندو فورس تیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کے تحت ملک کے تمام اضلاع میں شکتی آراد ھنا کیندر قائم کیا جائے گا جہاں اس کے کارکن لاٹھی اور پستول چلانا سیکھیں گے۔ اس سکیم پر نہ صرف باقاعدہ عملدرآمد ہو رہا ہے بلکہ اب تو مودی سرکار کی سرپرستی میں ہونے والی ہندو دہشتگردانہ کاروائیوں اور وارداتوں کا نوٹس انٹرنیشنل میڈیا بھی لے رہا ہے اور عالمی ادارے بھی بھارت پر انگلی اٹھارہے ہیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی جاری کردہ ایک رپورٹ میں بھارتی حکومت پر سخت تنقید کی گئی ہے کہ وہ اقلیتوں اور دلتوں پر ہونے والے ظلم اور جبر کو روکنے میں ناکام رہی ہے۔ سی آئی اے کی ورلڈ فیکٹ بک میں وشواہندو پریشد اور بجرنگ دل کو ملی ٹینٹ، عسکریت پسند یا جنگجو قرار دیا گیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں تنظیموں کو دہشتگرد کا درجہ دینے کا باضابطہ اعلان کیا ہے لیکن کیا ان دہشتگرد جماعتوں کے ساتھ بھی عالمی طور پر ویسا ہی سلوک کیا جارہا ہے جیسا پاکستان میں بعض جماعتوں کے بارے میں روا رکھا جارہا ہے؟ کیا اس کھلی منافقت کا پردہ چاک کرنے کی ذمہ داری ہماری حکومت پوری کر رہی ہے؟

بروز اتوار 11 ذوالقعدہ 1445ھ 19 مئی 2024ء

انجام کا وقت بہت قریب ہے

تاریخ کا ایک حیران کن سبق یہ ہے کہ اس کرہ ارض پر قتل وغارت، جنگ وجدل، عوامی نفرت اور غیض وغضب کی وجہ نہ لوگوں کی معاشی بدحالی رہی ہے اور نہ بھوک وافلاس، لوگ تاریخ میں کبھی بھی ان وجوہات کی بنیاد پر غصے میں پاگل ہو کر ہجوم در ہجوم انتقام کی آگ میں سلگتے ہوئے سڑکوں پر نہیں نکلے۔ مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا میں کسی بھی قوم میں لوگ غربت وافلاس اور بھوک ننگ خاموشی سے برداشت کرتے رہتے ہیں اور آنے والے اچھے دنوں کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ پڑوس کی دشمنیاں بھی اپنے اپنے علاقوں اور گھروں میں خاموشی سے بیٹھے ہوئے گزار دیتے ہیں لیکن دنیا میں تباہ کن جنگیں اور خونی انقلاب ہمیشہ تاریخ کے "بگڑے ہوئے بچوں" کی وجہ سے وقوع پذیر ہوئے۔ یہ "بگڑے ہوئے بچے" عجیب وغریب مخلوق ہوتے ہیں۔ یہ وہ نفسیاتی مریض ہوتے ہیں جن میں غرور وتکبر میں گندھی ہوئی انا انہیں اس مقام پر لے جاتی ہے جہاں وہ یہ تصور کرنے لگتے ہیں کہ ان کی طاقت اور ہیبت کے سامنے اب کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ وہ لوگوں کے فاقوں کا تمسخر اڑانے لگتے ہیں۔ زندگی کی ہر ضرورت پر ریاستی ٹیکس بڑھاتے ہوئے عوام کو بہتر مستقبل کیلئے یہ کڑوی گولی کھانے پر مجبور کرتے رہتے ہیں۔ اپنے مقابل عوامی طاقت کو حقیر گردانے لگتے ہیں اور اپنے ریاستی اختیارات کو ناقابل تسخیر سمجھنے لگتے ہیں۔ جب عوام کی عزتِ نفس پر کاری ضربیں لگنی شروع ہو جائیں تو پھر کوئی ایک واقعہ دلوں میں چھپی ہوئی تمام زیادتیوں کا طوفان بند توڑ کر ایسا نکلتا ہے کہ حکمرانوں کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لیجاتا ہے۔

انقلاب فرانس جس شخص کی تحریروں سے جاندار ہوا سے والٹیئر کہتے ہیں۔ یہ شاعر مزاج، افسانہ نگار ومصنف شخص جو تھیٹر میں ڈرامے کرواتا رہتا تھا، ایک دن بادشاہ کے ایک منہ چڑھے حواری روہان نے اسے برا بھلا کہا، والٹیئر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ لڑائی شروع ہوئی تو لوگوں نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی۔ یہ منظر دیکھ کر ایک خاتون بے ہوش ہو گئی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن کچھ دنوں بعد وہ ڈیوک سیلی کے گھر پر کھانا کھا رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی اسے باہر بلایا گیا اور پھر مسلح افراد نے اسے مارنا شروع کر دیا جبکہ روہان وہاں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ والٹیئر غصے میں پاگل ہو گیا۔ وہ انصاف حاصل کرنے کیلئے بادشاہ پھر عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹاتا رہا مگر اسے انصاف نہ مل سکا۔ اس نے تلوارزنی سیکھنا شروع کی اور شہر کے غنڈوں میں اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا اور پھر اس کے پیچھے پولیس لگا دی گئی اور گرفتار کر لیا گیا۔ رہائی اس شرط پر ملی کہ فرانس چھوڑ کر انگلستان چلا جائے۔ وہ ملک بدر تو ہو گیا لیکن اس کی تحریریں فرانس کے عوام کے دلوں میں آگ لگانے کیلئے وہاں پہنچتی رہیں۔

ان تاریخ کے "بگڑے ہوئے بچوں" کے حواری ایسے ہی لوگوں کے دلوں میں نفرتیں پیدا کرتے ہیں۔ اسی انقلاب فرانس کا ایک اور کردار لیفٹیننٹ رابس پیری تھا۔ جو سمجھتا تھا کہ یہ چند غنڈے ہیں جو حکومت کے خلاف شور مچاتے ہیں۔ ان کا سر کچلنا بہت ضروری ہے۔ رابس پیری اپنے اختیارات کے حساب سے آج کے وزیر خزانہ کے مساوی تھا۔ اس نے اپنی مرضی کے ججوں کو بادشاہ سے مقرر کروایا اور پھر ہر اس شخص کو دھمکانا شروع کر دیا جن سے بغاوت کا خطرہ تھا اور پھر انہیں گرفتار کر کے سزائیں دلوانا شروع کر دیں۔ صرف پیرس میں 2600 بڑے بڑے لوگ گرفتار ہو کر قتل ہوئے۔ ان میں آکسیجن دریافت کرنے والا مشہور سائنسدان وائزر اور مشہور شاعر آندرے بھی شامل تھا۔ ہر مہینے میں سر قلم کرانے والوں کی تعداد 1300 سے زیادہ ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لوگوں کا ہجوم محل کے گرد جمع ہوا تو ملکہ سے پوچھا گیا کہ لوگوں کو روٹی نہیں ملتی وہ کیا کریں تو اس نے تمسخر سے جواب دیا یہ لوگ کیک کیوں نہیں کھاتے لیکن جب لوگوں کا غیض وغضب سے ابھرتا اور کھولتا ہوا ہجوم محل کے دروازے توڑتا اندر داخل ہوا تو کسی رابس پیری جیسے وزیر خزانہ کے بس میں نہ تھا کہ انہیں کنٹرول کر سکے۔

رابس پیری جبڑے پر گولی لگنے سے ہلاک ہوا اور ساتھی آوارہ کتوں کی طرح لوگوں کے ہجوم سے ڈرتے بھاگتے تھے۔ تمسخر اڑانے والے، ان پر ہنسنے والے اور ان کو زمین کا حقیر ترین بوجھ سمجھنے والے یاد آ گئے۔ کسی نے خبر اڑادی کہ ان کو دبانے کیلئے فوج بلالی گئی ہے۔ ہجوم راستے میں ہر صاحب حیثیت کے گھروں اور گوداموں کو لوٹتا آگے بڑھتا رہا۔ ایک گورنر باس تیل کے قلعے میں تھا۔ لوگوں کو معلوم ہوا کہ فوج وہاں پر ہے، ہجوم ٹوٹ پڑا۔ حیرت کی بات ہے کہ اس ہجوم کو دیکھ کر صرف 120 سپاہی گورنر کے ساتھ ٹھہرے رہے جو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیئے گئے۔ گورنر نے ہتھیار ڈالے اور چند سپاہیوں کے ساتھ باہر نکلا لیکن لوگوں نے جن کی آنکھوں میں اپنی ذلت کا انتقام رقص کر رہا تھا، اسے قابل معافی نہ سمجھا۔ نہتے لوگوں کے ہاتھوں میں قصائیوں والے چُھرے تھے۔ ایک ایسے ہی چُھرے سے اس کی گردن تن سے جدا کر دی گئی۔ ٹھیک ایک چھوٹی سی رود بار کے اس پار انگلستان تھا، وہاں ویسا ہی قحط تھا، ویسی ہی غربت تھی، لوگ مفلوک الحال کی چکی میں پس رہے تھے مگر وہاں کوئی تاریخ کا "بگڑا ہوا بچہ حکمران" نہیں تھا، نہ ہی اس کے ساتھیوں میں رابس پیری جیسا وزیر خزانہ اور نہ ہی روہان جیسا مصاحب تھا، اس لئے وہاں انقلاب کی چاپ تک سنائی نہ دی۔

تاریخ کے یہ "بگڑے ہوئے بچے" لوگوں کو حقیر گردانتے ہیں، عدالتوں کو اپنا تابع بناتے ہیں اور لوگوں کو انصاف سے محروم کرنے پر اپنی توانائیاں صرف کر دیتے، انہیں ہر وہ آواز بری لگتی ہے جو ان کی غلطیوں یا خامیوں کی نشاندہی کرے۔ ان کے منہ چڑھے وزیر خزانہ یا امن وامان قائم کرنے کے نگران انہیں غدار اور سازش کچلنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ جو بھی لکھنے والا، بولنے والا، تحریر کا نقیب نظر آجائے، اسے دھمکیاں دیتے ہیں، گالیاں سناتے ہیں اور پھر اپنی ان کامیابیوں کا خراج تاریخ کے اس "بگڑے ہوئے بچے" سے وصول کرتے ہیں جس کو علم تک نہیں ہوتا کہ اس کے پاؤں سے زمین کھینچی جارہی ہے۔ اس کے ارد گرد ایک آگ سلگائی جارہی ہے۔ اسے لوگوں کی پھنکارتی ہوئی آنکھیں گھور رہی ہیں اور بھینچی ہوئی مٹھیاں انتقام کا انتظار کر رہی ہیں اور پھر جب لوگوں کا جم غفیر اٹھتا ہے تو ان کو سب فقرے یاد آنے لگتے ہیں جو ان "بگڑے ہوئے بچوں" نے بولے ہوتے ہیں۔ ان کا تمسخر اڑایا ہوتا ہے۔ ان کی لاشوں پر مسکراتے ہوئے اس نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا ہوتا ہے۔

اکثر سوچتا ہوں کہ ہر وہ شخص جو ایسی نفسیاتی کیفیت کا شکار ہوتا ہے جسے بے دلیل رعب و دبدبہ اور بڑا پن کہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنی ذلت و رسوائی اور انجام کا ذمہ دار کسی اور کو ٹھہراتے ہیں۔ یہ سب لوگ موت کی آغوش میں جاتے ہوئے سوچتے تو ہوں گے کہ یہ سب ان حواریوں کی وجہ سے ہوا۔ کاش میں ان کی نہ سنتا، کاش ملک کی معیشت کا بیڑہ غرق کرنے والے اس وزیر خزانہ کی جگہ کوئی اور ہوتا۔ مگر کیا کیا جائے۔ تاریخ کے ہر اس "بگڑے ہوئے بچے" جس نے کسی انقلاب کا پیش خیمہ بننا ہوتا ہے، اسے اسی طرح کے وزیر خزانہ اچھے لگتے ہیں، پسند آتے ہیں۔ گھبرائیے نہیں، اب ہمارے ارد گرد ایسے ہی اقتدار کے نشے میں بدمست افراد کیلئے ایسے ہی انجام کا وقت بہت قریب ہے۔

اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

بروز سوموار 12 ذوالقعد 1445ھ 20 مئی 2024ء

بھارتی انتخابات اور پاکستان

یوں تو ہندوستان میں ہر انتخاب میں پاکستان کے خوف کا ہوا کھڑا کر کے اپنے انتخابات جیتنے کی دائمی بیماری موجود ہے لیکن مودی جیسے متعصب اور مکار نیتا کی سیاسی بقاء ہمیشہ سے مسلم اور پاکستان دشمنی پر منحصر ہوتی ہے اور ان دنوں بھارتی انتخابی مہم میں مودی سرکار کو ایک مرتبہ پھر پاکستان کے خلاف بھارت کی جنگی مہم جوئی عروج پر ہے۔ دراصل بھارتی جارحیت جہاں مقبوضہ کشمیر کی ناقابل کنٹرول صورت حال سے دنیا کی توجہ ہٹانے کی کوشش ہوتی ہے بلکہ اب تو مودی نے اپنی انتخابی مہم میں پاکستان میں جاری سی پیک کو بھارت کے قومی ایجنڈے سے منسلک کر دیا ہے۔ مودی نے بڑی چالاکی سے اپنی انتخابی مہم کو اس ایجنڈے سے جوڑ دیا ہے جس سے بادی النظر میں تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ مودی الیکشن مہم کی حد تک جارحانہ کاروائی کا کریڈٹ لینا چاہتا ہے لیکن در حقیقت یہ سی پیک کے خلاف اس کا قومی ایجنڈہ ہے لہذا یہ دباؤ الیکشن کے بعد بھی جاری رہے گا لیکن یہ ممکن ہے کہ اس میں کچھ وقت کیلئے عارضی تعطل آجائے البتہ دوبارہ اقتدار میں آنے کے بعد مودی اس ایجنڈے کو تیزی سے آگے بڑھائے گا۔ سی پیک دراصل بھارت کے سیاسی اور معاشی پھیلاؤ کو لگام دینے اور سکیڑنے والا منصوبہ ہے جسے بھارت اپنی بقاء کیلئے انتہائی خطرناک تصور کرتا ہے، اسی لئے وہ مسلسل اسے ٹارگٹ کر رہا ہے۔ پاکستان سی پیک کا پارٹنر ہے اور بھارت کا حریف ملک بھی، اسی لئے بھارت پاکستان کو نشانے پر رکھے ہوئے ہے۔

پاکستانی سفارتی حکم نے اب تک بھارتی جارحیت کو کشمیر سے جوڑ رکھا ہے جبکہ اسے سی پیک سے بھی جوڑنے کی اشد ضرورت ہے۔ کشمیر کے ایشو پر دنیا کو وقتی تشویش ضرور ہے اور مودی کی اس احمقانہ حرکت سے یقیناً خطے میں کشمیر اب بھی ایک ایٹمی فلیش پوائنٹ ہے لیکن قصر سفید کے فرعون اور اسرائیل کے زیر اثر میڈیا نے اسے مستقل خطرہ بنانے سے گریز کیا جس میں ہماری ناتجربہ کار سفارتی ٹیم کا بھی قصور ہے جس کی وجہ سے کشمیر کو ایک پرانا ایشو سمجھ کر بیشتر ملکوں نے فی الحال اسے نظر انداز کر رکھا ہے۔ اکثر ممالک کشمیر کو پاک بھارت کا اندرونی مسئلہ سمجھتے ہیں کیونکہ فاسق کمانڈو پرویز مشرف دور سے ہماری حکومتوں نے کشمیر کو "بیک برنر" پر رکھ دیا تھا اور بالخصوص باجوہ اور عمران خان کی ملی بھگت سے اس کی ملکیت سے دستبرداری اختیار کر لی تھی جس کا فائدہ بھارت کو ہوا اور وہ تنہا اس ایشو کا مالک بن گیا۔ اگرچہ اب تحریک آزادئ کشمیر نے اپنی قربانیوں سے ایک نئی آب و تاب سے اپنا روشن سفر شروع کیا ہے لیکن کمزور سفارت کاری اور اندرونی چپقلش نے اس مسئلے کو وہ توانائی فراہم نہیں کی جس کی اسے ضرورت تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ کشمیر ایشو پر ہمیشہ ہم دفاعی پوزیشن پر رہے ہیں، بھارت الزامات لگاتا ہے تو صفائیاں دیتے رہتے ہیں جس میں بھارتی درندہ صفت فوجیوں کی جانب سے کشمیر میں جاری ظلم و ستم کے خلاف ہماری جارحانہ سفارتی کاروائی کہیں نظر نہیں آتی جو وقت اشد ضرورت ہے۔ بھارتی مکار بنیاء کشمیری تحریک کو بنیاد بنا کر ہمیں دہشتگردوں کا سرپرست باور کرتا ہے اور ہم ڈر کر جماعت الدعوۃ اور دیگر تنظیموں پر پابندیاں عائد کر دیتے ہیں جس سے عالمی سطح پر ہمارا امیج خراب ہو جاتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں بھارتی عدالتوں نے سمجھوتہ ایکسپریس کے ان تمام مجرمان کو بری کر دیا جنہوں نے باقاعدہ اس ہولناک جرم کا اعتراف کیا تھا، جس میں بھارتی فوج کا حاضر سروس کرنل پروہت بھی شامل تھا۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ بھارتی جارحیت کو کشمیر کے ساتھ ساتھ سی پیک سے بھی جوڑا جائے اور اسی حوالے سے دنیا کو اپنا مقدمہ سمجھایا جائے۔

اس وقت سی پیک سے منسلک "ون روڈ ون بیلٹ" سے ساٹھ سے زائد ممالک وابستہ ہو گئے ہیں، ایک جگہ چوٹ پڑے گی تو سب کے معاشی مفاد پر ضرب پڑے گی لہذا یہ ساٹھ ممالک ہر قیمت پر اپنا معاشی مفاد برقرار رکھنے کی کوشش کریں گے اور سی پیک کے حوالے سے یہ تمام ممالک ہمارے مؤقف کی

بھرپور حمائت کریں گے، ہماری بات سنیں گے اور مانیں گے کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بھارتی جارحیت نے شدت اختیار کی تو لازماً سی پیک کے منصوبے زد میں آئیں گے۔ فارن آفس اور دیگر اداروں کو فوری طور پر اس پر غور کر کے حالات کا نئے سرے سے تجزیہ کرنا چاہیئے۔ جس طرح مودی نے سی پیک کے خلاف اپنے قومی ایجنڈے سے اپنی انتخابی مہم کو جوڑ لیا ہے، اسی طرح سی پیک کے بچاؤ کے قومی ایجنڈے سے ہم خود کو جوڑ لیں اور اسے قومی کی بجائے اسے بین الاقوامی بنادیں، اسی میں ہماری کامیابی ہے کیونکہ اس ایجنڈے کو آگے بڑھانے سے بھارت دفاعی پوزیشن میں آجائے گا اور ہم جارحانہ پوزیشن پر کھڑے ہوں گے۔

دفاعی نقطہ نظر سے دو طیارے گرنے سے بھارت کی جو سبکی ہوئی ہے، اس نے صرف اندرونی طور پر بھارت کو نقصان نہیں پہنچایا بلکہ عالمی طور پر بڑا رسوا کیا ہے۔ امریکا نے بھارت کو تھپکی اس لئے دی تھی کہ وہ اسے چین کے مقابل کھڑا کرنا چاہتا تھا تاکہ بھارت چین کو انگیج رکھے اور چین امریکا کی برابری کی کوششیں ترک کر دے لیکن اس ایک جھڑپ نے امریکا سمیت ان تمام سرپرست ممالک کو واضح پیغام مل گیا ہے کہ وہ جس پر بھروسہ کر کے اس کی مدد کرتے تھے، اب وہ پاکستان کے ایک ہی جوابی حملے سے خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز کر رہ گیا ہے، چین کے آگے کیا کھڑا ہو گا؟ اس تاثر نے نہ صرف عالمی سیاست میں بھارتی رول کے ممکنہ اضافے پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے بلکہ سارک اور مشرقِ وسطیٰ میں بھی اس کی طاقت کے فسانے کو ہوا میں تحلیل کر دیا ہے۔ بھارت ان ملکوں کو اپنا فوجی ساز و سامان فروخت کرنے کا خواہشمند تھا اور اپنی فوجی خدمات بھی معقول معاوضے پر دینے کی کوشش کر رہا تھا تاہم پاکستان پر فضائی حملے کی حماقت کے بعد اب ایسا ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ خواب بن کر رہ گیا ہے۔ ایسی بے شمار کھڑکیاں ہیں جن کی بندش رفتہ رفتہ بھارت پر واضح ہو گی۔ اسی لئے اہم ذرائع کا کہنا ہے کہ بھارت ہر حال میں اپنی ساکھ بحال کرنا چاہے گا اور پاکستان پر وار کر کے کوئی ایسا نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا جس کا پروپیگنڈہ جنگی بنیادوں پر کر سکے۔

کرکٹ کے نشے میں غرق قوم کو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ پاکستان اس وقت حالت جنگ میں ہے اور حالیہ رسوائی نے اسرائیل اور امریکا کو بھی شدید زخمی کر دیا ہے کہ اس کا گھوڑا پہلی ہی دوڑ میں مار کھا کر منہ کے بل گر کر خاک چاٹ رہا ہے۔ اگرچہ جنگی نقصان زیادہ نہیں ہوا لیکن سیاسی، سفارتی اور تاثراتی امیج بہت زیادہ تباہ ہو گیا ہے۔ جنگ ایک سنجیدہ معاملہ ہے، آزاد عالمی میڈیا کا کہنا تھا کہ یہ اتنا اہم ہے کہ اسے محض چند سر پھرے اور نالائق بھارتی جرنیلوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اسی طرح لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا کہنا تھا کہ جنگ لڑنا جتنا آسان ہے، اس کے مقاصد حاصل کرنا اتنا ہی مشکل اور پیچیدہ ہے۔ اس لئے بھارتی جارحیت سے نمٹنے کیلئے قومی سطح پر ایک مشاورتی ادارہ بنانے کی ضروت ہے جس میں پارلیمنٹ، فوج، عدلیہ، سیاسی جماعتوں اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کے اہم افراد کی نمائندگی ہو۔ اس کی رکنیت کا معیار صرف اہلیت ہو اور اس میں حاضر و ریٹائرڈ سروس دونوں طرح کے دانشور ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک مکمل مشاورتی ادارہ ہو جو ہنگامی صورتحال میں مشاورت فراہم کرے، عوام کو جوڑ کر رکھے، حکومتی اداروں اور عوام کے درمیان پل کا کردار ادا کرے تاکہ حالت جنگ نازل ہونے پر عوام میں گھبراہٹ اور خوف نہ پھیلے گویا یہ ادارہ نہ صرف عوام کو بدترحالات کیلئے تیار کرے بلکہ حکومت اور فوج کو بروقت مفید قابل عمل مشورے بھی دے۔ یہ کوئی فیصلہ ساز ادارہ تو نہیں ہو گا لیکن زمانہ امن اور جنگ میں قوم اور ملک کو مفید آراء سے رہنمائی میں مدد کرے۔

بروز منگل 13 ذوالقعد 1445ھ 21 مئی 2024ء

سیاسی مذاکرات کی اشد ضرورت

نہ کوئی دنیا کی حقیقتوں کو جانتا ہے اور نہ ہی اپنے ارد گرد بکھرتی قوموں اور تباہ ہوتی ہوئی قوتوں کو دیکھتا ہے۔ عذاب کے فیصلوں اور اللہ کی جانب سے نصرت کے مظاہروں کو دیکھنے کیلئے کسی تاریخ کی کتاب کھولنے یا عاد و ثمود کی بستیوں کا مطالعہ کرنے کی ضرورت نہیں، یہ ابھی کل کی باتیں ہیں۔ میرے اللہ کا فرمان ہے کہ جب ہم کسی قوم پر کوئی آفت نازل کرتے ہیں تو وہ اس کی مادی توجیہات کرنے لگ جاتا ہے۔ کوئی سوچ سکتا تھا کہ دنیا کی دو ایٹمی سپر طاقتیں جن کے پاس اس ساری دنیا کو کئی مرتبہ تباہ کرنے کا سامان موجود ہو، جن کی تسخیر خلاؤں تک ہو، ایک سپر طاقت سوویت یونین جو پچاس سے زیادہ کیمونسٹ تحریکوں کی براہ مدد کرتا تھا، اور دوسری سپر طاقت امریکا جو درجنوں ممالک کو تاراج کر کے اپنی قابض افواج کے ذریعے آج بھی ان کی قسمت کے فیصلے کرتا ہے، ان دونوں طاقتوں کو بے خانماں، بے سر و ساماں افغان مجاہدوں نے صرف اپنے رب کے بتائے ہوئے حکم جہاد کے ذریعے ان کی یہ حالت کر دی کہ روس کی ائیر ہوسٹس صرف ایک ڈبل روٹی کیلئے اپنی عزت بیچنے پر مجبور ہو گئی اور وہاں کے لوگ صرف روٹی کیلئے دوکانوں پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ معاملہ مقامی پولیس کے قابو میں نہ رہا اور پھر ہجوم ایک دوسرے پر حملہ آور ہو گیا اور سینکڑوں شدید زخمی ہو گئے۔ نفرت اس حد تک پہنچ گئی کہ کل تک جس لینن کے مجسمے کو چومنا اپنے لئے اعزاز سمجھتے تھے، اسی مجسمے کو سر عام جوتے مارے گئے اور اس پر تھوکا گیا۔

دوسری سپر طاقت گیارہ سال تک اپنے تمام جدید جنگی ساز و سامان اور درجن سے زائد اتحادی افواج کی مدد کے باوجود اپنی افواج کی واپسی کی سلامتی کیلئے منت سماجت کرتی ہوئی اور بالآخر جاتے ہوئے 42 بلین ڈالر کے اسلحے کا سکریپ اور 13 بلین ڈالر کا ساز و سامان چھوڑ کر ذلت آمیز رسوائی کے ساتھ راہِ فرار اختیار کرنا پڑا۔ یہ انہی فاقہ کشوں اور موجودہ جدید تہذیب سے کوسوں دور افراد کا ملک ہے جہاں دنیا کی تین سپر طاقتوں کا قبرستان آج بھی دیدہ عبرت نگاہ ہے، بس ذرا ایمانداری سے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔

کسی ایک محاذ پر شکست کے بعد قومیں اپنے آپ کو مزید طاقتور کرنے کیلئے، متحد ہو جایا کرتیں ہیں لیکن جو مسلمان قوم جہاد سے منہ موڑ لے تو قدرت اس قوم کیلئے زوال و رسوائی کا فیصلہ صادر کر دیتی ہے۔ ان کو نفرت، تعصب، بھوک، افلاس اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہونے کا مزا چکھا دیا جاتا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ امریکا 1901ء سے چین، فلپائن، کوریا، ویت نام، جنوبی امریکا اور دنیا کے دیگر 38 ممالک سے ذلیل و رسوا ہو کر نکلا ہے۔ دور نہ جائیں، ابھی کل کی بات ہے، امریکا کی بھرپور طاقت اور قوت کا مظہر اسرائیل، جس کا دفاعی نظام اس قدر مضبوط تھا کہ امریکی پینٹاگون بارہا ایسی خواہش کا اظہار کرتا تھا کہ اس کا دفاعی انتظام بھی اسرائیل جیسا ہو لیکن اس طاقت کو ایک فوجی لحاظ سے غیر منظم صرف ساڑھے تین ہزار افراد پر مشتمل تنظیم حزب اللہ نے اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہوئے جہاد کے ذریعے امریکا کے لے پالک اسرائیل کو ایسی ذلت آمیز شکست دی کہ اس کے فوری تین شہر خالی ہو گئے، اس کے چار لاکھ شہری دربدر ہو گئے، کیا حزب اللہ کو کسی عالمی طاقت کی مدد حاصل تھی؟ اب ایک مرتبہ پھر گزشتہ چھ ماہ سے نہتے محصور غزہ کے ایک ایک انچ پر گولہ باری کر کے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا، لیکن اس کے باوجود اپنے مغویوں کی رہائی کیلئے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے آقاؤں سے مدد کی دہائی دے رہا ہے۔

لیکن وہ طاقت کے پجاری جن کا دل ہی نہیں مانتا کہ اس کائنات پر ایک اور حکمران طاقت ہے جس کا یہ وعدہ ہے کہ اگر تم مجھ پر یقین کرو تو تم قلیل بھی ہو گے تو زیادہ طاقت پر غالب آؤ گے۔ یہ لوگ پھر بھی توجیہات کرتے ہیں لیکن آخر میں انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ قدرت نے ہر انسان کے سینے میں

ایک چھوٹا سا ایٹم بم "دل" کی شکل میں نصب کر رکھا ہے۔ یہ چھوٹا سا لوتھڑا پہاڑوں سے ٹکرا جانے کی ہمت رکھتا ہے اگر اس میں صرف ایک رب کا خوف موجود ہو، سارا باطل اس سے لرزاں اور خوفزدہ رہتا ہے، لیکن اگر اس میں دنیا کا خوف بٹھالیں تو ہر دن رسوائی کی موت آپ ہم نے جب سے جہاد سے منہ موڑا ہے، دنیا کی تمام کی منتظر رہتی ہے۔ رسوائیاں ہمارا مقدر ٹھہری ہیں۔ ہم ایک جوہری قوت ہوتے ہوئے بھی لوگوں سے اپنے امن کی بھیک مانگ رہے ہیں اور دوسری طرف طالبان نے جہاد کا سہارا لیکر اپنے وجود کو منوایا ہے۔

امریکا اور مغربی ممالک جو جدید ٹیکنالوجی رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، جہاں ہزاروں افراد اپنی اس ٹیکنالوجی کی بدولت دہشت گردوں کی بو سونگھتے رہتے سیکورٹی ہیں جہاں کوئی شہری اپنے پڑوسی میں کسی لمبی داڑھی والے کو دیکھ لیں تو فوراً پولیس کو آگاہ کرتے ہیں، باہر سے آنے والوں کو گھنٹوں ائیر پورٹ پر کے نام پر ذلیل کیا جاتا ہے، کیا وہاں یہ سب ختم ہو گیا یا ان کے شہر ان خطروں سے محفوظ ہو گئے ہیں یا ان کا خوف کم ہو گیا؟؟؟ ہر گز نہیں، ہم تو ایک آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے ہاں سیاسی افراتفری اور بدامنی قابو میں نہیں آرہی۔

اپنے گھر کو ٹھیک کرنے کیلئے فوری ایسے اقدامات کی ضرورت ہے کہ قوم کے اندر نظریاتی تقسیم کو ختم کرنے کیلئے چند ملکی دانشور آگے بڑھ کر آپس کے اختلافات کو ختم کرانے کیلئے سنجیدہ کوششیں کریں۔ آج ہر کوئی سوشل میڈیا کے خطرناک ہتھیاروں سے لیس ایک دوسرے پر جو حملے کر رہے ہیں، اس کو فوری روکنے کی ضرورت ہے۔ مذاکرات ہمیشہ انتہائی خفیہ اور سنجیدگی سے کئے جاتے ہیں لیکن ہمارے ہاں ہر کوئی میڈیا پر بیٹھا نظر آتا ہے۔ کیا دنیا کے کسی خطے میں ایسا ہوا ہے؟ ویت نام، لاؤس، سری لنکا، چلی، نکاراگوا، کمبوڈیا، کہاں کسی نے میڈیا پر ایسی دوکانداری چمکائی ہے؟ دشمن تو یہی چاہتا ہے کہ مزید افراتفری بڑھے، عوام کا خون اور بہے اور گھرانے ماتم کدہ بن جائیں اور لوگ اس آگ میں جھلس جائیں اور پھر مجبور ہو کر سر جھکا کر ان کی ہر بات، ہر مطالبہ مان لیں۔، جوہری اثاثوں اور کشمیر سے دستبرداری اور بھارت کی غلامی اختیار کر لیں لیکن وقت نے یہ ثابت کیا ہے کہ ایسا نہ کبھی پہلے ہوا تھا اور نہ ہی آئندہ ہو گا۔

اس میں شک نہیں کہ ماضی میں ایک فوجی ڈکٹیٹر نے ہماری بہترین افواج کو ان دشمنوں کا آلہ کار بنانے کی پوری کوشش کی لیکن "جہاد" جیسے جذبے سے معمور فوج آج بھی اپنے لوگوں کے ساتھ کھڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یومِ شہدا پر جنرل عاصم منیر کے صرف ایک بیان پر ساری قوم میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری افواج کو مکمل طور پر اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کیلئے استعمال کیا جائے۔ مجھے قوی امید ہے کہ "جہاد" کے جذبے سے سرشار افواج اپنے ملک کے جوہری اثاثوں اور مسئلہ کشمیر پر کبھی قوم کو مایوس نہیں کرے گی، اسی لئے جنرل عاصم منیر نے ببانگ دہل کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیکر کشمیریوں سے مکمل یکجہتی کا اعلان کیا ہے۔ پچھلے 77 برسوں سے بھارت اور عالمی طاقتوں نے مسئلہ کشمیر سے جس طرح بے اعتنائی اختیار کی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اقوام متحدہ جو ان عالمی طاقتوں کی کنیز اور لونڈی کا کردار ادا کر رہی ہے اس کے چارٹر میں بھی مظلوم اقوام کی اپنی آزادی کیلئے مسلح جدوجہد کی حمائت کی گئی ہے اور کشمیر کا مسئلہ تو اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر سب سے پرانا ایسا مسئلہ ہے جو ابھی تک عالمی ضمیر کو ان کی بے حسی کی یاد دلانے کیلئے کافی ہے۔

اہل نظر پچھلے کئی ماہ سے خبر دار کرتے چلے آرہے ہیں۔رب کریم کے سامنے اپنی عاجزی وبے بسی کے ساتھ جہاد سے منہ موڑنے پر استغفار کی ضرورت ہے۔جن کے دلوں میں امریکا کا خوف اور ہاتھوں میں کشکول ہے،ان کے تکبر ٹوٹنے کا وقت آپہنچا ہے۔کیا ٹائی ٹینک کے ڈوبنے کا وقت آن پہنچا ہے؟سنا ہے جب جہاز ڈوبنے کا وقت ہوتا ہے تو چوہے سب سے پہلے جہاز چھوڑتے ہیں لیکن اب تو شاید ان چوہوں کا مقدر بھی ہمیشہ کیلئے غرق ہونا ٹھہر گیا ہے ۔کیا خوابوں کی تعبیر کا وقت آن پہنچا ہے؟

جب تک نہ جلے دیپ شہیدوں کے لہو سے
سنتے ہیں کہ جنت میں چراغاں نہیں ہوتا

بروز بدھ 14 ذوالقعد 1445ھ 22 مئی 2024ء

اگلی سپر پاور کون؟

چین کی تیز رفتار ترقی نے دنیا بھر میں کھلبلی مچادی ہے۔ امریکا اور یورپ کے ساتھ ساتھ روس اور دیگر علاقائی ممالک کو بھی تشویش لاحق ہوگئی ہے۔ چین کی ترقی کا گراف بلند ہوتا ہوا دیکھ کر روس کو بھی کچھ کرنے کا خیال آیا ہے اور اُس نے اس حوالے سے بہت کچھ کرنے کی ٹھانی ہے۔ روس سپر پاور بھی رہا ہے اور ایک بار پھر اِس حیثیت کا حامل ہونے کا خواہش مند بھی ہے۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سے روس کو ابھرنے کا کوئی ایسا موقع نہیں ملا جس سے غیر معمولی حد تک مستفید ہوا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ روسی قیادت علاقائی اور عالمی سطح پر اپنے لیے بلند تر کردار کی تلاش میں ہے اور اب ایسا لگتا تھا کہ وہ اِس حوالے سے کسی حد تک مطمئن ہے لیکن امریکا و اس کے اتحادیوں کی جانب سے یوکرین جنگ میں اس کے وسائل تقسیم ہو کر رہ گئے ہیں اور دوسری طرف چین نے ون بیلٹ، روڈ انیشیٹیو (بی آر آئی) کے حوالے سے جو کچھ کیا ہے وہ امریکا اور یورپ کیلئے تو پریشانی کا باعث ثابت ہوا ہے مگر روس نے اپنے آپ کو بہتر پوزیشن میں محسوس کر رہا ہے۔ جس کے بعد پیوٹن نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اب چین کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کچھ کر دکھانا لازم ہو گیا ہے۔

ادھر چین نے نئی اقتصادی شاہراہِ ریشم کے خواب کو بی آر آئی کے روپ میں شرمندۂ تعبیر کرنے کی ٹھانی ہے۔ ایسے میں روس بھلا کیوں کچھ نہ سوچے؟ وہ بھی اپنے لیے کوئی نیا علاقائی اور عالمی کردار چاہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ چین کے ساتھ قدم ملا کر بڑھ رہا ہے۔ مشرقی ایشیا اور یوریشیا کی ترقی اور سلامتی کے حوالے سے کوئی نیا اور بامعنی کردار ادا کرنا روس کیلئے ناگزیر سا ہو گیا ہے۔ روسی قیادت نے چینی قیادت کو متعدد مواقع پر یہ اعلانیہ پیغام دیا ہے کہ پورے خطے کو ایک لڑی میں پرونے کے پروگرام کے حوالے سے اُسے تھوڑی بہت اصلاحات کرنا پڑیں گی تاکہ روس جیسے بڑے ملک کو بھی اچھی طرح کھپایا جاسکے۔ چین کیلئے بھی لازم سا ہو گیا ہے کہ منصوبے ہر اعتبار سے جامع ہوں یعنی اُن میں کوئی ایسا سُقم نہ ہو کہ خطے کی کسی طاقت کو زیادہ بُرا لگے یا محسوس ہو کہ اُس کیلئے پنپنے کے مواقع پیدا نہیں ہو پا رہے۔ چین نے امریکی ترقی سے بھی خاموشی کے ساتھ مستفید ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔

چین کے صدر شی جن پنگ نے 2013ء میں قازقستان میں چین کے عظیم الشان منصوبے بی آر آئی کا اعلان کیا تھا، جس کے بعد سے اب تک بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔ ملائیشیا اور پاکستان اور اُس سے آگے افریقا تک چین کے متعدد منصوبے زیر تکمیل ہیں۔ بہت سے منصوبے مکمل بھی ہو چکے ہیں۔ اس حوالے سے شکایات کا بازار بھی گرم ہے۔ چین کے حوالے سے ایک بڑی شکایت یہ ہے کہ یہ کسی بھی منصوبے میں شراکت دار ملک کے مفادات کا زیادہ خیال نہیں رکھتا، جس کے نتیجے میں شکوے بڑھتے جارہے ہیں، تحفظات کا گراف بلند ہو رہا ہے۔ چین نے پورے خطے کو اقتصادی طور پر ایک لڑی میں پرونے کا جو پروگرام شروع کیا ہے وہ ابتدا میں غیر معمولی حد تک مبہم تھا، اب چین میں متعدد تھنک ٹینک ابھر کر سامنے آئے ہیں، جو حکومت کو مختلف حوالوں سے مشورے دے رہے ہیں۔ یہ تھنک ٹینک ایک ایسے ماحول کو یقینی بنانے کیلئے کام کر رہے ہیں جس میں چین کیلئے مشکلات کم سے کم ہوں اور شرکت دار کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کی راہ نکالی جاسکے۔

دنیا بھر میں اِس حقیقت کو تسلیم کرنے میں عار محسوس نہیں کی جارہی کہ چین نے جو منصوبہ شروع کیا ہے، وہ دنیا کو قرضوں میں لپٹے رہنے کے ماڈل سے دور کرنے کی چند بڑی اور مثبت کوششوں میں سے ایک ہے۔ امریکا اور یورپ نے مل کر بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف) کو فروغ دیا۔ امید کی جانی چاہیے کہ چین اگر کوئی عالمی مالیاتی ادارہ قائم کرنے کی تحریک چلاتا ہے تو وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا جو آئی ایم ایف کرتا رہا ہے۔ آئی ایم ایف نے

پسماندہ ممالک کو قرضوں کے جال میں پھنسا رکھا ہے۔ روس نے حال ہی میں شمال مشرقی ایشیا کی ریاستوں کو تنظیم کے پلیٹ فارم سے کچھ کرنے کی تحریک دی ہے۔

جو بائیڈن کی ایما پر امریکا کے خفیہ ادارے سی آئی اے نے یوکرین کے حوالے سے جو کچھ کیا، وہ امریکا اور یورپ کے حوالے سے روس کی سوچ میں تبدیلی کا باعث بنا۔ سابق صدر باراک اوباما نے یوکرین کے ایشو پر یورپی یونین کو روس پر پابندیاں عائد کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ عمل روس کو مختلف حوالوں سے تحفظات کا شکار کرنے کا باعث بنا۔ ایسے میں لازم تھا کہ روس اپنے آپشنز کیلئے کسی اور طرف دیکھنا شروع کرتا۔ روس نے بہت سے معاملات میں مغرب کی طرف دیکھتے رہنے کی پالیسی اپنائی تھی۔ اب ان پالیسیوں پر نظر ثانی کرتے ہوئے خود مختاری کی کامیاب پالیسی پر عملدرآمد شروع کر دیا ہے۔ ایسے میں روس کیلئے بالکل فطری تھا کہ سیاسی، معاشی اور عسکری معاملات میں خطے (یوریشیا) کی سب سے بڑی قوت یعنی چین کی طرف دیکھتا اور اُس نے ایسا ہی کیا اور اب خود آئی ایم یاف کی تازہ رپورٹ کے مطابق یوکرین جنگ کے باوجود روس کی معیشت میں مزید بہتری ہو رہی ہے۔

یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ روسی قیادت بیشتر معاملات میں چین پر بہت زیادہ انحصار کر رہی ہے، جس کے نتیجے میں ایسا وقت بھی آسکتا ہے کہ چین کے بغیر ڈھنگ سے جینا اُس کیلئے ممکن نہ رہے۔ چند ایک شعبوں میں دونوں ممالک نے ساتھ چلنے کی اچھی خاصی گنجائش پیدا کی ہے۔ یہ بات محسوس کی جاسکتی ہے کہ روس اپنے لیے جگہ بنانا چاہتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات کا خیال بھی رکھ رہا ہے کہ چین کے مقابلے میں اُس کی وہی حیثیت نہ رہ جائے، جو دو ڈھائی عشروں کے دوران امریکا کے مقابلے میں برطانیہ کی رہی ہے!

نومبر میں پاپوا نیوگنی میں (اے پی ای سی) کے رکن ممالک کا اجلاس ہوا، جس میں شرکت کیلئے پیوٹن نے اپنے وزیر اعظم میدویدوف کو بھیجا۔ اس اجلاس میں چین کے صدر شی جن پنگ نے امریکا کے نائب صدر سے ملاقات کی۔ خود پیوٹن نے سنگاپور میں آسیان کے سربراہ اجلاس میں شرکت کرنا ضروری سمجھا۔ جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کی تنظیم آسیان کے ارکان میں ویتنام، ملائیشیا، برونائی، لاؤس، فلپائن، کمبوڈیا، انڈونیشیا، سنگاپور، تھائی لینڈ اور میانمار (برما) شامل تھے۔ اس اجلاس میں اس نکتے پر بحث ہوئی کہ روس کی سرپرستی میں قائم یوریشین اکنامک یونین (ای اے ای یو) اور آسیان کے درمیان تجارت اور سرمایہ کاری کو زیادہ سے زیادہ کس طور فروغ دیا جائے۔ شنگھائی تعاون تنظیم کی طرز پر یوریشیائی ممالک کی عظیم تر شراکت داری قائم کرنے اور خطے میں ترقی کا عمل تیز کرنے کا جو عزم کیا گیا تھا، اب اس پر خاطر خواہ پیش رفت دکھائی دے رہی ہے۔

روس کسی بھی اعتبار سے اُتنا مضبوط تو نہیں جتنا چین ہے، مگر پھر بھی جغرافیائی مواقعوں کی بنیاد پر وہ ایشیا اور یورپ کے درمیان وسیع تر رابطے کا کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ خطے کے ممالک کو عظیم تر اقتصادی لڑی میں پرونے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ جن علاقوں میں چین کے حوالے سے تاریخی اعتبار سے تحفظات پائے جاتے ہیں، اُن میں روس کا کردار اہم ثابت ہو سکتا ہے۔ نقشے میں دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ روس وسیع تر جغرافیائی حقیقت ہونے کی بنیاد پر کتنے ممالک سے جُڑا ہوا ہے۔ غیر معمولی تزویراتی اہمیت کی بنیاد پر روس کئی ممالک سے وسیع البنیاد شراکت داری قائم کرکے سیاسی اور معاشی ہی نہیں، عسکری اعتبار سے بھی اپنی بات منوانے کے ساتھ ساتھ کئی ممالک کی وقعت میں اضافہ کر سکتا ہے۔

سنگاپور سربراہ اجلاس میں مفاہمت کی ایک یادداشت پر بھی دستخط کیے گئے تھے، جس کی رُو سے تجارت اور سرمایہ کاری کو تیزی سے فروغ دیا جائے گا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آسیان نے پہلی بار روس سے اپنے تعلق کو "اسٹریٹجک پارٹنر شپ" قرار دیا۔ مفاہمت کی جس یادداشت پر

دستخط کیے گئے، اُس کے تحت روس اس خطے میں تجارت اور سرمایہ کاری کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کیلئے مختلف شعبوں پر خاص توجہ دے رہا ہے. کسٹم ڈیوٹی کے معاملات کو نئی شکل دی گئی ہے۔ روس آئی ٹی اور چند دیگر شعبوں میں وسیع تر تعاون کر رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ روسی قیادت اس خطے میں اسمارٹ سٹیز قائم کر کے وسیع تر منصوبے کے کامیاب تجربے سے مستفید ہو رہا ہے۔ روسی صدر نے آسیان کے رکن ممالک کے سربراہان کو ذاتی طور پر 2019ء میں سینٹ پیٹرزبرگ اکنامک فورم اور ولاڈیواسٹوک ایسٹرن اکنامک فورم میں شرکت کی جو دعوت دی تھی، اس کی کامیابی کے ثمر کا فائدہ بھی اٹھا رہا ہے۔

روس کے زیر سایہ کام کرنے والی یوریشین اکنامک یونین اور آسیان کے درمیان 2017ء کے بعد سے تجارت میں کم و بیش 60 فیصد اضافہ ہوا ہے، جس کے نتیجے میں تجارت کا حجم 48 / ارب ڈالر تک پہنچا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس خطے میں جتنی تجارت کی سکت ہے یہ تجارتی حجم اس کا معمولی سا حصہ ہے۔ آسیان کے ارکان میں ویتنام سے روس کے تعلقات بہت اچھے ہیں، دونوں میں گاڑھی چھن رہی ہے۔ سرد جنگ کے دور میں روس نے سمندر میں تیل کی تلاش کے حوالے سے ویتنام کی خاصی مدد کی تھی۔ دونوں ممالک نے 2015ء میں آزاد تجارت کا معاہدہ کیا تھا، اس معاہدے کے بعد سے اب تک دونوں ممالک کے تجارت کا حجم 8 / ارب ڈالر تک پہنچ چکا ہے اور اس میں مزید فروغ کا امکان موجود ہے۔

یوریشین اکنامک یونین کے ارکان اور ویتنام کے درمیان تجارت بڑھتی جا رہی ہے۔ تیل، کھاد، فولاد اور مشینری ویتنام کی کلیدی درآمدات ہیں۔ برآمدات میں فون کے پرزے، الیکٹرانک آلات، کمپیوٹر اپیرل اور سافٹ ویئر نمایاں ہیں۔ اب جبکہ روس، یوریشین اکنامک یونین اور آسیان کے درمیان تجارتی معاہدہ ہو گیا ہے، ویتنام غیر معمولی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ وہ آسیان کے دیگر ممالک کیلئے روس اور یوریشین اکنامک یونین کی مصنوعات کی فراہمی میں اہم کردار ادا کر رہا ہے اس معاہدے سے فریقین کیلئے کم و بیش 2200 / ارب ڈالر کی جی ڈی پی والی مارکیٹ کھل رہی ہے اور دوطرفہ تجارت 2020ء تک 20 / ارب ڈالر سے بڑھ کر 2030ء تک 30 / ارب ڈالر تک پہنچ سکتی ہے۔

پیوٹن نے آج سے 5 برس قبل جو سنگاپور میں ملائیشیا کے صدر مہاتیر محمد، انڈونیشیا کے صدر رودودو، جاپان کے وزیر اعظم آبے، جنوبی کوریا کے صدر مُو جائے اِن اور چین اور تھائی لینڈ کے وزرائے اعظم سے جو ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا، اس نے ان تمام ملکوں سے قربت کے نئے در کھلے۔ روسی صدر نے جاپانی وزیر اعظم آبے سے کرلی جزائر کے حوالے سے بات کی جبکہ جنوبی کوریا کے صدر مُون جائے اِن سے اُنہوں نے شمالی کوریا کے معاملے پر بات کی۔ جاپان کے وزیر اعظم آبے نے 1945ء سے چلے آرہے تنازع کو ختم کرنے سے متعلق وسیع تر مذاکرات پر آمادگی ظاہر کی۔ چند ماہ قبل جاپان اور روس نے ایک سمندری راہداری اور ٹرانس سائبیرین ریلوے لائن کے ذریعے جاپانی مصنوعات کو روس تک پہنچانے کی جو کامیاب مشق کی تھی، اس میں مزید عملاً اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ سرکاری اراضی، مواصلات، بنیادی ڈھانچے اور سیاحت کے نائب وزیر تشی ہیرو مستوموتو نے عالمی میڈیا کے ساتھ بات کرتے ہوئے کہا کہ روس کی 5772 میل کی ریلوے لائن میں دوطرفہ تجارت کو غیر معمولی حد تک فروغ دینے کی سکت موجود ہے جبکہ ان دونوں ممالک کے درمیان تجارت سمندر کے راستے ہو رہی ہے یا پھر فضاء کے راستے۔ جاپانی مصنوعات کو بحر ہند کے راستے روس تک پہنچنے میں کم و بیش 62 دن لگتے ہیں ۔ فضائی راستے سے تجارت بہت مہنگی پڑتی ہے۔ نئی راہداری کھلنے سے شپنگ کا وقت بھی گھٹے گا اور لاگت میں بھی 40 فیصد تک کمی واقع ہو گی۔ گویا خطے

کے سب سے مضبوط امریکی اتحادی جاپان اب انتہائی سنجیدگی سے روس کے ساتھ تجارتی تعلقات کو بڑھانے کی عملی کوششوں میں مصروف ہے، گویا یہ جہاں روس کی کامیابی نظر آرہی ہے وہاں درپردہ چین کی کوششیں بھی بارآور دکھائی دے رہی ہیں۔

2017ء میں روس اور جاپان نے سرکاری سرپرستی میں بنیادی ڈھانچے کو فروغ دینے کیلئے مشترکہ ترقیاتی فنڈ قائم کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ مرلی جزائر کی ملکیت کا مسئلہ حل ہوتے ہی جہاں یہ فنڈ تیزی سے پروان چڑھے گا وہاں دونوں ممالک بنیادی ڈھانچے کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کی سمت تیزی سے بڑھنے کیلئے کوشاں ہیں۔ روس کو جنوب مشرقی، جنوبی اور وسط ایشیا میں اپنے کردار کو وسعت دینے کی تحریک اس لیے بھی ملی ہے کہ چین کو اپنے "میڈ اِن چائنا 2025ء" ایجنڈے کے حوالے سے امریکا کی طرف سے غیر معمولی دباؤ کا سامنا ہے۔ دوسری طرف جاپان، جنوبی کوریا اور بھارت نہیں چاہتے کہ اُنہیں امریکا، چین یا کسی اور ملک پر بہت زیادہ انحصار کرنا پڑے۔ اس حوالے سے اعتدال اور توازن قائم کرنے کی کوششیں تیز ہوتی جارہی ہیں۔ چین کسی اور ملک کو ناراض کیے بغیر روس اور خطے کی تمام ابھرتی ہوئی طاقتوں کے درمیان پُل کا کردار عمدگی سے ادا کر رہا ہے۔

بھارت نے ایک مرتبہ پھر روس سے تعلقات بہتر بنانے پر خاص توجہ دی ہے۔ سرد جنگ کے دور میں بھارت کا جھکاؤ سوویت یونین کی طرف رہا اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے امریکا اور یورپ سے بھی خوب فوائد بٹورے۔ سرد جنگ کے خاتمے اور سوویت یونین کی تحلیل کے بعد بھارتی قیادت نے روس کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اب برہمن سوچ نے انہیں مجبور کر دیا ہے کہ روس پر توجہ دی جانی چاہیے کیونکہ وہ اپنے مسائل کو بہت حد تک حل کر چکا ہے اور وسیع تر علاقائی و عالمی کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں آچکا ہے۔ دونوں ممالک نے سویلین نیوکلیئر ٹیکنالوجی، میزائل ٹیکنالوجی اور چند دوسرے اہم شعبوں میں اہم معاہدے کیے ہیں۔ روس، جو سویلین نیوکلیئر ری ایکٹر بنانے والا سب سے بڑا ملک ہے، بھارت میں نیوکلیئر فیول اسمبلیز تیار کرے گا۔ روس نے بھارت کو چار کراؤیک کلاس کے فریگیٹس فراہم کرنے کا معاہدہ کر رکھا ہے، جس میں 2 / فریگیٹس ڈھائی ارب ڈالر کی لاگت سے بھارت میں تیار ہو رہے ہیں۔

2019ء میں ایک سال کے دوران پیوٹن اور مودی کی پانچ ملاقاتیں ہوئیں۔ دونوں رہنما اس بات کا عندیہ دیا کہ دوطرفہ تعلقات کو 1950ء کے عشرے کی سطح تک لے جایا جائے۔ روس کا بھارت کی طرف متوجہ ہونا بہت اہم ہے کیونکہ چار پانچ سال کے دوران دونوں ممالک کے تعلقات قابلِ رشک نہیں رہے اور اس دوران امریکا نے بھارت کو اپنے دائرہ اثر میں رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور اب دونوں ممالک ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہیں کہ ایک دوسرے کو کہاں کہاں اور کس مد میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس دوران روس مسلسل چین سے ہٹ کر بھی بہت کچھ کرنے کی کوششیں کر رہا ہے۔ وہ جاپان، جنوبی کوریا، ویتنام اور بھارت پر بھرپور توجہ دے رہا ہے، جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ روسی قیادت کو اپنی بڑھتی ہوئی قوت کا احساس ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اس قوت کو عمدگی سے بروئے کار بھی لایا جائے۔

پیوٹن نے 2018 میں جس عظیم یوریشین اکمانک پارٹنرشپ کا اعلان کیا تھا، اب ایک مرتبہ پھر روس کا صدر منتخب ہونے کے بعد وہ اس حوالے سے غیر معمولی سنجیدہ اور متحرک دکھائی دے رہے ہیں۔ پیوٹن نے انرجی سپر رِنگ قائم کرنے کی بات بھی کی تھی، جو روس، چین، جاپان اور جنوبی کوریا کو جوڑے گا۔ جاپان کے جزیزے ہوکائیڈو اور روس کے جزیرے سخالین کو ریل اور روڈ لنک کے ذریعے جوڑنے کا پلان سرِفہرست ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو پورے خطے میں تجارت اور توانائی کے حوالے سے انقلاب برپا ہو جائے گا۔ یقیناً امریکا اتنی آسانی سے اپنی سپر میسی کو لاحق خطرات کے جواب میں خاموش تو نہیں بیٹھے گا، اسی لئے یوکرین جنگ میں الجھانے کا جو عمل شروع کیا گیا ہے، اس کو اب ایک نئے انداز سے آگے بڑھانے کی پالیسی پر عمل درآمد شروع ہو چکا

ہے لیکن کیا امریکا ایک مرتبہ پھر دنیا کی واحد سپر پاور کا اعزاز برقرار رکھنے کیلئے پاکستان اور افغانستان کی طرح یوکرین کو بھی قربانی کا بکرا بنانے میں کامیاب ہو جائے گا؟ اب شائد یہ ممکن نہیں ہو گا کیونکہ یورپی عوام اب امریکا کو دنیا کی واحد سپر پاور بنانے کیلئے مزید مالی اور جانی قربانی دینے کو تیار نہیں ہوں گے۔

بروز جمعرات 15 ذوالقعد 1445ھ 23 مئی 2024ء

ایک سکے کے دو رخ

تقریباً دو صدیاں پہلے کشمیر کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر کچھ ہندو پنڈتوں نے مستقل رہنے کی درخواست کی تو اس وقت کشمیری مسلمانوں نے اپنے حسن سلوک سے ان کو صدقِ دل سے خوش آمدید کہا اور اس طرح آہستہ آہستہ مزید ہندو افراد بھارت سے کشمیر میں پہنچنا شروع ہو گئے اور اس طرح یہ تمام ہندو افراد کشمیری پنڈت کے نام سے بلائے جانے لگے۔ بدھ سنگھ جو ایک لٹا پٹا جاگیر دار تھا اس نے بھی اپنے کنبے کے کچھ افراد کے ساتھ کشمیر میں پناہ لی ۔ ابھی وہ جوان ہی تھا کہ اس نے ایک انگریز افسر مانسٹوٹ کے پاس ملازمت حاصل کر لی اور پھر اس کے ساتھ ہی دلی منتقل ہو گیا۔ دورانِ ملازمت دلی قیام کے دوران 1812ء میں اس کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی جس کا نام اس نے موہن لال رکھا۔ بدھ سنگھ ایک جہاں دیدہ شخص تھا لہٰذا جب 1828ء میں انگریز نے فارسی کالج دلی میں انگلش کی کلاسیں شروع کیں تو بدھ سنگھ نے اپنے بیٹے موہن لال کو وہاں داخلہ دلا دیا جہاں موہن لال کے نام کے ساتھ کاشمیری کا اضافہ کر دیا گیا۔

یوں موہن لال کاشمیری ہندوستان کے ان 6 نوجوانوں میں شامل ہو گیا جنہوں نے انگریز راج کے شروع میں انگریزی سیکھ لی۔ 1831ء کو وہ فاتح افغانستان سر الیگزانڈر برنس کے پاس ملازم ہو گیا۔ موہن لال فارسی اور انگریزی زبان بولنے اور لکھنے میں کافی ماہر ہو گیا تھا لہٰذا اسے شروع میں بخارا کی مہم سونپی گئی۔ وہ برنس کے ساتھ دہلی سے نکلا اور لدھیانہ، پانی پت، کرنال، لاہور، پنڈ دادن خان، جلالپور، راولپنڈی، پشاور، کابل اور بامیان سے ہوتا ہوا بخارا پہنچا۔ برنس اور اس کے انگریز ساتھی جیرارڈ مقامی لوگوں کی بھیس میں اس کے ساتھ تھے۔ اس مہم کا مقصد افغانستان کی دفاعی پوزیشن کا جائزہ لینا تھا ۔ موہن لال کاشمیری سفر کے دوران ڈائری لکھتا رہا جو مختلف ذریعوں سے انگریز سرکار تک پہنچتی رہی۔ موہن لال 1834ء کو واپس پہنچا، انگریز سرکار نے اس کی خدمات کے عوض اسے قندھار میں اپنا پولیٹیکل ایجنٹ لگا دیا۔

1838ء کو انگریز نے افغانستان پر قبضے کا فیصلہ کیا، موہن لال کو اس مہم کا "گائیڈ" مقرر کر دیا گیا۔ موہن لال برنس کے ساتھ نکلا اور انگریز فوج کو سیدھا کابل لے گیا۔ افغانوں سے جنگ ہوئی، افغان ہار گئے کیونکہ موہن لال اس سے پہلے بہت سے غیر مسلم افغانیوں کو مال و دولت سے انگریز سرکار کی حمائت کیلئے خرید چکا تھا۔ انگریزوں نے شاہ شجاع کو تخت پر بٹھا دیا اور اس کی آڑ میں افغانستان پر حکومت کرنے لگے۔ موہن لال اس سارے دور میں انگریزوں کے مفادات کیلئے کام کرتا رہا۔ موہن لال کو قدرت نے سازش، مکر و فریب اور جوڑ توڑ کی صلاحیتوں سے نواز رکھا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے مقامی لوگوں میں رچ بس جاتا تھا اور پھر ان کی جڑیں کاٹ کر اپنے آقا انگریزوں کے ہاتھ میں دے دیتا تھا۔ موہن لال 1877ء تک زندہ رہا، اپنی باسٹھ سالہ زندگی میں اس نے برطانیہ کا سفر بھی کیا، آخری عمر میں اس نے دو سفر نامے بھی لکھے جو کسی ہندوستانی باشندے کی انگریزی زبان میں پہلی کتابیں تھیں۔

یہ کتابیں بد قسمتی سے شہرت نہ پا سکیں۔ 1930ء کے آخر میں نہرو لندن کے ایک کباڑیئے کی دوکان پر کسی کام سے گئے تو وہاں انہوں نے ان کتابوں کو خرید لیا۔ ان کتابوں کا جب مطالعہ کیا تو موہن لال کے مشاہدات اور زبان دانی پر حیران ہو گئے۔ نہرو کی تحریک پر بعد ازاں ہری رام گپتا نے موہن لال پر پی ایچ ڈی کی۔ گپتا کا مقالہ 1943ء میں شائع ہوا، اس کا دیباچہ خود نہرو نے لکھا لیکن بد قسمتی سے یہ مقالہ بھی کوئی شہرت نہ حاصل کر سکا۔ ساٹھ برس بعد یعنی 2003ء میں یہ ایک بار پھر شائع ہوا، اس مرتبہ اس نے تہلکہ مچا دیا، دنیا موہن لال کاشمیری کے مشاہدات پر حیران رہ گئی۔

موہن لال 1838ء سے 1841ء تک کابل رہا تھا، اس نے انگریزوں کی حکومت بنتے اور پھر بگڑتے دیکھی تھی، وہ افغانوں کا مزاج شناس بھی تھا لہٰذا

جب اس نے کابل میں انگریزوں کے زوال کی داستان لکھی تو کمال کر دیا اس نے لکھا: افغان سب کچھ سہہ جاتے ہیں لیکن وہ بیرونی طاقتوں کو برداشت نہیں کرتے۔ افغان شراب اور جنسی بے راہروی کے ساتھ بھی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ انگریز اقتدار پر قابض ہوئے تو انہوں نے افغانوں کے مزاج کو فراموش کر دیا، انہوں نے سارے اختیار اپنے ہاتھ میں لے لئے، بادشاہ فوج نے سرِعام شراب نوشی شروع کر دی۔ انگریزوں نے بڑے بڑے مکانات محض کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔ کابل میں شراب خانے کھولے گئے اور انگریز اور باغات پر قبضہ کر لیا، وہ وہاں گھڑ دوڑ، کرکٹ اور ڈراموں سے لطف اندوز ہونے لگے۔

وہ سردیوں میں کابل میں اسکیٹنگ بھی کرتے تھے، شہر بھر میں قحبہ خانے کھل گئے، انگریز فوجیوں کی دست درازیاں شرفاء کے گھروں تک پہنچ گئیں۔ انگریز افسر اور اہلکار سرداروں کی بہو بیٹیاں اٹھالاتے اور اس زیادتی پر حکومت خاموش رہتی۔ انگریزوں نے شہر کے تمام اچھے مکانات ہتھیا لئے یا پھر کرائے پر حاصل کر لئے۔ اناج، گھاس، گوشت اور سبزیاں بھی انگریز خرید لیتے تھے جس کے نتیجے میں افغانستان قلت اور مہنگائی کا شکار ہو گیا۔ افغان تین اس برس تک یہ ظلم سہتے رہے یہاں تک کہ 1841ء ستمبر آن پہنچا۔ تمام افغان سرداروں نے قرآن پر حلف لیتے ہوئے ایک معاہدے پر دستخط کئے اور کے بعد انگریزوں کو چن چن کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ برنس کو اس کے گھر کے سب سے بڑے دروازے پر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ یہ بغاوت 7 جنوری 1842ء تک جاری رہی۔ تنگ آکر میجر پاٹنجر نے افغانستان چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔ انگریز فوج کابل سے نکلی لیکن افغانوں نے اسے راستے میں گھیر کر قتل کر دیا۔ اس جنگ میں 20 ہزار انگریز مارے گئے، صرف ڈاکٹر برائیڈن بچا جو زندگی بھر افغانوں کی بربریت کی داستانیں سناتا رہا۔ موہن لال بھی اس جنگ میں گرفتار ہوا لیکن اس نے انگریزوں کے تمام خفیہ راز اگل دیئے اور بڑی مشکل سے رہائی پائی۔

مجھے گزشتہ دنوں میرے ایک مربی نے ان کشمیری پنڈتوں کی تاریخ پڑھنے کو کہا تو میرے ہاتھ موہن لال کاشمیری کی آب بیتی، گلوب اینڈ میل کی ایک پرانی رپورٹ اور کرسٹینا لیمب کا 2004ء میں لکھا ہوا کالم اکٹھے پڑھنے کا اتفاق ہوا، گلوب اینڈ میل نے انکشاف کیا "کابل شہر گناہوں کی دلدل بن چکا ہے، شہر میں جسم فروشی کے سینکڑوں مراکز کھل چکے ہیں، وزیر اکبر خان اور شہریوں کے جدید علاقوں میں درجنوں نائٹ کلب ہیں۔ افغان قانون کے مطابق شراب نوشی جرم ہے لیکن شہر میں شراب عام ہے"۔ کرسٹینا لیمب نیویارک ٹائمز میں اپنے کالم میں لکھتی ہیں کہ "کابل شہر میں ایک سابق افغان عمر نے دولاکھ ڈالر سے "پی کاک" کے نام سے ریستوران کھولا جس کا سوئمنگ پول مارٹینی شراب کے گلاس کی مانند ہے، اس ریستوران میں شراب کے ساتھ حرام گوشت بھی ملتا ہے، پی کاک کے علاوہ وہاں برطانیہ کے باشندوں نے ایلبو روم کے نام سے کاک ٹیل بار اور تھائی ریستوران بھی کھولا ہے۔ پورے شہر میں شراب اور عورت عام ہے جسے افغان پسندیدگی سے نہیں دیکھ رہے، حالت یہ ہے طالبان کے مخالف بھی آج ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں، کیا امریکا نے یہ جنگ اس لئے لڑی تھی کہ وہ یہاں شراب خانے، ریستوران اور رقص گاہیں تعمیر کر سکے"۔

میں نے موہن لال کی آب بیتی کو ایک طرف رکھا اور ٹھنڈا سانس بھر کر سوچا "کیا 1841ء اور 2024ء میں کوئی فرق ہے؟" کرسٹینا لیمب کے اسی کالم کے آخر میں اس کا جواب مل جاتا ہے کہ "ہاں ہے، 1841ء میں افغانستان میں انگریز تھا اور آج وہاں امریکی اپنی گیارہ سالہ ظلم و ستم کی بے شمار داستانیں چھوڑ کر آئے ہیں جن کے مہلک اور مضر اثرات کو زائل ہونے میں ابھی کافی وقت درکار ہو گا"۔ میں نے سوچا "کیا تاریخ خود کو دہرائے گی؟" تو اس کے

جواب میں کرسٹینا لیمب یوں جواب دیتی ہے کہ "ہاں جلد ہی کیونکہ غلطیوں کے بیج سے ہمیشہ غلطیوں کے پودے نکلتے ہیں"۔ میرا وجدان مجھے فوری طور پر اس طرف لے گیا کہ برہان وانی کی شہادت کے بعد کشمیر کی تحریک آزادی نے جب بہت زور پکڑ لیا اور بھارتی خفیہ ایجنسی کشمیر کی تحریک آزادی کو بدنام "را" نے کرنے کیلئے ویسے ہی اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئی تھی۔ جس طرح امریکی صدر کلنٹن کے بھارتی دورے کے دران بھارتی فوج کے خفیہ ادارے 20 مارچ 2000ء کو کشمیر کی تحریک آزادی کو کچلنے کیلئے چھتی سنگھ پورہ اننت ناگ میں بڑے بہیمانہ انداز میں وہاں کے مقامی گردوارہ میں 34 سکھوں کو قتل کر دیا اور اس کی ساری ذمہ داری کشمیری مسلمانوں پر ڈال دی تھی لیکن بعد میں خود بھارتی تین رکنی تحقیقاتی کمیشن نے بھارتی سیکورٹی فورسز کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے بھارتی بنئے کی اس خوفناک سازش کا بھانڈہ پھوڑ دیا تھا۔ مودی دورِ حکومت میں کبھی پٹھانکوٹ اور کبھی پلوامہ میں ایسے ہی ڈرامے دہرائے گئے، اس طرح بہت سے موہن لال اپنے گھناؤنے کردار مودی کی شکل میں بے نقاب ہو رہے ہیں اور دوسری طرف کشمیری پنڈتوں کو استعمال کرتے ہوئے من گھڑت واقعات سے دنیا کو گمراہ کیا جا رہا ہے جس کو بھارت کا میڈیا خوب اچھالتا ہے۔ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ان پنڈتوں کا انخلاء اس لئے بھی مقصود تھا کہ مسلمانوں کے خلاف بھارتی فوج کے ظالمانہ آپریشن میں ان کو فری ہینڈ مل سکے۔

بھارت جو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا دعویٰ کرتا ہے آخر وہ دنیا کے پریس اور کیمرے کو وہاں جانے کی اجازت کیوں نہیں دیتا؟ اگر چند منٹ کیلئے بڑی ناگواری کے ساتھ فرض کر لیا جائے کہ کشمیر بھارت کا حصہ ہے تو وہ کون سا قانون ہے جس کے تحت بھارت نے اپنے ہی ایک لاکھ سے زائد بے گناہ شہریوں کو کشمیر میں بیدردی سے قتل کر دیا ہے؟ اور نہرو جو بھارت کا بڑا محبوب لیڈر تھا اس نے اقوام متحدہ میں عالمی طاقتوں کو ضامن بنا کر جس تحریر پر دستخط کئے تھے اس قرارداد کشمیر پر کیوں عملدرآمد نہیں ہوا؟ اس کا کوئی جواب ہے کسی کے پاس؟ کیا موہن لال اور مودی ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں؟

بروز ہفتہ 17 ذوالقعدہ 1445ھ 25 مئی 2024ء